ایچ اقبال کلیکشن

(سسپنس اور جاسوسی ڈائجسٹ کی شاندار کہانیاں)

(1)

سسپنس کے آخری صفحات
اور جاسوسی کے سرورق کے رنگ

الجھی ڈور

کایا کلپ

آخری رابطہ

عجیب بحران

تماشائے فطرت

سفید خون

خواب گراں

تیسرا رنگ

الجھی ڈور

نشور ھادی

زندگی کے سیدھے اور صاف راستے میں جب اچانک ھی مسائل اور رکاوٹوں سے سابقہ پڑنے لگے تو انسان پریشان ھوجاتا ھے کہ یہ اس کے ساتھ کیا ھورھا ھے؟ اور کیوں ھورھا ھے۔ بیرونِ ملک سے واپس لوٹنے والا وہ نوجوان بھی ایسی ھی الجھن کا شکار تھا۔ کوئی نادیدہ ھاتھ اس کے لئے نت نئے مسائل پیدا کررھا تھا مگر وہ حقیقت کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ پے درپے اس پر مصائب کے پھاڑ ٹوٹ رھے تھے۔ حالات کی ڈور الجھتی ھی چلی جارھی تھی۔

حرص و ھوس، دھوکا اور فریب سے عبارت ایک پرتجسس و دلچسپ کھانی

شوفر کی وردی میں ملبوس احمد بخش کسی سوچ میں ڈوبا ہوا کار چلا رہا تھا۔ تین چوتھائی رات گزر چکی تھی لیکن ائرپورٹ کی طرف جانے والی سڑک کسی وقت ویران ہوتی ہی نہیں تھی۔ اکادکا ٹیکسیاں اور کاریں آجارہی تھیں۔ بس دن کی طرح ٹریفک کا ہجوم نہیں تھا۔

احمد بخش سوچ میں ڈوبا ہوا ہونے کے باوجود اس وقت چونک پڑا جب اس نے ایک شخص کو دیکھا جو ہاتھ کے اشارے سے اس کی کار روکنا چاہ رہا تھا۔ احمد بخش نے یہ بھی دیکھ لیا کہ اس شخص کے ساتھ ایک فیشن ایبل عورت بھی تھی۔ وضع قطع سے وہ دونوں ہی کسی اچھے گھرانے کے افراد معلوم ہورہے تھے۔ وہیں سڑک کے کنارے ایک سفید کار بھی کھڑی ہوئی تھی۔

احمد بخش کے دماغ میں فوراً یہ خیال آیا کہ ائرپورٹ کی طرف جاتے ہوئے ان دونوں کی کار خراب ہوگئی ہوگی اس لیے وہ اس سے لفٹ لینا چاہ رہے تھے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ شخص اس سے شاید صرف کچھ تکنیکی مدد حاصل کرنا چاہتا ہو۔ بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں جو کار ڈرائیونگ جاننے کے باوجود کار میں اچانک ہوجانے والی کوئی چھوٹی موٹی خرابی بھی ٹھیک نہیں کرسکتے۔

شدید سردی اور رات کے اس پہر میں کسی بھی شخص کی پریشانی دوچند ہوسکتی تھی اگر اس کے ساتھ کوئی عورت بھی ہو۔ اس وقت اس جگہ ٹیکسی بھی آسانی سے نہیں مل سکتی تھی۔ یہی سب کچھ سوچتے ہوئے احمد بخش نے بریک لگائے۔ وہ گھر سے کچھ جلدی چل پڑا تھا۔ اسے ائرپورٹ پہنچنے کی عجلت نہیں تھی۔ اگر اسے اس شخص کی کار کی خرابی دور کرنے میں دس پندرہ منٹ بھی لگ جاتے تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔

کار رکتے ہی اجنبی شخص ڈرائیونگ سیٹ کی کھڑکی کے پاس آیا۔ احمد بخش نے کھڑکی کا شیشہ نیچے کیا۔ اجنبی بولا ”معاف کرنا بھئی، ہم نے بہت مجبوری میں روکا ہے تمہیں۔ ہم کسی کو لینے ائرپورٹ جارہے تھے کہ یہاں کار خراب ہوگئی“ اس نے وہاں کھڑی ہوئی سفید کار کی طرف اشارہ کیا ”اگر تم ائرپورٹ ہی کی طرف....“

”میں ادھر ہی جارہا ہوں جناب!“ احمد بخش نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا ”آپ مناسب سمجھیں تو میں آپ کی کار دیکھ لوں۔ اگر کوئی چھوٹی موٹی خرابی ہوئی تو میں ٹھیک کردوں گا۔“

”وہ میں دیکھ چکا ہوں۔ اگر کوئی چھوٹی موٹی خرابی ہوتی تو میں ٹھیک کرلیتا۔“

”اگر ایسی بات ہے تو میں آپ لوگوں کو ائرپورٹ پہنچائے دیتا ہوں جناب! آپ ادھر سے آجایئے۔“ احمد بخش نے ہاتھ بڑھا کر اپنے برابر کی سیٹ کے دروازے کا لاک کھولا۔

اجنبی کار کے آگے سے گھوم کر دروازے کی طرف آیا اور دروازہ کھول کر احمد بخش کے برابر میں بیٹھ گیا۔

”محترمہ کو پچھلی سیٹ پر بٹھادیجئے!“ احمد بخش نے کہا ”آپ کو تھوڑی سی زحمت ہوگی۔ ہاتھ بڑھا کر پچھلے دروازے کا لاک کھول دیجئے!“

”بس ٹھیک ہے، چلو“ اجنبی کے ہونٹوں پر شاطرانہ سی مسکراہٹ نظر آئی۔ احمد بخش فوری طور پر اس مسکراہٹ کا سبب نہیں سمجھ سکا اور حیرت سے بولا ”کیا وہ آپ کے ساتھ نہیں جائیں گی؟“ احمد بخش نے اس عورت کو سفید کار کی طرف واپس جاتے دیکھا۔

”نہیں، میں نے کہا نا کہ بس اب چلو۔“



اس وقت احمد بخش کا چہرہ فق پڑ گیا جب اس نے اجنبی کے ہاتھ میں ریوالور دیکھا۔ اجنبی نے اپنے دوسرے ہاتھ میں دبا ہوا رومال' ریوالور پر ڈال دیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا ہو گا کہ آس پاس سے گزرنے والی گاڑیوں میں بیٹھے ہوئے کسی شخص کی نظر ریوالور پر پڑے۔ کار کے اندر روشنی تھی اور کھڑکیوں کے بند شیشے ایسے نہیں تھے کہ باہر سے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔

"چلو۔" اجنبی دوبارہ بولا۔ اس مرتبہ اس کے لہجے کی سختی اس کے ہونٹوں پر پھیلی ہوئی مسکراہٹ سے ہم آہنگ نہیں تھی۔

احمد بخش کا سارا جسم سنسنا گیا۔ وہ زندگی میں کبھی بھی اس قسم کی صورت حال سے دوچار نہیں ہوا تھا۔ ہاتھ پیر اس کے قابو میں نہیں رہے تھے۔ وہ بہ مشکل ہی کار حرکت میں لاسکا۔

"شاباش!" اجنبی بولا "تم بہت اچھے آدمی ہو۔ میں نے ایک عورت کو اپنے ساتھ اسی لیے رکھا تھا کہ اچھے لوگ اگر کسی کو عورت کے ساتھ پریشانی کی حالت میں دیکھتے ہیں تو ان کے دل میں ہمدردی کا جذبہ ضرور پیدا ہوتا ہے۔ آج رات سردی بھی بہت بڑھ گئی۔ سبھی گاڑیوں کے شیشے بند نظر آرہے ہیں۔ مجھے خیال تھا کہ تمہاری گاڑی کے شیشے بھی بند ہوں گے اور دروازے اندر سے لاک بھی ہوں گے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو مجھے تم سے کوئی بات کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ میں خود ہی دروازہ کھول کر کار میں آبیٹھتا۔" وہ اس طرح باتیں کررہا تھا جیسے سرِراہ اچانک کسی شناسا سے ملاقات ہوئی ہو اور وہ اسے اپنی "بپتا" سنانے لگا ہو۔

احمد بخش کے دل کی دھڑکنیں خاصی تیز تھیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اجنبی اس سے کیا چاہے گا!

"رفتار تسلی بخش ہے" اجنبی نے مطمئن انداز میں کہا "ایک ڈیڑھ میل کے بعد دائیں جانب ایک گلی دکھائی دے گی۔ اس کے سامنے دو منٹ کے لیے کار روکنا ہے۔ اس گلی کو اچھی طرح پہچان لینا۔ گلی کے کونے پر ایک بورڈ لگا ہوا ہے' وہ ذہن نشین کرلو گے تو گلی بھی یاد رہے گی۔ اس گلی کو یاد رکھنا اس لیے بھی ضروری ہے کہ ائرپورٹ سے واپس آتے ہوئے تمہیں اس گلی میں مڑنا ہو گا۔ اس گلی میں کچھ آگے جا کر ایک چھوٹی سی دکان ہے جہاں پنکچر لگائے جاتے ہیں۔ ٹیکسیوں والے تو اس دکان سے خوب واقف ہیں۔"

احمد بخش کا دماغ ٹھیک سے کام نہیں کررہا تھا۔ اجنبی کی وہ باتیں تو اس کی سمجھ میں بالکل ہی نہیں آسکیں۔ اسے پنکچر لگانے والے کی کسی دکان سے کوئی کام نہیں ہوسکتا تھا لیکن اجنبی نے کہا تھا کہ ائرپورٹ سے واپس آتے ہوئے اسے اس گلی میں جانا ہو گا۔

"رفتار کم کرو!" اجنبی چند لمحے کے توقف سے بولا "گلی قریب آگئی ہے۔"

احمد بخش نے رفتار کم کردی۔ ریوالور دیکھ لینے کے بعد اسے اتنی ہمت ہو ہی نہیں سکتی تھی کہ اجنبی کی کسی ہدایت یا حکم کو نظر انداز کرتا۔

"بس اب روک دو" اجنبی پھر بولا۔

احمد بخش نے اس گلی کے کونے پر لگا ہوا بورڈ دیکھ لیا تھا۔ اس نے کار گلی کے بالکل سامنے روکی۔

اسی وقت پیچھے سے آنے والی ایک سفید کار اس کی کار سے آگے آکر رک گئی۔ احمد بخش کے اندازے کے مطابق وہ وہی سفید کار تھی جو اس نے راستے میں کھڑی دیکھی تھی۔ اس کے اندازے کی تصدیق کے لیے یہ بہت تھا کہ اس کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر وہی عورت دکھائی دی تھی۔

"یہ گلی اچھی طرح پہچان لو" اجنبی کے لہجے میں تاکید تھی۔

احمد بخش وہ گلی آسانی سے یاد رکھ سکتا تھا۔ اس کی توجہ اس آدمی کی طرف مبذول ہو گئی تھی جو سفید کار سے اتر کر اس کی کار کے قریب آیا تھا۔ اجنبی نے اس کے لیے پچھلی سیٹ کے دروازے کا لاک کھول دیا۔

دوسرا آدمی کار میں بیٹھ گیا تو اجنبی نے کہا "بس' اب چلو۔"

احمد بخش کار دوبارہ حرکت میں لے آیا۔ وہ کسی حد تک مذہبی آدمی تھا اس لیے دل ہی دل میں کچھ آیات کا ورد کرنے لگا تھا۔ اس کی دماغی حالت ایسی تھی کہ اسے اس کے سوا کچھ سوجھا ہی نہیں۔ وہ بس اتنا ہی سمجھ سکا تھا کہ اس پر کوئی مصیبت آگئی تھی۔ مصیبت کی نوعیت وہ نہیں سمجھ سکا تھا۔ اجنبی کے منہ سے ابھی تک ایسی کوئی بات نہیں نکلی تھی جس سے سمجھ میں آسکتا کہ وہ کیا چاہتا تھا۔

"تم اپنے مالک کو لینے جارہے ہو نا احمد بخش!" اجنبی بولا۔

احمد بخش کو یہ بہت سنسنی خیز معلوم ہوا کہ اجنبی اس کا نام جانتا تھا۔ اس نے منہ کھولا۔ اس نے کچھ کہنا چاہا تھا مگر کہہ نہیں سکا۔ اس کا حلق اتنا خشک ہو گیا تھا کہ اسے بولنے میں دقت ہوتی۔

اجنبی اس کی کیفیت سے بے خبر' بولتا چلا گیا "تمہارے مالک کا نام ثاقب ہے۔ وہ دو سال بعد اپنے وطن لوٹ

رہا ہے۔ اس کی بیوی شبنم اسے لینے ائرپورٹ ضرور جاتی لیکن عین وقت پر اس کی طبیعت کچھ خراب ہوگئی‘ اس لیے اس نے صرف تمہیں ہی بھیج دیا۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

احمد بخش نے تھوک نگلنا چاہا مگر اس کا حلق خشک ہورہا تھا۔ وہ بہ مشکل بول سکا "نہیں۔"

"میرے اور تمہارے مالک کے مابین کچھ ایسے مسائل ہیں جنہیں حل کرنے کے لیے ہماری ملاقات تنہائی میں ہونا ضروری ہے۔ دو سال پہلے جب وہ یہاں سے جارہا تھا تو میں نے اس سے فون پر کئی مرتبہ کہا تھا کہ تنہائی میں ہماری ملاقات ہوجانا چاہیے لیکن وہ نہیں مانا۔ اب معاملہ اتنا بگڑ چکا ہے کہ ہر صورت اس سے میری ملاقات بہت ضروری ہے۔ وہ کیونکہ اب بھی تنہائی میں ملنے پر آمادہ نہیں ہوگا اس لیے مجھے ذرا پیچیدہ طریقہ اختیار کرنا پڑا ہے۔ اس سلسلے میں تمہیں مجھ سے تعاون کرنا ہوگا۔ جب تم اپنے مالک کو لے کر ائرپورٹ سے لوٹو تو اس گلی کے قریب پہنچ کر اس سے کہنا کہ ائرپورٹ آتے ہوئے کار کا ایک ٹائر پنکچر ہوگیا تھا جو تم نے اس گلی کی دکان پر بننے کے لیے دے دیا تھا لہٰذا واپسی پر ضروری ہے کہ ٹائر وہاں سے لے لیا جائے۔ یہ بات ایسی ہے کہ تمہارے مالک کی سمجھ میں آجائے گی۔ تم کار اس گلی میں لے جانا۔ وہ دکان ڈیڑھ دو فرلانگ کے فاصلے پر ہے۔ اس وقت اس گلی سے گاڑیاں نہیں گزرتیں۔ وہاں تقریباً سناٹا ہی ہوگا۔ تمہارے مالک سے بات کرنے کے لیے اس وقت وہ ایک مناسب جگہ ہوگی۔"

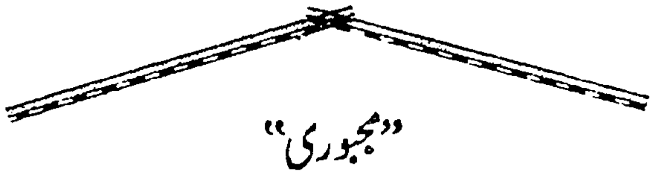
احمد بخش اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔ اس وقت اس کے دماغ میں یکایک یہ سوال ابھرا تھا کہ ائرپورٹ پر کیا وہ اپنے مالک کو اس صورتِ حال سے آگاہ نہیں کرسکتا؟

اجنبی کہتا رہا "ائرپورٹ پر جب تم کار پارکنگ لاٹ میں روکوگے تو میں بھی تمہارے ساتھ کار سے اتر آؤں گا لیکن میرا جو آدمی کار کی پچھلی سیٹ پر موجود ہے‘ وہ کار سے نہیں اترے گا۔ تم کار مقفل کرکے ائرپورٹ کی عمارت کی طرف جاؤگے تو میں تم سے کچھ فاصلے پر رہوں گا۔ جب بھی تم اپنے اردگرد کا جائزہ لوگے‘ مجھے زیادہ دور نہیں پاؤگے۔ میرا ہاتھ کوٹ کی جیب میں رہے گا اور جیب میں پڑے ہوئے ریوالور کی نال تمہاری طرف رہے گی۔ مجھے اندازہ ہے کہ تم ایک سمجھ دار آدمی ہو۔ تم اپنے مالک کو میرے بارے میں کچھ بتانے کی کوشش نہیں کروگے لیکن اگر تم سے ایسی کوئی حماقت سرزد ہوتی نظر آئی تو پھر میں خون خرابے سے بھی گریز نہیں کروں گا۔ وہاں تمہاری لاش پڑی رہ جائے گی اور میں وہاں سے غائب ہوجاؤں گا۔ میں جیب سے ریوالور نہیں نکالوں گا اس لیے کسی کو معلوم ہی نہیں ہوسکے گا کہ تم پر کدھر سے گولی چلی تھی۔ اگر تم نے حماقت کی تو میں اس وقت تمہارے مالک سے ملنے میں ناکام ہوجاؤں گا۔ میری یہ ساری محنت اکارت چلی جائے گی۔ مجھے تمہارے مالک سے تنہائی میں ملنے کے لیے کوئی دوسرا منصوبہ بنانا پڑے گا اور ضروری نہیں ہے کہ میرا دوسرا منصوبہ بھی ناکام ہو لہٰذا تمہارے حق میں یہی بہتر ہوگا کہ کوئی حماقت نہ کرنا۔ تمہارے مالک سے تو میں بعد میں مل ہی لوں گا لہٰذا اگر اس وقت تم نے اپنی جان گنوادی تو اس سے تمہارے مالک کو کوئی فائدہ نہیں ہوگا" اجنبی اتنے سکون سے بولتا چلا گیا تھا جیسے کسی معمولی موضوع پر بات کررہا ہو۔

سردی کے باوجود احمد بخش نے محسوس کیا کہ اس کے جسم سے پسینہ چھوٹنے لگا تھا۔

"دوسری بات" اجنبی نے قدرے توقف سے کہا "مجھے معلوم ہے کہ تمہارے مالک کو خود ہی کار چلانے کی عادت ہے۔ کسی وجہ سے شوفر ساتھ ہو تو وہ اسے پچھلی سیٹ پر بٹھادیتا ہے۔ ڈرائیونگ سیٹ خود سنبھالتا ہے۔ غالباً تم نے میرا اشارہ سمجھ لیا ہوگا۔"

"نہیں" احمد بخش کے منہ سے نکلا۔ وہ بہ مشکل بول سکا تھا۔ اس کی آواز گھٹی گھٹی سی تھی۔ اس کے دماغ میں سائیں سائیں ہورہی تھی۔ اعصاب جھنجھنانے لگے تھے اور



"مجبوری"

"نیو میکسیکو" نامی ایک اخبار کے دفتر فون کرکے ایک شخص نے کہا کہ اس نے اپنی شادی کا جو اطلاع نامہ بطور اشتہار چھپنے کے لیے دیا تھا‘ اسے روک لیا جائے۔ اخبار والوں نے بتایا کہ کاپی پریس جاچکی ہے اور اخبار چھپنا شروع ہوگیا ہے۔

تب وہ شخص مایوسی سے بولا "اوہ.... اس کا مطلب ہے مجھے اس منحوس عورت سے شادی کرنی ہی پڑے گی۔"

سارے وجود میں اس سوال کی دھمک پھیلی ہوئی تھی کہ جو کچھ بھی ہو رہا تھا' وہ کس نتیجے تک پہنچے گا؟

اجنبی بولا "میرا خیال تھا کہ تم سمجھ جاؤ گے۔ خیر! میں تمہیں بتاتا ہوں۔ جب تم اپنے مالک کے ساتھ کار میں بیٹھو گے تو ظاہر ہے کہ میں تمہارے ساتھ نہیں بیٹھ سکوں گا لیکن میرا آدمی پچھلی سیٹ پر موجود ہوگا۔ ڈرائیونگ سیٹ تمہارا مالک سنبھالے گا اس لیے تمہیں پچھلی ہی سیٹ پر بیٹھنا ہوگا۔ میرا آدمی آگے پیچھے کی سیٹوں کے درمیانی خلا میں خود کو پائیدان کے ایک گوشے میں سمیٹے رکھے گا۔ اس کے ریوالور کی نال تمہاری طرف رہے گی۔ میں تمہیں یہ موقع دینے کی حماقت نہیں کر سکتا کہ تم کار میں اپنے مالک کو کچھ بتادو۔"

احمد بخش کے دماغ میں ایک مبہم سی امید کلبلائی تھی جو اجنبی کی ان باتوں کے بعد دم توڑ گئی۔



طیارہ لینڈ کرنے ہی والا تھا۔ ایک دل کش نسوانی آواز موسم اور وقت وغیرہ کے بارے میں اعلان کر چکی تھی۔ اعلان کے مطابق مسافروں کو طیارے سے اترتے ہی نہایت سرد موسم کا سامنا کرنا تھا۔ وہاں دن بھر وقفے وقفے سے موسلا دھار بارش ہو چکی تھی اس لیے وہ رات وہاں کے موسم سرما کی بے حد سرد رات تھی۔

اس اعلان کے بعد بہت سے مسافروں نے اپنے اوورکوٹ سنبھال لیے تھے جبکہ طیارے میں سوار ہوتے وقت سبھی کو یہ خیال ہوگا کہ اپنی منزل پر پہنچنے کے بعد انہیں اوورکوٹ کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ وہاں اتنا سرد موسم شاذونادر ہی ہوتا تھا۔

ثاقب نے اوورکوٹ اپنے گھٹنوں پر رکھ کر سیفٹی بیلٹ باندھ لی تھی۔ اس کے تصور میں اس کی خوب صورت بیوی شبنم کا چہرہ جگمگا رہا تھا اس لیے اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ دو سال بعد اپنی محبوب بیوی اور چھوٹی سی' پیاری سی بیٹی انجبین سے ملنے کا خیال ہی اس کے لیے نشاط انگیز تھا۔

دو سال پہلے جب وہ وطن سے رخصت ہوا تھا' اس وقت انگبین کی عمر صرف ایک سال تھی اور شبنم سے اس کی شادی ہوئے دو سال گزر چکے تھے۔

ثاقب کی والدہ کا انتقال اس کے بچپن ہی میں ہو گیا تھا۔ کچھ اس کی خاطر اور کچھ اپنی مرحوم بیوی سے محبت کے باعث ثاقب کے والد نے دوسری شادی نہیں کی تھی۔ ساری زندگی انہوں نے اپنی توجہ بیٹے اور کاروبار پر مرکوز رکھی۔ وہ ایک بڑی آئل کمپنی کے مالک تھے۔

جب ثاقب نے اپنی تعلیم مکمل کی تو اس کے والد خاصے بیمار رہنے لگے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ اب ساری ذمے داریاں ثاقب سنبھال لیتا لیکن ثاقب کو آئل کمپنی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ کوئی خوبصورت ہوٹل کھولے اور پھر اس ہوٹل کی "چین" ملک کے تمام بڑے شہروں میں پھیلا دے۔

باپ کے پاس سرمائے کی کمی نہیں تھی۔ انہوں نے لاڈلے بیٹے کو اجازت دے دی کہ وہ اپنا مستقبل اپنی خواہش کے مطابق بنائے۔ آئل کمپنی انہوں نے فروخت کر دی کیونکہ اپنی بیماری کے باعث وہ اس پر مناسب توجہ نہیں دے سکتے تھے۔

ثاقب نے ایک سال خوردہ بلڈنگ خرید لی جسے حکومت نے مخدوش قرار دے دیا تھا۔ ثاقب نے وہ بلڈنگ تڑوا دی تاکہ اس کی جگہ ہوٹل تعمیر کرا سکے۔ اس نے اس سلسلے میں اپنے ایک دوست تاثیر کی خدمات حاصل کیں جو ایک آرکیٹیکٹ تھا اور جس میں ایک بڑا آرکیٹیکٹ بننے کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود تھی۔ وہ بس کسی اچھے موقع کا متلاشی تھا اور وہ موقع اسے ثاقب نے فراہم کر دیا۔

انہی دنوں میں ثاقب کی ملاقات شبنم سے ہوئی اور وہ ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے' پھر وہ پسندیدگی' محبت کی طرف بڑھنے لگی۔

شبنم کا تعلق متوسط طبقے سے تھا۔ اس کے والد کسی مناسب سرکاری منصب پر فائز تھے۔ ان کی سوچ کا ایک مخصوص انداز تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ متوسط طبقے کی لڑکیوں کی شادی امیر گھرانوں میں نہیں ہونا چاہیے لیکن شبنم نے اپنی ماں سے صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ اگر اس کی شادی ثاقب سے نہ ہوئی تو پھر کسی سے نہیں ہو سکے گی۔

دوسری طرف ثاقب کے والد اس کی شادی کسی بہت بڑے گھرانے میں کرنا چاہتے تھے لیکن ثاقب کو جو لڑکی پسند آئی' وہ متوسط طبقے کی تھی۔ ثاقب کے والد کی علالت ان دنوں سنگین صورت اختیار کر گئی تھی اس لیے انہوں نے تامل کیے بغیر بیٹے کی بات مان لی۔ وہ چاہتے تھے کہ بیٹے کی شادی ان کی زندگی ہی میں ہو جائے۔

اس طرح ثاقب اور شبنم کی شادی ہو گئی۔

اس شادی کے ساتھ ہی ثاقب کی زندگی میں ایک ایسا موڑ بھی آیا جو خاصی اہمیت کا حامل تھا۔ شادی کے دو ہی دن

بعد اسے ایک "لا انفورسمنٹ ایجنسی" کے دفتر میں بلایا گیا۔

ثاقب کے والد کے ایک دوست ریحان زیدی صاحب اس ایجنسی میں ڈپٹی ڈائریکٹر کے عہدے پر فائز تھے۔ ثاقب کبھی کبھی ان کے گھر چلا جایا کرتا تھا۔ اسے اپنے شہر یا اپنے ملک میں ہونے والے تخریب کاری کے ان واقعات کی بہت کرید رہتی تھی جن میں غیر ملکی ہاتھ کا شبہ کیا جاتا تھا۔ وہ ان واقعات پر ریحان زیدی صاحب سے خاصی باتیں کیا کرتا تھا۔ اس کی ان باتوں سے ریحان زیدی صاحب کو اس میں پوشیدہ ایک صلاحیت کا اندازہ ہوا۔ اس کے بارے میں انہوں نے اپنی رائے اپنے اعلیٰ حکام تک پہنچادی اور یہ ایک اتفاق تھا کہ جب اسے ایجنسی کے دفتر میں بلایا گیا' اس کی شادی کو دو ہی دن گزرے تھے۔

ایک طویل انٹرویو کے بعد ثاقب کو یہ کہہ کر رخصت کیا گیا تھا کہ ایجنسی ایک ہفتے کے اندر اندر اس کی خدمات حاصل کرنے کا فیصلہ کرسکتی ہے لیکن وہ کسی کو کانوں کان اس کی خبر نہ ہونے دے۔

ثاقب نے اسے اپنی زندگی کا ایک سنہری موقع جانا۔ ہوٹلوں کی ایک چین شروع کرنا اس کی زندگی کا ایک کاروباری معاملہ تھا لیکن اس کی دلی خواہش تھی کہ وہ کبھی کسی طرح اپنے وطن اور اپنی قوم کے کام آسکے تو وہ اس کے لیے ایک بہت بڑا اعزاز ہوگا۔

ایک ہفتے بعد ثاقب کو ایجنسی کے دفتر کے بجائے ایک بنگلے میں بلایا گیا جہاں ایجنسی کے ڈائریکٹر جنرل کے ساتھ صرف ایک افسر اور تھا۔ ثاقب کو یہ خوش خبری سنائی گئی کہ ایک ہفتے میں اس کے متعلق مکمل چھان بین کرنے کے بعد اس کا انتخاب کرلیا گیا تھا۔

ایجنسی غیر ملکی تخریب کاری کے خلاف ایک ایسا شعبہ قائم کرر ، جس میں صرف ایسے آدمیوں کو لیا جارہا تھا جو پہلے سے کسی سرکاری ملازمت میں نہ ہوں۔ ایسے لوگوں کو یہ حلف بھی اٹھانا تھا کہ اگر کسی وقت موت ان کے سامنے آجائے اور وہ اپنی سرکاری حیثیت ظاہر کرکے موت سے بچ سکتے ہوں تو وہ اپنی سرکاری حیثیت راز میں رکھنے کو ترجیح دیں اور موت قبول کرلیں۔

ثاقب نے یہ حلف بڑی خوشی سے اٹھالیا۔

اس شعبے میں کام کرنے والوں کی تربیت کا مرحلہ غیر معمولی طور پر طویل اور بہت کڑا تھا۔ ڈیڑھ سال کی تربیت تو اپنے ہی ملک میں ہونا تھی' پھر دو سال تک ایک مغربی ملک میں تربیت حاصل کرنا تھی۔ اس طرح ثاقب کو ساڑھے تین سال بعد اپنے وطن اور قوم کے لیے کام شروع کرنا تھا۔

دوسری طرف ہوٹل کی تعمیر میں بھی ساڑھے تین سال کا عرصہ لگتا تھا۔ ثاقب نے جس قسم کا نقشہ بنوایا تھا' اس کے مطابق عمارت کی تعمیر اس سے کم مدت میں ممکن نہیں تھی۔ ثاقب نے وہ ساری ذمے داری اپنے آرکی ٹیکٹ دوست تاثیر کو سونپ دی اور اپنی ساری توجہ تربیت کے حصول پر مرکوز کردی۔ کیونکہ وہ ہر بات راز رکھنے کا حلف اٹھاچکا تھا اس لیے یہ اس کی بیوی شبنم کو بھی نہیں معلوم ہوسکا کہ ان دنوں اس کے شوہر کی مصروفیات کیا تھیں۔

ڈیڑھ سال بعد ثاقب کو بیرونِ ملک جانا تھا اس لیے اس نے شبنم کو دھیرے دھیرے ذہنی طور پر دو سال کی جدائی کے لیے آمادہ کرلیا۔ اس نے شبنم سے کہا تھا کہ وہ ہوٹل کی تعمیر سے پہلے ہوٹل مینجمنٹ کا کورس کرنے کے لیے بیرونِ ملک جائے گا۔

چھ ماہ بعد ثاقب کے والد کا انتقال ہوگیا۔

مزید ایک سال گزرنے کے بعد ثاقب بیرونِ ملک روانہ ہوا۔ ہر متعلقہ شخص کو یہی بتایا گیا تھا کہ وہ ہوٹل مینجمنٹ کا کورس کرنے کے لیے باہر جارہا تھا۔

"جب میں واپس آؤں گا تو ہوٹل کی تعمیر مکمل ہو چکی ہوگی" اس نے روانگی سے پہلے تاثیر سے کہا تھا "میری عدم موجودگی میں تمہیں اخراجات کی طرف سے کوئی فکر مندی نہیں ہوگی۔ اخراجات کا جو تخمینہ لگایا گیا ہے' میں نے اس سے کچھ زیادہ رقم شبنم کے اکاؤنٹ میں جمع کرادی ہے۔ تمہیں جب بھی جتنی رقم کی ضرورت پڑے' شبنم سے کہہ دینا۔ تمہیں اس سے چیک مل جایا کرے گا۔ میں نے اسے سب کچھ سمجھا دیا ہے۔ تم ٹیلی فون پر مجھ سے رابطے میں بھی رہا کرنا۔"

اور شبنم سے ثاقب نے کہا تھا "جب بھی تاثیر کوئی رقم مانگے' تم اسے چیک دینے سے پہلے مجھے ٹیلی فون پر بتا ضرور دیا کرنا۔"

اس ہدایت کی وجہ یہ نہیں تھی کہ ثاقب کو تاثیر پر اعتماد نہیں تھا' بات صرف اتنی تھی کہ اس نے اپنے مرحوم باپ کی ایک نصیحت گرہ میں باندھ لی تھی۔ مرحوم اس سے ہمیشہ کہا کرتے تھے "کسی کو تم کتنا بھی اپنا سمجھو' روپے پیسے کے معاملے میں اس پر اندھا اعتماد ہرگز نہ کرنا۔"

لیکن اس نصیحت کو گرہ میں باندھ لینے کے باوجود ثاقب نے اپنی بیوی پر تو اعتماد کیا ہی تھا کہ اس کے اکاؤنٹ میں ایک بہت کثیر رقم جمع کرادی تھی۔

بیرون ملک ثاقب کے دو سال ابتدائی ڈیڑھ سالہ تربیت سے زیادہ سخت گزرے تھے لیکن وہ شبنم اور تاثیر سے ٹیلی فون پر بات کرنے کے لیے وقت بہرحال نکالتا تھا۔ شبنم کو خط بھی لکھا کرتا تھا۔ شبنم بھی اسے بڑی پابندی سے طویل اور پیار بھرے خطوط لکھا کرتی تھی۔ ہر دو ماہ بعد انگبین کی تازہ ترین تصویر بھی بھیجتی تھی اس لیے ثاقب اپنی پیاری بیٹی میں بتدریج آنے والی تبدیلیوں سے ہر وقت باخبر رہا تھا۔

انگبین جب تتلا کر باتیں کرنے لگی تھی تو ثاقب ٹیلی فون پر خود بھی تتلا کر اس سے باتیں کیا کرتا تھا اور اس وقت اسے ایک عجیب انبساط انگیز سنسنی محسوس ہوتی تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ اڑ کر اپنے وطن پہنچے اور اپنی بیٹی کو گود میں دبوچ کر اسے پیار کرے۔

اور اب وہ وقت آگیا تھا جب اس کی دانست میں اس کی دبی ہوئی تمام خواہشات کی تکمیل میں زیادہ دیر نہیں رہی تھی۔

جب طیارہ لینڈ کر گیا اور دروازہ کھول دیا گیا تو لوگ جوق در جوق دروازے کی طرف لپکنے لگے۔ ثاقب اس وقت سکون سے بیٹھا رہا۔ اسے تربیت کے دوران میں بتایا گیا تھا کہ اگر کوئی مضبوط جواز نہ ہو تو ہجوم سے گریز کرنا چاہیے۔

جب اترنے والوں کی تعداد کم رہ گئی تو ثاقب اپنی جگہ سے اٹھا۔ اس نے اوور کوٹ پہنا اور اپنا سفری بیگ اٹھا کر دروازے کی طرف بڑھا۔ بیگ پر فضائی کمپنی کا نشان تھا اور اس کے تسمے سے دو "ٹیگ" بندھے ہوئے تھے۔ ثاقب نے بیگ اپنے بائیں ہاتھ میں سنبھالا تھا اور اسی ہاتھ میں مختلف رنگوں کے تین کتابچے بھی تھے۔ انہیں کتابچہ اس اعتبار سے کہا جا سکتا تھا کہ ان کی ضخامت بیس چوبیس صفحات سے زیادہ نہیں تھی مگر لمبائی چوڑائی اتنی تھی کہ دور سے ان پر فائلوں کا گمان ہو سکتا تھا۔ وہ سفر کے دوران میں ان کتابچوں کا مطالعہ کرتا رہا تھا جو ہوٹل مینجمنٹ کے بارے میں تھے۔

اس نے طیارے کے دروازے سے باہر نکلتے ہوئے "ٹنل" میں قدم رکھا تو وہ طیارے کا آخری مسافر تھا۔ اس کے آگے ایک جوان العمر لڑکی تھی۔ ثاقب نے اسے طیارے میں بھی دیکھا تھا۔ وہ شرٹ اور جینز میں ملبوس تھی لیکن اس وقت وہ سمور کا کوٹ بھی پہنے ہوئے تھی۔ اس کے ایک شانے سے سفری بیگ اور دوسرے شانے سے وینٹی بیگ لٹکا ہوا تھا۔ وہ اپنا وینٹی بیگ کھولے' اس میں کچھ تلاش کرتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔

اس وقت لڑکی کے چہرے کا صرف ایک حصہ ثاقب کے سامنے تھا لیکن طیارے میں وہ اس کا پورا چہرہ دیکھ چکا تھا۔ اس کی رنگت کھلتی ہوئی سانولی تھی۔ نقش و نگار جاذب نظر تھے۔ بالوں کا اسٹائل کچھ ایسا تھا کہ وہ بار بار اس کی بائیں آنکھ پر آجاتے تھے جنہیں ہٹانے کے لیے اسے اپنا بایاں ہاتھ حرکت میں لانا پڑتا تھا۔ وہ کچھ لاابالی اور اپنی ذات میں مگن سی نظر آتی تھی۔ حرکات و سکنات میں ایسی بے خودی تھی جیسے اسے اپنے اردگرد کا ہی نہیں' اپنے وجود کا بھی ہوش نہ رہتا ہو۔ طیارے میں وہ دو مرتبہ ٹوائلٹ کی طرف جاتے ہوئے ثاقب کی نشست کے قریب سے گزری تھی۔ ایک مرتبہ اس کے بالوں میں لگا ہوا ایک کلپ پھسل کر گر پڑا تھا لیکن وہ آگے بڑھتی چلی گئی تھی۔ ثاقب نے وہ کلپ اٹھا لیا تھا۔ جب وہ ٹوائلٹ سے لوٹی تھی تو ثاقب نے اسے روک کر اس کا کلپ اس کی طرف بڑھایا تھا۔ وہ چونکی تھی اور پھر ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنی نشست کی طرف بڑھ گئی تھی۔

ٹنل میں آگے بڑھتے ہوئے اسی قسم کا واقعہ پھر پیش آیا۔ لڑکی کے وینٹی بیگ سے ایک "کی چین" گر پڑی لیکن وہ اپنا وینٹی بیگ بند کرتے ہوئے آگے بڑھتی رہی۔

ثاقب نے وہ "کی چین" اٹھالی۔ اس میں دو چابیاں تھیں۔ ثاقب نے اپنی رفتار کچھ بڑھائی اور لڑکی کے قریب پہنچ کر بولا "یہ کی چین آپ کے بیگ سے گر گئی تھی۔"

"شکریہ" لڑکی نے جلدی سے "کی چین" لے لی پھر جلدی جلدی پلکیں جھپکاتے ہوئے ثاقب کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے ہنس پڑی۔ اس کی ہنسی میں کھنک تھی۔ موسیقیت سے لبریز ہنسی! وہ بولی "یہ ایک دلچسپ اتفاق ہے کہ میری گرائی ہوئی کوئی چیز دوسری بار بھی آپ ہی کو ملی۔ میرے جاننے والے کہتے ہیں کہ مجھے اپنی چیزیں گرانے کا شوق ہے۔ ویسے یہ حقیقت ہے کہ میری چیزیں اکثر گم ہوتی رہتی ہیں۔"

"آپ کچھ بے خود سی رہتی ہیں" ثاقب کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔

"لوگ یہ بھی کہتے ہیں" وہ پھر ہنسی "مگر یقین کیجئے کہ میں شراب نہیں پیتی۔"

اس سے پہلے کہ ثاقب کچھ کہتا' اس لڑکی نے ثاقب کی طرف دیکھتے ہوئے الوداعی انداز میں ہاتھ ہلایا اور ہنس کر بولی "میں دعا کروں گی کہ جب بھی میری کوئی چیز گرے' آپ آس پاس ہی کہیں ہوں" پھر وہ تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

ساڑھے تین سال تک ثاقب کی تربیت کچھ ایسی ہوئی تھی کہ "کیسے؟" اور "کیوں؟" جیسے سوالات اس کے دماغ میں ضرور جنم لیتے تھے جب اس کے سامنے کچھ ہوتا تھا۔ اس وقت بھی اس کے دماغ میں یہ سوال ابھرا کہ کیا واقعی یہ محض ایک اتفاق تھا کہ اس لڑکی کی چیزیں دو مرتبہ اس طرح گریں کہ اسی کو ملیں؟

ایسے اتفاقات کو مسترد کرنا بہرحال ممکن نہیں ہوتا۔ وہ سوال اس لیے بھی ثاقب کے دماغ میں نہیں رہ سکا کہ محبوب بیوی شبنم اور پیاری بیٹی انگبین کا خیال پھر اس کے دماغ میں در آیا تھا۔ ان دونوں سے جلد از جلد ملنے کی خواہش اس کی رگ رگ میں کسی سیال مادے کی طرح دوڑ رہی تھی۔

لیکن یہ اس کے لیے ممکن نہیں تھا کہ وہ ائرپورٹ کی عمارت سے فوراً نکل جاتا۔ اسے طیارے سے سامان لانے والی بیلٹ کے پاس ہی بیس منٹ تک رکنا پڑا۔ اس کا سامان دو بڑے بڑے سوٹ کیسوں اور ایک چرمی بیگ پر مشتمل تھا۔ سامان ٹرالی پر رکھ کر وہ اسے دھکیلتا ہوا بیرونی دروازے کی طرف بڑھا۔

طیارے کے مسافروں کا استقبال کرنے والوں کی بھیڑ اس وقت خاصی کم ہوگئی تھی۔ ثاقب کو اپنا شوفر احمد بخش فوراً نظر آگیا جو اس کے گھر میں اس کے باپ کے زمانے سے ملازم تھا۔

ثاقب جیسے ہی باہر نکلا' احمد بخش نے قریب آتے ہوئے اسے سلام کیا اور ٹرالی خود سنبھال لی۔

"کیسے ہو احمد بخش؟" ثاقب نے محبت سے پوچھا۔

"ٹھیک ہوں صاحب! آپ کی دعائیں ہیں۔"

"خیریت ہے نا!" ثاقب نے اسے غور سے دیکھا۔ اس نے احمد بخش کو اتنا سنجیدہ کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ تو ایک ایسا شخص تھا جو زندگی ہنس کھیل کر گزارنے کا قائل تھا۔ مسکراہٹ تو اس کے ہونٹوں پر عموماً رہتی تھی جو اس وقت غائب ہوگئی تھی۔

"جی ... جی ہاں۔ سب خیریت ہے" احمد بخش کا یہ لب ولہجہ بھی ثاقب کو اجنبی سا لگا۔

ثاقب نے کچھ سوچتے ہوئے کہا "میرا خیال تھا کہ شبنم مجھے لینے ضرور آئے گی۔"

"ان کی طبیعت اچانک کچھ خراب ہوگئی صاحب! رات کو انہوں نے بہت دیر سے کھانا کھایا تھا۔ اس کے گھنٹا بھر بعد ہی ان کے پیٹ میں خاصی گڑبڑ ہوگئی۔"

"ارے!"

"گھبرانے کی بات نہیں ہے صاحب! جب میں گھر سے چلا تھا تو وہ بتا رہی تھیں کہ ان کی طبیعت بہتر ہو گئی ہے۔ انہوں نے بس احتیاطاً یہ سوچا تھا کہ انہیں فوراً گھر سے باہر نہیں جانا چاہیے۔"

فٹ پاتھ کے کنارے احمد بخش نے ٹرالی روک دی اور بولا "میں ایک ایک کر کے دونوں سوٹ کیس کار تک..."

"نہیں" ثاقب نے اس کی بات کاٹی "کسی پورٹر کو لے لو" پھر اس نے خود ہی ایک پورٹر کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔

"انگبین کیسی ہے؟" ثاقب نے احمد بخش سے پوچھا اور قریب آجانے والے پورٹر کی طرف دیکھتے ہوئے ٹرالی کی طرف اشارہ کیا۔

"بے بی بھی ٹھیک ہیں صاحب!" احمد بخش نے مختصر جواب دیا۔

ثاقب کو جواب کا یہ اختصار بھی غیر معمولی محسوس ہوا۔ جب وہ یہاں سے گیا تھا تو انگبین صرف ایک سال کی تھی لیکن اس کا ذکر چھیڑتے ہی احمد بخش اس کے بارے میں مسلسل باتیں کرنے لگتا تھا۔ بے بی کی آنکھوں میں ابھی سے بہت چمک ہے صاحب! ایسے بچے بہت ذہین ہوتے ہیں۔ "بے بی کا ناک نقشہ..." اور پھر وہ کسی کے ٹوکنے ہی پر چپ ہوتا تھا لیکن اس وقت؟

ثاقب کا دماغ اس سوال کی آماجگاہ بن گیا۔ ساتھ ہی اسے ایک اور عجیب احساس بھی ہوا۔

پورٹر جب سوٹ کیس اٹھا رہا تھا تو ثاقب نے اچٹتی سی نظر سے اس شخص کو دیکھا جو اتنا قریب تھا کہ اس نے احمد بخش سے اس کی گفتگو بھی سن لی ہوگی۔ وہ اوورکوٹ پہنے ہوئے تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ اوورکوٹ کی جیبوں میں تھے۔ وہ اس طرح ادھر ادھر دیکھ رہا تھا جیسے کسی کی تلاش میں ہو۔ ثاقب کو اس کا وہ انداز کچھ مصنوعی معلوم ہوا۔ غالباً اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اس نے دو مرتبہ احمد بخش کو کن انکھیوں سے اس شخص کی طرف دیکھتا ہوا پایا تھا۔

"کیا چکر ہے؟" ثاقب کا دماغ الجھنے لگا۔

پورٹر نے دونوں سوٹ کیس اپنے سر پر لاد کر چرمی بیگ اپنے شانے سے لٹکا لیا تھا۔ ثاقب اور احمد بخش اس کے ساتھ سڑک پار کرنے لگے۔ ثاقب نے دیکھا کہ اوورکوٹ والا اجنبی بھی ان کے ساتھ سڑک پار کر رہا تھا۔

ثاقب کی الجھن میں اضافہ ہوا۔ کیا یہ شخص اس کے قریب رہنا چاہتا ہے؟ مگر کیوں؟ اور احمد بخش نے کن انکھیوں سے اس شخص کی طرف کیوں دیکھا تھا؟ اور احمد بخش اتنا سنجیدہ کیوں تھا؟

ثاقب نے ایک مرتبہ اوورکوٹ والے کی طرف براہِ راست دیکھا تو دونوں کی نظریں مل گئیں۔ اوورکوٹ والا فوراً مسکرا پڑا اور بولا "بعض اوقات ایسی پریشانی لاحق ہو جاتی ہے جس کا پہلے سے بالکل گمان نہیں ہوتا۔ میرے ایک دوست کو اسی فلائٹ سے آنا تھا لیکن اس نے یقیناً عین وقت پر اپنا پروگرام ملتوی کر دیا۔ کم بخت نے مجھے اس کی اطلاع بھی نہیں دی۔ میں ابھی گھر جا کے اسے فون کروں گا اور اسے اس کی غیر ذمے دارانہ حرکت پر اچھی طرح لتاڑوں گا۔"

بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ سفر میں یا راہ چلتے ہوئے کسی بھی اجنبی سے مخاطب ہو کر اپنا دکھڑا رونے لگتے ہیں جبکہ سننے والے کو ان کے دکھڑے سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی لیکن ثاقب کے خیال کے مطابق وہ اوورکوٹ والا ایسے لوگوں میں سے نہیں تھا۔ وہ صرف اس لیے باتیں بنانے لگا تھا کہ اسی بہانے قریب رہ سکے۔

ثاقب نے اپنے اعصاب میں تناؤ محسوس کیا۔ اب اسے یہ خیال بھی آیا کہ احمد بخش سنجیدہ نہیں بلکہ کچھ خوف زدہ تھا اور اپنے خوف کا تاثر اپنے چہرے پر آنے سے روک رہا تھا۔

بہت سے خیالات نے ثاقب کے دماغ پر یورش کر دی۔ اسے ایک امکان یہ بھی نظر آیا کہ شاید اوورکوٹ والے کی جیب میں ریوالور ہو۔ اس کے ہاتھ تو جیبوں میں تھے ہی۔ شاید اس نے احمد بخش کو ڈرا دیا ہوگا کہ اگر اس نے اپنے مالک کو کچھ بتایا یا بتانے کی کوشش کی تو اسے گولی مار دی جائے گی۔

لیکن ایسا کیوں ہوگا؟ ثاقب اپنے اس خیال کو رد کرنے لگا۔ ایسی باتوں کا کوئی جواز تو ہوتا ہے اور کوئی جواز اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

"بارش کی وجہ سے آج موسم بہت سرد ہو گیا ہے" اوورکوٹ والے نے بڑبڑانے والے انداز میں اس وقت کہا جب وہ پارکنگ لاٹ میں داخل ہو رہے تھے۔

ثاقب نے اس وقت بھی اوورکوٹ والے کی بات کے جواب میں کچھ کہنا ضروری نہیں سمجھا۔ اس نے اپنے دماغ میں آنے والے شبہات کو مسترد کرنے کی کوشش تو کی تھی لیکن وہ لاشعوری طور پر پوری طرح چوکنا تھا۔

کار کے قریب پہنچ کر ثاقب اور احمد بخش کے قدم رکے تو پورٹر کو ان کے ساتھ رکنا ہی تھا لیکن وہ اوورکوٹ والا بھی

رکا۔

"آپ کی کار بہت شاندار ہے" وہ تحسین آمیز لہجے میں بولا۔

"جی۔ شکریہ!" ثاقب نے اس مرتبہ اوور کوٹ والے کو بہت غور سے دیکھا۔

احمد بخش نے کار کی ڈکی کھولی۔

اوور کوٹ والے نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ اس وقت ایک کار پارکنگ لاٹ میں داخل ہو رہی تھی۔ زیادہ تر کاریں وہاں سے جانے کے لیے متحرک ہو رہی تھیں۔ بعض کاروں کے دروازے کھولے جا رہے تھے۔

"میری کار ذرا آگے کھڑی ہے۔" اوور کوٹ والا پھر ثاقب سے مخاطب ہوا "میں عموماً چھوٹی کار رکھتا ہوں۔ یہاں کی سڑکوں پر بڑی کاروں کے لیے پارکنگ کا مسئلہ بہت ٹیڑھا ہے۔"

ثاقب نے اپنے سر کو خفیف سی جنبش دینے پر اکتفا کیا اور اپنے پرس سے پورٹر کو کچھ پیسے دینے لگا۔

سامان ڈکی میں رکھا جا چکا تھا۔ احمد بخش نے ڈکی بند کی اور ثاقب کے قریب آکر کار کی چابی اس کی طرف بڑھادی۔

ثاقب کا اعصابی تناؤ برقرار تھا۔ وہ احمد بخش سے کچھ کہے بغیر کار کی ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھولنے لگا۔ ان لمحوں میں وہ اوور کوٹ والے کی طرف سے پوری طرح چوکنا تھا۔ اسے اس وقت یہ احساس بڑی شدت سے ہو رہا تھا کہ وہ غیر مسلح تھا۔

جب وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا تو احمد بخش نے کھڑکی میں ہاتھ ڈال کر پچھلے دروازے کا لاک کھولا اور پھر دروازہ کھول کر پچھلی نشست پر بیٹھنے لگا۔

"اچھا جناب! خدا حافظ!" اوور کوٹ والے نے آگے بڑھتے ہوئے اس طرح کہا جیسے ثاقب سے پرانی شناسائی رہی ہو۔

اوور کوٹ والے کے آگے بڑھ جانے سے ثاقب کا اعصابی تناؤ تیزی سے کم ہوتا چلا گیا۔ اس نے سوچا اگر خطرے کی کوئی بات تھی تو اب وہ خطرہ اس کے سر پر نہیں رہا۔ اوور کوٹ والا ان سے دور نکل گیا تھا۔ اب کار میں احمد بخش اسے کچھ بتاتے ہوئے کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتا۔

○☆○

صبح کی روشنی پھیلنے میں اب بھی آدھا گھنٹا باقی تھا۔

ثاقب کی کار پارکنگ لاٹ سے نکلی اور سڑک پر فراٹے بھرنے لگی۔ ثاقب کا خیال تھا کہ احمد بخش اسے فوراً کچھ بتائے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ ثاقب سوچنے لگا کیا اس کے شکوک و شبہات بے بنیاد تھے؟ لیکن اس کا دماغ اس سوال کے اثباتی جواب کے ضمن میں متذبذب رہا۔ اس نے بایاں ہاتھ بڑھاکر عقب نما آئینے کا زاویہ اس طرح بدلا کہ اسے پیچھے بیٹھے ہوئے احمد بخش کا چہرہ نظر آنے لگے۔ اس کے ہاتھ کی حرکت پر احمد بخش نے بھی عقب نما آئینے کی طرف دیکھا۔ یقیناً اسے بھی آئینے میں ثاقب کی آنکھیں نظر آگئی ہوں گی۔

احمد بخش کا چہرہ دیکھتے ہی ثاقب کے اعصاب میں پھر تناؤ آنے لگا۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ احمد بخش کے چہرے پر اب خوف کا تاثر دکھائی دینے لگا تھا۔ پہلے وہ غالباً کوشش کرتا رہا تھا کہ اس کے چہرے پر خوف کا تاثر نہ ابھر سکے۔

سڑک پر اکادکا گاڑیاں آ جا رہی تھیں۔ ثاقب کے لیے ضروری نہیں تھا کہ وہ ساری توجہ ڈرائیونگ پر مرکوز رکھتا۔

"کیا بات ہے احمد بخش! تم بہت چپ چپ ہو!" ثاقب کی نظریں عقب نما آئینے میں احمد بخش کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

"نہیں تو صاحب! ایسی تو کوئی بات نہیں" احمد بخش نے جواب دیا اور فوراً ہی نظریں جھکا کر اپنے دائیں جانب دیکھنے لگا۔

"کیا یہ کوئی اشارہ ہے؟" ثاقب نے سوچا۔ احمد بخش نے نظریں جھکا کر اپنی دائیں جانب کیوں دیکھا تھا؟

ثاقب نے اب تیزی سے ایک ہی رخ پر سوچنا شروع کیا۔ شاید کسی نے کسی وجہ سے اس کے خلاف کوئی منصوبہ بندی کی تھی۔ کوئی اسے کسی قسم کا نقصان پہنچانا چاہتا تھا۔ احمد بخش کو کسی طرح اس سازش کا علم ہوگیا۔ جب سازش کرنے والے کو اس کا اندازہ ہوگیا تو اس نے احمد بخش کو دھمکی دی کہ اگر اس نے اس بارے میں اپنی زبان کھولنے کی کوشش کی تو اسے ختم کردیا جائے گا۔

اوور کوٹ والا اجنبی، سازش کرنے والوں ہی میں سے کوئی ہو سکتا تھا۔ وہ اسی لیے قریب قریب رہا کہ احمد بخش، ثاقب کو کچھ بتا نہ سکے۔ پھر وہ ساتھ ساتھ چلتا ہوا پارکنگ لاٹ میں کار تک بھی آیا۔ یہاں سے وہ آگے بڑھ گیا۔ غالباً یہاں سے کسی دوسرے آدمی کی ڈیوٹی شروع ہوتی کہ وہ احمد بخش کو خاموش رہنے پر مجبور رکھے۔ وہ آدمی کسی طرح پہلے ہی سے کار میں موجود تھا۔ اس نے ڈرائیونگ سیٹ کے پیچھے خود کو پائیدان کے خلا میں سمیٹ رکھا تھا۔ احمد بخش نے اسی لیے نظر جھکا کر اس طرف دیکھا تھا۔

ثاقب نے اپنے دماغ میں یہ کہانی بنالی لیکن وہ یہ اندازہ

لگانے سے قاصر تھا کہ اس کے خلاف کسی قسم کی سازش ہوسکتی تھی اور سازش کرنے والا کون ہو سکتا تھا؟

ثاقب نے ایک اچٹتی سی نظر سے سامنے سڑک کا جائزہ لینے کے بعد پھر عقب نما آئینے کی طرف دیکھا اور بولا "میرا خیال ہے، تم ضرور کچھ فکر مند ہو" اس نے سوچا تھا کہ اگر اس کے شبہے کے مطابق کوئی گڑبڑ تھی اور احمد بخش نے اسے آنکھوں سے اشارہ کیا تھا تو ایسی ہی کوشش وہ دوبارہ بھی کر سکتا تھا۔

اس مرتبہ احمد بخش کی نظریں جھکی رہیں۔ وہ اپنی دائیں جانب ہی دیکھتا رہا اور بولا "مجھے کیا فکر ہو سکتی ہے؟" اس کا انداز سوالیہ تھا "آپ مجھے دیکھ ہی رہے ہیں۔"

ثاقب کا دماغ پھر تیزی سے ایک ہی رخ پر سوچنے لگا۔ اس مرتبہ احمد بخش نے بہت واضح اشارہ دیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ اسے دیکھ بھی رہا ہے لہٰذا اسے اندازہ لگا لینا چاہیے کہ اسے کیا فکر ہو سکتی ہے۔

احمد بخش تعلیم یافتہ تو نہیں لیکن خاصا سمجھ دار شخص تھا۔ اسے عقب نما آئینے میں ثاقب کی آنکھیں نظر آئی ہوں گی تو اس نے سمجھ لیا ہوگا کہ اس کا چہرہ بھی ثاقب کو نظر آجانا چاہیے۔ اسی لیے اس نے کہا تھا کہ آپ مجھے دیکھ ہی رہے ہیں۔ یہ اشارہ خطرناک حد تک واضح تھا۔ خطرناک حد تک اس لیے کہ کار میں چھپے ہوئے آدمی کو اگر اس کا شبہ ہو جاتا تو احمد بخش کے لیے کوئی ناخوشگوار صورتِ حال پیدا ہو سکتی تھی۔

"اچھا خیر! گھر پہنچ کر بات کریں گے" ثاقب نے یہ جملہ اس لیے کہا کہ کار میں چھپے ہوئے شخص کو مطمئن کر سکے۔

"صاحب!" احمد بخش بولا "اگر کوئی بات آپ کو کرنا ہی ہے تو ابھی کر لیں۔"

ثاقب کے خیال میں اس مرتبہ احمد بخش نے بہت ہی زیادہ خطرناک حد تک جرات مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ کہنے کی کوشش کی تھی کہ اگر اسے کچھ کرنا ہی ہے تو فوراً کر ڈالے۔

ثاقب کو یہ خیال بھی تھا کہ کار میں کسی نامعلوم آدمی کی موجودگی اس کا ایک مفروضہ ہی تھا لیکن جو کچھ اس کے مشاہدے میں آتا رہا تھا، اس میں سرّیت تھی لہٰذا اس امکان کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔

یہ بات ثاقب کی سمجھ میں ابھی تک نہیں آسکی تھی کہ اگر کوئی کار میں موجود تھا تو وہ کب تک چھپا رہتا؟ اس کے مقاصد کیا ہو سکتے تھے؟

لیکن اس کی دانست میں احمد بخش کیونکہ یہ اشارہ دے چکا تھا کہ اسے جلد از جلد کچھ کرنا چاہیے اس لیے ان سوالات پر غور کرنے میں وقت ضائع کرنا مناسب نہیں ہوتا۔ جلد از جلد کچھ کر گزرنا ہی مناسب ہوتا!

ثاقب کیونکہ مسلح نہیں تھا اس لیے وہ ایک ہی فیصلہ کر سکا۔ اس فیصلے پر عمل درآمد کی صورت میں احمد بخش کو بھی چوٹیں لگ سکتی تھیں لیکن کسی زیادہ ناخوشگوار ممکنہ صورتِ حال سے بچنے کے لیے کوئی دوسری تدبیر فوری طور پر ثاقب کی سمجھ میں نہیں آسکی تھی۔

کار کی رفتار اس وقت تیس میل سے زیادہ نہیں تھی۔ ثاقب سناٹے میں ڈوبی ہوئی سڑکوں پر اتنی کم رفتار سے ڈرائیونگ نہیں کرتا تھا۔ وہ سڑک سناٹے میں ڈوبی ہوئی تو نہیں تھی لیکن اس برائے نام سے ٹریفک میں رفتار چالیس پینتالیس میل سے بھی زیادہ رکھی جا سکتی تھی۔ ثاقب کیونکہ پے چیدہ خیالات میں الجھا ہوا تھا اس لیے رفتار بڑھانے کی طرف اس کا دھیان ہی نہیں گیا تھا۔ بے خیالی میں کم رہنے والی وہ رفتار اس کے فیصلے پر عمل درآمد ہی معاون ثابت ہوتی لیکن اس نے رفتار میں تھوڑی سی کمی اور کی۔ وہ کمی کار میں موجود کسی شخص کو چوکنا کر سکتی تھی اس لیے ثاقب بولا "مجھے سگریٹ لینا ہے احمد بخش! لیکن کوئی دکان نظر نہیں آرہی ہے۔"

"اس وقت کوئی دکان کہاں کھلی ہوگی صاحب!" احمد بخش نے کہا۔

"مجھے یاد آرہا ہے کہ یہاں کہیں کوئی ایک دکان تھی جو رات بھر کھلی رہتی تھی۔"

"مجھے تو یاد نہیں ہے صاحب!"

ثاقب نے اس مختصر دورانیے میں رفتار اتنی کم کر لی تھی کہ اب وہ اپنی سوچی ہوئی تدبیر پر عمل کر سکتا تھا۔ اس نے بریک پر اچانک بھرپور دباؤ ڈال دیا۔ اسٹیئرنگ پر اس نے اپنی گرفت بہت مضبوط کر لی تھی تاکہ کار "بہک" نہ سکے۔

وہ جھٹکا اتنا زبردست تھا کہ احمد بخش اچھل کر اگلی نشست کی پشت گاہ سے ٹکرایا اور اس کے منہ سے ایک کراہ نکل گئی۔

ثاقب نے ایسی آواز سنی تھی جیسے پچھلی نشست کے پائدان میں کوئی وزنی چیز اچھلی ہو۔

کار ایک بہت ہی زبردست دھچکے کے ساتھ رکی تھی۔ ثاقب نے ہینڈ بریک بھی لگا دیا تھا۔ پھر وہ برقی سرعت کے ساتھ ڈرائیونگ سیٹ اور اس کے برابر کی سیٹ کے درمیان

سے کار کے پچھلے حصے میں گیا۔ جس طرح ایک لحظہ کے لیے بجلی چمک جاتی ہے' اسی طرح اس نے پائدان پر پڑے ہوئے آدمی کو دیکھ لیا جو جھٹکا کھانے کے بعد سنبھلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ثاقب فوراً اس پر چھا گیا۔ اس نے چاہا تھا کہ اس شخص کو دبوچنے کے ساتھ اس شخص کی دونوں کلائیاں اپنی گرفت میں لے لے۔ اس کوشش میں اس کی کامیابی بس ایک اس پل کی تاخیر سے ہوئی جس پل میں اس شخص نے اپنا ریوالور کا ٹریگر دبا دیا تھا۔

گولی چلنے کا دھماکا ہوا اور ثاقب نے احمد بخش کی ہلکی سی چیخ سنی۔ فوری طور سے احمد بخش کی طرف توجہ دینا ممکن نہیں تھا۔ ثاقب نے اپنے "شکار" کی دونوں کلائیاں پکڑ کر اس کے ہاتھ پائدان سے ٹکا دیے۔ ریوالور بہرحال اس شخص کے ہاتھ ہی میں رہا تھا۔ بے بسی یا بوکھلاہٹ کے عالم میں وہ ٹریگر دباتا ہی چلا گیا۔ کار میں دھماکے گونجتے رہے لیکن کوئی دوسری گولی احمد بخش یا ثاقب کو نشانہ نہیں بنا سکی۔ سبھی گولیاں غالباً پچھلی نشست کے نچلے حصے میں پیوست ہوتی رہی تھیں۔ پھر ثاقب نے ایسی آواز سنی جیسے ٹریگر دبا ہو لیکن گولی نہ چلی ہو۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ریوالور خالی ہو چکا تھا۔ یہ بات سمجھتے ہی ثاقب نے اپنے شکار کی کلائی چھوڑ کر اپنے اسی ہاتھ سے اس کی کنپٹی پر ایک زوردار گھونسا مارا۔

"شکار" جو ثاقب کے نیچے دبا ہوا مچل رہا تھا' فوراً ساکت ہو گیا۔ کنپٹی کے ایک مخصوص مقام پر لگنے والی وہ ضرب کسی بہت ہی طاقت ور آدمی کو بھی ایک پل میں بے ہوش کر سکتی تھی۔

اس طرف سے مطمئن ہونے کے بعد ثاقب نے احمد بخش کی طرف توجہ دی۔ وہ نشست پر اس طرح نظر آ رہا تھا جیسے لڑھک گیا ہو۔ اس کا ہاتھ پیٹ پر تھا اور بہتے ہوئے خون سے رنگین ہو چکا تھا۔ ثاقب کے لیے یہ بات کچھ اطمینان بخش تھی کہ احمد بخش کے چہرے پر شدید تکلیف کا تاثر نہیں تھا۔

اسی وقت ایک تیز رفتار پولیس موبائل وہاں آ کے رکی۔



صبح کی روشنی پھیلے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ ثاقب کے شاندار بنگلے سے ایک کار نکلی اور سڑک پر فراٹے بھرنے لگی۔ کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر شبنم اکیلی تھی۔ اپنی بیٹی انگبین کو اس نے اس کی گورنس مسز راؤ کے سپرد کر دیا تھا۔ ٹیلی فون پر اسے ثاقب سے اطلاع ملی تھی کہ اس کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا تھا۔ فون اس نے اسپتال سے کیا تھا جہاں احمد بخش آپریشن تھیٹر میں تھا۔

اس خیال سے شبنم کے دل کی دھڑکنیں خاصی تیز تھیں کہ نہ جانے کیا کچھ ہوا ہو۔

سڑکوں پر اس وقت بھی برائے نام ٹریفک تھا اس لیے شبنم کو اسپتال پہنچنے میں دیر نہیں لگی۔ ثاقب اسے آپریشن تھیٹر کے سامنے ملا۔ وہاں کچھ پولیس والے بھی موجود تھے۔ شبنم کے لیے ان میں ایک شناسا چہرہ انسپکٹر دانیال کا تھا۔ وہ اس کا چچا زاد بھائی تھا۔ ثاقب جب بیرونِ ملک گیا تھا' اس وقت دانیال سب انسپکٹر تھا۔

شبنم تو تیزی سے ثاقب کی طرف لپکی ہی تھی لیکن ثاقب خود بھی اس کی طرف بڑھا تھا۔ اس نے بڑی گرم جوشی سے شبنم کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے اور آہستہ سے بولا "طیارے میں تو سوچتا رہا تھا کہ دو سال بعد تم سے ملاقات کیسے خوبصورت انداز میں ہو گی لیکن ایک تو یہاں اور لوگ بھی ہیں' دوسرے اس واقعے نے جذبات پر کچھ برف بھی ڈال دی ہے۔"

"مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہو رہی ہے کہ آپ بالکل ٹھیک ہیں۔ مجھے یہ خیال تھا کہ ٹیلی فون پر آپ نے مجھے سب کچھ ٹھیک ٹھیک نہیں بتایا ہو گا۔"

"میں نے تمہیں کچھ غلط نہیں بتایا تھا' انگبین کہاں ہے؟"

"اسے مسز راؤ کے پاس چھوڑ آئی ہوں۔ یہاں کیسے لے آتی؟ یہ آپ نے اچھا کیا کہ دانیال بھائی کو بلوا لیا۔"

"یہ ضروری تھا" ثاقب نے جواب دیا "پولیس والے مجھے بے تکے سوالات سے بہت پریشان کر رہے تھے۔ دانیال کے آ جانے سے میں اس مصیبت سے بچ گیا ہوں۔ میں نے دانیال کو پہلے اور تمہیں بعد میں فون کیا تھا۔"

دانیال دانستہ قدرے رک کر ان دونوں کے قریب آیا۔

"احمد بخش کے بارے میں کچھ بتائیے!" شبنم نے ثاقب سے کہا۔

ثاقب سے پہلے دانیال بول پڑا "میں نے ابھی ایک ڈاکٹر سے بات کی تھی۔ وہ آپریشن تھیٹر میں تو نہیں ہے لیکن کیس دیکھ چکا ہے۔ گولی احمد بخش کے پیٹ میں ایسی جگہ پیوست ہوئی ہے کہ آپریشن ناکام نہیں رہے گا لیکن فوری طور پر احمد بخش کو آئی سی یو ہی میں رکھا جائے گا۔ پولیس ابھی اس کا بیان بھی نہیں لے سکے گی۔"

"مجھے راستے میں احمد بخش نے جو کچھ بتایا تھا' وہ میں

پولیس کو بتا چکا ہوں" ثاقب نے کہا۔
"پولیس اپنے طور پر بھی اس کا بیان تو لے گی" دانیال بولا۔
"احمد بخش نے آپ کو کیا بتایا تھا؟" شبنم نے پوچھا "کیا گولی لگنے کے بعد اس کی حالت ایسی تھی کہ کچھ بتا سکے؟"
"ہاں۔" ثاقب نے جواب دیا "وہ کچھ تکلیف میں تو تھا لیکن خون نکل جانے کی وجہ سے اس کی نقاہت بتدریج بڑھتی رہی تھی۔ اس کے ہوش و حواس اس وقت زائل ہوئے تھے جب میری کار اسپتال کے پھاٹک کے قریب تھی۔"
"اسے آپ ہی یہاں لائے تھے؟"
"ہاں۔ پولیس موبائل میری کار کے ساتھ ساتھ چلتی رہی تھی۔"
"اور وہ آدمی جو آپ کی کار میں تھا؟"
"اسے پولیس نے اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔"
"اس نے کچھ بتایا؟"
"ایسے لوگوں کی زبان اتنی جلدی نہیں کھلوائی جاسکتی" ثاقب کے بجائے دانیال نے جواب دیا "ابھی اس کا صرف نام ہی معلوم ہوسکا ہے۔ وہ ایک جرائم پیشہ شخص ہے اور پولیس کی بلیک لسٹ پر ہے۔ اس کا نام گل جان ہے۔"
"احمد بخش نے آپ کو کیا بتایا؟" شبنم نے پوچھا۔
"اس نے بڑی ہمت سے کام لیا۔ میں تو اس سے کہہ رہا تھا کہ وہ خاموش رہے، بولنے سے تکلیف میں اضافہ ہوگا لیکن اس نے رک رک کر ہانپ ہانپ کر مجھے سب کچھ بتادیا۔ ائرپورٹ کی طرف جاتے ہوئے اسے راستے میں ایک عورت اور ایک مرد سڑک پر کھڑے نظر آئے تھے" ثاقب نے احمد بخش کا بیان دہرادیا۔
"ثاقب!" دانیال بولا "خود آپ کے ذہن میں کوئی بات آتی ہے کہ آپ کے خلاف یہ سب کچھ کون کرسکتا ہے؟"
"نہیں" ثاقب نے مایوسانہ انداز میں سرہلایا "تم نے بتایا ہے کہ گرفتار ہونے والا شخص گل جان کوئی جرائم پیشہ ہے اس لیے اس کا اوورکوٹ والا ساتھی بھی غالباً اسی قسم کا آدمی ہوگا۔ ان کے ساتھ جو عورت تھی، وہ بھی اسی قسم کی ہوگی اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جرائم پیشہ لوگوں کو مجھ سے کیا دشمنی ہوسکتی ہے۔"
"پس پردہ کسی اور شخص کا ہاتھ ہوسکتا ہے جو شاید جرائم پیشہ نہ ہو۔"
"میں بالکل اندازہ نہیں لگاسکتا کہ مجھ سے کسی کو بھی کیا دشمنی ہوسکتی ہے۔"

دانیال متفکر انداز میں آپریشن تھیٹر کی طرف دیکھنے لگا۔
"تم موبائل فون لائی ہو؟" ثاقب نے شبنم سے پوچھا۔
"جی ہاں" شبنم نے اپنا پرس کھولتے ہوئے کہا "میں ائرپورٹ آتی تو آپ کا موبائل فون بھی ساتھ لاتی لیکن اچانک طبیعت خراب ہوجانے کی وجہ سے مجھے خیال نہیں آسکا کہ موبائل فون احمد بخش ہی کے ذریعے آپ کو بھجوادوں۔"
"اب تمہاری طبیعت کیسی ہے؟" ثاقب نے موبائل فون اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے پوچھا۔
"طبیعت تو اس وقت بھی ٹھیک ہی ہوچکی تھی جب میں نے احمد بخش کو بھیجا تھا۔ میں بس ذرا ڈری ہوئی تھی کہ راستے میں کچھ گڑبڑ ہوئی تو پریشانی ہوگی۔"
"اچھا ہی ہوا کہ تم نہیں آسکیں۔ تمہاری وجہ سے صورتِ حال زیادہ پیچیدہ ہوجاتی" ثاقب نے کہا اور موبائل فون پر کسی کا نمبر ملانے لگا۔
"تاثیر کو بھی اطلاع دے دوں" ثاقب نے جواب دیا پھر کہا "تم نے مجھے پرسوں فون پر بتایا تھا کہ کام اب اختتام پذیر ہے۔"
"جی ہاں۔ اب بس فنشنگ کا کام ہورہا ہے۔ تاثیر کا خیال ہے کہ اگلے ماہ ہوٹل کا افتتاح کیا جاسکتا ہے۔"
ثاقب نے نمبر ملانے کے بعد موبائل فون اپنے کان سے لگالیا۔
"دانیال بھائی!" شبنم بولی "آپ اس کیس میں پوری طرح دلچسپی لیجیے گا!"
"تمہیں یہ کہنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟" دانیال کا انداز تھوڑا سا شکایتی تھا۔
شبنم پھیکے سے انداز میں مسکرادی۔ صورتِ حال سے پیدا شدہ تفکر اس کے چہرے سے صاف ظاہر ہورہا تھا۔



جیسا کہ ڈاکٹر نے انسپکٹر دانیال کو بتایا تھا، احمد بخش کا آپریشن کامیاب رہا اور پھر اسے آئی سی یو میں پہنچادیا گیا۔ پولیس کو یہ بات بارہ گھنٹے بعد بتائی جاتی کہ وہ احمد بخش کا بیان کب لے سکتی تھی۔
تاثیر اسپتال آگیا تھا۔ اس سے ثاقب کی گفتگو کافی دیر چلی۔ وہ جس قسم کے حالات سے دوچار ہوا تھا، وہ اس نے تاثیر کو بھی بتادیے تھے۔ تاثیر نے اس پر خاصی تشویش ظاہر کی کہ وہ کون ہوسکتا ہے جس نے جرائم پیشہ افراد کے ذریعے ثاقب کو ایک ویران گلی میں لے جانا چاہا تھا لیکن ثاقب اس

کی تشویش دور کرنے کے لیے کچھ نہیں کہہ سکا۔ خود اس کا ذہن الجھا ہوا تھا کہ اسے ایک ویران گلی میں لے جانے کی منصوبہ بندی کیوں کی گئی تھی؟ اوورکوٹ والے نے احمد بخش سے بالکل جھوٹ بولا تھا۔ ایسا کوئی نہیں تھا جس نے کبھی ثاقب سے تنہائی میں ملنا چاہا ہو اور ثاقب اس کے لیے تیار نہ ہوا ہو۔

ثاقب اس موضوع پر مسلسل باتیں کرتے کرتے اکتا گیا تھا اس لیے اس نے تاثیر سے ہوٹل کے بارے میں گفتگو چھیڑ دی تھی۔

اس موضوع پر گفتگو سے اکتاہٹ اپنی جگہ لیکن ثاقب کا دماغ اسی میں الجھا رہا تھا۔ اس نے پولیس کو یہ بات نہیں بتائی تھی کہ جب احمد بخش کے ہوش و حواس زائل ہوئے تھے' اس وقت اس کے منہ سے ایک ادھورا جملہ نکلا تھا۔ وہ اس سارے معاملے کے بارے میں اپنے کسی شک کا اظہار کرنا چاہتا تھا لیکن اس کی ہمت جواب دے گئی تھی اور وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔

ثاقب کا خیال تھا کہ اگر وہ پولیس کو یہ بتا دیتا تو بات پھیل سکتی تھی۔ اس کے خلاف کسی قسم کی سازش کرنے والا بھی اس سے باخبر ہو سکتا تھا اور جس نے جرائم پیشہ افراد کے ذریعے اسے اغوا کروانے کی کوشش کی تھی' وہ اسپتال میں بھی احمد بخش کو ختم کروانے کی کوشش کر سکتا تھا۔ وہ یہ جان کر یقیناً پریشان ہو جاتا کہ کسی وجہ سے احمد بخش کے دل میں کچھ شکوک پیدا ہو گئے تھے۔ اسے یہ دھڑکا لگ سکتا تھا کہ وہ شکوک اس کے لیے پریشانی کا سبب بن سکتے ہیں۔

ثاقب نے یہ بات چھپا کر اپنی دانست میں احمد بخش کی زندگی کو کسی خطرے میں پڑنے سے بچا لیا تھا۔

ثاقب نے یہ بات صرف شبنم کو اس وقت بتائی جب کار میں وہ دونوں گھر جا رہے تھے۔

شبنم پر تشویش لہجے میں بولی "یہ بات آپ دانیال بھائی کو تو بتا دیتے!"

"ہاں!" ثاقب نے سرہلایا "یہ بات دانیال کو بتائی جا سکتی ہے۔ گھر چل کر اسے فون کروں گا۔"

"مناسب ہو گا کہ گھر سے کسی ملازم کو اسپتال بھیج دیا جائے۔ ہم وہاں نہیں رک سکتے تھے لیکن کسی کو تو وہاں ہونا چاہیے۔ آخر احمد بخش آپ کے گھر کا بیس سال پرانا ملازم ہے۔"

"ہاں۔ کسی کو بھیج دینا۔ اس کی فکر تو مجھے بھی رہے گی۔ میں چاہتا ہوں کہ جب پولیس کو احمد بخش کا بیان لینے کی اجازت ملے تو میں وہاں پہنچ جاؤں۔ یہ مناسب نہیں ہو گا کہ احمد بخش پولیس کو بھی اپنے اس شک کے بارے میں بتا دے۔ جب اس معاملے کی تحقیق کے لیے دانیال ہے تو محکمہ پولیس کو احمد بخش کے شک سے بے خبر رکھنا ہی مناسب ہو گا۔ ویسے تو متعلقہ پولیس افسر کو بھی یہ سمجھایا جا سکتا ہے کہ یہ بات راز میں رہنا کیوں ضروری ہے لیکن ہم زیادہ اعتماد دانیال پر کر سکتے ہیں۔"

"سوال یہ ہے کہ جب پولیس کو احمد بخش کا بیان لینے کی اجازت ملے گی' اس وقت اگر آپ اسپتال میں ہوئے بھی تو احمد بخش کو اس معاملے میں کیسے خاموش رکھ سکیں گے؟ میرا خیال ہے کہ پولیس اس وقت آپ کو احمد بخش سے دور ہی رکھے گی۔"

"یہ تو ہے" ثاقب نے الجھے ہوئے ذہن کے ساتھ کہا "لیکن اگر میں بروقت اسپتال میں ہوا تو ممکن ہے کہ مجھے کوئی تدبیر سوجھ جائے۔"

"میرے خیال سے تو اس سلسلے میں دانیال بھائی ہی کام آ سکتے ہیں!"

"گھر چل کے اسے فون تو کروں گا" ثاقب نے کہا۔

لیکن گھر پہنچنے کے بعد وہ دانیال کو فون کرنا' اپنی پریشانی اور اپنے دیگر معاملات' سبھی کچھ ذرا دیر کے لیے بھول ہی گیا۔ مسز راؤ انگبین کو گود میں لیے ہوئے سامنے آ گئی تھی اور ثاقب کے دل میں باپ کی محبت جاگ پڑی تھی۔ اس نے انگبین کو اپنی گود میں لے کر پیار کرنا شروع کر دیا تھا۔

انگبین گھبرا کر رونے کے بجائے کھلکھلانے لگی تھی۔ ممکن ہے اس کا سبب یہ ہو کہ ثاقب اپنی تین سالہ بٹی کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ شبنم ٹیلی فون پر ثاقب کو بتاتی رہی تھی کہ وہ انگبین کو اس کی تصویر دکھاتی رہتی ہے۔

شبنم نے فوراً ایک ملازم کو اسپتال بھیج دیا پھر ثاقب سے بولی "آپ خالی پیٹ ہوں گے۔ اسپتال میں آپ نے دو مرتبہ صرف چائے پی تھی۔ آپ جلدی سے غسل کر کے ناشتا کر لیجیے۔ بعد میں کھیلتے رہیے گا انگبین سے۔"

"شبنم!" ثاقب کچھ سوچتا ہوا جیسے بے خیالی میں بولا "یہ ممکن تو تھا نا کہ سازش کرنے والے کامیاب ہو جاتے۔ شاید وہ مجھے مار ہی دیتے تو اس وقت انگبین یتیم اور تم بیوہ..."

"چپ رہیں" شبنم چیخ پڑی۔

ثاقب چونک سا گیا۔ اس کی گود میں انگبین بھی گھبرا کر بسورنے لگی تھی۔

"آئی ایم سوری!" ثاقب نے آہستہ سے کہا۔

"جائیے، آپ جاکر غسل کیجیے" شبنم نے روہانسی آواز میں کہا اور راتھبین کو اس کی گود سے لے لیا۔
ثاقب خاموشی سے غسل خانے کی طرف بڑھ گیا۔ وہ کچھ خفت محسوس کرنے لگا تھا۔ وہ خود کچھ بھی سوچتا رہتا لیکن اسے اپنی بیوی کے سامنے ایسی بات زبان پر نہیں لانا چاہیے تھی۔
وہ غسل کرکے باتھ روم سے نکلا تو خود کو کچھ ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا جو واقعات اس کے ساتھ پیش آچکے تھے، ان کا دباؤ ذہن پر سے ختم تو نہیں ہوا تھا لیکن بوجھل پن میں کمی ضرور آئی تھی۔
شبنم نے ناشتے کی ٹرالی کمرے ہی میں منگوالی تھی۔
"دانیال کو فون کرنا تو یاد ہی نہیں رہا" ثاقب نے شبنم سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔
"کچھ سکون سے کیجیے گا فون، پہلے ناشتا کرلیجیے۔"
"راتھبین کہاں ہے؟"
"اسے میں نے مسز راؤ کو دے دیا ہے۔ وہ ہوگی تو آپ ٹھیک سے ناشتا بھی نہیں کریں گے۔"
ناشتا شبنم نے بھی نہیں کیا تھا، ثاقب کے ساتھ وہ بھی شامل ہوگئی۔
ناشتے کے دوران میں ثاقب نے وقت دیکھا۔ اسے اپنے محکمے کے ڈائریکٹر جنرل کو موبائل فون پر اپنے واپس آجانے کی اطلاع دینا تھی۔ موبائل فون پر ہی اسے ہدایت ملتی کہ وہ کس وقت دفتر پہنچے لیکن وہ ایسے حالات میں الجھا رہا تھا کہ اب تک ڈائریکٹر جنرل سے رابطے کی نوبت نہیں آئی تھی۔
وہ ناشتے سے فارغ ہوا ہی تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف سے اس ملازم کی آواز آئی جسے شبنم نے اسپتال بھیجا تھا۔
"احمد بخش مرگیا صاحب!" اس نے اطلاع دی تھی۔
"کیا ... کیا!" ثاقب کے منہ سے نکلا "کیا کہہ رہے ہو؟"
شبنم اس کا چہرہ تکنے لگی۔
"جی ہاں صاحب!" ملازم نے جواب دیا "میں جب یہاں پہنچا تو مجھے یہی معلوم ہوا۔"
"ڈاکٹر سے میری بات کراؤ" ثاقب نے تیزی سے کہا۔
"میں ڈاکٹر صاحب کے کمرے سے تو آپ کو فون نہیں کرسکتا تھا صاحب! میں تو پبلک فون سے بات کر رہا ہوں۔"
"اچھا تو تم" ثاقب نے سوچتے ہوئے کہا "گھر واپس آجاؤ۔"
جواب سنے بغیر ثاقب نے ہاتھ سے کریڈل دبا کر سلسلہ منقطع کیا اور شبنم کی طرف دیکھتے ہوئے بتایا کہ اسے کس سے کیا اطلاع ملی تھی۔
"ارے!" شبنم کے منہ سے نکلا "وہ لوگ ... میرا مطلب ہے، اسپتال والے تو کہہ رہے تھے کہ آپریشن بہت کامیاب رہا ہے اور خطرے کی کوئی بات نہیں ہے پھر اتنی جلدی کیا ہوگیا؟"
"معلوم کرتا ہوں۔" ثاقب کریڈل سے ہاتھ ہٹا کر اسپتال کے نمبر ڈائل کرنے لگا۔
شبنم بے چینی سے اس کے قریب پہنچ گئی۔
متعلقہ ڈاکٹر سے فوری طور پر رابطہ نہیں ہوسکا تھا لیکن استقبالیہ پر ڈیوٹی دینے والے ایک ذمے دار شخص نے ثاقب کی گفتگو اس سب انسپکٹر سے کرادی جس کی ڈیوٹی اسپتال میں لگائی گئی تھی۔
ثاقب کو معلوم ہوا کہ احمد بخش کی اچانک موت سے ڈاکٹر وغیرہ بھی حیران تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کیسے ہوگیا۔ سب انسپکٹر سے ثاقب کو ایک نئی بات صرف یہ معلوم ہوئی کہ دو تین منٹ پہلے احمد بخش کی لاش پوسٹ مارٹم کے لیے لے جائی جاچکی تھی۔
ثاقب نے مضمحل انداز میں ریسیور رکھا اور شبنم کو سب انسپکٹر سے ملی ہوئی اطلاع بھی دے دی۔
شبنم متفکر انداز میں ثاقب کی طرف دیکھتے ہوئے بولی "اس کا مطلب ہے، اب یہ نہیں معلوم ہوسکے گا کہ آپ کے خلاف جو یہ پراسرار سی سازش تھی، اس کے بارے میں احمد بخش کو کیا شک تھا؟"
ثاقب کچھ سوچتا ہوا سر ہلا کر رہ گیا۔
"کیا ہمیں اسپتال جانا چاہیے؟" شبنم بولی۔
"جانا تو پڑے گا" ثاقب نے جواب دیا "اسپتال سے اس کی لاش تو لینا ہوگی۔"
"پولیس والے وہاں ہوں گے۔ وہ آپ کو پھر پریشان کرسکتے ہیں۔ پہلے آپ دانیال بھائی کو فون کیجیے، ان سے مشورہ لے لیجیے۔"
ثاقب نے کچھ کہے بغیر ریسیور اٹھالیا اور نمبر ڈائل کرنے لگا۔ جلد ہی دانیال کے موبائل فون سے رابطہ ہوگیا۔
"کیا تم فوراً گھر آسکتے ہو دانیال؟" ثاقب نے کہا۔
"کیا آپ کو احمد بخش کی موت کا علم ہوگیا؟"
"ہاں، تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"اسپتال چھوڑنے سے پہلے میں نے اس کا بندوبست کردیا تھا کہ میں حالات سے ہروقت باخبر رہ سکوں۔ احمد بخش سے ملاقات میں بھی کرنا چاہتا تھا۔ اس کی موت کی اطلاع ملتے ہی میں اسپتال کی طرف روانہ ہوچکا ہوں۔ میں نے سوچا تھا کہ آپ کو اسپتال پہنچنے کے بعد فون کروں گا لیکن آپ کو اطلاع مل چکی ہے۔"

"شبنم نے ایک ملازم کو اسپتال بھیجا تھا۔ اسی نے وہاں پہنچ کر یہاں فون کیا۔ اب تم سے مجھے یہ مشورہ کرنا تھا کہ احمد بخش کی لاش لینے میں اسپتال جاؤں یا نہیں۔ ابھی مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس کی لاش پوسٹ مارٹم کے لیے۔۔۔"

"مجھے بھی اس کا علم ہوچکا ہے" دانیال نے بات کاٹتے ہوئے کہا "احمد بخش کی لاش کے سلسلے میں آپ کسی فکر میں نہ پڑیں۔ وہ سب میں دیکھ لوں گا۔ اسپتال سے ہوکر میں ابھی آپ کے گھر کی طرف آتا ہوں۔"

"کتنی دیر میں؟"

"میرا خیال ہے کہ ایک گھنٹے میں آجاؤں گا۔ اگر کسی وجہ سے دیر لگی تو فون کردوں گا۔"

"ٹھیک ہے، شبنم بھی بہت پریشان ہے۔ ہمیں تمہارا انتظار رہے گا۔"

ثاقب نے رابطہ منقطع کیا اور شبنم کو بتایا کہ دانیال نے کیا کہا تھا۔

"بس ٹھیک ہے" شبنم نے کہا "دانیال بھائی سب سنبھال لیں گے۔ میں اب ذرا جاکر انگبین کو دیکھ آؤں اور کچن کا بھی ایک چکر لگاکر دیکھ آؤں کہ خانساماں کیا کررہا ہے؟"

"انگبین کو ساتھ ہی لے آنا۔"

"تو پھر پہلے کچن کا چکر لگالوں۔ پھر انگبین کو لیتی ہوئی آجاؤں گی۔"

شبنم چلی گئی۔ ثاقب نے یہ موقع غنیمت جانا اور موبائل پر اپنی ایجنسی کے ڈائریکٹر جنرل سے رابطہ کیا۔

"معاف کیجیے گا سر!" ثاقب نے کہا "میں صبح کی فلائٹ سے آگیا تھا لیکن آپ کو بہت دیر سے اطلاع دے رہا ہوں۔"

"کوئی بات نہیں، مجھے تمہاری الجھنوں کا علم ہے۔"

"آپ کو علم ہے؟" ثاقب چونکا۔

"تم مجھے اطلاع دے چکے تھے کہ کس فلائٹ سے آرہے ہو۔ مجھے تمہارے فون کا انتظار تھا۔ جب تمہارا فون نہیں آیا تو مجھے معلومات کروانا پڑیں۔ جو کچھ تمہارے ساتھ ہوا ہے، اس کی وجہ سے میں بھی فکرمند ہوگیا ہوں۔"

"تب پھر آپ نے اس کے بارے میں سوچا بھی ہوگا؟ کیا یہ ممکن ہے کہ ہماری ایجنسی کا یہ نیا شعبہ کسی کی نظر میں کھٹک رہا ہو اور اسی نے میرے خلاف یہ سازش کی ہو جس کا مقصد ابھی تک سمجھ میں نہیں آرہا ہے؟"

"اس کا امکان نہ ہونے کے برابر ہے" ڈائریکٹر جنرل نے کہا "اس شعبے کے سلسلے میں مکمل رازداری برتی گئی ہے۔"

"جی!" ثاقب نے سوچتے ہوئے کہا "تو اب میں دفتر کب آؤں؟"

"کل صبح دس بجے آجاؤ۔ ہاں، اگر کسی الجھن میں پڑجاؤ تو مجھ سے کسی وقت بھی رابطہ کرسکتے ہو۔"

"شکریہ سر! میں دس بجے پہنچ جاؤں گا۔"

دوسری طرف سے رابطہ منقطع کردیا گیا۔



انسپکٹر دانیال تین گھنٹے بعد آسکا۔ اس کے چہرے سے تفکر کا اظہار ہورہا تھا۔ اس نے اسپتال سے فون بھی کردیا تھا کہ اسے دیر ہوجائے گی۔

"میں نے تمہیں ایک بات نہیں بتائی تھی دانیال!" ثاقب نے کہا "میں چاہتا تھا کہ وہ بات پھیلنے نہ پائے۔ پولیس کو بتادیتا تو بات پھیل سکتی تھی۔ میں اس وقت شدید ذہنی دباؤ میں تھا۔ مجھے چاہیے تھا کہ تمہیں تو وہ بات بتا ہی دیتا۔ اسپتال سے واپس آتے ہوئے میں نے راستے میں شبنم کو وہ بات بتائی تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ بات پھیلنے سے احمد بخش کی زندگی خطرے میں پڑسکتی ہے لیکن اب تو وہ بے چارہ ویسے ہی اپنی زندگی سے ہاتھ دھوچکا ہے۔"

"وہ بات کیا ہے؟" دانیال نے ثاقب کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

ثاقب نے بات بتائی، پھر کہا "میرا اندیشہ درست تھا ناکہ یہ بات پھیلنے سے احمد بخش کی زندگی خطرے میں پڑسکتی تھی۔"

"ہاں" دانیال نے ٹھنڈی سانس لی "آپ کا اندیشہ تو درست تھا ثاقب، لیکن وہ لوگ غالباً پہلے ہی سے واقف تھے کہ احمد بخش کن شکوک میں گرفتار تھا، البتہ ان لوگوں کا یہ جان لینا تعجب خیز ہے کہ احمد بخش نے بے ہوشی سے پہلے آپ کو اپنے شکوک سے آگاہ نہیں کیا تھا۔"

"یہ تو وہ لوگ اس لیے جان سکتے ہیں کہ میں نے پولیس کو جو بیان دیا تھا، اس میں یہ بات نہیں تھی۔"

"معاف کیجئے گا ثاقب! آپ محکمہ پولیس کی طرف سے کچھ زیادہ ہی بدگمان ہیں۔ پولیس کو دیا جانے والا کوئی بیان اتنی جلدی طشت ازبام نہیں ہو سکتا۔"

ثاقب نے غور سے اس کی طرف دیکھا "مجھے تمہاری ان باتوں سے پے چیدگی سی محسوس ہو رہی ہے۔"

"یقیناً محسوس ہو رہی ہوگی" دانیال نے کہا "میں نے ابھی آپ لوگوں کو ایک بہت اہم بات نہیں بتائی ہے۔"

ثاقب اور شبنم استفہامیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتے رہے۔

دانیال کچھ رک کر بولا "احمد بخش کی موت طبعی نہیں۔ اسے قتل کیا گیا ہے۔"

"کیا!" ثاقب چونک پڑا۔

"جی ہاں" دانیال نے کہا "جب مجھے اس کی موت کی اطلاع ملی تھی تو میں حیران رہ گیا تھا۔ ڈاکٹر تو بڑے یقین سے کہہ چکے تھے کہ آپریشن بہت کامیاب رہا تھا اور اس کی زندگی خطرے سے قطعی باہر تھی۔ یہ باتیں میرے ذہن میں تھیں اس لیے میں اس کی موت کی اطلاع ملتے ہی اسپتال کی طرف دوڑ پڑا تھا۔"

ثاقب نے مضطربانہ انداز میں پہلو بدلا۔

دانیال نے بتایا "ڈاکٹروں کو بھی فوراً شبہ ہوگیا تھا کہ احمد بخش کی موت شاید طبعی نہیں۔ اس کا جسم ہلکا سا نیلا پڑ گیا تھا۔ اس کی لاش فوری طور پر پوسٹ مارٹم کے لیے لے جائی گئی۔ پوسٹ مارٹم سے اس شبہے کی تصدیق ہوگئی۔ احمد بخش کو زہر دیا گیا تھا۔"

ثاقب پریشان ہوگیا "اسپتال کے آئی سی یو میں یہ کیسے ممکن ہے؟ وہاں جو مریض ہوتے ہیں' ان کی حالت ایسی نہیں ہوتی کہ وہاں وہ کسی کو زہر دے سکیں اور مریضوں سے متعلق کسی شخص کو وہاں جانے کی اجازت نہیں ہوتی!"

"اسی لیے پولیس دو ڈاکٹروں اور چند نرسوں سے پوچھ گچھ کر رہی ہے جو اس دوران میں وہاں آئے گئے تھے لیکن پولیس کو یہ احساس بھی ہے کہ سانپ نکل چکا ہے اور اب صرف لکیر پیٹی جا رہی ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"ایک نرس اسپتال سے غائب ہو چکی ہے۔ بستر پر احمد بخش کے جسم میں اس وقت خون بھی پہنچایا جا رہا تھا اور گلوکوز کی ڈرپ کے ذریعے کوئی دوا بھی۔ پولیس نے خون کی بوتل اور ڈرپ فوراً اپنی تحویل میں لے لی تھیں۔ مجھے یہاں آنے میں تین گھنٹے اسی لیے لگ گئے کہ میں سب کچھ معلوم کرنے کے بعد ہی یہاں آنا چاہتا تھا۔"

"تو اتنی دیر میں کیا' کیا معلوم ہوا؟" شبنم نے بے چینی سے پوچھا۔

"کچھ تو میں بتا ہی چکا ہوں۔ باقی باتیں یہ ہیں کہ زہر' ڈرپ میں ہی ملایا گیا تھا۔ اس وارڈ میں جانے والی کسی نرس کے لیے یہ کوئی مشکل کام نہیں کہ وہ سرنج کے ذریعے زہر کی کم یا زیادہ مقدار ڈرپ میں انجیکٹ کردے اور پھر اسپتال سے غائب ہو جائے۔"

"اس کا نام پتا تو اسپتال کے ریکارڈ میں ہوگا!"

"اس کا نام سلویا ہے۔ وہ اینگلو انڈین ہے۔ پولیس کو اسپتال سے اس کا پتا بھی معلوم ہوگیا تھا لیکن سلویا اس پتے پر ملی نہیں۔ وہ اپنا ضروری سامان لے کر اپنے گھر سے بھی غائب ہو چکی ہے۔ وہ ایک چھوٹا سا اپارٹمنٹ ہے جہاں وہ رہتی تھی۔"

"اس کے عزیز واقربا؟"

"کوئی نہیں ہے۔" دانیال نے بتایا "البتہ اپارٹمنٹ میں وہ ایک عورت سعدیہ قمر کے ساتھ رہتی تھی۔ سعدیہ قمر ایک بیوہ ہے جو ایک بڑے ہوٹل میں ملازمت کرتی ہے۔ اس کی عمر زیادہ نہیں ہے۔ غالباً بتیس چونتیس سال کی ہوگی۔ اس کا ایک آٹھ سالہ لڑکا کسی اسکول میں پڑھتا ہے اور اسکول ہی کے ہوسٹل میں رہتا ہے۔ پولیس نے سعدیہ قمر سے پوچھ گچھ کی ہے لیکن کوئی ایسی بات معلوم نہیں ہو سکی ہے جس سے غائب ہو جانے والی نرس سلویا کا کچھ سراغ لگ سکے۔"

"یہ سب کچھ تو بڑا پریشان کن ہے" شبنم بھرائی ہوئی آواز میں بولی "جن لوگوں نے ثاقب کے خلاف کسی قسم کی سازش کی تھی' ان کے ہاتھ تو خاصے دراز معلوم ہوتے ہیں۔ جو لوگ اسپتال کے آئی سی یو میں کسی کو ختم کرا دیں' وہ معمولی لوگ تو نہیں ہو سکتے۔"

"یہ تو ظاہر ہے۔"

"اور ایسے لوگوں کی ثاقب کے خلاف کسی قسم کی سازش ــ" شبنم اس طرح خاموش ہوگئی جیسے اس کا ذہن بری طرح الجھ گیا ہو۔

ثاقب بڑبڑایا "بہت ہی عجیب بات تو یہ ہے کہ احمد بخش کو میرے خلاف سازش کرنے والے ایسے لوگوں کے بارے میں کوئی شک کیسے ہوگیا تھا۔"

"معاملہ خاصا پے چیدہ ہے" دانیال نے کہا "اس الجھی ڈور کو سلجھانے میں وقت تو لگے گا۔"

"پولیس انہیں تو پریشان نہیں کرے گی؟" شبنم نے ثاقب کی طرف اشارہ کیا۔

"پولیس انہیں پوچھ گچھ کے لیے بلا سکتی ہے اور خود بھی یہاں آسکتی ہے لیکن یہ معمول کی کارروائی ہوگی۔ کیونکہ میرا نام بیچ میں آچکا ہے اس لیے وہ لوگ خواہ مخواہ پریشان نہیں کریں گے" دانیال نے جواب دیا پھر ثاقب کی طرف دیکھ کر بولا "بہرحال آپ کو ابھی بہت چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔ وہ لوگ جو بھی ہوں' اس ناکامی کے بعد دوبارہ بھی آپ کے خلاف کچھ کرسکتے ہیں۔"

"لیکن وہ کیا کرسکتے ہیں؟" شبنم روہانسی ہوگئی۔

"اور انہوں نے کیا کرنا چاہا تھا؟" ثاقب بڑبڑایا۔

"یہ سب کچھ دھیرے دھیرے ہی معلوم ہوسکے گا" دانیال نے کہا "میں اب جاؤں گا۔ ایک بار پھر کہتا چلوں کہ بہت چوکنا رہیے گا۔"

ثاقب سر ہلا کر رہ گیا۔

دانیال کو گئے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ پولیس آگئی۔ متعلقہ پولیس افسر اس سے آدھے گھنٹے تک پوچھ گچھ کرتا رہا۔ وہ چاہتا تھا کہ ثاقب ان معاملات میں کسی قسم کے شک کا اظہار کرے لیکن ثاقب تو خود حیران تھا کہ وہ سب کس نے کیا تھا اور کیوں کیا تھا؟

پولیس افسر کے استفسار پر ثاقب اپنے دوستوں اور شناساؤں کے بارے میں اپنے جذبات واحساسات بیان کرتے ہوئے بہت صاف گوئی سے کام لیتا رہا۔ اس گفتگو کے اختتام پر پولیس افسر نے تاثیر کے بارے میں جو سوالات کیے' ان میں ایک سوال یہ تھا کہ اپنے ہوٹل کی تعمیر کے اخراجات کے معاملے میں ثاقب نے تاثیر پر مکمل اعتماد کیوں کیا تھا۔

"اس لیے کہ میرے خیال میں اس پر اتنا اعتماد کیا جاسکتا ہے" ثاقب نے سیدھا سا جواب دیا تھا۔

"تاہم آپ ان اخراجات کی جانچ پڑتال ضرور کیجیے گا۔"

پولیس افسر نے جاتے جاتے یہ ایک ایسی بات کہہ دی تھی' جس نے ثاقب کو تھوڑا سا بے چین ضرور کردیا۔ اسے اپنے مرحوم والد کی یہ نصیحت یاد آنے لگی کہ تم کسی کو کتنا بھی اپنا سمجھو' روپے پیسے کے معاملات میں اس پر اندھا اعتماد ہرگز نہ کرنا۔



سہ پہر کو تاثیر' ثاقب کے گھر آیا۔ ثاقب نے اسپتال اس سے کہہ دیا تھا کہ وہ چار بجے اس کے گھر آجائے۔ ثاقب اس کے ساتھ اپنے ہوٹل کا معائنہ کرنے کے لیے جانا چاہتا تھا لیکن اسپتال میں ثاقب کو علم نہیں تھا کہ چار بجے وہ اپنے شوفر احمد بخش کی تدفین کے معاملے میں الجھا ہوا ہوگا۔ اس وقت انسپکٹر دانیال بھی موجود تھا۔

"اس کام میں شام تو ہو ہی جائے گی" ثاقب نے تاثیر سے کہا "اور اس قسم کے کاموں میں تھکن کچھ زیادہ ہی ہوجاتی ہے۔ اب میں کل ہی ہوٹل دیکھنے چل سکوں گا۔"

"کس وقت؟" تاثیر نے پوچھا۔

"میں دوپہر کے بعد تمہیں فون کرکے بتادوں گا۔"

ثاقب نے "دوپہر کے بعد" کی بات اس لیے کی تھی کہ دوسرے دن اسے دس بجے اپنے دفتر جانا تھا اور ابھی وہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ اسے کب تک فراغت ملتی۔

اس رات ثاقب بستر پر لیٹا تو وہ بہت تھکن محسوس کررہا تھا۔ تھکن صرف جسمانی نہیں' ذہنی بھی تھی۔ صبح سے اب تک وہ مسلسل سوچتا بھی رہا تھا۔ اس ذہنی اور جسمانی تھکن کی وجہ سے اسے جلد ہی نیند آگئی۔

صبح اس کی آنکھ کچھ دیر سے کھلی اس لیے وہ ناشتا کرکے فوراً دفتر جانے کی تیاری کرنے لگا۔

"اچانک کہاں کا ارادہ کرلیا؟" شبنم نے پوچھا۔

"ہوٹل ہی کے کچھ معاملات ہیں' دو ایک افراد سے ملاقات کرنا ہے" یہ جھوٹ بولنا ثاقب کی مجبوری تھی۔ وہ شبنم کو نہیں بتا سکتا تھا کہ اس کی وابستگی ایک حساس ادارے سے ہوچکی تھی اور وہ رازداری کا حلف اٹھا چکا تھا۔

"آرام کرنے ہی کے بہانے ابھی دو تین روز گھر سے نہ نکلتے تو اچھا تھا" شبنم کے لہجے میں تشویش تھی۔

"کل کا واقعہ تمہارے ذہن پر شدت سے اثرانداز ہوا ہے" ثاقب مسکرایا "اتنا نہ گھبراؤ شبنم! میں نے شاید پہلے بھی کہا تھا کہ میری بے خبری میں بھی میرے خلاف سازش کرنے والے کامیاب نہیں ہوسکے تھے۔ اب تو میں ہوشیار ہوچکا ہوں۔ ایسی باتیں مجھے اتنا خوف زدہ بھی نہیں کرسکتیں کہ میں گھر میں دبک کر بیٹھا رہوں۔"

کسی نہ کسی طرح شبنم کی ڈھارس بندھا کر ثاقب گھر سے روانہ ہوا۔

ایجنسی کے نئے شعبے کا دفتر اسی بنگلے میں تھا جہاں ثاقب نے حلف اٹھایا تھا۔ تین گھنٹے کی ایک میٹنگ میں شرکت کے بعد ثاقب وہاں سے لوٹا تو اس کے پاس ایک نیا موبائل فون اور ایک پستول بھی تھا۔

گھر پہنچ کر ثاقب نے شبنم کو دونوں چیزیں دکھائیں اور

کہا "موبائل فون اور ایک ریوالور میرے پاس پہلے ہی سے ہے لیکن یہ پستول بالکل جدید قسم کا ہے اور یہ موبائل فون میں نے اس لیے خرید لیا کہ یہ مجھے اچھا لگا تھا۔"

"آپ نے پستول خرید کر بہت اچھا کیا۔"

"اب جلدی سے کھانا لگواؤ' بھوک لگ رہی ہے۔"

انگبین اس وقت شبنم کی گود میں تھی۔ ثاقب نے اسے اپنی گود میں لے لیا۔ انگبین کھلکھلانے لگی۔ ثاقب نے اسے پیار کیا۔ اسی وقت ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ ثاقب نے ریسیور اٹھایا "ہیلو!"

"شکر ہے کہ آپ کی آواز سنائی دے گئی" دوسری طرف سے ایک نسوانی آواز آئی۔

ثاقب کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں۔

"آپ کے گھر میں تین ٹیلی فون ہیں" آواز پھر آئی "گزشتہ ڈھائی گھنٹے میں ہر نمبر پر دو دو' تین تین بار رنگ کر چکی ہوں۔ مجھے آپ کی آواز نہیں سنائی دی تھی اس لیے میں ہر مرتبہ کچھ بولے بغیر سلسلہ منقطع کر دیتی تھی۔ اچھا یہ بتائیے' اس وقت آپ کے قریب کوئی اور تو نہیں ہے؟"

"کس سے بات کرنا ہے آپ کو؟" ثاقب نے سخت لہجے میں پوچھا۔

"آپ ہی سے بات کرنا ہے" جواب ملا پھر کہا گیا "میں نے تو آپ کی آواز فوراً پہچان لی مگر آپ میری آواز نہیں پہچان سکے؟"

"کون ہیں آپ؟" ثاقب نے اپنے لہجے کی سختی کم کی۔

"اپنے آس پاس دیکھیے۔ وہاں میری کوئی چیز گر گئی ہو تو اٹھا دیجیے!"

"اوہ!" ثاقب کے منہ سے نکلا۔ اسے وہ لڑکی یاد آ گئی تھی جسے اس نے سفر کے دوران میں طیارے میں دیکھا تھا۔ ٹوائلٹ جاتے ہوئے اس کے بالوں سے ایک کلپ ثاقب کی نشست کے قریب گرا تھا پھر ائرپورٹ کی عمارت میں اس کے وینٹی بیگ سے ایک "کی چین" گری تھی۔ وہ دونوں چیزیں ثاقب ہی نے اٹھا کر اسے دی تھیں۔

"ہوں!" ثاقب کے ہونٹ بھنچ گئے۔

"اب غالباً آپ نے مجھے پہچان لیا" لڑکی کی آواز آئی "میرا نام سارہ ہے۔ میں ایک بار پھر پوچھوں گی کہ اس وقت آپ کے قریب کوئی اور تو نہیں ہے؟ ... اگر ہے تو آپ مجھ سے بات کیے بغیر ریسیور رکھ دیجیے۔ جو بھی آپ کے قریب ہو' اس سے کوئی بہانہ کر دیجیے گا۔ آپ کے حق میں بہتر یہی ہے کہ جب میں آپ سے کچھ کہوں' اس وقت آپ کے قریب کوئی اور نہ ہو۔"

اس لڑکی کی آواز پہچان لینے کے بعد ثاقب کی پیشانی سے جو شکنیں ختم ہو گئی تھیں' وہ لڑکی کی ان باتوں کی وجہ سے پھر ابھر آئیں۔

"بتائیے!" لڑکی کی آواز پھر آئی "آپ اس وقت اکیلے ہیں نا؟"

"کہنا کیا ہے؟" ثاقب نے پوچھا۔

"آپ اکیلے ہیں نا؟" زور دے کر پوچھا گیا۔

"ہاں۔" ثاقب نے جواب دیا۔

"شکر ہے" وہ اس طرح بولی جیسے سکون کا سانس لیا ہو "میں آج کے اخبارات میں پڑھ چکی ہوں کہ کل آپ کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ میں اس سلسلے میں آپ کو کچھ بتا سکتی ہوں اگر آپ آج شام کسی جگہ مجھ سے مل لیں۔ کسی کو اس ملاقات کے بارے میں بتایئے گا نہیں۔ رازداری بے حد ضروری ہے۔ اس ملاقات کا علم آپ کی بیوی کو بھی نہیں ہونا چاہیے۔"

"بیوی کو کیوں نہیں؟"

"اس کا جواب میں آپ کو ملاقات ہونے پر دوں گی" وہ بولی "آپ مجھے یہ بتا دیجیے کہ شام کو آپ کہاں ملیں گے۔ یقین کیجیے کہ آپ مجھ سے نہ مل کر خسارے میں رہیں گے۔"

ثاقب سوچ میں پڑ گیا۔

"جلدی جواب دیجیے!" وہ بولی "ایسا نہ ہو کہ کوئی آپ کے پاس آ جائے۔ آپ نے اس معاملے میں رازداری نہ برتی تو میری زندگی بھی خطرے میں پڑ جائے گی۔"

"اچھا!" ثاقب نے سوچتے ہوئے کہا "شام سات بجے آپ مجھے شیرٹن میں ملیے۔"

"شیرٹن میں کس جگہ؟"

"لابی ہی میں مل جایئے گا۔ پھر ہم کسی جگہ بھی جا بیٹھیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں اب ریسیور رکھتی ہوں۔ ایک بار پھر تاکید کر دوں کہ رازداری بہت ضروری ہے۔"

ثاقب کو جواب میں کچھ کہنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ دوسری طرف سے سلسلہ منقطع کر دیا گیا تھا۔ یہ گفتگو اس اعتبار سے بالکل صحیح وقت پر ختم ہوئی کہ ثاقب جب ریسیور رکھ رہا تھا' اسی وقت شبنم کمرے میں آئی تھی۔

"کس کا فون تھا؟" اس نے پوچھا۔

"فون کرنے والے نے کچھ کہے بغیر ریسیور رکھ دیا۔" ثاقب کھوئے کھوئے سے انداز میں شبنم کی طرف دیکھتا ہوا

بولا۔
”عجیب بات ہے“ شبنم نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا ”ابھی شاید دو گھنٹے کے اندر ہی ایسے کئی فون آچکے ہیں اور سبھی فون کسی پی سی او سے کیے گئے تھے۔“
”بعض لوگ خواہ مخواہ اپنا وقت برباد کرتے ہیں اور دوسروں کو پریشان کرتے ہیں“ ثاقب نے بات ٹالنے کی کوشش کی ”کھانا لگ گیا؟“
”جی ہاں“ شبنم نے انگبین کو اس کی گود سے لے لیا۔
کمرے سے نکل کر وہ دونوں ڈائننگ روم کی طرف بڑھے۔
”آپ چلیے“ شبنم بولی ”میں انگبین کو مسز راؤ کے سپرد کر آؤں۔ یہ کھانے میں بہت پریشان کرتی ہے۔“
ثاقب سرہلا کر آگے بڑھتا چلا گیا۔ اس لڑکی کے معنی خیز ٹیلی فون نے اس کا دماغ خاصا الجھا دیا تھا۔ اس نے اپنا نام سارہ بتایا تھا لیکن اس کا امکان تھا کہ اس نے غلط بیانی سے کام لیا ہو۔ اس نے جو دوسری باتیں کی تھیں، ان میں ثاقب کے لیے سب سے زیادہ الجھن کی بات یہ تھی کہ اس کی تاکید کے مطابق ثاقب کو اپنی بیوی سے بھی رازداری برتنا تھی۔
ثاقب کو ڈائننگ روم میں شبنم کا زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ وہ ایک منٹ میں آگئی تھی۔
”اس ٹیلی فون سے آپ بھی پریشان ہوگئے ہیں نا؟“ وہ بولی ”میں نے آپ کو ایسی ٹیلی فون کالز کے بارے میں بتایا تھا تو آپ سرسری انداز میں ٹال گئے تھے لیکن میں آپ کے چہرے پر فکرمندی دیکھ رہی ہوں۔“
”میں تو کل کے واقعات کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ مجھے احمد بخش کی موت کا بہت دکھ ہے۔“
”اچھا، کھانا تو شروع کیجیے۔“
ثاقب نے ایک ڈش کی طرف ہاتھ بڑھایا۔
کھانے کے دوران میں شبنم بولی ”آپ ان ٹیلی فون کالز کے سلسلے میں فکرمند نہ سہی لیکن میں خاصی الجھن میں ہوں۔ جب آپ آئے تھے تو میں نے آپ سے فوراً اس کا ذکر اس لیے نہیں کیا تھا کہ آپ اس الجھن میں پڑنے سے پہلے کھانا کھالیں۔“
”تم ان ٹیلی فون کالز کی وجہ سے الجھن میں کیوں ہو؟ بہت سے لوگوں کو اکثر یہ شکایت رہتی ہے۔“
”دراصل میرے ذہن میں ایک ایسا خیال آگیا ہے جو مجھے پریشان کررہا ہے۔“
”کیا خیال؟“
”شاید کوئی اس طرح یہ جاننا چاہتا ہو کہ آپ گھر پر ہیں یا نہیں؟“
”کسی کو یہ جان کر کیا فائدہ ہوگا؟“
”ان لوگوں کو کیا فائدہ ہوتا جو ائرپورٹ سے واپسی پر آپ کو ایک ویران گلی میں لے جانے میں کامیاب ہوجاتے“ شبنم نے جواباً سوال کیا پھر بولی ”جس طرح ابھی تک اس بارے میں کوئی اندازہ نہیں ہورہا ہے، اسی طرح یہ اندازہ لگانا بھی مشکل ہے کہ کسی کو گھر میں آپ کی موجودگی کا پتا لگانے کی ضرورت کیوں پیش آسکتی ہے۔“
”ہوں“ ثاقب نے سرہلایا ”ان حالات میں یہ ٹیلی فون کالز تمہارے لیے یقیناً الجھن کا سبب بن سکتی ہیں لیکن میں اسے اہمیت نہیں دے رہا ہوں۔“
”آپ کے آنے سے پہلے میں تو سوچ رہی تھی کہ دانیال بھائی کو فون کرکے اس بارے میں بتادوں۔“
”بتادیتیں تو اچھا تھا۔ تمہارے ذہن کا بوجھ تو ہلکا ہوجاتا۔“
”کھانا کھاکے میں انہیں فون کیے دیتی ہوں۔“
”ٹھیک ہے۔ ابھی کردینا۔ میں تو کھانا کھاکے اب آرام کرنا چاہتا ہوں۔ شام کو تاثیر آئے گا۔ کل تو میں اس کے ساتھ ہوٹل دیکھنے جا نہیں سکا تھا۔“
پھر ایسا ہی ہوا۔ کھانا کھاکر شبنم نے ثاقب کے سامنے ہی دانیال کو فون کرکے اسے اپنی الجھن سے آگاہ کیا۔ ثاقب آنکھیں بند کیے بستر پر لیٹا رہا۔ اب اس کے دماغ میں یہ سوال گردش کررہا تھا کہ وہ شام کو اس پراسرار لڑکی سے ملنے جائے یا نہیں؟
وہ لڑکی ثاقب کی نظر میں زیادہ پراسرار اس لیے بھی ہوگئی تھی کہ اس نے طیارے ہی میں اس سے شناسائی حاصل کرلی تھی۔ اب ثاقب کا خیال تھا کہ کلپ اس لڑکی کے بالوں سے گرا نہیں تھا بلکہ اس نے جان بوجھ کر گرایا تھا۔ پھر ایسی ہی حرکت اس نے ائرپورٹ کی عمارت میں کی تھی۔ اس کے وینٹی بیگ سے ”کی چین“ کا گرنا بھی اب ثاقب کی نظر میں اتفاقی امر نہیں تھا۔ لڑکی نے دوسری بار وہ حرکت اس لیے کی تھی کہ ثاقب اسے اچھی طرح پہچان لے مگر کیوں؟ وہ اپنی شناخت کیوں کروانا چاہتی تھی؟
ثاقب اس سے زیادہ سوچنے سے قاصر رہا لیکن اسے یہ خیال ضرور آیا کہ اگر وہ لڑکی مستقبل میں اس کے لیے کوئی خطرہ بننا چاہتی تھی تو اسے اپنی شناخت کرانے سے گریزاں ہی رہنا چاہیے تھا۔

ایک مرتبہ ثاقب کے ذہن میں خیال آیا کہ وہ اس سلسلے میں اپنے محکمے کے افسرِ اعلیٰ سے مشورہ کرے لیکن اس نے یہ خیال ذہن سے جھٹک دیا۔ اس نے سوچا تھا کہ اب وہ ایک حساس ادارے کا ایک اہم فرد ہے‘ اسے اب اپنی تربیت اس طرح کرنا چاہیے کہ اس کی خود اعتمادی مسلسل بڑھتی رہے۔

لیٹے لیٹے اس نے یہ فیصلہ بھی کرلیا کہ وہ اس لڑکی سے ملنے ضرور جائے گا۔

شبنم فون کر چکی تو ثاقب نے تاثیر کو فون کیا اور اسے ساڑھے چار بجے بلالیا۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ دو گھنٹے تاثیر کے ساتھ رہے گا اور پھر اس لڑکی سے ملنے چلا جائے گا۔

○☆○

شام کو اس نے تاثیر کے ساتھ دو گھنٹے ہی گزارے۔ ہوٹل کی تعمیر اس کی خواہش کے عین مطابق ہوئی تھی۔ عمارت کا جائزہ اس نے ہر پہلو سے لیا۔

پھر ٹھیک سات بج رہے تھے جب وہ شیرٹن ہوٹل کی لابی میں داخل ہوا۔ وہ اچھی تراش کے ایک بہترین سوٹ میں ملبوس تھا۔ کوٹ کے نیچے اس کے شولڈر ہولسٹر میں وہ پستول بھی تھا جو اسے اپنے دفتر سے ملا تھا۔ اس کی نگاہیں اپنے اردگرد کے ماحول سے پوری طرح باخبر تھیں۔ اس نے لابی پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی اور اس لڑکی کو دیکھ لیا جس نے اسے وہاں بلایا تھا۔ وہ لڑکی اسے دیکھ کر صوفے سے اٹھ گئی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی طرف بڑھے۔

قریب پہنچ کر لڑکی مسکرائی ”ہیلو!“

جواب میں ثاقب کے ہونٹ بھی ہلے۔ اس کی آواز بہت دھیمی تھی۔ لڑکی اندازے ہی سے سمجھ سکی ہوگی کہ ثاقب نے بھی ”ہیلو“ ہی کہا ہوگا۔

”ادھر آیئے“ ثاقب نے ایک طرف اشارہ کیا۔

وہ دونوں ایک ہال میں داخل ہوئے اور ثاقب نے ایک ایسی میز کا انتخاب کیا جہاں سے وہ اپنے اردگرد کے ماحول پر پوری طرح نظر رکھ سکتا تھا۔

”میں خوش ہوں کہ آپ نے مجھ پر اعتماد کیا“ لڑکی بولی ”مجھے اندیشہ تھا کہ آپ شاید نہ آئیں۔“

”اگر مجھے نہ آنا ہوتا تو میں فون پر ہی کہہ دیتا۔“

”آپ اس سوٹ میں بہت اچھے لگ رہے ہیں۔“

”کیا آپ نے مجھے میری تعریف کرنے کے لیے بلایا ہے؟“

”پہلی ملاقات پر ایسی چند باتیں کرلینے میں کوئی حرج تو نہیں ہوتا“ وہ مسکرائی۔

ثاقب نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ طیارے میں بھی اس کی طرف متوجہ ہوکر مسکرائی تھی۔ ائرپورٹ کی عمارت میں اپنی ”کی چین“ لیتے ہوئے بھی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور اب بھی وہ مسکرائی تھی لیکن اس وقت ثاقب نے پہلی بار محسوس کیا کہ اس کی مسکراہٹ اس کی آنکھوں کی کیفیت سے ہم آہنگ نہیں تھی۔ ثاقب کا یہ احساس خاصا عجیب سا تھا کہ اگر وہ مسکراتے ہوئے ہونٹ اس لڑکی کے تھے تو وہ آنکھیں یقیناً کسی اور لڑکی کی تھیں اور اگر وہ آنکھیں اس لڑکی کی تھیں تو وہ مسکراتے ہوئے ہونٹ کسی اور لڑکی کے تھے۔ مسکراتے ہوئے لوگوں کی آنکھوں میں اداسی نہیں ہوتی۔

لڑکی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ گہری ہوگئی ”اتنے غور سے کیا دیکھنے لگے؟“

”میں منتظر ہوں کہ آپ کچھ بولیں“ ثاقب نے سنجیدگی سے کہا ”اور میں واقف ہوسکوں کہ آپ نے مجھے اتنے پراسرار انداز میں کیوں بلایا ہے؟“

لڑکی کے ہونٹوں سے مسکراہٹ غائب ہوگئی۔ یکلخت وہ بہت سنجیدہ نظر آنے لگی۔ اس نے ثاقب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”میرا خیال ہے کہ آپ نے غور تو ضرور کیا ہوگا اور خصوصاً میری اس ٹیلی فون کال کے بعد تو آپ کو یہ سوچنا ہی چاہیے کہ طیارے میں میرا کلپ اور ائرپورٹ کی عمارت میں میری ”کی چین“ گرنا کیا محض اتفاق تھا؟“

ثاقب نے کسی قدر لمبی سانس لی ”یقیناً‘ یہ سوال میرے ذہن میں آیا تھا۔“

”تو آپ نے کیا اندازہ لگایا؟ میری خواہش ہے کہ آپ بالکل سچ بولیں“ وہ بدستور سنجیدہ نظر آتی رہی۔

”میرا خیال ہے کہ وہ اتفاق نہیں تھا“ ثاقب نے جواب دیا ”دونوں مرتبہ آپ نے وہ چیزیں جان بوجھ کر میرے قریب گرائی تھیں۔“

”بالکل ٹھیک اندازہ لگایا آپ نے“ وہ بولی ”اب یہ بھی بتادیجئے کہ آپ کے خیال کے مطابق میری اس حرکت کا مقصد کیا ہوسکتا ہے؟“

”کسی اجنبی سے اس قسم کی حرکت کا مقصد متعارف ہونے کے سوا کچھ نہیں ہوسکتا۔“

”آپ کی یہ بات بالکل درست ہے کہ ایسی کسی حرکت کا مقصد متعارف ہونے کے سوا کچھ نہیں ہوتا اور یقیناً میری اس حرکت کا مقصد یہی تھا لیکن آپ کے جملے میں لفظ اجنبی

پوری طرح درست نہیں ہے۔ میں آپ کے لیے اجنبی ہو سکتی ہوں لیکن آپ میرے لیے اجنبی نہیں تھے۔"

ثاقب الجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس سے پہلے کہ لڑکی پھر کچھ کہتی، ایک ویٹر قریب آگیا۔ ثاقب نے لڑکی سے کچھ پوچھنے کا تکلف کیے بغیر ویٹر کو ایک مشروب لانے کا آرڈر دے دیا۔

ویٹر کے رخصت ہوتے ہی لڑکی بولی "آپ کی یہ عادت ہے کہ راہ چلتے یا کسی بھی جگہ آپ کی اچٹتی سی نظر کسی لڑکی یا عورت پر پڑ جائے تو دوبارہ اس کی طرف نہیں دیکھتے۔ غالباً مجھے بھی آپ نے کبھی اچٹتی سی نظر سے ہی دیکھا ہوگا یا شاید دیکھا ہی نہ ہو لیکن میں آپ کو تین سال سے جانتی ہوں۔"

"خوب!" ثاقب نے دھیمی آواز میں اتنا ہی کہا۔

"جس سڑک پر آپ کا بنگلا ہے، میرا گھر بھی اسی سڑک پر ہے۔" لڑکی نے بتایا "وہاں سے آپ کو آتے جاتے میں سال بھر تک دیکھتی رہی ہوں۔ پھر آپ کچھ عرصے تک دکھائی نہیں دیے تو میں نے اس کا سبب جاننے کی کوشش کی۔ مجھے معلوم ہوا کہ آپ ملک سے باہر چلے گئے تھے۔ مجھے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے میری زندگی میں کوئی کمی ہو گئی ہو۔ دو سال تک میری زندگی کمی کے اس احساس کے ساتھ گزرتی رہی ہے۔"

ثاقب نے پہلو بدلا۔ لڑکی کی ان باتوں کا مطلب کسی کی بھی سمجھ میں آسکتا تھا۔

"ایک ماہ قبل میں باہر گئی تھی" لڑکی نے اپنی بات جاری رکھی "جب میں وہاں سے لوٹی تو مجھے یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ میں جس طیارے میں سفر کر رہی تھی، اس میں آپ بھی تھے۔ دو سال بعد آپ کو دیکھ کر میں کچھ بے اختیار سی ہو گئی اور میں نے ایک مرتبہ اپنا کلپ گرا کے اور دوسری مرتبہ کی چین گرا کے آپ کی نظروں میں آنے کی کوشش کی۔ میں اپنے مقصد میں کامیاب بھی رہی۔ میں چاہتی تھی کہ اس کے بعد جب میں آپ سے ملوں تو آپ مجھے پہچان لیں لیکن یہ میرے سان گمان میں بھی نہ تھا کہ آپ سے میری یہ ملاقات اس وقت ہوگی جب حالات ایک خطرناک رخ پر نکل چکے ہوں گے۔"

ثاقب اب بھی خاموش رہا۔ لڑکی نے ایسی کوئی بات کہی بھی نہیں تھی کہ وہ کچھ بولنا ضروری سمجھتا۔

لڑکی کچھ رک کر یکایک بولی "آپ اس وقت کیا سوچ رہے ہیں؟"

"میں ابھی صرف سن رہا ہوں۔"

"کیا آپ یہ سوال نہیں کریں گے کہ میں نے آپ سے کیوں متعارف ہونا چاہا؟"

"ممکن ہے کہ آپ کی بات ہی میں اس سوال کا جواب مل جائے۔"

لڑکی نے اس کے چہرے سے نظر ہٹا کر کچھ سوچا، پھر دوبارہ اس کی طرف متوجہ ہو کر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی "مزید باتوں سے پہلے میں آپ کو اسی سوال کا جواب دوں گی جو ابھی آپ نے کیا بھی نہیں ہے۔ میں آپ سے اس لیے متعارف ہونا چاہتی تھی کہ آپ مجھے اچھے لگتے ہیں۔"

یہ بات ثاقب کے لیے غیر متوقع نہیں رہی تھی لیکن وہ اب بھی خاموشی سے لڑکی کی طرف اس طرح دیکھتا رہا جیسے اسی کو بولتے رہنے کا موقع دینا چاہتا ہو۔

لڑکی کے ہونٹوں پر ایک مضمحل سی مسکراہٹ نظر آئی "یہ بات کہنے کے لیے کچھ دوسرے الفاظ بھی ہوتے ہیں۔ ان الفاظ سے بہت صاف طور پر اظہار مدعا کیا جا سکتا ہے لیکن میرے لیے اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے کیونکہ آپ شادی شدہ ہیں اور میں بھی غیر شادی شدہ نہیں ہوں۔"

اس وقت ثاقب نے بے اختیار ایک طویل سانس لی۔

"میں کسی کی دوسری بیوی ہوں" لڑکی نے میز پر رکھے ہوئے گلدان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اب آپ یہ بتائیے کہ کیا آپ مجھے ایک بری لڑکی کہیں گے؟"

ثاقب فیصلہ نہیں کر سکا کہ اسے کیا جواب دینا چاہیے۔

لڑکی پھر اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگی۔ اس نے کچھ رک کر کہا "غالباً آپ جواب دینے میں دقت محسوس کر رہے ہیں۔ خیر، میں خود ہی اس سلسلے میں کچھ کہتی ہوں۔ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ کسی شادی شدہ لڑکی کا کسی دوسرے مرد کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھنا ہمارے معاشرے میں ایک بری بات ہے لیکن اگر اس بات کو غیر فطری بھی قرار دیا جائے تو یہ زیادتی ہوگی۔ میں سمجھتی ہوں کہ فطری معاملات کو اخلاقیات کی کسوٹی پر نہیں پرکھنا چاہیے لیکن یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ آپ یا ہمارا معاشرہ میرے اس خیال سے اتفاق کرے۔"

یکایک وہ خاموش ہوئی اور پھر جیسے کچھ سوچ کر ہنس پڑی "شاید میں تھوڑی سی بے وقوف ہوں۔ اس قسم کی نظریاتی بحث کا یہ کوئی موقع نہیں ہے۔ ویسے بھی آپ تو یہ جاننے کے لیے بے چین ہوں گے کہ میں نے آپ کو اتنے پراسرار انداز میں کیوں بلایا ہے۔ میں اب اسی طرف آتی ہوں لیکن اس سے پہلے اتنا ضرور کہوں گی کہ آپ اگر مجھے اچھے لگے تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ میرے دل میں کسی قسم کی

خواہشات بھی بے دار ہوئی ہوں گی۔ میں نے آپ سے متعارف ہونا چاہا تو صرف اس لیے کہ کبھی میرا تھوڑا بہت وقت آپ کے ساتھ ہنس بول کر گزر سکے۔ اس کے سوا کوئی خیال نہیں تھا مجھے۔"

ثاقب سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ یہ لڑکی خاصی پڑھی لکھی ہوگی اس لیے اسے بولنے کا سلیقہ خوب آتا تھا۔

"آپ کافی پڑھی لکھی معلوم ہوتی ہیں" دل کی بات ثاقب کی زبان پر آگئی۔

"میں نے ایم اے کیا تھا" اس مرتبہ وہ کچھ کھوئے کھوئے سے انداز میں بولی "بہت سے خواب بھی بنے تھے میں نے لیکن ... اوہ! میں تو اصل موضوع کی طرف آرہی تھی، آپ کا جملہ مجھے بھٹکا کر پھر کہیں اور لے جائے گا۔ میں آپ کو بتانا چاہتی ہوں کہ کل صبح طیارے سے نکلتے وقت تو میں آپ کے آگے تھی لیکن کسٹم میں مجھے کچھ دیر لگی تھی۔ میں جب باہر نکلی تھی، اس وقت میں نے ایک شخص کو آپ کے ساتھ سڑک پار کرتے دیکھا تھا۔ اسے آپ کے قریب دیکھ کر میں کچھ بے چین ہوگئی تھی۔ اس شخص کا نام قادر ہے اور وہ کوئی اچھا آدمی نہیں ہے۔ اس کا تعلق فاران داوَدی سے ہے جو ایک بہت ہی خطرناک آدمی ہے۔ اس کا وطن ہمارا ملک نہیں ہے لیکن وہ یہاں ایک طویل عرصے سے رہ رہا ہے۔ اسے یہاں کے شہری حقوق حاصل ہیں۔ میں نے ابھی کہا تھا کہ قادر کو آپ کے قریب دیکھ کر میں بہت بے چین ہوگئی تھی لیکن جب آپ اپنی کار میں بیٹھ گئے اور قادر دوسری کار کی طرف چلا گیا تو میں پرسکون ہوگئی۔"

"قادر کو میرے قریب دیکھ کر آپ بے چین کیوں ہوئی تھیں؟"

"میں نے ابھی بتایا نا کہ وہ کوئی اچھا آدمی نہیں ہے اور اس کا تعلق فاران داوَدی جیسے خطرناک آدمی سے ہے۔"

"آپ کی بے چینی کی صرف یہی وجہ تھی؟"

لڑکی کچھ سوچنے لگی۔ وہ خاصی فکرمند نظر آنے لگی تھی، اس نے چند لمحے رک کر کہا "مجھے آپ بات ختم کرلینے دیجیے۔"

"اچھا" ثاقب نے ایک طویل سانس لی "کہیے!"

"شوفر میری کار لے کر ائرپورٹ آگیا تھا۔ شہر کی طرف آتے ہوئے میری کار آپ کے پیچھے تھی۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ میری اور آپ کی کار کے درمیان میں وہ کار بھی موجود تھی جس میں، میں نے قادر کو بیٹھے دیکھا تھا۔ اسے آپ کی کار کے پیچھے دیکھ کر میں پھر بے چین ہوگئی۔ جب آپ کی کار اچانک رکی تھی اور پے درپے گولیاں چلنے کی آوازیں سنائی دی تھیں تو کئی کاریں وہاں رکی تھیں۔ رکنے والی کاروں میں میری کار بھی تھی لیکن قادر کی کار تیزی سے آگے نکلتی چلی گئی تھی۔ میں وہاں اس وقت تک رکی تھی جب وہاں پولیس موبائل پہنچ گئی تھی۔ اپنے گھر پہنچنے کے بعد میں سوچتی رہی کہ قادر کو آپ کے قریب دیکھ کر میری بے چینی بے بنیاد نہیں تھی۔ پھر آج صبح کے اخبارات سے مجھے تفصیلات کا علم ہوا۔ آپ کے بیان سے یہ بات صاف ہوگئی کہ آپ کی زندگی خطرے میں تھی۔"

"میرے بیان میں تھا کہ مجھے اغوا کرنے کی منصوبہ بندی کی گئی تھی۔ یہ آپ نے کیوں سمجھ لیا کہ میری زندگی خطرے میں تھی؟"

"خطرے میں تھی ہی نہیں بلکہ اب بھی ہے" لڑکی نے کہا "کسی وجہ سے میں یہ نہیں مان سکتی کہ آپ کو صرف اغوا کرنے کی منصوبہ بندی کی گئی تھی۔ وہ لوگ اس گلی میں آپ کو یقیناً قتل کردیتے۔ اس قسم کی منصوبہ بندی غالباً اس لیے کی گئی تھی کہ وہ لوگ آپ کو قتل کرکے آپ کی لاش غائب ہی کردینا چاہتے ہوں گے۔ سرِعام آپ کو قتل کرکے وہ آپ کی لاش غائب نہیں کرسکتے تھے۔"

"کیا آپ مجھے ڈرا رہی ہیں؟"

"آپ کے چہرے مہرے سے میں نے اندازہ لگایا ہے کہ آپ ڈرپوک آدمی نہیں ہیں۔ یہ سب کچھ میں نے آپ کو اس لیے بتایا ہے کہ اب آپ بہت محتاط ہوجائیں۔ آج اخبارات سے سب کچھ جاننے کے بعد میں بے قرار ہوگئی تھی کہ کسی طرح آپ سے رابطہ کروں۔ آپ کے گھر کے نمبر مجھے نیو میریکل ڈائریکٹری سے معلوم ہوئے تھے۔ پھر میں متعدد فون کرنے کے بعد آپ سے رابطہ کرنے میں کامیاب ہوئی تھی۔"

لڑکی کی باتوں نے ثاقب کا دماغ کسی حد تک بوجھل کردیا۔ لڑکی کے لب ولہجے سے اسے اندازہ ہورہا تھا کہ وہ کچھ باتیں چھپانا تو چاہ رہی تھی لیکن جتنا کچھ کہہ رہی تھی، وہ جھوٹ نہیں تھا۔

"آخر آپ کو یہ خیال کیوں ہے کہ مجھے قتل کیا جاتا اور وہ خطرہ مجھے اب بھی لاحق ہے؟"

"اس لیے کہ چند مہینے پہلے میں نے ایک ایسے شخص کو فاران داوَدی سے ملاقات کرتے ہوئے دیکھا تھا کہ میں حیران رہ گئی تھی۔ فی الحال اس شخص کا نام اپنی زبان پر لانا میں مناسب نہیں سمجھتی۔ اس کا تذکرہ کرتے ہوئے میں صرف

گمنام آدمی کے الفاظ استعمال کروں گی۔ وہ گم نام آدمی ایک ایسا شخص ہے جس کے لیے آپ کی موت بہت فائدہ مند ہوگی۔"

"ایسا کون ہو سکتا ہے؟" ثاقب نے بڑبڑانے والے انداز میں پوچھا۔

"میں نے کہا نا کہ میں فی الحال اس کا نام اپنی زبان پر نہیں لاؤں گی۔ آپ کے لیے میرا مشورہ ہے کہ آپ اس سلسلے میں بہت ہی اعلیٰ سطح کے لوگوں سے رابطہ کریں۔ متعلقہ پولیس افسر تو کیا' کسی بھی پولیس افسر پر بھروسا کر کے آپ غلطی کریں گے۔ مجھے علم ہے کہ پولیس کے بہت سے لوگ فاران داؤدی کے تنخواہ دار اور نمک خوار ہیں۔"

"آپ اس معاملے میں شاید ضرورت سے زیادہ ہی رازداری برتنا چاہتی ہیں۔ آپ نے کہا تھا کہ آپ سے اپنی اس ملاقات کے بارے میں اپنی بیوی کو بھی نہ بتاؤں۔"

وہ پھیکے سے انداز میں مسکرائی "میں ایک عورت ہوں اس لیے جانتی ہوں کہ عورت کے لیے کوئی بات اپنی ذات تک محدود رکھنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ آپ انہیں رازداری کی کتنی بھی تاکید کریں' میرے خیال میں یہ اندیشہ رہے گا کہ وہ انسپکٹر دانیال پر بھروسا کر ہی لیں۔ وہ آخر ان کے رشتے دار ہیں۔"

"بہت خوب!" ثاقب نے آہستہ سے کہا "آپ یہ بھی جانتی ہیں؟"

"کوئی اگر کسی کو پسند کرنے لگے تو اس کے بارے میں سبھی کچھ جاننے کی کوشش کرتا ہے" لڑکی نے نظریں جھکا کر کہا۔

ثاقب نے فوراً گفتگو کے اس موڑ سے گریز کی کوشش کی' اور پوچھا "آپ مجھے فاران داؤدی یا قادر کے پتے بتا سکتی ہیں؟"

"قادر کا پتا مجھے ایک مرتبہ اتفاقاً ہی معلوم ہو گیا تھا۔ میں ان دونوں کے پتے آپ کو اپنی تحریر میں نہیں دوں گی۔ میں بتاتی ہوں' آپ لکھ لیں۔"

ثاقب نے اپنی جیب سے قلم کے ساتھ نوٹ بک بھی نکالی۔ جو پتے اسے بتائے گئے' وہ اس نے لکھ لیے۔ پتوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ قادر کسی اپارٹمنٹ میں اور فاران داؤدی بنگلے میں رہتا تھا۔

ایک منٹ کے لیے ان کی گفتگو رک گئی۔ ویٹر ایک ٹرے میں ان کے لیے مشروبات کے گلاس لے آیا تھا۔ وہ گلاس میز پر رکھ کر چلا گیا تو وہ بولی "بزرگوں سے سنا ہے کہ اگر انسان خطرے میں ہو تو اسے سوتے وقت بھی اپنی ایک آنکھ کھلی رکھنا چاہیے۔ میں آپ سے کہوں گی کہ آپ بھی اتنے ہی محتاط رہیے گا۔ وہ لوگ بہت خطرناک ہیں۔ آپ خود کو اپنے گھر میں بھی محفوظ نہ سمجھیے گا۔ وہ آپ پر کہیں بھی وار کر سکتے ہیں۔"

"میری سمجھ میں یہ نہیں آرہا ہے کہ آپ ان خطرناک لوگوں کو کیسے جانتی ہیں؟"

"وقت آنے پر آپ کو یہ بھی معلوم ہو جائے گا" لڑکی نے مشروب کا گلاس اٹھاتے ہوئے کہا "وہ لوگ اتنے خطرناک ہیں کہ اگر انہیں آپ سے میری اس ملاقات کا علم ہو جائے تو آج کی رات میری زندگی کی آخری رات ہوگی۔"

"اوہ!"

لڑکی نے گلاس کی طرف اشارہ کیا "جلدی سے یہ ختم کر لیجیے تاکہ ہم اب یہاں سے اٹھیں۔"

"آپ نے اپنا پتا نہیں بتایا؟" ثاقب نے گلاس اٹھاتے ہوئے کہا۔

"آپ نے پوچھا ہی نہیں تھا" وہ خفیف سی مسکراہٹ سے بولی "آپ میرے بنگلے کا نمبر لکھ لیجیے۔ سڑک تو وہی ہے جس پر آپ رہتے ہیں۔"

"اپنا موبائل فون اور ٹیلی فون نمبر بھی بتا دیجیے" ثاقب نے نوٹ بک اور قلم دوبارہ نکالتے ہوئے کہا۔

ثاقب نے اس کے بنگلے کا نمبر' موبائل فون نمبر اور ٹیلی فون نمبر اپنے پاس نوٹ کر لیے۔

"خدا کرے کہ آپ ہر خطرے سے محفوظ رہیں۔" وہ بولی "آپ اس سلسلے میں اعلیٰ حکام سے رابطہ کرنے میں دیر نہ لگائیے گا۔"

"ظاہر ہے کہ میں وہ سبھی کچھ کروں گا جو کوئی اپنی حفاظت کے لیے کر سکتا ہے۔" ثاقب نے کہا "میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے اتنی اہم معلومات فراہم کیں۔"

"آپ کو شکر گزار ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں نے جو کچھ کیا ہے' اپنے لیے کیا ہے۔"

"اپنے لیے؟" ثاقب نے استعجابیہ لہجے میں کہا۔

"جی ہاں۔ میں بتا چکی ہوں کہ آپ مجھے اچھے لگتے ہیں۔ میں نہیں چاہتی کہ آپ کو کچھ ہو' لہٰذا میں نے آپ کو جو کچھ بتایا ہے' اس میں میری ہی غرض ہے نا!"

ثاقب اس کا منہ تکتا رہ گیا۔

○☆○

تھوڑی دیر بعد وہ رخصت ہوئی۔ ثاقب اپنی کار کا دروازہ کھولے اس کی کار کو دور ہوتے ہوئے دیکھتا رہا۔ پھر ایک طویل سانس لے کر اپنی کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

تربیت کے تین سالہ دورانیے میں ثاقب کو سکھایا گیا تھا کہ وہ کبھی کسی پر آسانی سے اعتبار نہ کرے۔ لہٰذا خود اس کے لیے بھی عجیب بات تھی کہ اس نے ان ساری معلومات پر یقین کرلیا تھا جو اسے مہیا کی گئی تھیں۔ اس ملاقات سے پہلے اسے شبہ تھا کہ لڑکی نے اسے اپنا نام شاید صحیح نہ بتایا ہو لیکن اب اسے یہ یقین بھی تھا کہ اس لڑکی کا نام سارہ ہی ہوگا۔

ثاقب کو اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ سارہ ایک عجیب وغریب لڑکی تھی۔ طیارے اور ائرپورٹ کی عمارت میں اسے وہ ایک کھلنڈری سی لڑکی معلوم ہوئی تھی لیکن اس سے ملاقات میں اسے محسوس ہوا تھا کہ وہ بہت جذباتی لڑکی تھی جس نے اپنی زندگی میں کوئی گہری چوٹ بھی کھائی تھی۔

اس نے ثاقب سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس ملاقات کے بارے میں اپنی بیوی کو احتیاطاً کچھ نہیں بتائے گا لیکن اب یہ ثاقب کے لیے ایک اور وجہ سے بھی ضروری ہوگیا تھا۔ سارہ اس سے محبت کرتی تھی۔ یہ بات جان کر شبنم کے ذہن میں گرہ سی پڑ جاتی۔ شاید اسے ہروقت ہی یہ دھڑکا لگا رہتا کہ ثاقب کہیں بہک نہ جائے، اس لڑکی کی محبت سے متاثر ہوکر اس کی طرف جھکنے نہ لگے۔

یہ احساس ثاقب کے لیے تھوڑی سی الجھن کا سبب بھی بنا تھا کہ ایک لڑکی اس سے محبت کرنے لگی تھی۔ وہ شادی شدہ سہی لیکن محبت کے جذبات اس کے دل میں تین سال سے پرورش پارہے تھے۔ اس نے کھل کر اپنی محبت کا اظہار نہیں کیا تھا، صرف پسندیدگی کی بات کی تھی لیکن ثاقب بچہ نہیں تھا کہ اس پسندیدگی کا مطلب نہیں سمجھتا۔

ثاقب کے مشاہدے میں پہلے کبھی ایسا کوئی واقعہ نہیں آیا تھا لیکن اس کا خیال تھا کہ کوئی شادی شدہ لڑکی یا عورت کسی بھی وجہ سے اپنے شوہر سے لگاؤ نہ رکھتی ہو یا شوہر اس سے لاتعلق سا رہتا ہو تو محبت کی پیاس، میں لڑکی کی نظریں ادھر ادھر بھٹکنے لگتی ہیں اور پھر کوئی بھی اس کی نظروں میں سما کر اس کے دل میں اتر سکتا ہے۔

ثاقب کو یہ خیال بھی تھا کہ سارہ نے اسے جن خطرناک لوگوں کے بارے میں بتایا تھا، ان سے اس کا کوئی نہ کوئی تعلق ضرور ہوگا۔ اسی لیے وہ ثاقب سے اپنی ملاقات کو اپنے لیے خطرناک سمجھ رہی تھی۔

ثاقب نے کار کا انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے سوچا کہ اسے اپنی زندگی کی کا خیال تو رکھنا ہی ہے لیکن کیا اسے سارہ کی حفاظت کے بارے میں نہیں سوچنا چاہیے جس نے خطرہ مول لے کر اسے بہت اہم معلومات فراہم کی تھیں؟

کار حرکت میں آئی ہی تھی کہ ثاقب کے موبائل فون نے گنگنانا شروع کیا۔ اس نے فوراً کال ریسیو کی۔ اسے دوسری طرف سے اپنے محکمے کے سیکشن آفیسر کی آواز سنائی دی۔

”فوراً دفتر پہنچو ثاقب!“

”بہتر ہے سر!“ ثاقب نے جواب دیا۔

دوسری طرف سے فوراً سلسلہ منقطع کردیا۔

ثاقب نے کار کی رفتار تیز کی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آسکا تھا کہ یہ اچانک طلبی کیوں ہوئی تھی۔ کیا شہر میں تخریب کاری کا کوئی ایسا واقعہ ہوگیا تھا جس کے سلسلے میں کچھ ذمے داریاں اسے ہی سونپی جانی تھیں۔

جلد ہی وہ اس بنگلے میں پہنچ گیا جس پر ایک پرائیویٹ ادارے کا بورڈ لگا ہوا تھا۔

وہ سیدھا سیکشن آفیسر کے کمرے میں پہنچا۔ صبح کی میٹنگ میں اس سے ثاقب کا تعارف ہوچکا تھا۔

”بیٹھو!“ سیکشن آفیسر نے اپنے سامنے کی ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ ثاقب اس کی طرف استفہامیہ نظروں سے دیکھتا ہوا بیٹھ گیا۔

سیکشن آفیسر بولا ”تم سارہ کو کب سے جانتے ہو؟“

”جی!“ ثاقب چونکا۔ اسے ذرا بھی خیال نہیں تھا کہ سارہ سے اس کی ملاقات کا علم اس کے سیکشن آفیسر کو ہوجائے گا۔

سیکشن آفیسر سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

ثاقب نے آہستہ سے کہا ”آپ کو علم ہے کہ میں ابھی سارہ سے ملا تھا؟“

”ظاہر ہے“ سیکشن آفیسر نے کہا ”اسی لیے تو میں نے یہ سوال کیا ہے۔“

”اس سے یہ میری پہلی ملاقات تھی لیکن میں اسے جانتا ذرا پہلے سے ہوں۔ وہ کل مجھے طیارے میں اور پھر ائرپورٹ پر ملی تھی۔ آج اس نے مجھے فون کیا تھا۔ وہ مجھے ان معاملات کے بارے میں کچھ بتانا چاہتی تھی جو مجھے پیش آچکے تھے۔“

”اور تم محکمے کو اس کی اطلاع دیے بغیر اس سے ملنے چلے گئے؟“

"سر!" ثاقب نے دبے لہجے میں کہا "میرا خیال تھا کہ یہ میرا قطعی نجی معاملہ ہے۔"

"اگر ہمارے محکمے کے کسی آدمی کے ساتھ اس قسم کے واقعات پیش آجائیں تو وہ اس کا نجی معاملہ نہیں رہتا۔ محکمے کو بھی فکر ہوجاتی ہے کہ اس کے کسی آدمی کے ساتھ کیا خطرناک صورتِ حال ہے۔ تم نے اس سلسلے میں محکمے سے کوئی تعاون نہیں چاہا تھا لیکن یہ ممکن نہیں تھا کہ میں تمہاری طرف سے فکر مند نہیں ہوتا۔ میں نے دو آدمیوں کو تمہاری حفاظت پر مامور کردیا تھا۔"

ثاقب نے غور سے سیکشن آفیسر کی طرف دیکھا "کیا وہ دونوں آدمی ہوٹل میں موجود تھے؟"

"ہاں" سیکشن آفیسر نے جواب دیا "لیکن ابھی تک سیکشن کے تمام آدمیوں سے واقف نہیں ہوئے ہو اس لیے انہیں شناخت نہیں کرسکتے تھے۔ خیر! میں یہ جاننے کے لیے بے چین ہوں کہ اس نے تمہیں کیوں بلایا تھا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ وہ تمہیں کسی جال کی طرف تو نہیں لے جانا چاہتی؟"

"جال کی طرف؟" ثاقب نے استعجابیہ لہجے میں کہا "میرا خیال تو یہ ہے کہ وہ میری ہمدرد ہے۔"

"مجھے یہ یقین کرنے میں تامل ہوگا۔ وہ ایک ایسے شخص کی بیوی ہے جس کے بارے میں ہمیں شبہ ہوچکا ہے کہ وہ تخریب کاری کی کم از کم دو وارداتوں میں ضرور ملوث ہے۔"

ثاقب نے بے چینی سے پہلو بدلا "کیا اس شخص کا نام فاران داؤدی ہے؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں" سیکشن آفیسر نے عجیب سی نظروں سے اس کی طرف دیکھا "تمہیں یہ نام کیسے معلوم ہوا؟"

"مجھے سارہ ہی نے بتایا ہے سر!" ثاقب نے جواب دیا "اس نے کہا ہے کہ میں فاران داؤدی کی طرف سے خبردار رہوں۔"

اس مرتبہ سیکشن آفیسر کے چہرے پر الجھن کے آثار دکھائی دیے۔ وہ بولا "مجھے سب کچھ تفصیل سے بتاؤ!"

ثاقب نے کسی قطع برید کے بغیر سب کچھ بیان کردیا۔ جھجک کے باوجود اس نے یہ بتانے سے بھی گریز نہیں کیا تھا کہ سارہ اپنے بیان کے مطابق اسے پسند کرتی تھی۔

"یہ تو... یہ تو..." سیکشن آفیسر نے اپنی بات مکمل نہیں کی اور کرسی سے اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ وہ خاصا مضطرب نظر آرہا تھا۔ ثاقب خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ آخر سیکشن آفیسر پھر اپنی کرسی پر بیٹھ گیا اور بولا "یہ تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے شوہر کے خلاف ہوگئی ہے۔"

"اس بات کو یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ وہ اپنے شوہر کے ہاتھوں مجھے کسی قسم کا نقصان پہنچتے ہوئے نہیں دیکھنا چاہتی۔"

"اس نے آخر اس شخص کا نام کیوں چھپایا جو فاران داؤدی سے ملا تھا اور جس شخص کے بارے میں اس کا یہ خیال ہے کہ اس کے لیے تمہاری موت فائدہ مند ہوسکتی ہے۔"

"میں کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا کہ اس نے اس شخص کا نام کیوں چھپایا ہے۔"

"اگر وہ اس شخص کا نام بتادیتی تو غالباً یہ سارا معاملہ بڑی آسانی سے نمٹایا جاسکتا تھا۔"

"یہ میں بھی سوچ چکا ہوں۔"

"اس سے کسی طرح اس شخص کا نام معلوم کیا جانا چاہیے" سیکشن آفیسر نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔ پھر بولا "ویسے یہ بھی بڑی اطمینان بخش یا خوش آئند بات ہے کہ ہمیں مستقبل میں کسی وقت فاران داؤدی کے خلاف ایک بہت اہم گواہ مل جائے گا۔"

"سر!" ثاقب نے کہا "کیا میں یہ پوچھنے کی جسارت کرسکتا ہوں کہ فاران داؤدی سے سارہ کی شادی کن حالات میں ہوئی تھی؟ یہ میں اس لیے جاننا چاہتا ہوں کہ سارہ غالباً فاران داؤدی سے خوش نہیں ہے۔"

"ایک چھبیس ستائیس سالہ لڑکی کے لیے بہت مشکل ہوتا ہے کہ وہ ساٹھ پینسٹھ سال کے شوہر سے خوش رہے۔"

"اوہ!" ثاقب کے منہ سے نکلا۔

سیکشن آفیسر کچھ سوچتا ہوا کہنے لگا "فاران داؤدی کے بارے میں رپورٹ تیار کروائی گئی تھی تو یہ بھی معلوم ہوگیا تھا کہ فاران داؤدی نے ساڑھے تین سال پہلے سارہ سے شادی کی تھی۔ فاران داؤدی کی دو جوان بیٹیاں ہیں۔ غالباً اسی لیے وہ سارہ کو اپنی پہلی بیوی اور بیٹیوں کے ساتھ اپنے گھر میں نہیں رکھ سکتا تھا۔ سارہ کا باپ فاران داؤدی کا ملازم تھا۔ سارہ بچپن ہی میں اپنی ماں کے سائے سے محروم ہوگئی تھی اور جب وہ فرسٹ ائیر کی طالبہ تھی تو اس کے باپ کا انتقال ہوگیا تھا۔ اس کے بعد داؤدی نے اسے اپنی سرپرستی میں لے لیا تھا۔ ایم اے کرنے تک وہ کالج یا یونیورسٹی کے ہاسٹلوں میں رہتی تھی۔ جب وہ ایم اے کے امتحان سے فارغ ہوئی تھی تو فاران داؤدی نے اسے ایک بنگلا دلادیا تھا۔ انہی دنوں میں اس نے سارہ سے شادی بھی کی تھی۔ شادی کے بعد اس نے چند ماہ تک اپنا خاصا وقت اسی بنگلے پر گزارا لیکن

اس کے بعد دھیرے دھیرے اس کا وہاں جانا کم ہوتا چلا گیا۔ اب وہ مہینے میں دو ایک بار ہی اس بنگلے کا رخ کرتا ہے اور وہاں زیادہ دیر رکتا بھی نہیں ہے۔" سیکشن آفیسر نے رک رک کر یہ سب کچھ اس طرح بتایا تھا جیسے ذہنی طور پر کسی اور ہی ادھیڑبن میں ہو۔

"تو شاید!" ثاقب نے سوچتے ہوئے کہا "سارہ اس شادی کے سلسلے میں کچھ مجبور ہو گئی ہوگی۔"

سیکشن آفیسر نے ثاقب کی طرف دیکھا' پھر سر ہلا کر بولا "امکان تو یہی ہے" جواب دے کر وہ پھر کچھ سوچنے لگا۔

چند لمحے خاموش رہنے کے بعد ثاقب بولا "میرے لیے اب کیا حکم ہے سر!"

"میں نے ابھی ابھی فیصلہ کیا ہے کہ تمہیں نصیر اختر سے ملادوں" سیکشن آفیسر نے کہا اور ٹیلی فون کا ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کرنے لگا۔

ثاقب خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

"ہیلو نصیر!" سیکشن آفیسر ماؤتھ پیس میں بولا "تم اس وقت کہاں ہو؟ میں چاہتا ہوں کہ تم فوراً میرے پاس پہنچو۔ کتنی دیر میں پہنچو گے؟ ٹھیک ہے' میں تمہارا منتظر ہوں" سیکشن آفیسر نے ریسیور رکھ دیا اور ثاقب کی طرف دیکھتا ہوا بولا "نصیر اختر کا تعلق ہمارے ہی سیکشن سے ہے۔ فاران داؤدی کی فائل اسی کے پاس ہے۔ فاران داؤدی کے خلاف ٹھوس ثبوت حاصل کرنے کے علاوہ اس نے بہت کچھ کرلیا ہے۔ میں نے یہ فیصلہ بھی ابھی کیا ہے کہ فاران داؤدی کی فائل پر اب تم بھی اس کے ساتھ کام کرو۔"

"غالباً یہ بہتر ہوگا کہ میں پہلی مرتبہ کسی سینئر کے ساتھ کام کروں۔"

سیکشن آفیسر نے شاید ثاقب کی بات سنی ہی نہیں۔ وہ کچھ سوچتا ہوا کہنے لگا "نصیر اپنی رپورٹ دینے کے لیے آج پانچ بجے میرے پاس آیا تھا۔ اسے امید ہے کہ وہ بہت جلد فاران داؤدی پر ہاتھ ڈالنے میں کامیاب ہوجائے گا۔ یہ ضروری ہے کہ اس شخص کو جلد از جلد گرفتار کیا جائے۔ یہ یہاں ایک غیر ملکی طاقت کے اشارے پر کام کررہا ہے اور نصیر اختر کی رپورٹ کے مطابق اس نے یہاں اپنا نیٹ ورک بڑی عیاری سے بنایا ہے۔ نصیر اختر کی رپورٹ سارہ کے اس خیال کی تائید کرتی ہے کہ محکمہ پولیس کے کچھ لوگ فاران داؤدی کے آلہ کار بنے ہوئے ہیں۔ سارہ نے تم کو بالکل صحیح مشورہ دیا تھا کہ اس سارے معاملے کی بھنک پولیس کے کانوں تک نہیں پہنچنا چاہیے۔ ابھی کچھ نہیں معلوم کہ پولیس میں کون کون فاران داؤدی کا ایجنٹ ہے۔"

ثاقب سوچنے لگا "کیا یہ ممکن ہے کہ شبنم کا چچازاد بھائی انسپکٹر دانیال بھی فاران داؤدی کا ایجنٹ ہو؟"

سیکشن آفیسر ثاقب کی سوچ سے بے خبر' بولتا رہا۔ "کچھ دن پہلے تخریب کاری میں ملوث ایک شخص بہت زخمی حالت میں گرفتار ہوا تھا۔ ڈاکٹروں سے کہا گیا تھا کہ وہ اس شخص کی زندگی بچانے کی ہر ممکن کوشش کریں۔ ممکن تھا کہ وہ اسے بچانے میں کامیاب ہوجاتے لیکن وہ شخص آئی سی یو میں بڑے پراسرار طور پر ختم ہوگیا۔"

ثاقب چونک پڑا۔

"ہاں!" سیکشن آفیسر نے سر ہلایا "تمہیں اپنے شوفر احمد بخش کا خیال آنا ہی چاہیے تھا۔ تمہاری اور سارہ کی ملاقات سے یہ بات غالباً طے پاگئی ہے کہ احمد بخش کی موت میں فاران داؤدی کا ہاتھ ہے اور اس بات سے میں اندازہ لگا رہا ہوں کہ فاران داؤدی نے اگر سب اسپتالوں میں نہیں تو کچھ خاص خاص اسپتالوں میں اپنے آدمی لگادیے ہیں تاکہ وہاں بھی ایسے افراد کو ختم کرواسکے جن کی زندگی اس کے لیے نقصان دہ ثابت ہوسکتی ہے۔ احمد بخش کی موت کی ذمے دار نرس سلویا اس کی آلہ کار ہوگی۔ تخریب کاری میں ملوث وہ زخمی شخص جسے ختم کروادیا گیا' ہمارے لیے ایک اہم گواہ ثابت ہوسکتا تھا لیکن یہ بات مجھے الجھن میں ڈال رہی ہے کہ تمہارے شوفر کو آخر ان تخریب کاروں کے بارے میں کیا معلوم تھا کہ اسے ختم کروادیا گیا؟"

"یہ میرے لیے بھی تعجب خیز ہے سر!"

"دھیان پھر اس طرف جارہا ہے کہ اگر سارہ تمہارے اس دشمن کا نام بتادیتی جو فاران داؤدی سے ملا تھا تو کم از کم یہ معما حل ہوجاتا کہ فاران داؤدی تمہیں کیوں ختم کروانا چاہتا ہے۔"

"اس سلسلے میں قادر شاید کچھ کام آجائے۔ سارہ نے مجھے اس کا پتا تو لکھوایا ہی ہے اور میں اسے پہچانتا ہوں۔ ائرپورٹ پر وہ مجھ سے بہت قریب تھا۔"

"تم اور نصیر اختر مل کر ہی اس سلسلے میں کوئی لائحہ عمل مرتب کرنا" سیکشن آفیسر نے گھڑی کی طرف دیکھا "اسے ایک آدھ منٹ میں یہاں پہنچ جانا چاہیے۔"

"اتنی جلدی؟"

"ہاں۔" سیکشن آفیسر نے بتایا "جب میں نے اسے فون کیا تو اس کی کار یہاں سے زیادہ دور نہیں تھی۔"

○☆○

دو منٹ بعد نصیر اختر وہاں پہنچ گیا۔ سیکشن آفیسر نے ان دونوں کا تفصیلی تعارف کروایا اور پھر کہا "تم دونوں میٹنگ روم میں جا کر گفتگو کرلو۔"

نصیر اختر اٹھا تو ثاقب بھی اٹھ گیا۔ اس نے کمرے سے باہر نکل کر کہا "کیا یہ بھی ہمارے سیکشن کا کوئی قاعدہ ہے کہ اس قسم کی گفتگو میٹنگ روم ہی میں کی جائے۔"

"نہیں" نصیر اختر مسکرایا "یہ ضروری نہیں ہے۔ میرا خیال ہے، چیف کو ابھی کہیں جانا ہوگا۔"

"میں سمجھا تھا کہ۔" ثاقب نے مسکرا کر اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

میٹنگ روم میں کرسیوں پر بیٹھنے کے بعد ثاقب نے کہا "فاران داؤدی کی فائل پر آپ اب تک تنہا کام کرتے رہے ہیں۔"

"بس کچھ ایسے لوگ ہیں جو میری ہدایات پر کام کرتے ہیں۔ فیصلے صرف مجھے ہی کرنا پڑتے تھے لیکن اب آپ بھی میرے ساتھ ہوگئے۔ میں خود کو کسی قدر ہلکا پھلکا محسوس کررہا ہوں۔ ایک سے دو بھلے ہوتے ہیں۔"

اس کے بعد وہ دونوں سنجیدگی سے تمام معاملات پر گفتگو کرتے رہے۔ نصیر اختر نے بتایا کہ اس کے ماتحت فاران داؤدی پر مسلسل نظر رکھے ہوئے ہیں اور اس سلسلے میں اتنا محتاط طریقہ رکھا گیا ہے کہ فاران داؤدی کو اپنی نگرانی کا بالکل شبہ نہ ہوسکے گا۔

گفتگو آدھے گھنٹے تک جاری رہی۔ نصیر اختر نے ثاقب سے سارہ کے موبائل فون اور ٹیلی فون نمبر لے لیے۔ قادر کا پتا بھی اپنے پاس لکھ لیا اور اسی وقت موبائل فون پر کسی کو وہ پتا بتا کر اس سے کہا "فوری طور پر معلوم کرو کہ قادر اس وقت اپنے گھر پر ہے یا نہیں؟"

"میرا خیال ہے کہ اب ہمیں چلنا چاہیے۔" نصیر اختر نے اٹھتے ہوئے کہا "ابھی رات زیادہ نہیں ہوئی ہے۔ قادر جیسے لوگ اس وقت گھر پر نہیں ہوتے لیکن اگر مجھے اس کی موجودگی کی اطلاع ملی تو میں آپ سے رابطہ کروں گا۔ اگر ہم قادر کو کسی طرح اپنے جال میں لاسکیں تو ممکن ہے کہ بات کچھ آگے بڑھ سکے۔"

"اسے کس طرح جال میں لایا جاسکتا ہے؟"

"یہ بھی ابھی سوچوں گا۔ فوری طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔ آپ بھی سوچیے گا۔"

وہ دونوں میٹنگ روم سے باہر آئے۔ اس وقت ثاقب کا موبائل فون گنگنانے لگا۔ وہ کال اس کی بیوی شبنم کی تھی۔

"کہاں ہیں آپ؟" اس نے پریشان لہجے میں کہا "آپ نے کہا تھا کہ آٹھ بجے تک یا زیادہ سے زیادہ ساڑھے آٹھ بجے تک گھر آجائیں گے لیکن اب نو بج رہے ہیں۔"

"ہاں ذرا سی دیر ہوگئی۔ بہرحال اب نکل رہا ہوں۔ آدھے گھنٹے میں پہنچ جاؤں گا" ثاقب نے موبائل فون بند کردیا۔ پھر اس نے مسکرا کر نصیر اختر کو بتایا "مجھے صرف آدھے گھنٹے کی دیر ہوئی ہے ابھی لیکن بیگم صاحبہ پریشان ہوگئی ہیں۔"

"پھر تو آپ کے لیے کام کرنا مشکل ہوجائے گا۔ ہم لوگوں کو تو کسی وقت بھی حرکت میں آنے کی ضرورت پڑجاتی ہے۔"

"یہ وقتی بات ہے۔ جلد ہی سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا۔ ایک تو میرے ساتھ حالات کچھ غیر معمولی ہیں۔ دوسرے دو سال بعد وطن لوٹا ہوں۔ بیوی اور بچی کو مجھے ابھی کچھ وقت تو دینا چاہیے تھا جو میں نہیں دے سکا ہوں۔"

نصیر اختر سرہلا کر رہ گیا۔

باہر نکل کر دونوں نے ایک دوسرے سے مصافحہ کیا اور پھر اپنی اپنی کاروں میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہوئے۔ ثاقب نے جان بوجھ کر ایسا راستہ اختیار کیا کہ سارہ کے بنگلے کے سامنے سے گزر سکے۔

وہ اس سڑک پر پہنچا ہی تھا کہ موبائل فون پر نصیر اختر کی کال آگئی۔ اس نے بتایا کہ قادر ابھی اپنے گھر میں نہیں تھا۔

"دوسری بات یہ کہ فاران داؤدی پندرہ منٹ پہلے سارہ کے بنگلے پر پہنچا ہے۔"

ثاقب چونکا "کیا آپ کے خیال میں یہ بات کوئی اہمیت رکھتی ہے؟"

"نہیں۔" نصیر اختر نے جواب دیا "میں نے آپ کو رواروی میں بتادیا۔ مہینے میں ایک دو مرتبہ وہ سارہ کے گھر جاتا ہی ہے۔"

"کہیں اسے میری اور سارہ کی ملاقات کا علم نہ ہوگیا ہو۔"

"میرے خیال میں اس کا امکان نہیں۔ اگر اسے وہ اطلاع ملنا ہوتی تو بروقت ہی مل جاتی جس کے بعد آپ کا اور سارہ کا ہوٹل سے بخیروخوبی نکل آنا شاید بہت دشوار ہوجاتا۔"

"مجھے بہت دکھ ہوگا اگر اس لڑکی کو میری وجہ سے کوئی نقصان پہنچا۔"

"آپ کے لیے اس کے جذبات ایسے ہیں کہ آپ کو دکھ

ہونا ہی چاہیے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ فوری طور پر اس کے لیے خطرے کی کوئی بات نہیں ہے۔ کیا آپ اپنے گھر پہنچ گئے؟"

"بس پہنچنے ہی والا ہوں۔"

"چلیں ٹھیک ہے۔ اگر ضرورت محسوس ہوئی تو میں آپ سے دوبارہ رابطہ کرلوں گا۔ اگر قادر کے سلسلے میں آپ کوئی منصوبہ بندی کرسکیں تو مجھ سے رابطہ کرنے میں آپ بھی دیر نہ لگایئے گا۔"

"ٹھیک ہے" ثاقب نے موبائل فون بند کردیا۔

اس وقت اس کی کار سارہ کے بنگلے کے سامنے سے گزر رہی تھی۔ بنگلے کے احاطے میں اندھیرا تھا لیکن پھاٹک پر اور برآمدے میں روشنی دکھائی دے رہی تھی۔

اچانک ثاقب کے ذہن میں خیال آیا کہ اگر وہ ابھی سارہ کے موبائل فون پر اس سے رابطہ کرے تو فاران داؤدی کی موجودگی میں وہ اس سے کس طرح بات کرے گی؟

ذہن میں آنے والے اس خیال پر ثاقب نے فوراً عمل بھی کیا۔ ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ سنبھالے، دوسرے ہاتھ میں دبا ہوا موبائل فون کان سے لگائے وہ دوسری طرف کی گھنٹیاں سنتا رہا۔

آخر دوسری طرف سے کال ریسیو کی گئی "ہیلو!" وہ سارہ ہی کی آواز تھی۔

"میں نے اس وقت صرف آپ کی خیریت معلوم کرنے کے لیے فون کیا تھا۔ آپ میری آواز تو پہچان ہی گئی ہوں گی۔"

"میں خیریت سے ہوں۔ اس وقت میں آپ سے زیادہ بات نہیں کرسکتی" سارہ کی آواز سے گھبراہٹ ظاہر ہو رہی تھی۔

اسی وقت ثاقب نے ایک مدھم سی مردانہ آواز سنی "کس کا فون ہے سارہ؟" سوال کرنے والا سارہ سے کچھ دور تھا۔

"کک.... کسی کا نہیں۔ رانگ نمبر..." سارہ نے جواب دیتے ہوئے رابطہ منقطع کردیا۔

ثاقب نے جھٹکے سے اپنی کار روک دی۔ اسے بہت تیزی سے خیال آیا تھا کہ سارہ جواب دینے میں غلطی کر بیٹھی تھی۔ اس سے وہ سوال کرنے والا فاران داؤدی ہی ہو سکتا تھا اور یہ بات عین ممکن تھی کہ اس نے سارہ کا وہ جملہ سن لیا ہو جو اس نے موبائل پر کہا تھا۔ وہ جملہ سننے کے بعد فاران داؤدی اس بات پر ہرگز یقین نہیں کرتا کہ وہ کوئی رانگ نمبر تھا۔

ثاقب بے چینی سے سوچنے لگا کہ سارہ کو فون کرکے وہ شاید اسے خطرے میں ڈال بیٹھا ہے۔ وہ بے چینی سے غور کرنے لگا کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے۔ بہت جلد وہ ایک فیصلے تک پہنچ گیا۔ اپنی دانست میں وہ سارہ کو خطرے میں ڈال ہی بیٹھا تھا تو مزید کچھ جاننے کے لیے بھی ایک کوشش کی جاسکتی تھی۔ اس نے اپنے موبائل فون پر سارہ کا نمبر دوبارہ ملایا۔ دوسری طرف گھنٹی بجی اور پھر فوراً اس نتیجے تک پہنچ گیا کہ اب موبائل فون سارہ کے ہاتھ میں نہیں بلکہ فاران داؤدی کے ہاتھ میں تھا اور اس نے خاموش رہ کر کال کرنے والے کی آواز سننا چاہی تھی۔

"کیا صدیق صاحب ہیں؟" ثاقب نے اپنی آواز بدلنے کی کوشش کی۔

دوسری طرف سے رابطہ منقطع کردیا گیا۔

ثاقب نے جواب دے کر فاران داؤدی کو یہ باور کرانے کی کوشش کی تھی کہ وہ اس سے پہلے بھی سارہ کا نمبر غلطی سے ملا بیٹھا تھا لیکن اس کوشش کے باوجود اس کے ذہن میں خیال رہا کہ وہ فاران داؤدی کو مطمئن نہیں کرسکا ہوگا۔

اس سڑک پر دن میں بھی ٹریفک کم رہتا تھا۔ رات کو اس میں مزید کمی آجاتی تھی۔ ثاقب نے کار حرکت میں لاکر بہ آسانی یوٹرن لیا۔ موبائل فون پر اس نے نصیر اختر کا نمبر بھی ملایا۔ دوسری طرف سے نصیر اختر کا جواب اس وقت ملا جب اس نے اپنی کار سارہ کے بنگلے کے قریب روک دی تھی۔

ثاقب نے نصیر اختر کو صورتِ حال سے آگاہ کیا۔

نصیر اختر نے سب کچھ سن کر کہا "آپ کا یہ خیال درست ہوسکتا ہے کہ آپ نے سارہ کو خطرے میں ڈال دیا ہے۔ آپ کے موبائل کا نمبر تو سارہ کے موبائل پر آگیا ہوگا!"

"فاران داؤدی اس نمبر سے آشنا نہیں ہوگا۔ یہ موبائل فون مجھے آج ہی دفتر کی طرف سے ملا ہے۔ یہ بھول جایئے کہ فاران داؤدی اس نمبر سے آشنا ہوگا یا نہیں!" ثاقب نے تیزی سے کہا "آپ یہ بتایئے کہ وہ لوگ کہاں ہیں جنہیں آپ نے فاران داؤدی کی نگرانی پر مقرر کیا ہے۔ مجھے یہاں کوئی دکھائی نہیں دے رہا ہے۔"

"اگر وہ آپ کو دکھائی دے سکتے تو فاران داؤدی کو بھی دکھائی دے جاتے۔ آپ ان کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"مجھے ان کی مدد کی ضرورت پڑسکتی ہے۔ میں سارہ کے

بنگلے میں داخل ہونا چاہتا ہوں۔ شاید سارہ کو اس وقت مدد کی ضرورت ہو۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں، آپ کو یہ قدم ضرور اٹھانا چاہیے" نصیر اختر نے تیزی سے کہا "سارہ کو فون کرکے آپ نے جو غلطی کی ہے، شاید وہ کار آمد ہی ثابت ہوجائے۔ آپ بنگلے میں ضرور داخل ہوں اور دیکھیں کہ وہاں کیا صورتِ حال ہے۔ فاران داؤدی کی نگرانی کرنے والوں نے آپ کو یقیناً دیکھ لیا ہوگا۔ میں ابھی ان سے رابطہ کرکے انہیں ہدایت دے دیتا ہوں کہ وہ آپ سے تعاون کریں۔ میں خود بھی جلد از جلد وہاں پر پہنچنے کی کوشش کروں گا۔"

"ٹھیک ہے۔"

دوسری طرف سے رابطہ منقطع کردیا گیا۔

ثاقب نے موبائل فون اپنی جیب میں ڈالا اور انجن بند کرکے کار سے اتر آیا۔ وہ اردگرد کا جائزہ بھی لے رہا تھا اور سارہ کے بنگلے کے پھاٹک کی طرف سے بھی غافل نہیں تھا۔

ایک کار کسی طرف سے نکل کر بہت تیزی سے ثاقب کے قریب آرکی۔ اس میں سے دو آدمی اترے۔

"لیس سر!" ان میں سے ایک ثاقب سے بولا "ہمیں ہدایات مل چکی ہیں۔ فرمایئے ہمیں کیا کرنا ہے؟"

"میرے ساتھ آئیں" ثاقب بنگلے کے پھاٹک کی طرف لپکا۔

"سر!" دونوں اجنبیوں میں سے دوسرے نے کہا "بنگلے کے پھاٹک کے اندر چوکی دار ہوگا جو یقینی طور پر فاران داؤدی کا خاص آدمی ہوگا۔ وہ پھاٹک تو نہیں کھولے گا۔"

"ہمیں بنگلے میں بہت رازداری سے داخل ہونا ہے" ثاقب نے کہا۔

"تو پھر ذرا سا توقف کیجئے۔"

ان میں سے ایک تیزی سے اپنی کار کی طرف واپس چلا گیا۔ اس نے کار کی ڈکی سے ایک خاصا بڑا چرمی بیگ نکالا اور تیزی سے لوٹا۔

"ہم پہلو کی دیوار پھلانگ کر اندر جاسکتے ہیں۔" اس نے کہا "احاطے میں تاریکی ہے۔ چوکیدار کی کوٹھری پھاٹک کے قریب ہے۔ وہ ہمیں احاطے میں اترتے نہیں دیکھ سکے گا۔"

"ہمیں جو کچھ کرنا ہے، بہت تیزی سے کرنا ہے" ثاقب نے کہا "تم میں سے ایک یہیں پھاٹک پر رکے۔ اگر فاران داؤدی کی کار پھاٹک سے نکلے اور اس کے ساتھ سارہ بھی ہو تو گولی مار کر اس کی کار کا ٹائر برسٹ کردینا۔"

"بہتر ہے۔"

ایک آدمی وہیں رک گیا۔

سارہ کے بنگلے کے ایک جانب بنگلوں کی قطار تھی اور ان سب بنگلوں کی دیواریں ملی ہوئی تھیں لیکن سارہ کے بنگلے کی دوسری جانب گلی تھی۔

اس گلی میں پہنچ کر اجنبی نے چرمی بیگ کھولا۔ اس میں سے ایک عجیب سی بندوق نکالی جس کے دہانے پر کسی دھات کا بنا ہوا ایک آکٹوپس سا نظر آرہا تھا۔

بندوق کا رخ اوپر کرکے اس کا ٹریگر دبایا گیا۔ ہلکے سے دھماکے کی آواز کے ساتھ دھات کا آکٹوپس اڑتا ہوا اوپر جانے لگا۔ اس سے ایک پتلی سی رسی کا ایک سرا بندھا ہوا تھا۔

آکٹوپس دیوار سے ذرا اوپر جاکر نیچے آیا اور دیوار میں پھنس گیا۔ اس سے بندھی ہوئی رسی کا دوسرا سرا بندوق ہی میں رہا تھا۔

"اب ہم آسانی سے اوپر چڑھ سکتے ہیں۔" ثاقب نے اندھیرے میں اپنے ساتھی کی آواز سنی۔

رسی میں دو دو فٹ کے فاصلے سے گرہیں پڑی ہوئی تھیں اس لیے رسی کے سہارے اوپر چڑھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔

رات کے دس بھی نہیں بجے تھے لیکن گلی میں بالکل سناٹا تھا۔ اس سناٹے کی تاریکی بھی ان کی مددگار ثابت ہوئی۔ اوپر چڑھ کر رسی دوسری طرف لٹکادی گئی۔ دونوں آدمی جتنی آسانی سے اوپر چڑھے تھے، اس سے زیادہ آسانی کے ساتھ تاریک احاطے میں اتر گئے۔

بنگلے کی ایک کھڑکی تک پہنچنے میں انہیں نہ تو دیر لگی، نہ کوئی خطرہ پیش آیا۔ اس کمرے میں اندھیرا تھا جس کی کھڑکی تک وہ دونوں پہنچے تھے۔

ثاقب کے ساتھی نے بڑی تیزی سے کھڑکی کا ایک شیشہ کاٹ دیا۔ اس کے بعد اندر ہاتھ ڈال کر کھڑکی کھولنا مشکل نہیں تھا۔

وہ دونوں کھڑکی کے راستے اس کمرے میں داخل ہوئے اور اس وقت ثاقب کو ہلکی ہلکی نسوانی چیخیں سنائی دینے لگیں۔ ثاقب مضطرب ہوگیا۔ اس کے اندازے کے مطابق وہ چیخیں سارہ ہی کی ہوسکتی تھیں۔

کمرے کے دروازے سے وہ دونوں ایک راہداری میں پہنچے اور چیخیں کچھ صاف سنائی دینے لگیں۔ یہاں سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ چیخوں کی آواز کس طرف سے آرہی تھی۔ ثاقب نے اسی طرف قدم بڑھائے۔ اس نے

اپنا پستول ہولسٹر سے نکال لیا تھا۔ اس کے ساتھی کی پنسل ٹارچ کی روشنی راستہ دکھارہی تھی۔ ایک ہاتھ میں پنسل ٹارچ اور دوسرے ہاتھ میں ریوالور سنبھالے وہ ثاقب ہی کی طرح تیزی سے متحرک تھا۔

وہ دونوں بہت جلد ایک کشادہ ڈرائنگ روم تک پہنچ گئے۔ وہاں سارہ ایک کرسی سے بندھی ہوئی تھی۔ ایک معمر آدمی اس پر چمڑے کی بیلٹ برساتے ہوئے دانت پیس کر کہہ رہا تھا "تجھے بتانا پڑے گا سارہ کہ وہ فون کس کا تھا؟"

سارہ کے جسم پر صرف نائٹی تھی۔ وہ خون سے رنگین ہوتی جارہی تھی۔ چمڑے کی بیلٹ اس کے جسم کی کھال ادھیڑتی جارہی تھی۔

"یہ داؤدی ہے؟" ثاقب نے دانت پر دانت جما کر دھیمی آواز میں اپنے ساتھی سے پوچھا۔

"جی ہاں" جواب ملا۔

ثاقب فوراً آگے بڑھا اور بلند آواز میں بولا "قانون کے نام پر خود کو ہمارے حوالے کردو فاران داؤدی!"

فاران داؤدی کے ہاتھ سے بیلٹ گر گئی۔ ان دونوں کو دیکھ کر وہ حیران نظر آیا تھا لیکن اس نے حیرت زدگی کے عالم میں اپنا وقت ضائع نہیں کیا اور ایک طرف چھلانگ لگائی۔

"ٹھہرو داؤدی!" ثاقب نے چیختے ہوئے ایک ہوائی فائر کیا۔

فاران داؤدی نے ایک صوفے کی آڑ لے کر اپنی جیب سے پستول نکال لیا تھا۔ اگر ثاقب اور اس کا ساتھی فوراً خود کو نیچے نہ گراتے تو فاران داؤدی کی چلائی ہوئی گولیوں کی زد میں آجاتے۔

پھر ان دونوں نے بہت تیزی سے ایسی پوزیشن بھی لے لی کہ خود کو فاران داؤدی کی گولیوں سے پوری طرح محفوظ کرلیا۔

"تم بچ نہیں سکتے داؤدی!" ثاقب نے چیخ کر کہا "بنگلا اس وقت پولیس کے نرغے میں ہے" وہ داؤدی کو نروس کرنا چاہتا تھا۔

فاران داؤدی نے ایک گولی چلائی اور ثاقب نے سارہ کی چیخ سن کر اس کی طرف دیکھا۔ فاران داؤدی نے وہ گولی سارہ کے سینے پر چلائی تھی۔

سارہ کی چیخ نے ثاقب ہی کو نہیں، اس کے ساتھی کو بھی سارہ کی طرف متوجہ کردیا تھا۔ فاران داؤدی کو اندازہ ہوگا کہ فطری طور پر ایسا ہونا ہی چاہیے۔ اس نے اس لمحے سے پوری طرح فائدہ اٹھایا اور جست لگا کر ایک دروازے سے باہر نکل گیا۔ ساٹھ پینسٹھ سال کی عمر میں بھی وہ غضب کا پھرتیلا تھا۔

"اس کے پیچھے جاؤ" ثاقب نے اپنے ساتھی سے کہا اور خود تیزی سے سارہ کی طرف لپکا۔

سارہ کے سینے سے خون ابل رہا تھا۔ اس کے چہرے سے اذیت ظاہر ہورہی تھی لیکن ثاقب کو اپنے قریب پاکر اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"میں تمہیں کچھ نہیں ہونے دوں گا سارہ!" ثاقب تیزی سے وہ ڈوری کاٹنے لگا جس سے سارہ بندھی ہوئی تھی۔ یہ ثاقب کی عادت تھی کہ وہ ایک چھوٹا سا نیل کٹر ہر وقت اپنی جیب میں رکھتا تھا۔ اس وقت وہی نیل کٹر اس کے کام آگیا تھا۔

سارہ کے ہونٹ لرزے۔ شاید وہ کچھ بولنا چاہتی تھی لیکن بول نہیں سکی۔ اس کے چہرے پر پسینہ چمکنے لگا تھا۔

"ہمت رکھو سارہ! ہمت رکھو۔ تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ میں تمہیں بہت تیزی سے اسپتال لے جاؤں گا۔ مجھے تم سے اپنے اس دشمن کا نام معلوم کرنا ہے جسے تم نے فاران داؤدی سے ملتے دیکھا تھا۔"

"وہ... وہ..." سارہ نے بولنا چاہا مگر اس کی آواز لڑکھڑا گئی۔

"بولو، بولو!" ثاقب نے مضطربانہ انداز میں کہا۔ وہ سارہ کو آزاد کرا چکا تھا۔

"وہ..." سارہ کے منہ سے پھر اتنا ہی نکلا۔

"بولو" ثاقب کا اضطراب بڑھ گیا۔ اس نے سارہ کو اپنے دونوں ہاتھوں پر اٹھالیا تھا۔

سارہ نے بولنے کی کوشش کی "تا... تا..." اس کے منہ سے اتنا ہی نکل سکا اور پھر اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔

ثاقب کے ذہن کو دو جھٹکے لگے۔ ایک جھٹکا سارہ کی موت کا تھا اور دوسرا دماغ میں پھیلنے والے اس خیال کی گونج کا کہ سارہ نے اسے شاید کسی کا نام بتانا چاہا تھا لیکن اس کی زبان "تا" سے آگے کچھ نہیں کہہ سکی تھی۔



شبنم کی وہ رات بڑی پریشانی میں گزری۔ وہ کوشش کرتی رہی تھی لیکن ثاقب کے موبائل فون سے اس کا رابطہ نہیں ہوسکا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ثاقب کا موبائل فون بند ہو۔ یہ اندازہ لگانا شبنم کے لیے ممکن نہیں تھا کہ موبائل فون ثاقب نے بند کیا ہوگا یا کوئی اور گڑبڑ تھی۔

ثاقب سے رابطہ نہ ہونے کے باعث شبنم اتنی پریشان ہوئی تھی کہ رات سوا دس بجے ہی اس نے انسپکٹر دانیال کو فون کر دیا تھا۔

دانیال نے آ کر اس کی ڈھارس بندھانے کی کوشش کی۔

شبنم نے اس سے کہا تھا "میں ڈر رہی ہوں کہ جو لوگ ایک مرتبہ انہیں اغوا کرنے میں ناکام رہے تھے' وہ دوسری مرتبہ کامیاب نہ ہو گئے ہوں!"

"میں اپنے وسائل سے معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

دانیال نے تین چار افراد سے موبائل فون پر رابطہ کر کے انہیں کچھ ہدایات دی تھیں لیکن اس وقت وہ خود بہت پریشان ہو گیا تھا جب موبائل فون پر اس کے لیے کسی کی کال آئی تھی۔

دانیال نے شبنم کو یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ کال کس کی تھی اور اسے کیا معلوم ہوا تھا جس سے اچانک اسے بہت زیادہ پریشانی لاحق ہو گئی تھی۔ وہ فوراً ہی کہیں جانے کے لیے کھڑا ہو گیا تھا۔ اس نے شبنم کے استفسار پر بس اتنا بتایا تھا کہ اسے اچانک ایک ضروری کام پیش آ گیا ہے لیکن وہ جلد ہی شبنم سے موبائل فون پر رابطہ کرے گا۔

پھر رات ڈھلتی رہی تھی لیکن دانیال کا فون نہیں آیا تھا۔ پھر شبنم نے خود دانیال سے رابطے کی کوشش کی تھی لیکن شاید دانیال نے بھی اپنا فون بند کر دیا تھا۔

اس سے شبنم کی پریشانی اور بڑھی تھی۔ وہ انگبین کو گود میں لیے ٹہلتی رہی تھی۔ ٹہل ٹہل کر تھک جاتی تو تھوڑی دیر کے لیے بیٹھ جاتی تھی۔ گھنٹے آدھے گھنٹے بعد اس نے ثاقب اور دانیال سے ان کے موبائل فون پر رابطے کی کوششیں بھی جاری رکھی تھیں لیکن اسے کامیابی نہیں ہو سکی تھی۔ جب صبح ہو گئی تو اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اس پولیس افسر سے رابطہ کرے جو ثاقب کے اغوا کی کوشش کرنے والوں کے بارے میں اور احمد بخش کی موت کے بارے میں تحقیقات کر رہا تھا۔

شبنم کو تھانے فون کر کے معلوم ہوا کہ وہ پولیس افسر وہاں موجود نہیں تھا۔ شبنم کو تھانے سے اس کا موبائل فون نمبر مل گیا لیکن پھر اسے پولیس آفیسر سے رابطہ کرنے کی ضرورت نہیں رہی۔ اس نے باہر سے آنے والی ایک مدھم سی آواز سنی تھی جیسے کوئی کار آ کر رکی ہو۔ وہ کمرے کی کھلی ہوئی کھڑکی کی طرف جھپٹی۔ اس کی خواب گاہ اوپری منزل پر تھی۔ اس نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو اسے ثاقب کی کار دکھائی دی۔ وہ دروازہ کھول کر کار سے اتر رہا تھا۔

شبنم کھڑکی سے ہٹ کر دروازے کی طرف جھپٹی۔ اس نے بڑی تیزی سے زینے طے کیے۔ نیچے اسے مسز راؤ مل گئی۔ شبنم نے انگبین کو اس کے حوالے کیا اور بیرونی دروازے کی طرف لپکی۔ اس وقت ثاقب دروازہ کھول کر خود ہی اندر آ گیا۔

"یہ... یہ کیا حالت ہو رہی ہے آپ کی؟" شبنم کے منہ سے نکلا۔

ثاقب کے بال کسی حد تک بکھرے ہوئے سے تھے اور آنکھیں اتنی بوجھل ہو رہی تھیں جیسے وہ ساری رات کا جاگا ہوا ہو۔ ٹائی کی ناٹ درست نہیں تھی۔ وہ اس کے گلے میں جھول رہی تھی۔ سوٹ پر سلوٹیں تھیں لیکن شبنم کے لیے زیادہ پریشان کن بات یہ تھی کہ اس کے سوٹ پر خون کے دھبے تھے۔

"اوپر' خواب گاہ میں چلو" ثاقب کی آواز تھکی تھکی سی تھی۔

"یہ... یہ... خون..."

"میں کسی کو قتل کر کے نہیں آیا ہوں۔ یہ دھبے سارہ کے خون کے ہیں۔"

"کون سارہ؟"

"سب کچھ بتاؤں گا' اوپر چلو۔"

شبنم اس کا بازو پکڑ کر اس کے ساتھ ساتھ زینے طے کرنے لگی۔

مسز راؤ اور گھر کے دوسرے ملازمین نے بھی ثاقب کی وہ حالت دیکھی تھی مگر ان میں سے کوئی بھی ثاقب سے اس بارے میں استفسار کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔

خواب گاہ میں پہنچ کر ثاقب تھکے ہوئے انداز میں کرسی پر گر سا پڑا اور ایک طویل سانس لے کر بولا "سارہ سے میری ملاقات طیارے میں ہوئی تھی۔" وہ ٹھہر ٹھہر کر' سانس لے لے کر شبنم کو سب کچھ بتاتا رہا۔

ہوٹل میں ثاقب اور سارہ کی ملاقات کا حال سن کر شبنم کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔

ثاقب نے پوچھا "یہ جان کر تمہارے احساسات کیا ہیں کہ ایک لڑکی مجھے تین سال تک خاموشی سے چاہتی رہی۔"

"اگر وہ شادی شدہ نہ ہوتی تو میں اسے بہت عظیم لڑکی کہتی۔ آپ نے اس سے اپنے دشمن کا نام جاننے پر اصرار کیوں نہیں کیا؟"

"کیا تھا" ثاقب نے سر ہلایا "لیکن وہ بتانے پر تیار نہیں

ہوئی تھی۔ پھر اس وقت شاید وہ مجبوراً تیار ہوئی جب اس کے سینے میں گولی لگ چکی تھی۔"

"کیا!" شبنم چونکی "گولی۔۔۔؟"

"ہاں۔" ثاقب نے کہا "میں نے ابھی بتایا تھا ناکہ میرے لباس پر یہ خون اسی کا ہے۔ میں اسے زخمی حالت میں اسپتال لے گیا تھا۔ پہلے تو میں سمجھا تھا کہ وہ مجھے کچھ بتانے کی کوشش کرتے ہوئے مرگئی تھی لیکن ایسا نہیں تھا۔ وہ صرف بے ہوش ہوئی تھی۔"

"اسے گولی لگی کیسے؟" شبنم نے بے چینی سے پوچھا "اور آپ اس وقت اس کے پاس کیسے تھے؟"

ثاقب نے گزشتہ رات کا واقعہ بیان کرنا شروع کیا۔ نصیر اختر اور ریاض دونوں آدمیوں کا اس نے ذکر نہیں کیا اور یہ بتایا کہ وہ اپنے طور پر اپنی کوششوں سے اس بنگلے میں داخل ہوا تھا۔

وہ سب کچھ بیان کرکے اس نے آخر میں کہا "اس طرح فاران داؤدی کو فرار کا موقع مل گیا۔"

"سارہ فاران داؤدی کے خلاف کیوں ہوگئی تھی؟"

"اس کی دو وجوہ تھیں۔ ایک تو وہ فاران داؤدی سے شادی کا تصور بھی نہیں کرسکتی تھی۔ اس نے فاران داؤدی کو ہمیشہ اپنا ایک بزرگ سمجھا تھا۔ فاران داؤدی نے اپنے ایک ملازم کی موت کے بعد اس کی بیٹی کو اپنی سرپرستی میں لے لیا تھا" ثاقب نے وہ سب کچھ بھی بتایا' پھر کہا "اس نے سارہ کو جو بنگلا دلایا تھا وہیں اس نے سارہ کو اپنی ہوس کا نشانہ بنایا۔ سارہ اس کے بعد خودکشی ہی کرلیتی لیکن فاران داؤدی نے اسے اپنی محبت کا یقین دلایا اور اس سے شادی کرلی۔ شادی کے باعث سارہ نے خودکشی کا ارادہ ترک کردیا لیکن وہ خود کو ایک گھٹے ہوئے ماحول میں محسوس کرتی رہی۔ اس نے ذہنی طور پر فاران داؤدی کو قبول نہیں کیا تھا۔ ابھی کچھ دن پہلے وہ صرف یہاں کی گھٹن سے وقتی فرار کے لیے مغربی ممالک کی سیر پر نکل گئی تھی۔ وہاں سے واپسی پر طیارے میں مجھ سے ملی اور اس نے مجھ سے تعارف حاصل کرنا چاہا۔ خیر! فاران داؤدی کے خلاف ہونے کی ایک وجہ تو یہ تھی اور دوسری وجہ یہ کہ اسے فاران داؤدی کی حقیقت کا علم ہوگیا تھا۔ وہ جان گئی تھی کہ فاران داؤدی ایک غیر ملکی طاقت کا آلۂ کار بن کر تخریب کاری کے بہت سے کاموں میں ملوث تھا۔ وہ چونکہ سارہ کے پاس جاتا رہتا تھا اور اسی دوران میں اس کے موبائل فون پر کالیں بھی آتی رہتی تھیں۔ اس لیے سارہ کو ان باتوں سے کچھ شبہ ہوگیا تھا۔ پھر ایک مرتبہ اسے اپنے اس شبہے کی تصدیق کا موقع بھی مل گیا۔ سارہ کے بنگلے کا ایک کمرا فاران داؤدی نے اپنے لیے وقف کر رکھا تھا۔ وہاں وہ جب بھی جاتا تھا' اپنا خاصا وقت اس کمرے میں بھی گزارتا تھا۔ وہاں وہ ایک کمپیوٹر میں اپنے خاص معاملات کا ریکارڈ رکھا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ وہ نشے میں سارہ کو بھی اس کمرے میں لے گیا تھا۔ سارہ کے سامنے ہی وہ کمپیوٹر پر ایک ڈیڑھ گھنٹے مصروف رہا اور اس وقت سارہ یہ جان گئی کہ وہ کسی وقت خود بھی اس کمپیوٹر کی خفیہ فائلوں تک کس طرح پہنچ سکتی ہے لیکن اس روز اپنے شبہے کی تصدیق کے بعد وہ ڈر گئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اگر اس کی کسی حرکت سے فاران داؤدی کو اس پر شبہ ہوگیا تو وہ اسے زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

"آپ اصل بات کی طرف نہیں آرہے ہیں؟" شبنم پہلو بدل کر بولی "آپ کو اپنے دشمن کا کچھ پتا چل گیا یا نہیں؟"

"چل گیا" ثاقب نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "اور اس سے مجھے بہت صدمہ پہنچا۔ وہ بتانے کے لیے مجھے کچھ ہمت درکار ہے۔ میں اپنی ہمت مجتمع کرنے ہی کے لیے تمہیں یہ سب کچھ بھی بتا رہا ہوں" ثاقب نے کچھ سوچتے ہوئے کہا "فاران داؤدی وہ کمرا مقفل رکھا کرتا تھا۔ سارہ کبھی وہ کمرا کھولنے کی ہمت نہیں کرسکی تھی لیکن میرے معاملے میں اس نے ہر خطرہ مول لینا گوارا کرلیا۔"

"وہ زندہ تو بچ گئی نا؟" شبنم نے کھوئے ہوئے سے لہجے میں پوچھا۔

ثاقب نے اثبات میں سر ہلایا "ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ میں نے اسے بہت صحیح وقت پر اسپتال پہنچادیا تھا۔ اگر مجھے تھوڑی سی دیر ہوجاتی تو اسے بچانا مشکل ہوجاتا۔ آپریشن کرکے اس کے سینے سے گولی نکال لی گئی تھی اور اسے آئی سی یو میں پہنچادیا گیا تھا۔ وہ ابھی کوئی دو ڈھائی گھنٹے پہلے ہوش میں آئی ہے۔ اس پر یہ خیال شدت سے مسلط تھا کہ وہ زندہ نہیں بچے گی اس لیے وہ اپنا تفصیلی بیان فوراً دینا چاہتی تھی۔ ڈاکٹروں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ اب وہ خطرے میں نہیں ہے لیکن اس نے بیان دینے پر اصرار جاری رکھا۔ اس نے کچھ دیر مجھ سے بھی بات کی۔"

"آپ کو اس سے ہی اپنے دشمن کا نام معلوم ہوا ہوگا۔"

"ہاں' لیکن وہ مجھے رات کو ہی معلوم ہوگیا تھا۔"

"ابھی آپ بتا چکے ہیں کہ اس نے بے ہوشی سے پہلے ہی کچھ بتانے کی کوشش کی تھی۔"

"اس کے منہ سے صرف "تا" کی آواز نکلی تھی۔"
"تاثیر؟" شبنم چونکی۔
ثاقب کچھ سوچتے ہوئے کہتا رہا۔ "جب میں اسے لے کر اسپتال کی طرف روانہ ہوا تھا تو وہ ہوش میں آ گئی تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ بے ہوش ہوئی ہی نہیں تھی۔ تکلیف کی کسی شدید لہر نے وقتی طور پر اس کا دماغ ماؤف کر دیا تھا۔ ایک اعتبار سے اسے بھی بے ہوشی ہی کہنا چاہیے۔ چلتی کار میں جب میں نے اس کی کراہ سنی تو اس کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ آنکھیں کھولے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے ہونٹ ہلے تو میں نے اس سے کہا کہ وہ خاموش رہے۔ میرا خیال تھا کہ بولنے سے اس کی تکلیف میں اضافہ ہوگا لیکن اس وقت بھی اس کے ذہن پر یہ خیال مسلط تھا کہ وہ زندہ نہیں بچے گی۔ وہ مرنے سے پہلے مجھے کچھ ضروری باتیں بتانا چاہتی تھی۔ اس نے رک رک کر مجھے سب سے اہم بات تو اس کمپیوٹر کے بارے میں بتائی اور اس کمپیوٹر میں موجود خفیہ فائلوں تک رسائی کا طریقہ بھی بتایا۔ میں نے اسے اسپتال کی طرف لے جاتے ہوئے اپنے موبائل فون پر ریحان زیدی سے رابطہ کر کے انہیں صورتِ حال سے آگاہ کر دیا تھا۔ تم ریحان زیدی سے واقف ہونا؟"
"آپ کے مرحوم والد کے دوست اور..."
"ہاں" ثاقب نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "تمہیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ وہ ایک حساس ادارے میں ڈپٹی ڈائریکٹر ہیں۔ انہی کی وجہ سے اسپتال میں ایسے انتظامات ہو سکے تھے کہ اسپتال میں سارہ کو احمد بخش کی طرح ہلاک نہ کروایا جا سکے لیکن یہ میں تمہیں بعد کی بات بتانے لگا۔ جب سارہ سے مجھے اس کمپیوٹر کے بارے میں معلوم ہوا تھا تو میں نے موبائل فون پر اس کی اطلاع فوراً ہی ریحان زیدی کو دینا ضروری سمجھا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ریحان صاحب کے ادارے کے لوگوں نے فوری طور پر سارہ کے بنگلے کو نرغے میں لے کر پہلے تو وہاں کے چوکی دار کو گرفتار کیا' پھر بنگلے کی ہر چیز گویا اپنی تحویل میں لے لی۔ کمپیوٹر میں موجود خفیہ فائلوں سے فاران داؤدی کے سارے نیٹ ورک کا پتا چلا اور دوسری بہت سی سنسنی خیز معلومات حاصل ہوئیں۔ اسپتال میں جس وقت سارا کا آپریشن ہو رہا تھا' قانون نافذ کرنے والی ایجنسیاں سارے شہر میں متحرک ہو چکی تھیں۔ فاران داؤدی کے شاید بہت کم آدمی بچ سکے ہوں گے۔ زیادہ تر گرفتار ہو چکے ہیں۔ فاران داؤدی کے گھر پر ریڈ کر کے اسے بھی گرفتار کر لیا گیا تھا۔ کمپیوٹر سے حاصل شدہ معلومات اس کے خلاف ٹھوس ثبوت کی صورت میں موجود ہیں۔"
"تاثیر کے بارے میں سارہ نے اور کیا بتایا؟"
"وہ جو "تا" کہہ کر بے ہوش ہوئی تھی' اس سے میں نے غلط نتیجہ اخذ کیا تھا اور تم بھی غلط سمجھی ہو۔ اس وقت دراصل میرے ایک استفسار پر اس نے یہ کہنے کی کوشش کی تھی کہ طاقت نہیں ہے اس میں بولنے کی۔"
"تو پھر؟"
"کار میں اس نے مجھے میرے دشمن کا نام بتایا۔ اس سے دانیال کا نام سن کر مجھے بہت دکھ پہنچا تھا۔"
"دانیال؟" شبنم کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔
"ہاں" ثاقب اس کی طرف دیکھے بغیر کہتا رہا "یہ تو سارہ ہی بتا چکی تھی کہ پولیس کے بہت سے افسر فاران داؤدی کے آلۂ کار بنے ہوئے ہیں۔ کمپیوٹر سے حاصل شدہ معلومات سے ان سب کے نام بھی معلوم ہو گئے تھے۔ ان سب کو گرفتار کیا جا چکا ہے اور یہ بھی معلوم ہو گیا ہے کہ دانیال مجھے کیوں مروانا چاہتا تھا۔"
"کیوں؟" شبنم خاصی بے چین ہو گئی تھی۔
"اس لیے کہ میرے بعد میری ساری دولت تمہاری ہو جاتی اور وہ تم سے شادی کر لیتا۔"
"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" شبنم کی آواز کپکپا گئی۔
"کیا اس سے تمہارے تعلقات نہیں تھے؟" ثاقب نے سوال کیا۔ اس کا چہرہ بدستور مغموم نظر آ رہا تھا۔
شبنم کا چہرہ فق پڑ گیا۔
ثاقب نے ایک ٹھنڈی سانس لی "انکار کرنا فضول ہوگا شبنم! دانیال کی زبان کھلوائی جا چکی ہے۔ احمد بخش کو دراصل کسی طرح تم دونوں کے تعلقات کا علم ہو گیا تھا۔ دوسرے ملازمین کی بہ نسبت گھر میں وہ بہت آزادانہ طور پر متحرک رہتا تھا۔ اس نے تم دونوں کو دیکھ لیا ہوگا۔ وہ مجھ سے غالباً اسی شک کا اظہار کرنا چاہتا تھا کہ میرے خلاف وہ سازش دانیال کی بھی ہو سکتی ہے لیکن دانیال نے اس کی زبان بند کروا دی۔ تمہیں شاید کبھی شک نہ ہوا ہو لیکن دانیال کو ضرور شک تھا کہ احمد بخش کو اس کے اور تمہارے تعلقات کا علم ہو چکا ہے یا کم از کم شبہ ضرور ہو گیا ہے۔"
شبنم کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا اور ایک جا رہا تھا۔
ثاقب اس کی طرف بھیگی ہوئی آنکھوں سے دیکھنے لگا' پھر بولا "مجھے تم سے اب بھی اتنی محبت ہے شبنم کہ میں تمہارے ساتھ کوئی ظالمانہ سلوک نہیں کر سکتا لیکن یہ بھی

ممکن نہیں کہ تم بدستور میری بیوی رہو۔"
شبنم کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔
ثاقب کچھ رک کر بولا "دانیال یہ بھی بتا چکا ہے کہ میرے خلاف اس کی سازش کا علم تمہیں نہیں تھا۔ ابھی تمہاری باتوں سے بھی مجھے اندازہ ہوگیا ہے کہ اس سازش میں تم شریک نہیں تھیں۔ تمہارا جرم بس اتنا ہی ہے کہ تم نے میری محبت کو، میرے اعتماد کو قتل کیا ہے۔ مجھے اس کا بھی یقین ہے کہ تم ہمیشہ سے اس قسم کی لڑکی نہیں ہو۔ بس گڑبڑ یہ ہوئی کہ میں شادی کے بعد بہت جلدی تم سے دو سال کے لیے دور ہوگیا۔ تم یہ دوری برداشت نہیں کرسکیں اور تمہارے قدم بہک گئے۔ ذرا دیر پہلے تم نے سارہ کے بارے میں کہا تھا کہ اگر وہ شادی شدہ نہ ہوتی تو تم اسے بہت عظیم لڑکی کہتیں لیکن اب یہ بتاؤ کہ تم کیا ہو؟ اس نے تو مجھ سے صرف محبت کی، وہ اس سے زیادہ کچھ چاہتی بھی نہیں تھی۔ اس نے گزشتہ دو سالوں میں تمہیں اور دانیال کو متعدد بار ساتھ ساتھ گھومتے پھرتے ہوئے دیکھا تھا۔ عورت کی حرکات و سکنات بتا دیتی ہیں کہ وہ جس کے ساتھ گھوم پھر رہی ہے، اس سے اس کے تعلق کی نوعیت کیا ہے۔ وہ نوعیت سارہ نے بھی بھانپ لی تھی لیکن اس نے میرے سامنے اپنی زبان سے تم پر وہ سنگین الزام نہیں لگایا۔ اس کی خواہش تھی کہ مجھے دوسرے طریقوں سے اس کا علم ہو۔ اسے یہ ڈر بھی تھا کہ وہ چونکہ مجھ سے محبت کرتی ہے اس لیے میں اس کی باتوں کو محض الزام تراشی نہ سمجھ لوں۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ میں اس سے ناراض ہوجاؤں۔ اسی لیے میں سمجھتا ہوں کہ وہ بہرحال ایک عظیم لڑکی ہے۔ مجھ سے اس کی محبت بے لوث تھی اور شاید بے لوث ہی رہے گی۔ اس نے شادی شدہ ہوتے ہوئے بھی مجھ سے صرف محبت ہی کی نا! تم نے تو شادی شدہ ہوتے ہوئے بھی ایک اور مرد سے ایسا تعلق قائم کرلیا جس کا تمہیں کوئی حق نہیں تھا۔ میرے سامنے تم اسے دانیال بھائی بھی کہتی رہیں۔ تم نے لفظ بھائی کی تقدیس کی بھی دھجیاں بکھیر دیں۔"
شبنم روتی ہوئی اپنی جگہ سے اٹھی اور ثاقب کے قدموں میں گر پڑی۔ وہ سسکیاں لیتے ہوئے کہہ رہی تھی "مجھے معاف کردیجیے ثاقب!"
"یہ ممکن نہیں ہے شبنم!" ثاقب کے لہجے میں افسردگی تھی "تم سے محبت کے باوجود میں تمہیں اب بیوی کی حیثیت سے اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتا۔ ساری زندگی یہ احساس مجھے کسی زہریلے سانپ کی طرح ڈستا رہے گا کہ ...." ثاقب کی آواز رندھ گئی۔

"میں آپ کی کنیز بن کر رہ سکتی ہوں۔" شبنم گڑگڑائی۔
"ایسا صرف کہانیوں میں ہو [illegible] شبنم! اب [illegible] میں تمہارے لیے کوئی گنجائش نہیں [illegible] کرکے اپنے کسی گھر والے کو بلا [illegible] سے چلی جاؤ۔ ویسے تم اکیلی بھی جا [illegible] کسی کے ساتھ ہی جاؤ۔ میں آج [illegible] طلاق نامہ تیار [illegible] تمہیں بھجوادوں گا لیکن انجینئر میرے [illegible] نے اسے مجھ سے لینے کی کوئی کوشش [illegible] قانونی قدم اٹھانا چاہا تو یہ تمہارے حق میں برا ہوگا [illegible] چاہتا کہ اس طلاق کا سبب کیا [illegible] کوشش کے بعد میں لوگوں کو سب [illegible] گا، تم رسوا ہوجاؤ گی اور یقین کرو کہ [illegible] رسوا [illegible] چاہتا۔"
روتے روتے شبنم پر غشی طاری ہونے لگی۔



ایک ہفتے میں سارہ کی طبیعت پوری [illegible] سنبھل گئی۔ اسپتال سے اسے گھر جانے کی اجازت مل گئی۔
ثاقب اسپتال میں اس سے [illegible] سارہ سے ملنے وہاں پہنچتا تھا۔ اس [illegible] بھی تھی۔
"مجھے معلوم ہوا ہے کہ آج تم اسپتال سے رخصت ہو رہی ہو؟" ثاقب نے اس سے کہا۔
"ہاں ثاقب!" وہ مغموم نظر آرہی تھی [illegible] یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔ اگر آپ مجھے [illegible] نہ لاتے تو میں مرگئی ہوتی۔"
"یہ کوئی احسان نہیں ہے سارہ [illegible] موت کے قریب پہنچ گئی تھیں تو اس کا واحد ذمے دار [illegible] تھا۔ میری [illegible] وجہ سے یہ نوبت آئی تھی۔ تم نے صرف [illegible] خطرے میں ڈالی تھی۔"
"آپ کے لیے نہیں" سارہ نے آہستہ سے کہا "میں نے جو کچھ کیا، اپنی محبت کے لیے کیا۔"
"تو پھر اپنی محبت کی خاطر ایک کام اور [illegible]"
سارہ سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔
ثاقب نے کہا "شبنم کو میں طلاق دے چکا ہوں۔ ایک ہفتے سے اس چھوٹی سی بچی کو میں بہ مشکل سنبھالے ہوئے ہوں۔ مردوں کے لیے بچوں کو سنبھالنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ کیا تم اسے سنبھالنے کی ذمے داری قبول کرسکتی ہو؟"
سارہ کے ہونٹ لرزنے لگے اور آنکھیں چھلک گئیں۔
یہ دو افراد کی ایک نئی زندگی کا آغاز تھا۔

کایا کلپ

ایچ اقبال

جیل سے رہا ہونے والے ایک ایسے شخص کی روداد جو چھوٹے موٹے جرم کرکے اپنا گزارا کیا کرتا تھا۔ ایک اجنبی حسینہ اس کی اصلاح کرنا چاہتی تھی۔ لیکن نہ چاہتے ہوئے بھی وہ ایک خطرناک گروہ کا آلۂ کار بننے پر مجبور ہوگیا۔ وہ اُسے اپنے ایک خاص مقصد کے لئے استعمال کرنا چاہتے تھے۔

جرم کی کالی دنیا کی فریب کاریاں، جہاں کوئی کسی سے مخلص نہیں ہوتا۔

کیفی نے تین ماہ بعد جیل کے پھاٹک سے نکل کر آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کئی لمبی لمبی سانسیں لیں۔

فروری کا مہینہ تھا لیکن اس وقت دھوپ میں اتنی تمازت تھی کہ کیفی کو اپنے جسم پر کوٹ کچھ گراں گزرنے لگا۔ وہ اس نے اتار کر اپنے شانے پر اس طرح ڈالا کہ وہ انگلی میں پھنسا ہوا اس کی پیٹھ پر لٹکا رہا۔ اس نے اپنے شکن آلود کپڑوں پر اچٹتی سی نظر ڈالی اور قدم بڑھائے۔ اسے کچھ ہی فاصلے پر آسمانی رنگ کی ایک چمکتی ہوئی قیمتی کار دکھائی دی تھی اور اسے اتنا اندازہ بھی ہوگیا تھا کہ اس کی ڈرائیونگ سیٹ پر کوئی عورت یا لڑکی بیٹھی ہوئی ہے جس کی آنکھوں پر تاریک شیشوں کا چشمہ ہے۔

کیفی اس طرح آگے بڑھنے لگا کہ اس کار کے قریب سے گزر سکے۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ کیسی تھی۔ عام نوجوانوں کی طرح یہ اس کی فطرت میں بھی داخل تھا کہ آس پاس سے گزرتی ہوئی لڑکیوں کو اگر براہِ راست نہیں تو کن انکھیوں سے ضرور دیکھ لیتا تھا۔

جب وہ کار کے قریب سے گزرا تو اس نے دیکھ لیا کہ وہ کوئی عورت نہیں، لڑکی ہی تھی۔ اس کی عمر اکیس بائیس سال سے زیادہ معلوم نہیں ہوتی تھی۔ میک اَپ سے قطعی بے نیاز ہونے کے باوجود وہ خوب صورت نظر آرہی تھی۔ سیاہ چشمے نے اسے اور زیادہ دلکش بنادیا تھا۔ کار میں وہ اکیلی ہی تھی۔

جیل کے قریب یہ کیا کررہی ہے؟ کیفی سوچتا ہوا کار سے آگے نکلا ہی تھا کہ عقب سے آواز آئی "ذرا سنو!" آواز نسوانی ہی تھی۔ کیفی چونک کر رکا۔ اس نے خود مڑے بغیر سر گھما کے پیچھے دیکھا۔ لڑکی کار کی کھڑکی سے سر نکالے اسی کی طرف دیکھ رہی تھی لیکن کیفی کو خیال آیا کہ لڑکی کسی اور سے مخاطب ہوگی! کیفی نے اپنے آگے دیکھا لیکن اسے کوئی نظر نہیں آیا۔

"میں تم ہی سے مخاطب ہوں!" لڑکی کی آواز میں مترنم ہنسی بھی شامل ہوگئی۔

کیفی کار سے چند ہی قدم آگے نکلا تھا۔ وہ مڑ کر حیرت زدگی کے عالم میں کار کی کھڑکی کے قریب پہنچ گیا اور سوالیہ نظروں سے لڑکی کی طرف دیکھنے لگا۔

"میرا نام ماہین ہے۔" لڑکی نے مسکراتے ہوئے بتایا پھر پوچھا "تم آج ہی... میرا مطلب ہے، ابھی جیل سے رہا ہوئے ہونا؟"

"اگر ہوا ہوں تو تمہیں اس سے کیا؟" کیفی خشک لہجے میں بولا "تمہیں کیا مطلب؟"

"مطلب ہے، جبھی تو پوچھ رہی ہوں۔" لڑکی کی مترنم ہنسی پھر سنائی دی۔

"کیا مطلب ہے؟" کیفی اسے گھورتا رہا۔

"تمہارا نام کیفی ہے نا؟" وہ بولی۔

کیفی حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"ٹھیک ہے۔" ماہین مسکرائی "مجھے جواب مل گیا۔ تمہارے چہرے سے ظاہر ہوگیا کہ تم مجھ سے اپنا نام سن کر حیران ہوئے ہو۔" ماہین نے اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا "مجھے تمہاری رہائی کا یہی وقت بتایا گیا تھا۔"

کیفی کا ذہن الجھنے لگا۔ لڑکی کی باتیں اس کے فہم و ادراک سے بالا تھیں۔ ماہین پھر بولی "تم چوری کا خمیازہ بھگت کر جیل سے رہا ہوئے ہونا؟"

کیفی نے بگڑ کر کہا "تمہیں ان سب باتوں سے کیا مطلب؟"



"مطلب تو ہے۔" ماہین نے زور دے کر کہا "اسی لیے تو مجھے تمہارا نام معلوم ہے اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تم جیل سے کس وقت نکلو گے!..... خیر! تم کار میں آجاؤ۔ تفصیل سے گفتگو ہم راستے میں کرلیں گے۔ میں تمہیں وہیں پہنچادوں گی جہاں تمہیں جانا ہے۔"

کیفی متذبذب رہا۔ یہ سمجھ میں آنے والی بات تھی بھی نہیں کہ اس جیسے معمولی جرائم پیشہ شخص پر ایک ایسی لڑکی مہربان ہوجائے جو یقینی طور پر کسی امیر گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔

"آؤ!" ماہین نے دوبارہ کہا اور اپنے بائیں جانب جھک کر اپنے پہلو کی سیٹ کا دروازہ تھوڑا سا کھول دیا "جمیلہ بڑی بے چینی سے تمہارا انتظار کررہی ہوگی!"

کیفی کو پھر حیرت کا جھٹکا لگا۔ جمیلہ اس کی بیوی کا نام تھا۔

"آؤ نا کیفی!" ماہین سنجیدہ ہوگئی "تم ایک مضبوط جسم کے بہت دلیر آدمی ہو! یہ تو مجھے سوچنا بھی نہیں چاہیے کہ تم مجھ جیسی لڑکی سے خوف زدہ ہوسکتے ہو!"

"تم میری بیوی کو کیسے جانتی ہو؟" کیفی اسے گھورنے لگا۔

ماہین نے اِدھر اُدھر دیکھ کر سنجیدگی سے کہا "یہ بہت نامناسب ہے کیفی کہ تم اس طرح کھڑے کھڑے مجھ سے باتیں کرتے رہو۔ یہاں بڑی حد تک سناٹا ہی ہے لیکن دور سے دیکھنے والوں کے لیے بھی یہ بڑی عجیب بات ہوگی کہ میں اپنی کار میں بیٹھی، جیل سے رہا ہونے والے ایک شخص سے باتیں کررہی ہوں۔ تم کار میں آجاؤ۔ میں تمہاری ہر الجھن دور کردوں گی۔ تمہیں ہر بات کا جواب دے دوں گی۔"

کیفی نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی پھر الجھے ہوئے ذہن کے ساتھ کار میں آبیٹھا۔ اس کی وہ جسمانی حرکت ایسی تھی جیسے اس میں اس کے ارادے کو قطعی دخل نہ ہو۔

ماہین نے فوراً انجن اسٹارٹ کیا اور کار حرکت میں لے آئی۔

ماہین مسکرائی "تمہارا نام بہت اچھا ہے۔ تم جس طبقے سے تعلق رکھتے ہو، اس طبقے میں نام عموماً بگاڑ دیے جاتے ہیں۔ رشید، شیدا بن جاتا ہے۔ صلاح الدین، صلو بن جاتا ہے۔ تمہارا نام کیف الرحمٰن ہے جو بگڑ کر کیفی بن گیا لیکن کیفی، بگڑا ہوا نام نہیں لگتا۔"

کیفی کو ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ خشک لہجے میں بولا "تم مجھے اور میری بیوی کو کیسے جانتی ہو؟"

ماہین سنجیدہ ہوگئی "تم اصل موضوع کی طرف آنے کے لیے بہت بے چین ہو۔ خیر! میں خود بھی اس موضوع سے بچنا نہیں چاہتی۔ میں تمہیں آخر کیوں نہیں بتاؤں گی کہ میں تمہیں اور تمہاری بیوی کو کیسے جانتی ہوں لیکن پہلے کچھ اور بھی بتاؤں گی۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تمہیں غلط راہوں پر چلے ہوئے ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ چار سال پہلے جب تمہاری شادی ہوئی تھی تو تم ایک ٹیکسٹائل مل میں ملازم تھے۔ تمہارا چال چلن بالکل ٹھیک تھا لیکن اب سے ڈھائی سال پہلے تمہیں ایک خراب ماحول مل گیا۔ تمہاری دوستی کچھ ایسے لوگوں سے ہوگئی جو ہمیشہ قانون کو مطلوب رہے ہیں۔ ان لوگوں کے ساتھ رہتے رہتے تم بھی غلط راہوں پر چل نکلے۔ تم نے ملازمت چھوڑ دی اور ایسے کام کرنے لگے جن میں کم محنت کرکے زیادہ حاصل ہوجاتا ہے یا یہ کہ محنت کیے بغیر ہی حاصل ہوجاتا ہے مگر قانون وہ کام کرنے کی اجازت کسی کو نہیں دیتا۔ تم نے دو سال میں ایسے بہت سے کام کیے ہیں لیکن یہ تمہاری خوش قسمتی ہے کہ تم دو سال میں صرف دو ہی مرتبہ قانون کی گرفت میں آئے اور دونوں مرتبہ معمولی جرائم پر گرفت میں آئے۔ اسی لیے پہلی مرتبہ بھی تمہیں تین ماہ کی سزا ہوئی تھی اور آج بھی تم تین ہی ماہ کی سزا کاٹ کر جیل سے نکلے ہو۔"

کیفی خاموش بیٹھا رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ لڑکی اس سے اس قسم کی باتیں کیوں کررہی تھی!

"کیفی!" ماہین پھر بولی "میں چاہتی ہوں کہ تم یہ سب کچھ چھوڑ دو اور پھر ایک اچھے انسان بن جاؤ جیسے پہلے تھے۔"

"اچھا انسان!" کیفی نے ناگواری سے اس کی طرف دیکھا "جب میں ویسا انسان تھا نا، مجھے اپنی تنخواہ ملنے کے بیس دن بعد ہی لوگوں سے قرضہ لینے کی ضرورت پڑنے لگتی تھی۔"

"انسان اگر ایمان داری سے محنت کرتا رہے تو اپنی زندگی کے ان مشکل حالات سے نکل ہی جاتا ہے۔"

"مجھے اتنی محنت کی ضرورت نہیں ہے۔" کیفی نے منہ بنایا۔

"تم ضرور محنت کرتے کیفی! ضرور محنت کرتے۔" ماہین نے زور دے کر کہا "بس گڑبڑ یہ ہوئی کہ تم بُرے ماحول میں پڑ گئے ورنہ کبھی جیل نہ گئے ہوتے، میں تمہیں اس برے ماحول سے نکالنا چاہتی ہوں۔"

"تم نے ٹھیکا لیا ہے زمانے بھر کا؟"

"نہیں۔" ماہین مسکرائی "میں تن تنہا زمانے بھر کا ٹھیکا نہیں لے سکتی۔ میں نے صرف تمہارا ٹھیکا لیا ہے۔ میں صرف ایک ہی مثال قائم کرنا چاہتی ہوں۔ میں صرف تم کو صحیح راہ پر لانا چاہتی ہوں۔ میں ثابت کرنا چاہتی ہوں کہ بُرے

ماحول میں پڑے ہوئے انسان کو واپس اچھے ماحول میں لایا جاسکتا ہے کیونکہ کوئی بھی پیدائشی طور پر بُرا انسان نہیں ہوتا۔ صرف حالات اور ماحول ہی انسان کو غلط راہوں پر لے جاتے ہیں۔"

کیفی نے ناگواری سے اس کی طرف دیکھا "تم مجھے اور میری بیوی کو کیسے جانتی ہو؟"

"میں نے جیل میں سزائیں کاٹنے والوں کی کئی فائلیں پڑھی تھیں۔" ماہین نے سنجیدگی سے بتایا "ان میں سے مجھے کسی ایک آدمی کا انتخاب کرنا تھا جسے میں غلط راہوں سے واپس لاسکوں۔ یہ محض اتفاق ہے کہ میں نے تمہارا انتخاب کیا۔ تمہاری فائل سے ہی مجھے تمہارا پتا معلوم ہوا۔ میں تمہارے گھر گئی اور تمہاری بیوی جمیلہ سے ملی۔ تمہاری بیوی بہت اچھی ہے کیفی! اس نے مجھے تمہارے بارے میں بہت کچھ بتایا۔ وہ تم سے محبت کرتی ہے۔ وہ فاقے کرکے بھی تمہارے ساتھ خوش رہ سکتی ہے لیکن یہ دکھ نہیں سہنا چاہتی کہ اس کی شناخت ایک جرائم پیشہ شخص کی بیوی کی حیثیت سے ہو۔"

"تم آخر چاہتی کیا ہو؟" کیفی نے جھنجلا کر کہا۔

"بتا تو چکی ہوں۔" ماہین مسکرائی "میں تمہیں ایک اچھا انسان بنانا چاہتی ہوں اور تمہیں تمہارے بُرے دوستوں سے دور کرنا چاہتی ہوں۔"

"کیوں چاہتی ہو تم ایسا؟ میں کیا لگتا ہوں تمہارا؟"

"جو رشتہ انسان سے انسان کا ہوتا ہے' وہی رشتہ ہے تم سے میرا۔"

"صرف مجھ سے ہی کیوں ہے؟"

"صرف تم سے نہیں ہے' سب انسانوں سے ہے لیکن میں نے ابھی کہا تھا نا کہ میں تن تنہا تو ساری دنیا سے برائی ختم نہیں کرسکتی۔ میں صرف تمہاری ہی ایک مثال دنیا کے سامنے رکھنا چاہتی ہوں۔ میں ثابت کرنا چاہتی ہوں کہ اگر بڑی سطح پر کوششیں کی جائیں تو دنیا سے برائی اگر ختم نہ بھی ہو تو بہت کم ضرور ہو جائے گی۔"

"میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ اصل چکر کیا ہے!" کیفی نے ماہین کو گھورتے ہوئے کہا "تم اصل میں چاہتی کیا ہو؟"

"میں اس بات پر افسوس کا اظہار نہیں کروں گی کہ تم نے میری باتوں کو جھوٹ سمجھا اور مجھے شک کی نگاہ سے دیکھ رہے ہو! تم ایسے ہی ماحول میں پڑ چکے ہو کہ ایسی باتوں پر تمہیں شک ضرور ہوگا لیکن میں کوشش جاری رکھوں گی کہ تمہارے سوچنے کا یہ انداز بدل سکوں۔"

"اس سے تمہیں کیا فائدہ ہوگا؟"

"مجھے اس سے جو فائدہ ہوگا' میں تمہیں اس کے بارے میں بھی بتادیتی لیکن وہ بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی۔ اگر تم تعلیم یافتہ ہوتے تو میری وہ باتیں ضرور سمجھ لیتے لیکن تم نے صرف آٹھویں جماعت تک تعلیم حاصل کی ہے۔"

"سب کچھ معلوم کرچکی ہو میرے بارے میں!" کیفی بڑبڑایا۔

"ہوں۔" ماہین کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔

کیفی سوچنے لگا کہ یہ کوئی گہرا چکر معلوم ہوتا ہے' یہ لڑکی کسی خاص وجہ سے اس کے پیچھے لگی ہے۔ اسے پتا لگانا چاہیے کہ یہ چکر ہے کیا؟

"تو!" کیفی نے ماہین کی طرف دیکھا "تم مجھے کس طرح اچھا انسان بناؤ گی؟"

"اب تم اصل معاملے کی طرف آئے ہو!" ماہین مسکرائی "میں نے اسی لیے کار کی رفتار کم رکھی ہے کہ تمہارا گھر آنے سے پہلے بہت سی باتیں ہو جائیں!"

کیفی سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

"میں چاہتی ہوں کہ تم اپنے اس ماحول سے نکل آؤ۔" ماہین نے کہا۔

"اور فاقے کروں!" کیفی طنزیہ انداز ہنسا "میری بیوی اگر فاقے کرنا چاہتی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ مجھے بھی فاقے کرنا اچھا لگے گا۔"

"تم نے مجھے اپنی بات مکمل کرنے نہیں دی۔" ماہین نے سنجیدگی سے کہا "میں جانتی ہوں کہ اگر تم اس ماحول سے نکل کر شرافت کی زندگی گزارنا چاہو گے تو تمہیں بہت زیادہ مشکلات پیش آئیں گی۔ یہ ہمارے معاشرے کا المیہ ہے کہ ایسے لوگوں کے لیے راستے بند کردیے جاتے ہیں۔ سزایافتہ شخص کو کہیں ملازمت بھی نہیں ملتی لیکن ایسے لوگ کوئی چھوٹا موٹا کاروبار کرکے بھی تو اپنی ایک نئی زندگی شروع کرسکتے ہیں۔"

"تو میں کاروبار کروں؟" کیفی نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"کیوں؟ کیا حرج ہے اس میں؟"

"دیکھو میم صاحب!" کیفی نے منہ بنایا "جب تم نے میرے بارے میں سب کچھ معلوم کرلیا ہے تو تمہیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ میں نے کوئی بہت بڑے بڑے ڈاکے نہیں ڈالے! میں نے اتنا روپیا جمع نہیں کیا ہے کہ اس سے کوئی کاروبار شروع کرسکوں!"

"مجھے یہ تو نہیں معلوم کہ تمہارے پاس کتنا روپیا ہے لیکن یہ ضرور جانتی ہوں کہ تم نے روپیا اڑایا بہت ہے۔ شراب تم پیتے ہو' جوا تم کھیلتے ہو اور مزے کی بات یہ ہے کہ جوے میں عموماً ہارتے ہو لیکن جوا کھیلنے سے باز نہیں آتے۔ خیر چھوڑو! ان باتوں سے کوئی فائدہ نہیں کہ تم کیا کرتے رہے ہو۔ میں فرض کیے لیتی ہوں کہ تمہارے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ ایسی صورت میں یہ ہوسکتا ہے کہ کوئی چھوٹا موٹا کاروبار کرنے کے لیے روپیا تم مجھ سے لے لو۔"

کیفی چونکا اور ماہین کو غور سے دیکھنے لگا۔

"میں بالکل سنجیدگی سے بات کررہی ہوں۔" ماہین نے اسے ایک مرتبہ کن انکھیوں سے دیکھ کر کہا "لیکن ایک تو یہ کہ میں تمہیں کوئی بہت بڑی رقم نہیں دوں گی اور دوسرے یہ کہ جو کچھ دوں گی' وہ قرض نہیں دوں گی۔ میں ایک ایسے باپ کی بیٹی ہوں کہ تمہیں بڑا سرمایہ بھی فراہم کرسکتی ہوں لیکن یہ میں اس لیے نہیں کروں گی کہ اس طرح تمہیں زیادہ محنت نہیں کرنا پڑے گی اور تمہیں زندگی کی اونچ نیچ کا تجربہ بھی نہیں ہوسکے گا۔ تمہاری ناتجربہ کاری کی وجہ سے وہ سارا سرمایہ ڈوب بھی سکتا ہے۔ میں تمہیں بس اتنا ہی روپیا دوں گی کہ تم کسی معمولی کاروبار سے آغاز کرو۔ قرض اس لیے نہیں دوں گی کہ وہ معمولی کاروبار بھی تمہاری ناتجربہ کاری کے باعث ختم ہوسکتا ہے۔ اس طرح تم پر قرض کا بوجھ ہوجائے گا۔ میں تمہیں جو روپیا دوں گی وہ اس شرط پر ہوگا کہ میں بھی اس کاروبار میں برابر کی شریک ہوں گی۔ روپیا میرا ہوگا اور محنت تمہاری ہوگی۔ نفع نقصان میں ہم برابر کے شریک ہوں گے۔ اگر روپیہ ڈوب گیا تو اس سے تمہیں کچھ تجربہ ضرور حاصل ہوجائے گا۔ اس کے بعد میں تمہیں مزید کچھ رقم دوں گی اور مجھے امید ہے کہ پہلی بار کا تجربہ تمہیں دوسری مرتبہ ناکامی سے ضرور بچائے گا۔"

"کتنا روپیا دو گی؟"

ماہین ہنس پڑی "تمہارے دل میں تو ابھی سے کھوٹ آگیا کیفی! یہ سب کچھ تو میں نہیں چلنے دوں گی۔"

چالاک بھی ہے' کیفی نے سوچا۔

"تمہارا گھر قریب آگیا ہے۔" ماہین نے کہا "اب ہم زیادہ باتیں نہیں کرسکتے۔ آج تم میری باتوں پر سنجیدگی سے غور کرنا۔ کل میں تم سے پھر ملوں گی۔ کل دوپہر کو میں خود تمہارے گھر آؤں گی۔"

ماہین نے رفتار کم کرنا شروع کردی تھی۔ آخر اس نے بریک لگا کے کار روک دی۔ وہ متوسط اور غریب طبقے کی ملی جلی آبادی تھی۔ کیفی کار سے اُتر گیا۔

"کل دوپہر کو میرا انتظار کرنا' کہیں غائب نہ ہوجانا۔" ماہین نے اسے تاکید کی اور کار حرکت میں لے آئی۔



کیفی کے گھر کے دو دروازے تھے۔ پچھلی طرف کا دروازہ صحن میں کھلتا تھا۔ کیفی اس دروازے میں ہمیشہ تالا ڈالے رکھتا تھا۔ چابی اسی کی جیب میں رہتی تھی۔ رات گئے' وقت بے وقت وہ ادھر ہی سے اپنے گھر میں آجایا کرتا تھا۔ اس وقت بھی وہ اسی راستے سے گھر میں داخل ہوا اور سب سے پہلے اس کا سامنا اپنے سسر سے ہوا جسے محلے کے لوگ دینو کاکا کہا کرتے تھے۔

"آگیا تو؟" دینو کاکا اسے گھورتا ہوا بولا "وہی چھوڑ گئی ہے نا تجھے کار والی؟ وہ بہت اچھی لڑکی ہے کیفی! اس کی باتیں تیری سمجھ میں آگئیں تو تیری زندگی سدھر جائے گی۔"

"تو وہ تم سے بھی مل چکی ہے؟" کیفی نے پُرخیال نظروں سے دینو کاکا کی طرف دیکھا۔

"ہاں۔ مجھ سے بھی مل چکی ہے' تیری بیوی سے بھی مل چکی ہے۔ میں نے ابھی جو کچھ کہا' وہ تیری سمجھ میں آیا کہ نہیں؟"

"جمیلہ کہاں ہے؟"

"نہا رہی ہے.... تو میری بات کا جواب دے!"

"تم میرے معاملوں میں زیادہ دخل دینا چھوڑ دو بابو جی!" کیفی نے بگڑ کر کہا۔

"وہ تو میں دوں گا۔ جب تک دخل نہیں دینا چاہیے تھا' نہیں دیا۔ میں تیرے گھر میں رہتا ہوں تو اس لیے نہیں رہتا کہ میں نے ڈھٹائی لادلی ہے اپنے اوپر! جمیلہ کی ماں کے مرنے کے بعد میں اکیلا ہی رہا کرتا تھا لیکن جب تیرے لچھن بگڑے تو اپنی بٹی کی وجہ سے یہاں آکر رہنے لگا۔ کوئی تو ہو اس کرموں جلی کی دیکھ بھال کرنے والا۔ میں یہاں مفت کی روٹیاں بھی نہیں توڑتا ہوں۔ اپنی آدھی سے زیادہ تنخواہ جمیلہ ہی کے ہاتھ پر رکھتا ہوں۔ تجھے معلوم ہے۔"

دینو کاکا کسی فیکٹری میں ملازم تھا۔

"اور کچھ بھی کہنا ہے؟" کیفی صحن میں لگے بیری کے درخت سے ٹیک لگا کر کھڑا ہوگیا اور دینو کاکا کی طرف دیکھنے لگا۔

"مجھے زیادہ کچھ نہیں کہنا۔ سمجھا سمجھا کر تھک گیا ہوں۔ بس ایک بات کہنا ہے۔ کیا نام ہے اس کا؟ منیرے سے دوستی چھوڑ دے! اور اگر نہیں چھوڑ سکتا تو یہاں نہ بلایا کر اسے! کہیں اور مل لیا کر جا کے۔"

"کیوں؟" کیفی کی پیشانی پر بل پڑ گئے "وہ میرا دوست ہے۔ کیوں نہ بلاؤں اسے یہاں؟"

"بس میری زبان نہ کھلوا۔ جو کہہ دیا ہے' اسے گرہ میں باندھ لے۔"

"وہ تو آئے گا یہاں!" کیفی سر جھٹک کر بولا۔

"آئے گا تو مجھ سے اپنی ٹانگیں تڑوائے گا۔"

"تو پھر مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا!" کیفی نے تیز لہجے میں کہا۔

"کیوں!" دینو کاکا کا لہجہ بھی تیز ہوگیا "بہت بڑا غنڈا سمجھنے لگا ہے تو اپنے آپ کو!.... قتل کردے گا مجھے؟ چل یہ بھی کرلے' چڑھ جا پھانسی پر' کردے میری بٹی کو بیوہ! تجھ جیسے آدمی سے جان تو چھوٹ جائے گی اس کی! کرلے گی کہیں نوکری' اپنے بچے کو بھی پال لے گی۔"

کیفی کا دو سال کا ایک بیٹا تھا۔

اسی وقت صحن میں بنے ہوئے غسل خانے سے جمیلہ اپنے بالوں پر ایک میلا سا تولیا باندھے باہر نکلی اور تیزی سے کیفی کی طرف آئی پھر کیفی کا بازو پکڑ کر اسے کمرے کے دروازے کی طرف لے جانے لگی۔

"اپنے باپ کو سمجھا لے جمیلہ!" کیفی نے کہا "الٹی سیدھی سننے کی عادت نہیں ہے مجھے!"

"کیا کرلے گا تو؟" دینو کاکا تیز لہجے میں بولا "ابھی کہہ تو چکا ہوں کہ مجھے قتل کرنا چاہتا ہے تو یہ بھی کرڈال!"

"اب چپ بھی ہوجاؤ بابو جی!" جمیلہ نے اپنے باپ سے کہا "میں سمجھالوں گی انہیں!"

"تو سمجھائے گی؟" دینو کاکا نے طنزیہ لہجے میں کہا "تجھے سمجھانا آتا تو یہ ایسے گندے راستوں پر نہ جاتا۔"

کیفی نے پلٹ کر کوئی سخت بات کہنا چاہی تھی لیکن جمیلہ اسے کمرے میں گھسیٹ لے گئی۔

کمرے میں دو پلنگ تھے۔ ایک پلنگ پر دو سال کا بچہ لیٹا سو رہا تھا۔

"طبیعت تو ٹھیک ہے نا اس کی؟" کیفی نے اسی پلنگ پر بیٹھ کر محبت سے بچے کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔

"اس کی طبیعت کو کیا ہونا ہے!" جمیلہ نے کہا "سب کچھ بھول کر بس اسی کا تو خیال رکھتی ہوں میں .... تم بابو جی سے مت الجھا کرو۔ بڑھاپے میں ان کا مزاج بہت تیز ہوگیا ہے۔ اماں کے مرنے کے بعد چڑچڑے بھی ہوگئے ہیں۔ وہ کہاں ہے؟ کار والی باجی؟"

"اچھا!" کیفی طنزیہ انداز میں ہنسا "رشتے بھی بنا لیے گئے ہیں؟"

"سچ کہتی ہوں' وہ بہت اچھی ہیں۔ بڑی اچھی باتیں کرتی ہیں۔"

"کون سی اچھی باتیں؟ ذرا میں بھی سنوں!"

"پہلے تم جاکے منہ ہاتھ دھولو۔ بابو جی تو کمرے میں چلے گئے ہوں گے۔ میں تمہارے لیے چائے بناتی ہوں۔ تھوڑی دیر میں کھانا بھی پک جائے گا۔ چائے بنالاؤں تو پھر بتاؤں گی تمہیں کار والی باجی کی باتیں!"

"چائے نہیں پینی مجھے' بیٹھ جا۔ مجھے اپنی کار والی باجی کے بارے میں بتا! وہ آخر چاہتی کیا ہے؟"

"تمہیں وہی چھوڑ گئی ہے نا؟"

"تو میرے سوال کا جواب دے۔"

"وہ تمہیں اچھا انسان بنانا چاہتی ہے۔"

"میں برا انسان ہوں؟" کیفی نے آنکھیں نکالیں۔

"نہیں نہیں' یہ مطلب تھوڑی تھا میرا!" جمیلہ گھبرا کے بولی "بس وہ کام برے ہیں جو تم کرنے لگے ہو۔ جب ہماری شادی ہوئی تھی تو ہم بڑی تنگی سے رہتے تھے لیکن یہ سب مصیبت تو نہیں تھی۔ جب دیکھو' پولیس چلی آرہی ہے گھر پر!

تمہیں دو مرتبہ سزا بھی ہوئی!"
لیکن خاصی پوچھ گچھ کے باوجود کیفی کو جمیلہ سے بھی ماہین کے بارے میں تسلی بخش معلومات حاصل نہیں ہو سکیں! جمیلہ چار پانچ جماعتیں پڑھی ہوئی سیدھی سادی لڑکی تھی۔ ماہین نے اسے اپنے بارے میں اگر کچھ بتایا بھی تھا تو وہ سمجھ نہیں سکی تھی۔ کیفی کی پوچھ گچھ کے جواب میں اس نے بہت کچھ کہا مگر اس کی ساری باتوں کا لب لباب بس اتنا ہی تھا کہ ماہین ایک بڑے گھر کی بہت اچھی لڑکی تھی جو برے لوگوں کو اچھا بنانا چاہتی تھی۔

○☆○

"تم بالکل خبطی ہوگئی ہو ماہین!" شہاب بہت جھنجلائے ہوئے انداز میں بولا "ایک ہفتے سے تو تم اس کے گھر کے چکر لگا رہی تھیں۔ آج اسے لینے کے لیے جیل بھی پہنچ گئیں اور اسے اس کے گھر پہنچانے بھی گئیں!"
"میں نے جو کچھ لکھا ہے' اسے ثابت کرکے رہوں گی شہاب!" ماہین نے سنجیدگی سے پوچھا۔
"مجھے تو اب ڈیڈی پر بھی غصہ آرہا ہے۔ انہوں نے تمہیں سزا یافتہ قیدیوں کی فائلیں دیکھنے کا موقع فراہم ہی کیوں کروایا؟"
"اس لیے کہ انکل کو میرے نظریے سے اتفاق ہے۔ ڈی آئی جی پولیس ہونے کے باوجود انہیں جرائم پیشہ لوگوں کے سلسلے میں حکومت کی پالیسیوں سے اتفاق نہیں اور وہ معاشرے کے اس رویے کو بھی ٹھیک نہیں سمجھتے جو برائیوں کے مزید پھلنے پھولنے کا راستہ ہموار کرتا ہے۔"
"تمہارے نظریے سے ڈیڈی کے اتفاق کا یہ مطلب نہیں کہ تم خود کو ایسے خطرات میں ڈالو۔ مجھے حیرت ہے کہ تم اس شخص کو کار میں اپنے ساتھ لے گئیں۔ تمہیں اس سے بالکل ڈر نہیں لگا؟"
"ڈر!" ماہین ہنس پڑی "وہ ایک انسان ہے شہاب' کوئی عفریت نہیں ہے کہ میں اس سے ڈرتی!"
"اس قسم کے انسان کسی عفریت سے بھی زیادہ خطرناک ثابت ہوسکتے ہیں' خصوصاً لڑکیوں کے معاملے میں!"
"خیر اس طرف سے تو میں نے اطمینان حاصل کرلیا تھا۔" ماہین نے جواب دیا "اس کی فائل میں یہ اندراج موجود ہے کہ وہ خوب صورت لڑکیوں یا عورتوں کو گھورتا ضرور ہے لیکن اس سے زیادہ اس نے کبھی کچھ نہیں کیا۔ کسی پر کبھی کوئی فقرہ تک نہیں کسا۔"
"اگر اس نے اب تک کچھ نہیں کیا تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ آئندہ بھی کچھ نہیں کرے گا۔" شہاب کی جھنجلاہٹ ختم نہیں ہورہی تھی۔
"اگر اس نے میرے ساتھ کوئی بدتمیزی کی تو اسے اس کا خمیازہ بھی بھگتنا پڑے گا۔ میں اب کوئی عام سی لڑکی تو ہوں نہیں شہاب! میں تربیت کے آخری مراحل سے گزر رہی ہوں۔ کچھ ہی عرصے بعد میں خود محکمۂ پولیس کی مشینری کا ایک پرزہ بن جاؤں گی۔"
"تمہارا یہ شوق بھی مجھے ایک آنکھ نہیں بھایا!"
"دونوں آنکھوں سے دیکھتے ہونا!" ماہین ہنس کر بولی "ایک آنکھ بند کرکے دیکھو' بھا جائے گا۔"
"میں ڈیڈی سے صاف صاف کہنے والا ہوں کہ میں ایک پولیس والی سے ہرگز شادی نہیں کروں گا۔"
"تمہارے تو فرشتے بھی کریں گے۔ ہتھکڑیاں تو میرے پاس ہوں گی جناب شہاب صاحب! جب چاہوں گی' آپ کی کلائیوں میں پہنادوں گی۔"
"ایسی کی تیسی ہتھکڑیوں کی۔" شہاب نے کہا اور غصے میں بہت تیزی سے چلتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔
ماہین اس وقت اپنے کمرے میں تھی۔ شہاب نے وہیں آکر اس پر برسنا شروع کیا تھا۔ وہ دونوں چچا زاد ہونے کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے کے منگیتر بھی تھے۔ ایک دوسرے سے محبت بھی کرتے تھے اسی لیے ماہین مطمئن بھی رہی۔ اس کے معاملے میں شہاب کا غصہ دیرپا نہیں ہوتا تھا۔
ماں کے سایوں سے وہ دونوں ہی محروم تھے۔ ماہین کے والد کو شکار کا شوق جنون کی حد تک تھا۔ اسی شوق کی وجہ سے وہ عموماً گھر پر نہیں رہتے تھے۔ بیٹی کی طرف سے انہیں اطمینان رہتا تھا۔ بڑے بھائی اور بھتیجے پر وہ بے انتہا اعتماد کرتے تھے۔ ورثے میں دونوں بھائیوں کو اتنا کچھ ملا تھا کہ زندگی آسودگی سے گزر سکتی تھی۔ اسی لیے ماہین کے والد کو کچھ کرنے دھرنے کا خیال کبھی نہیں آیا اور وہ اپنے شکار کے شوق میں پڑے رہے۔ اس کے برخلاف شہاب کے والد احمد رضا نے پولیس میں ملازمت کرلی تھی۔ وہ ان کا ایک شوق بھی تھا۔ اپنی ذمے داریاں انہوں نے ہمیشہ بڑی خوش اسلوبی سے پوری کی تھیں اسی لیے ڈی آئی جی کے عہدے تک پہنچنے میں انہیں زیادہ عرصہ نہیں لگا تھا۔
ماہین ایک شکاری باپ کی بیٹی تھی لیکن پولیس میں جانے کا شوق اسے اپنے چچا کی طرف سے ملا تھا۔ اس کا دوسرا شوق افسانہ نگاری تھا۔ وہ کوئی نامور افسانہ نگار تو نہیں بن سکی تھی لیکن اس نے اتنے افسانے لکھ ڈالے تھے

کہ اب انہیں کتابی شکل بھی دی جاسکتی تھی۔ ایک ڈیڑھ مہینے پہلے اس کا ایک افسانہ اسی موضوع پر شائع ہوا تھا کہ برے لوگوں کو واپس صحیح راستے پر لانا ہرگز ناممکن نہیں! بعض لوگوں نے اس افسانے پر تنقید کرتے ہوئے اسے "ان نیچرل" قرار دیا تھا جس پر ماہین کسی نہ کسی حد تک آپے سے باہر ہوگئی تھی۔ اس نے تہیہ کرلیا تھا کہ وہ اپنے افسانے کو نیچرل ثابت کر کے رہے گی۔ اس نے اپنے چچا احمد رضا سے بات کی تھی۔ وہ بھی اپنی بھتیجی کے نظریے سے متفق تھے لہٰذا انہوں نے ماہین سے تعاون کیا۔ اس کے کہنے سے انہوں نے جیلر کو فون کردیا۔ ماہین نے جاکر جیلر سے ملاقات کی، اس سے قیدیوں کے بارے میں معلومات حاصل کیں اور پھر خود بھی کچھ قیدیوں کی فائلیں دیکھنے کے بعد ان میں سے کیفی کا انتخاب کیا۔

ایک ہفتے پہلے وہ کیفی کے گھر جاکے اس کی بیوی جمیلہ اور جمیلہ کے باپ دینو کاکا سے مل چکی تھی۔ اس نے اپنی باتوں سے ان دونوں ہی کو اپنا گرویدہ بنالیا تھا۔ اس نے انہیں اپنے افسانے کے بجائے یہ بتایا تھا کہ وہ ایک ایسی انجمن سے تعلق رکھتی ہے جو جرائم پیشہ لوگوں کی اصلاح کے لیے کام کررہی ہے۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ جمیلہ اس کی بات بالکل نہیں سمجھ سکی تھی لیکن دینو کاکا نے تعلیم یافتہ نہ ہونے کے باوجود بات سمجھ لی تھی۔ وہ بہرحال مرد تھا اور مرد گھر سے باہر نکلتا ہے تو اس کی معلومات کچھ نہ کچھ بڑھ ہی جاتی ہیں۔ دوسرے یہ کہ دینو کاکا کی عمر بھی پینسٹھ سال سے زیادہ تھی۔ عمر کا تجربہ بھی اس کے ساتھ تھا۔ اس کے بچے تو سات ہوئے تھے لیکن ابتدائی چھ مرگئے تھے۔ ساتویں جمیلہ زندہ بچی تھی جو اس کی ساتویں ہی اولاد تھی۔ جمیلہ کی شادی کے چھ ماہ بعد دینو کاکا کی بیوی کا انتقال ہوگیا تھا۔ اس کے بعد دینو کاکا اسی بستی کے ایک گھر میں اکیلا ہی رہا کرتا تھا لیکن جب کیفی غلط راہوں پر چل نکلا اور جمیلہ راتوں کو بھی اکیلی رہنے لگی تو دینو کاکا کیفی کے گھر میں آکر رہنے لگا۔

جمیلہ بہت خوب صورت تو نہیں لیکن خاصی اچھی شکل کی اور نہایت متناسب الاعضا تھی۔



جمیلہ کے لیے منیرے کے دل میں کھوٹ تھا۔ جمیلہ کو دیکھتے ہوئے اس کی آنکھوں سے جو تاثر امنڈتا تھا، وہ تجربہ کار دینو کاکا کی نظروں سے چھپا نہیں رہ سکا تھا۔ جن دنوں کیفی جیل میں تھا، منیرے نے شام کے وقت گھر آکے جمیلہ سے بہت ڈھکے چھپے انداز میں ایسی باتیں کی تھیں کہ اسے اس کے شوہر کے خلاف اکسا سکے۔ دینو کاکا نے وہ باتیں سن لی تھیں اور منیرے پر بہت بری طرح برس پڑا تھا۔ اس نے منیرے سے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ وہ اس کے گھر میں کبھی نہ آئے۔

منیرے کو کیفی کی رہائی کے دن کا علم تھا لیکن دل میں چور ہونے کی وجہ سے وہ کیفی کو لینے جیل بھی نہیں گیا تھا اور دن بھر اپنے گھر سے بھی غائب رہا تھا۔ وہ سوچتا رہا تھا کہ دینو کاکا نے کیفی سے اس کے بارے میں نہ جانے کیا کیا کہا ہوگا!

شام کو وہ بستی ہی کے ایک چائے خانے میں چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ وہ اپنے گھر سے کب تک غائب رہ سکتا ہے؟ کیفی کا سامنا تو اسے کرنا ہی پڑے گا۔

اچانک منیرے کے کاندھے پر کسی کا ہاتھ پڑا اور آواز آئی "کہاں غائب ہے یار!"

منیرے نے چونک کر دیکھا کہ وہ کیفی تھا۔

"ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گیا میں۔" کیفی نے اس کے برابر کی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

منیرے نے غور سے کیفی کی طرف دیکھا اور کچھ سکون محسوس کیا۔ کیفی کے چہرے پر ناراضگی یا غصے کا تاثر قطعی نہیں تھا۔

"تو مجھے لینے جیل بھی نہیں آیا؟" کیفی کے لہجے میں شکایت تھی پھر وہ یکایک ہنس پڑا "چل اچھا ہی ہوا کہ تو نہیں آیا۔ تجھے دیکھ کر وہ پتا نہیں مجھ سے ملتی کہ نہیں۔"

"کون؟" منیرے متجسس ہوگیا۔ کیفی کا عام سا رویہ دیکھ کر منیرے کے دل کا چور "پسپا" ہوگیا تھا۔

"یار وہ ہے تو خوب صورت۔" کیفی نے سوچتے ہوئے کہا "پلے نہیں پڑ رہا کہ وہ مجھ سے کس چکر میں ملی ہے۔"

"ٹھیک سے بتا یار!"

"چائے تو منگا۔"

منیرے نے چائے خانے کے لڑکے کو آواز دی اور بلند آواز میں اس سے کہا "میرے یار کے لیے چائے لا، ملائی مار کے۔" پھر وہ کیفی کی طرف متوجہ ہوا "ہاں! اب بتا؟"

کیفی نے اسے ماہین کے بارے میں سب کچھ بتادیا۔ اسی دوران میں چائے بھی آگئی تھی اور کیفی اس کی چسکیاں بھی لیتا رہا تھا۔ اس کی ساری کہانی منیرے نے بہت دلچسپی سے سُنی!

کیفی نے سب کچھ بتانے کے بعد پوچھا "اب بتا! کیا چکر ہوسکتا ہے!"

"میری تو عقل کام نہیں کررہی ہے پیارے!.... لیکن

اس سے جو رقم ملتی ہے وہ تو ہتھیا ہی لے!"

"اس سے مجھے کوئی کاروبار کرنا پڑے گا۔"

"کاروبار کو گولی مار..... اس سے دو چار لاکھ لے لے اور نکل لے کہیں پتلی گلی سے....."

"اتنی رقم تو شاید وہ دے گی بھی نہیں اور پھر یہ کیسے ہوگا کہ میں کہیں نکل لوں! میں تیری طرح اکیلا تو ہوں نہیں کہ کہیں بھاگ جاؤں! میری بیوی بھی ہے اور بچہ بھی ہے۔ ارے ہاں! یاد آیا! دینو کاکا سے تیرا کوئی پھڈا ہوا تھا؟"

"نہیں..... نہیں تو۔" منیرے اس اچانک "حملے" سے کچھ گھبرا گیا۔

"بڈھا بہت ناراض ہو رہا تھا تجھ پر! کوئی بات تو ہوئی ہوگی؟" کیفی نے سوالیہ نظروں سے منیرے کی طرف دیکھا۔

"اوہ کچھ نہیں یار!" منیرے نے بات بنانے کی کوشش کی "تو جیل میں تھا اس لیے میں بھابی سے پوچھنے چلا گیا تھا کہ کوئی پریشانی نہ ہو گھر میں۔ بس اتنی سی بات تھی! بگڑ گیا دینو کاکا مجھ پر! کہنے لگا اب نہ آنا اس گھر میں، تجھے کس نے دیا ہے اس گھر کا ٹھیکا!"

"سٹھیا گیا ہے وہ!" کیفی نے منہ بنایا۔

کیفی کے اس رویے سے منیرے کی ہمت بندھ گئی۔ اس نے کہا "چھوڑ یار! میں تو بھول بھی گیا اس بات کو۔ بڑے اگر دو چار بری بھلی سنا دیں تو برا نہیں ماننا چاہیے۔"

"میں اپنے گھر میں اس کا یہ زور تو نہیں چلنے دوں گا کہ وہ میرے کسی دوست کا آنا جانا بند کر دے۔"

"ابے چھوڑ یار! اس لڑکی کے بارے میں کچھ اور بتا۔"

"اور کیا بتاؤں؟ سب کچھ تو بتا دیا!"

"مجھے تو وہ کوئی کریک لڑکی لگتی ہے۔" منیرے نے کہا۔ اور پھر مسکراتے ہوئے بائیں آنکھ دبا کر بولا "کوشش کر کے دیکھ! ہو سکتا ہے کہ تجھے اس پر ہاتھ صاف کرنے کا موقع مل جائے!"

"کیا مطلب؟" کیفی اسے گھورنے لگا۔

"اب مطلب بھی بتاؤں!" منیرے ہنسا۔

"دیکھ منیرے! مجھ سے ایسی بات تو کیا نہ کر!" کیفی نے سخت لہجے میں کہا "سبھی دھندے ٹھیک ہیں مگر کسی لڑکی کو برباد کرنا مردانگی نہیں ہے۔"

"یہ بات ہے تو پھر تو لڑکیوں کو چپکے چپکے دیکھتا کیوں ہے؟"

"اچھی چیز اچھی تو لگے گی لیکن اچھی چیز کو خراب تو نہیں کرنا چاہیے۔"

"کل وہ تجھ سے ملنے آئے گی نا؟"

"کہا تو تھا اس نے! جمیلہ کو تو اس نے اپنی بہن بنا لیا ہے۔"

"ہوشیار رہنا اس سے! پتا نہیں کون ہے، کیا چاہتی ہے؟"

"ہوشیار تو رہوں گا۔" کیفی نے سوچتے ہوئے کہا "دماغ میرا بھی گھوما ہوا ہے۔ جانے کیا چکر ہے یہ!"

"اچھا ایک بات بتا! کسی بڑے دھندے میں پڑا جائے؟"

"بڑا دھندا کیسا؟"

"یار ہم لوگ بس چھوٹی چھوٹی وارداتیں کرتے ہیں، کوئی بڑا کام کریں تو موٹی رقم ہاتھ لگے۔"

"نا بابا! بس یہی ٹھیک ہے۔ دو چار مہینے کی جیل تو کوئی خاص نہیں ہوتی۔ میں اپنے بیوی بچے کے پاس لوٹ تو آتا ہوں! بڑے دھندوں میں خطرہ بہت ہوتا ہے۔ زندگی کا بھی کوئی بھروسا نہیں رہتا۔ بات بات پہ گولیاں چلتی ہیں۔"

"میں تو سوچ رہا ہوں یار! کوئی بڑا دھندا کرنا چاہیے۔"

"تو سوچ سکتا ہے۔" کیفی نے سر ہلا کر کہا "تیرا آگے پیچھے کوئی رونے والا نہیں ہے۔ میں نہیں رہا تو میرے بیوی بچے کا کیا ہوگا!"

"تیری مرضی یار!" منیرے چپ ہو گیا۔ کیفی کے تیور دیکھ کر اس نے زیادہ بات کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا ورنہ وہ اسے بتاتا کہ "بڑے دھندے" کے سلسلے میں اس کا کسی سے رابطہ ہو چکا تھا۔



دوسرے دن دوپہر ڈھل رہی تھی جب ماہین، کیفی کے گھر پہنچی۔

آس پاس رہنے والوں نے اسے اور اس کی کار کی طرف تعجب سے دیکھا۔ ایک ہفتے میں انہوں نے ماہین کو وہاں کئی بار آتے دیکھا تھا۔ یہ ان کے لیے تعجب ہی کی بات تھی کہ کیفی جیسے آدمی کے گھر میں وہ کسی ماڈرن لڑکی کو قیمتی کار میں آتے دیکھیں!

ماہین آس پاس کے لوگوں کی طرف توجہ دیے بغیر دروازے کی طرف بڑھی۔ اس نے کنڈی کھڑکھڑانے کے لیے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ دروازہ کھل گیا۔

"آؤ بٹی!" دینو کاکا مسکرائے "میں نے تمہاری کار کی آواز سن لی تھی۔ جمیلہ نے مجھے بتایا تھا کہ تم اس وقت آؤ گی۔"

"جمیلہ کو کیفی نے بتایا ہوگا!" ماہین مسکراتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔

کمرے میں ایک طرف لگے ہوئے پلنگ اور دوسرے سازوسامان سے غربت صاف ظاہر ہو رہی تھی۔

"کیفی کہاں ہے؟" ماہین نے پوچھا۔

"دوسرے کمرے میں۔" دینو کاکا نے منہ بنایا "اس کے ساتھ سر پھوڑنے کا تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔"

"مایوس نہیں ہونا چاہیے کاکا!" ماہین نے کہا "تم سے میرا وعدہ ہے کہ میں تمہارے داماد کو صحیح راستے پر واپس لاکے رہوں گی۔"

دینو کاکا چپ رہ گیا۔

ماہین دوسرے دروازے سے صحن کی طرف نکلی اور پھر برابر کے دروازے سے دوسرے کمرے میں داخل ہو رہی تھی کہ جمیلہ نے لپک کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی "آؤ بہن! ہم تو تمہارا انتظار ہی کر رہے تھے۔"

ماہین نے جمیلہ کو گلے لگاتے ہوئے اس پلنگ کی طرف دیکھا جس پر بیٹھا ہوا کیفی اسے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ دوسرے پلنگ پر لیٹا ہوا اس کا دو سالہ لڑکا ہاتھ پیر مارتے ہوئے ادھر ادھر سہلا رہا تھا۔

ماہین اس پلنگ کی طرف گئی۔ بچے کو پیار کیا اور پھر اسی پلنگ پر بڑی بے تکلفی سے بیٹھ گئی۔

"میں تمہارے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں۔" جمیلہ بولی۔

"پہلے میرے پاس آؤ۔" ماہین نے کہا۔

جمیلہ اس کے قریب پہنچی۔ ماہین نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے پہلو میں بٹھا لیا اور بولی "کسی تکلف کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے پاس بیٹھو۔" پھر وہ جمیلہ کا جواب سنے بغیر کیفی کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرائی "کیا حال ہے؟ مجھے اتنے غور سے کیوں دیکھ رہے ہو؟"

"دیکھ رہا ہوں کہ مجھے اتنی ماڈرن سالی کہاں سے مل گئی۔" کیفی نے بڑے سپاٹ لہجے میں کہا۔

ماہین ہنس پڑی "ٹھیک ہے۔ میں جمیلہ کو بہن بنا چکی ہوں لہٰذا تم مجھے سالی یقیناً کہہ سکتے ہو۔" پھر وہ سنجیدگی سے بولی۔ "کل سے اب تک کچھ سوچا یا نہیں؟"

"سوچا تو بہت ہے۔"

"کیا سوچا ہے؟"

"یہی کہ یا تو تم کوئی پاگل لڑکی ہو یا بہت چالاک ہو اور مجھے کسی بڑی مصیبت میں پھنسانا چاہتی ہو۔"

"تمہاری دوسری بات بالکل غلط ہے البتہ تم مجھے پاگل قرار دے دو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔" ماہین نے مسکراتے ہوئے کہا۔

جمیلہ نے بچے کو اپنی گود میں لے لیا اور نظریں جھکائے خاموش بیٹھی رہی۔

ماہین پھر بولی "میں نے بھی کل سے اب تک بہت سوچا ہے۔ کل میں نے کہا تھا کہ تمہیں کاروبار کے لیے کچھ رقم دے دوں گی لیکن سوچ بچار کے بعد میں نے یہ خیال اپنے ذہن سے نکال دیا ہے۔ میں تمہیں نقد رقم نہیں دوں گی۔ میں نے تمہیں پچاس ہزار روپے دینے کے بارے میں سوچا تھا لیکن آج کے زمانے میں اتنی رقم سے کام بننا مشکل ہے۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اسی علاقے کی مارکیٹ میں تمہیں کرائے پر ایک دکان دلا دیتی ہوں۔ تم اس میں ایک چھوٹا سا جنرل اسٹور کھول لو۔ اسٹور کے لیے جتنے سامان کی ضرورت ہوگی، وہ میں دکان میں ڈلوا دوں گی۔ چند دن میں سب کچھ ہو جائے گا۔ ایک ہفتے کے اندر اندر تم دکان سنبھال لینا۔"

کیفی نے منہ بنایا "مجھے ملازم رکھنا چاہتی ہو؟"

"بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔ میری مالی پوزیشن کا اندازہ تو تمہیں ہو گیا ہوگا۔ میں کسی کو ملازم رکھ کے ایسا معمولی کام کیوں شروع کروں گی؟" ماہین نے کہا پھر جواب کا انتظار کیے بغیر بولی "وہ دکان کرائے پر لی جائے گی۔ ایڈوانس اور سال بھر کا کرایہ میں ہی دوں گی لیکن رسیدیں تمہارے نام سے بنیں گی۔ جو سامان میں دکان میں ڈلواؤں گی، وہ بھی تمہارا ہی ہوگا کیونکہ وہ دکان تمہاری ہوگی۔ میں تم سے کوئی رسید نہیں لوں گی کہ وہ سامان تمہیں میں نے دیا ہے۔ بس ایک احتیاط مجھے کرنا ہوگی۔ اس دکان پر ایک ملازم بھی کام کرے گا جو میرا آدمی ہوگا۔"

"میری نگرانی کے لیے؟" کیفی نے منہ بنایا "تم سمجھ رہی ہو کہ میں وہ سب کچھ بیچ باچ دوں گا۔"

"میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ میرا ایک آدمی وہاں رہے اور مجھے دکان کے حالات سے باخبر رکھے۔ میری نیت میں کوئی کھوٹ نہیں ہے کیفی! میں تم سے پارٹنر شپ کا کوئی معاہدہ نہیں کر رہی ہوں۔ یہ میں نے تم پر چھوڑ دیا ہے کہ دکان کا آدھا منافع خود ہی مجھے دے دیا کرنا۔"

"دیکھو بی بی صاحب!" کیفی نے اسے گھورتے ہوئے کہا "میں تمہارے ایسے کسی چکر میں پڑنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ تم میری بیوی سے بہناپا نبھاتی رہو۔ مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں لیکن مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔"

"اچھا!" ماہین سنجیدگی سے بولی "گویا تم اپنی وہی زندگی

گزارنا چاہتے ہو جو دو سال سے گزار رہے ہو؟"
"ہاں۔" کیفی کی آواز میں جھٹکا سا تھا۔
ماہین سوچتے ہوئے چند لمحے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر بولی "دیکھو کیفی! ایک اچھی لڑکی تمہاری بیوی اور ایک پیارا سا بچہ تمہارا بیٹا ہے۔ اگر تمہیں ان دونوں سے محبت ہے تو تمہیں انہی کی خاطر اپنی زندگی کی روش بدل لینا چاہیے۔"
اسی وقت جمیلہ نے کیفی کی طرف دیکھتے ہوئے التجائیہ انداز میں کہا "مان جاؤ نا ان کی بات؟"
"تو چپکی بیٹھ۔" کیفی نے اسے ڈانٹ دیا۔
جمیلہ نے پھر نظریں جھکا لیں۔
"دیکھو کیفی!" ماہین نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "ابھی تم نے جمیلہ کو ڈانٹا تو بہت زور سے ہے لیکن میں نے تمہارے لہجے میں ایک بات نوٹ کی ہے۔ تم جمیلہ سے محبت تو کرتے ہو!.... اور یہ بچہ؟ ظاہر ہے کہ تمہیں اس سے بھی محبت ہو گی! کوئی باپ ایسا نہیں ہو سکتا جو اپنی اولاد سے محبت نہ کرے۔ میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ تم ان دونوں کی خاطر اپنی جان بھی دے سکتے ہو۔"
"مجھے جذباتی نہ کرو!" کیفی نے سر جھٹک کر بڑے سخت لہجے میں کہنا چاہا تھا لیکن اس کی آواز میں ہلکا سا ارتعاش آ گیا اور ماہین مسکرا دی۔
"میں نے کوئی غلط بات نہیں کہی ہے۔" ماہین بولی "یہی دونوں تمہاری زندگی کے ساتھی ہیں کیفی!.... منیرے جیسے لوگ تمہارے کسی کام نہیں آئیں گے۔"
کیفی نے بڑی سخت نظروں سے جمیلہ کی طرف دیکھا اور بولا "تمہارے باپ نے میرے دوست کی شکایت بھی جڑ دی ہے؟"
"غلط خیال ہے تمہارا۔" ماہین بول پڑی "یہ تو صحیح ہے کہ ڈیٹو کاکا نے تمہارے دوست کا ذکر اچھے الفاظ میں نہیں کیا تھا لیکن میں منیرے کے بارے میں پہلے سے جانتی ہوں۔ تمہارے بارے میں مکمل چھان بین کی تھی میں نے! مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ منیرے بھی ایک شخص ہے جو بعض وارداتوں میں تمہارے ساتھ رہا ہے! میں نے تمہاری جگہ اس کا انتخاب اس لیے نہیں کیا کہ وہ میرے لیے زیادہ مشکل ثابت ہوتا۔ اس کو بگڑے ہوئے کئی سال گزر چکے ہیں اور مجھے ڈر ہے کہ جلد ہی وہ کسی بہت ہی خطرناک راہ پر چل پڑے گا۔ اسے چند دنوں سے ایک ایسے شخص کے ساتھ دیکھا جا رہا ہے جو شہر کے چند خطرناک بدمعاشوں میں سے ہے۔"

کیفی نے چونک کر ماہین کی طرف دیکھا۔
"کیوں؟" ماہین اسے غور سے دیکھنے لگی۔ "کیا اس نے تم سے بھی اس کا ذکر کیا تھا؟ کل شام تم اس سے ملے تو تھے نا!"
"تو تمہیں یہ بھی معلوم ہو گیا؟" کیفی نے اسے گھور کر دیکھا۔ "تم کسی سے میری نگرانی کروا رہی ہو؟ کیا تمہارا تعلق پولیس سے ہے؟"
ماہین ہنس پڑی "ابھی تک تو نہیں ہے۔"
"اس کا کیا مطلب ہوا؟"
"دیکھو کیفی! تم فضول باتیں کر رہے ہو۔ پولیس والوں کا یہ کام نہیں ہوتا کہ وہ جرائم پیشہ لوگوں کو سدھارنے کی مہم پر نکل پڑیں۔ میں اپنا پیسا خرچ کرنے کے لیے تیار ہوں' اپنا وقت صرف کر رہی ہوں' صرف اس لیے کہ تم صحیح راستے پر لوٹ آؤ۔ ہرچند کہ اس میں میرا بھی ایک مقصد ہے لیکن اگر میں اپنے کسی مقصد کے لیے بھی تمہیں ان غلط راہوں سے واپس لانا چاہتی ہوں تو کوئی مجھے غلطی پر نہیں سمجھ سکتا۔ منیرے کو تم اپنا دوست سمجھنا چھوڑ دو۔ جرائم کی دنیا میں کوئی کسی کا دوست نہیں ہوتا۔ اپنے مفاد کے لیے اپنے قریب ترین آدمی کے گلے پر بھی چھری چلا دی جاتی ہے یہاں! منیرے تو شاید اب بہت ہی خطرناک راستے پر جانے والا ہے اور اگر تم بھی اس کے ساتھ ہی راستے پر چل پڑے تو یہ تمہارے حق میں بہت برا ہو گا۔ ان راہوں پر زیادہ آگے نکل جانے والوں کے لیے واپسی ممکن نہیں رہتی۔ واپسی کے راستے پر انہیں قانون اور سزاؤں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس لیے وہ واپس نہیں لوٹ پاتے۔ آگے.... اور آگے.... اور آگے.... وہ بڑھتے ہی رہتے ہیں اور کسی دن کسی خوف ناک آگ کا ایندھن بن جاتے ہیں!"
اچانک کیفی نے جمیلہ کو پھر ڈانٹا "یہ کیا کر رہی ہے؟"
ماہین نے چونک کر دیکھا۔ اس کے برابر میں بیٹھی ہوئی جمیلہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ کیفی نے اسے ڈانٹا تو وہ اپنے دوپٹے سے اپنی آنکھیں خشک کرنے لگی۔
"رو نہ میری بہن!" ماہین نے بڑی محبت سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا "ابھی سے کیوں روتی ہو! کیفی کے بارے میں میرا اندازہ غلط ثابت ہو رہا ہے۔ میں سمجھی تھی کہ اپنی بیوی کے لیے نہیں تو اپنے بچے کے لیے اس کے دل میں ضرور محبت ہو گی لیکن یہ تو منیرے سے بھی زیادہ بگڑ چکا ہے۔ اپنے آنسو سنبھال کر رکھو میری بہن! تمہیں تو بہت آنسو بہانے ہوں گے۔ کیفی تو ابھی اسی راستے پر بہت آگے جائے گا

اور اپنے بچے کا مستقبل بھی اندھیرے میں دھکیل جائے گا۔"
"بکو مت!" کیفی غصے میں اچھل کر کھڑا ہو گیا "چلی جاؤ یہاں سے!"
"اچھا۔" ماہین نے سنجیدگی سے کہا اور کھڑی ہو گئی "تم بہت بدنصیب ہو کیفی! ایک اچھے مستقبل نے تمہارے دروازے پر دستک دی لیکن تم دروازہ کھولنے کے لیے تیار نہیں ہو! میں جا رہی ہوں۔ میں ہار گئی اور میں اب یہاں کبھی نہیں آؤں گی۔"
"نہیں نہیں!.... نہیں میری بہن!" جمیلہ نے ایک ہاتھ سے اپنے بچے کو سنبھالتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے ماہین کا بازو پکڑ لیا۔ اس کی آواز بھرا گئی تھی۔ "تم یہاں آنا مت چھوڑنا۔ کوئی تو ایسا ہو جو میرا اور میرے بچے کا خیال رکھ سکے۔"
کیفی غصے سے چیخا "میں کیا مر گیا ہوں؟"
"نہیں نہیں!" جمیلہ ہذیاتی انداز میں چیخی "ایسی باتیں نہ کرو۔ خدا اس بچے پر تمہارا سایہ سلامت رکھے!" وہ پاگلوں کی طرح آگے بڑھی اور اس نے اپنا بچہ کیفی کے قدموں میں رکھ دیا پھر زار و قطار رونے لگی۔
"چل ہٹ!" کیفی نے جمیلہ کو زور سے دھکا دیا اور بچے کو اٹھا کر اپنے سینے سے لگا لیا جو اچانک چیخ چیخ کر رونے لگا تھا۔
کیفی کے ہونٹ پھڑپھڑانے لگے تھے۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ اس کے جذبات پوری شدت سے امنڈ پڑے تھے۔ وہ اپنے بچے کو تھپکتے ہوئے بڑبڑانے لگا تھا "میں اپنے بیٹے کے لیے سب کچھ چھوڑ دوں گا۔"
خوشی سے ماہین کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ کامیابی وہ اپنے بہت قریب محسوس کر رہی تھی۔ جمیلہ نے کیفی کے جذبات بھڑکا دیے تھے۔ ماہین نے ہی اسے یہ سب کچھ کرنے کی ہدایت کی تھی۔ اسے ڈر بس یہ تھا کہ کیفی اپنی بیوی کی اداکاری بھانپ نہ لے لیکن جمیلہ نے اس وقت اداکاری نہیں کی تھی۔ اس نے کیا تو وہی تھا جو اسے ماہین نے سمجھایا تھا لیکن یہ سب کچھ کرتے ہوئے وہ سچ مچ جذباتی ہو گئی تھی۔
"میں اب اپنے بچے کے لیے اپنی زندگی بدل دوں گا۔" کیفی بڑبڑایا۔
جمیلہ جو اس کے دھکے سے ایک طرف جا گری تھی، روتی رہی لیکن اب اس کے چہرے پر مسرت کی چمک آ گئی تھی۔ اس کے آنسو اب خوشی کے آنسو بن گئے تھے۔
ماہین نے اداکاری سے کام لیتے ہوئے ٹھنڈی سانس لی اور دروازے کی طرف جانے کے لیے قدم بڑھایا "اب میں جا رہی ہوں جمیلہ! تم جانو اور تمہارا شوہر!"
"اب تم اس طرح کیوں جا رہی ہو بہن!" جمیلہ نے جھپٹ کر اسے پکڑ لیا اور بولی "اب تو انہوں نے تمہاری بات مان لی ہے۔"
"میں نے کسی کی بات نہیں مانی ہے۔" کیفی نے جمیلہ کی طرف دیکھتے ہوئے جھنجلا کر کہا "میں نے صرف اپنے دل کی بات مانی ہے۔"
"انسان اپنے دل کی ہی بات مانتا ہے کیفی!" ماہین نے نرمی سے کہا "تم نے بھی اپنے دل کی بات مان کر بہت اچھا کیا۔ میں آج ہی کسی اسٹیٹ ایجنٹ سے مل کر دکان کا بندوبست کرتی ہوں۔ میں وہ سب کچھ کروں گی جو میں نے وعدہ کیا ہے۔"
"مجھے تمہاری مدد کی ضرورت نہیں ہے۔" کیفی غرایا "میں خود ہی اپنی نئی زندگی شروع کر دوں گا۔ میں پہلے ہی کی طرح نوکری کر لوں گا۔ نوکری نہیں ملے گی تو مزدوری کر لوں گا۔"
"یہی تو ہمارے معاشرے کی خرابی ہے کیفی!" ماہین پھیکے سے انداز میں مسکرائی "یہ معاشرہ کسی سزا یافتہ شخص کو نہ تو نوکری دیتا ہے، نہ مزدوری!"
"تو پھر میں اپنا کوئی کام کر لوں گا۔" کیفی نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا اور بچے کو گود میں لیے کمرے میں ٹہلنے لگا۔
"یہی تو میں چاہتی ہوں کہ تم اپنا کوئی کام کرو۔"
"لیکن میں تم سے کوئی پیسا نہیں لوں گا۔ میرے پاس تھوڑا بہت روپیا تو ہے لیکن کوئی کاروبار کرنے کے لیے میں اپنا یہ مکان بھی بیچ دوں گا۔"
"میں تمہاری یہ بات سن کر بہت خوش ہوئی ہوں کیفی! جب انسان صحیح راستے پر قدم اٹھاتا ہے تو اس کا ضمیر پوری طرح جاگ جاتا ہے اور اس کی خودداری بھی بیدار ہو جاتی ہے۔ میں نے تو تم سے پارٹنر شپ کی بات کی تھی لیکن اگر تم اسے میرا احسان سمجھ کر اسے قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہو تو میں بھی اصرار نہیں کروں گی۔ تم ویسا ہی کرو جیسا تم نے سوچا ہے۔"
جمیلہ روہانسی آواز میں بولی "مکان بیچ کر ہم رہیں گے کہاں؟"
"کرائے کے مکان میں۔" کیفی نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔
"ٹھیک ہے۔" ماہین نے سرہلایا "کرائے کے مکان میں

رہنا کوئی بری بات نہیں ہے۔ بے شمار لوگ کرائے کے مکانوں میں رہتے ہیں۔" پھر اس نے پوچھا "تمہارا یہ مکان کتنے کا بک جائے گا؟"

"تین لاکھ کا تو بک ہی جائے گا۔"

"میں تمہیں اس کے ساڑھے تین لاکھ دیتی ہوں۔" ماہین نے کہا اور پلنگ پر بیٹھ کر اپنے پرس سے چیک بک نکالنے لگی۔

بچہ اب بھی روئے جا رہا تھا۔ کیفی نے جمیلہ کی طرف دیکھ کر نرمی سے کہا "سنبھال اسے!"

جمیلہ نے لپک کر بچہ اپنی گود میں لے لیا۔

ماہین چیک بناتے ہوئے کہنے لگی "مکان کے کاغذات تم بعد میں میرے نام کرا دینا۔ میں فوری طور پر یہ مکان اس لیے خرید رہی ہوں کہ تمہیں روپیا فوری طور پر مل جائے اور تم جلد از جلد اپنا کام شروع کردو۔ تم مکان کسی اور کو بیچو گے تو تمہیں کچھ وقت لگ جائے گا اور یہ مناسب نہیں ہے۔ بہتر ہوگا کہ تم جلد از جلد مصروف ہو جاؤ۔"

ماہین چیک بنا کر کھڑی ہوگئی۔ اس نے چیک پلنگ پر رکھی بچے کے دودھ کی بوتل کے نیچے دبایا اور پھر جمیلہ کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا "اب تم سے ملنے میں کل آؤں گی۔"

پھر ماہین نے دروازے کی طرف رخ کیا تو ایک لمحے کے لیے ٹھٹک گئی۔

دروازے میں کھڑے ہوئے دینو کاکا کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

ماہین جب وہاں سے روانہ ہوئی تو اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ اسے اتنی جلدی اور اتنی آسانی سے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہوچکی ہے! اس کی دانست میں یہ امکان بالکل نہیں تھا کہ کیفی نے اسے بے وقوف بنایا ہو۔ اسے اس کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ وہ اس کی باتیں ماننے سے صاف انکار کرسکتا تھا اور اگر بے وقوف ہی بنانا چاہتا تو اس کی پیش کش قبول کرلیتا۔ اس نے تو اس کی پیش کش مسترد کرکے اپنا مکان بیچنے کا فیصلہ کر ڈالا تھا۔ ماہین نے خود ہی اس کا مکان خریدنے کی خواہش ظاہر کی تھی اور اسے چیک دے دیا تھا۔

ماہین نے سب خدشات اپنے ذہن سے جھٹک کر یقین کرلیا کہ وہ ایک ڈراما کرکے کیفی کے جذبات جھنجوڑنے اور اپنا مقصد حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی تھی۔ یہ ڈراما کرنے کے علاوہ اس نے کیفی سے کوئی جھوٹ نہیں بولا تھا۔ منیرے کے بارے میں اس نے کیفی سے جو باتیں کہی تھیں، وہ اسے اپنے چچا ڈی آئی جی احمد رضا سے معلوم ہوئی تھیں۔ منیرے کو چند دنوں سے ایک شخص داور کے ساتھ دیکھا جا رہا تھا۔

داور پر پولیس یہ شبہ کر رہی تھی کہ وہ کچھ غیر ملکی دہشت گردوں کے لیے کام کر رہا تھا۔ پندرہ دن قبل ایک گاڑی دھماکے سے اڑائی جاچکی تھی اور پولیس کو کسی وجہ سے شبہ ہوا تھا کہ اس دہشت گردی میں داور کا ہاتھ بھی تھا۔ داور کو اس سلسلے میں پولیس ہیڈ کوارٹر بلا کر اس سے پوچھ گچھ بھی کی گئی تھی لیکن اس پوچھ گچھ کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا تھا۔ پولیس اس سے اپنے "روایتی" انداز میں اس لیے پیش نہیں آسکی تھی کہ داور کو کچھ بڑے لوگوں کی پشت پناہی حاصل تھی اور اب پولیس کا ایک "سیل" ان بڑے لوگوں پر بھی کڑی نظر رکھے ہوئے تھا۔



دوسرے دن شام کو داور نے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے منیرے سے کہا "میں نے تمہارے بارے میں چھان بین کرلی ہے۔ اب مجھے یقین ہوگیا ہے کہ تم کوئی بڑا کام کرنا چاہتے ہو۔"

"بالکل داور صاحب!" منیرے نے خوش ہو کر کہا "اب چھوٹے موٹے کاموں میں مزہ نہیں آتا۔ کار تو کیا اپنے پاس ایک موٹر سائیکل تک نہیں ہوسکی۔"

"کار بھی ہوجائے گی۔" داور نے مسکرا کر کہا "لیکن سب کچھ ذرا دھیرے دھیرے ہوگا۔ زیادہ بڑے کام کرنے سے پہلے تمہیں کچھ چھوٹے چھوٹے کام کرنا ہوں گے مگر وہ کام صرف میری نظر میں چھوٹے چھوٹے ہیں۔ تمہارے لیے وہ چھوٹے کام بھی بڑے ہوں گے۔"

"میں بے چین ہوں داور صاحب! آپ بولو، حکم دو۔"

"ایک بڑے آدمی کو اغوا کرنا ہے۔" داور نے بتایا۔

"کسے؟" منیرے نے پوچھا۔

"یہ بعد میں بتایا جائے گا۔ پہلے تم یہ سن لو کہ میرا مقصد کیا ہے۔"

منیرے خاموشی سے داور کی طرف دیکھتا رہا۔

داور نے سگریٹ کا ایک گہرا کش لے کر کہا "یہ تو مجھے معلوم ہوچکا ہے کہ تمہارے پاس کار نہیں ہے لیکن تمہیں کار ڈرائیونگ آتی ہے بلکہ تم خاصے مشاق ڈرائیور ہو۔"

منیرے خاموش ہی بیٹھا رہا۔

"منصوبے پر چند دن بعد عمل درآمد ہونا ہے۔" داور نے پھر بولنا شروع کیا "جس شخص کو اغوا کرنا ہے، وہ تین بجے اپنے دفتر سے نکل کر اپنی کار میں بیٹھے گا۔ کار کوئی اور ڈرائیو کرتا ہے۔ مطلب یہ کہ شوفر بدلتے رہتے ہیں۔ ہم ایسا

بندوبست کریں گے کہ اس دن جس شوفر کی ڈیوٹی ہوگی' اسے غائب کردیا جائے گا اس کی جگہ تم لے لوگے۔"
"پھر تو یہ کام بڑی آسانی سے ہوجائے گا۔" منیرے بول پڑا "جب کار کی ڈرائیونگ میرے ہاتھ میں ہوگی تو..."
"غلط سمجھ رہے ہو تم!" داور نے خشک لہجے میں کہتے ہوئے اس کی بات کاٹی "صرف تمہاری وجہ سے یہ کام آسان نہیں ہوجائے گا۔ میری پوری بات سنو! وہ آدمی اکیلا کار میں آکر نہیں بیٹھے گا۔ اس کے پیچھے پیچھے اس کا ایک باڈی گارڈ بھی ہوگا جو تمہارے برابر کی سیٹ پر بیٹھے گا۔"
"اوہ!" منیرے کے منہ سے نکلا۔
"یہ تو بڑی آسانی سے ہوسکتا ہے کہ باڈی گارڈ جب کار میں بیٹھ رہا ہو تو اسے گولی مار کر ختم کردیا جائے لیکن اس طرح وہاں ہنگامہ ہوجائے گا۔ لوگ کار کی طرف دوڑ پڑیں گے۔ تمہارے لیے ممکن ہی نہیں رہے گا کہ کار وہاں سے نکال لے جاؤ۔"
منیرے پھر خاموشی سے داور کا منہ تکنے لگا۔
"ہمارا منصوبہ یہ ہے۔" داور پھر بولا "کہ باڈی گارڈ کی جگہ بھی ہمارا آدمی لے لے گا۔ جس آدمی کو اغوا کرنا ہے' اس کا باڈی گارڈ اس کے برابر کے کمرے میں ہوتا ہے۔ جب اس آدمی کو اپنے دفتر سے اٹھنا ہوتا ہے تو وہ انٹرکام پر اپنے باڈی گارڈ کو اطلاع دے دیتا ہے پھر جیسے ہی وہ اپنے کمرے سے نکلتا ہے' باڈی گارڈ بھی اپنے کمرے سے نکل کر اس کے پیچھے چل پڑتا ہے اور اس کی کار میں شوفر کے برابر کی سیٹ پر بیٹھ جاتا ہے۔ یہ خطرہ ہم اس طرح ختم کریں گے کہ جس وقت وہ شخص اپنے دفتر کے کمرے سے اٹھتا ہے' اس سے چند منٹ پہلے میرے کچھ آدمی باڈی گارڈ کے کمرے میں گھس کر اسے اپنے قبضے میں کرلیں گے اور پھر اس کے روپ میں ہمارا ایک آدمی باڈی گارڈ کے بجائے اس کمرے سے نکلے گا۔"
منیرے پھر جلدی سے بولا "اور وہ میرے برابر میں آکر بیٹھ جائے گا۔"
"ہاں۔"
"تو پھر یہ کام آسانی سے ہوجائے گا نا؟"
"آسانی سے تو ہوجائے گا لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ہمارا وہ آدمی کون ہو جو باڈی گارڈ کی جگہ لے! ہر شخص تو اس کی جگہ نہیں لے سکتا۔ وہ کوئی ایسا آدمی ہو جو باڈی گارڈ کا ہم شکل ہو اور جسامت میں بھی اسی جیسا ہو۔ بالکل ویسا ہی ہم شکل ملنا ممکن نہیں ہے لیکن میری نظر میں ایک ایسا آدمی ہے جو باڈی گارڈ سے خاصی حد تک مشابہ ہے۔ ہمیں کرنا یہ ہوگا کہ اس آدمی کی قلمیں مصنوعی طور پر بڑی کرنا ہوں گی۔ سر کے بال تھوڑے سے بڑے کرنا ہوں گے۔ میں نے ایک ایسی وگ بنوالی ہے جو باڈی گارڈ کے بالوں کے مطابق ہے۔ تیسرے یہ کہ اس شخص کے چہرے پر ہلکی مونچھوں کا اضافہ کرنا ہوگا۔ اس کی آنکھوں اور باڈی گارڈ کی آنکھوں میں بہت نمایاں فرق ہے لیکن اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ باڈی گارڈ کمرے سے نکلتے وقت چشمہ لگالیتا ہے۔ ہمارا آدمی وہی چشمہ لگالے گا۔"
منیرے کے چہرے سے الجھن ظاہر ہونے لگی۔
داور مسکرایا "تم سوچ رہے ہوگے کہ جب ہم یہ سب کچھ کرلیں گے تو پھر مسئلہ ہی کیا رہ جاتا ہے۔"
منیرے نے اپنے سر کو خفیف سی جنبش دی۔
داور بولا "مسئلہ یہ رہ جاتا ہے کہ منیرے ہمارے پاس ایسا کوئی آدمی نہیں ہے جو ان چند تبدیلیوں کے بعد باڈی گارڈ جیسا بن جائے۔"
"تو پھر؟" منیرے نے متفکرانہ انداز میں پوچھا۔
"پھر یہ کہ..." داور مسکرایا "اس آدمی کا بندوبست تم کروگے۔"
"میں؟" منیرے حیرت سے بولا۔
"ہاں۔" داور نے زور دے کر کہا "تم!"
"میں کہاں سے کروں گا؟" منیرے نے الجھ کر کہا۔
"تم بڑی آسانی سے کرسکتے ہو۔ وہ تمہارا دوست ہے۔ کیفی نام ہے اس کا۔"
منیرے نے ایک طویل سانس لی اور سوچتا ہوا بولا "یہ تو مشکل ہے داور صاحب!"
"کیوں؟" داور اسے غور سے دیکھنے لگا "میری اطلاع کے مطابق وہ کل ہی جیل سے رہا ہوا ہے۔ تم دونوں ساتھ ساتھ بھی کئی وارداتیں کرچکے ہو۔ کیا تم اسے کسی بڑے کام پر آمادہ نہیں کرسکتے؟"
منیرے سوچ میں پڑگیا۔
"کیوں؟" داور کی پیشانی پر شکنیں پڑگئیں "کیا یہ مشکل کام ہے؟ میں تمہیں بتادوں کہ اس کام کے عوض تمہیں تین لاکھ روپیا ملے گا اور تم کیفی کو بھی بتادینا کہ اسے بھی اتنی ہی رقم ملے گی۔"
"تین... تین لاکھ۔" منیرے کی آواز بھرا گئی۔
"اور یہ تو ابتدائی مرحلہ ہوگا۔" داور نے اکسانے والے انداز میں کہا "تم دونوں میرے لیے کام کرتے رہے تو اس سے کہیں زیادہ ملے گا۔"

”میں تو ہر طرح سے حاضر ہوں داور صاحب لیکن کیفی۔“

”کیا فضول باتیں کرنے لگے!“ داور نے بگڑ کر کہا ”کیا تمہیں یا کیفی کو کبھی کسی واردات میں اتنی رقم ملی ہے؟“

”وہ تو ٹھیک ہے داور صاحب لیکن کیفی ذرا ڈرپوک قسم کا آدمی ہے۔ میں کل ہی اس سے ملا تھا۔ آپ سے تو میری کئی ملاقاتیں ہو چکی ہیں اور مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ اب مجھے کرنے کے لیے بڑے بڑے کام ملیں گے اس لیے میں نے کیفی سے بھی بات کی تھی لیکن اس نے انکار کر دیا۔ اس کا کہنا ہے کہ بڑے کاموں میں خطرات بھی بڑے ہوتے ہیں لہٰذا وہ ان چکروں میں نہیں پڑے گا۔“

”تم اس سے دوبارہ ملو۔“ داور نے منہ بنا کر کہا ”جب وہ تین لاکھ کی رقم کے بارے میں سنے گا تو اس کے خیالات بدل جائیں گے۔“

”میں بات کر کے دیکھتا ہوں۔“ منیرے سوچتا ہوا بولا۔

”پوری پوری کوشش کرنا۔ اس سے کام تو لینا ہی ہے۔ اگر تم کامیاب نہ ہو سکے تو مجھے خود کوئی تدبیر کرنا پڑے گی لیکن تم کامیاب ہو گئے تو میں سمجھوں گا کہ تم مستقبل میں بھی میرے لیے کام کے آدمی ثابت ہو گے!“



داور سے اس ملاقات کے بعد منیرے کی شدید خواہش تھی کہ داور اسے اپنے لیے ایک کام کا آدمی بلکہ اہم آدمی سمجھنے لگے اس لیے وہ سوچ رہا تھا کہ کیفی کو ہر قیمت پر تیار کرنا پڑے گا۔ اس کی امنگ اس لیے اور زیادہ بڑھ گئی تھی کہ ملاقات ختم ہونے پر داور نے اسے ایک لفافہ دیا تھا جس میں پچاس ہزار روپے تھے۔

اب مسئلہ یہ تھا کہ کیفی سے ملاقات کس طرح کی جائے! منیرے کو اس کے گھر جانے میں تذبذب تھا۔ وہ ڈینو کاکا کے سامنے جاتے ہوئے ہچکچا رہا تھا لیکن اس کے دل و دماغ میں ڈینو کاکا کے خلاف اشتعال کی لہریں بھی تھیں۔ اس کی دانست میں ڈینو کاکا کی ہستی ہی وہ دیوار تھی جس نے اسے جمیلہ تک نہیں پہنچنے دیا تھا ورنہ بھولی بھالی جمیلہ کو تو وہ بڑی آسانی سے شیشے میں اتار لیتا۔ جمیلہ بہت دن سے اس کے اعصاب پر سوار تھی۔ اسے حاصل کرنے کے لیے وہ کچھ بھی کرنے کے لیے تیار تھا لیکن فی الحال اسے پہلے کوئی ایسی تدبیر سوچنا تھی کہ کیفی کو داور کا آلۂ کار بنا سکے۔

بہت سوچ بچار کے بعد کیفی سے ملاقات کی ایک ہی تدبیر اس کی سمجھ میں آسکی۔ اس نے محلے کے ایک بچے کو دس روپے دے کر ایک چھوٹا سا پرچہ اس کے ہاتھ کیفی کو بھجوایا۔ بچے کو اس نے سختی سے تاکید کی تھی کہ پرچہ وہ صرف کیفی ہی کے ہاتھ میں دے۔

پرچے میں اس نے لکھا تھا ”یار کیفی! تجھ سے ایک بہت ضروری کام ہے۔ ابھی فوراً اس چائے خانے میں آکر مل لے جہاں کل ملاقات ہوئی تھی۔“

اس نے پرچے میں اپنا نام نہیں لکھا تھا۔ بس بچے کو سمجھا دیا تھا کہ وہ کیفی کو اس کا نام بتا دے۔

جب وہ بچہ پرچہ لے کر گیا تو منیرے کچھ فاصلے پر آڑ میں کھڑا کیفی کے گھر کی طرف دیکھتا رہا۔ دل ہی دل میں وہ دعا بھی مانگ رہا تھا کہ کیفی اس وقت گھر پر ہی ہو۔

پھر اس وقت وہ خوش ہو گیا جب اس نے کیفی کو گھر سے نکلتے دیکھا۔ بچے نے پرچہ اسے دیا اور کچھ کہہ کر وہاں سے ایک طرف دوڑ لیا۔

منیرے تیزی سے مڑ کر چائے خانے کی طرف چل پڑا۔ اسے یقین تھا کہ کیفی آئے گا ضرور! چائے خانے میں پہنچ کر وہ ایک میز پر بیٹھ گیا۔ اس کی توقع کے مطابق پانچ منٹ بعد ہی کیفی وہاں آ گیا۔

”ایسا کیا خاص کام پڑ گیا مجھ سے؟“ کیفی نے آتے ہی پوچھا ”اور یہ آخر پرچہ بھیجنے کی کیا ضرورت تھی؟“

”یار میں نہیں چاہتا کہ خواہ مخواہ ڈینو کاکا سے سامنا ہو۔“

”تو اس کی پروا نہ کیا کر! میں اپنے گھر پر اس کی حکومت تو نہیں چلنے دوں گا۔ خیر چھوڑ! کام کیا پڑ گیا اس وقت؟“

منیرے نے اپنی جیب سے نوٹوں کا لفافہ نکال کر کیفی کے سامنے رکھ دیا اور دھیمی آواز میں بولا ”پچاس ہزار ہیں۔“

کیفی اسے حیرت سے دیکھنے لگا۔

”یہ تیرے بھی ہو سکتے ہیں۔“ منیرے بولا ”پھر اس کے بعد ڈھائی لاکھ اور بھی ملیں گے۔“

”وہ کیسے؟“ کیفی کی حیرت برقرار رہی۔

”کل میں نے تجھ سے بات کی تھی نا!“

”کون سی بات....؟ اچھا اچھا وہ؟.... بڑے دھندے والی؟“

”ہاں۔“

”لیکن میں نے تجھے جواب دے دیا تھا۔“

”کام زیادہ خطرناک نہیں ہے۔“ منیرے نے کہا ”بس ایک آدمی کو اغوا کرنا ہے۔“

کیفی اسے حیرت سے دیکھتا رہا۔

”یہ کام صرف ہم دونوں کو کرنا ہے۔“ منیرے پھر بولا۔

"تین لاکھ مجھے ملیں گے اور تین لاکھ تجھے! مجھے یہ پچاس ہزار ایڈوانس ملے ہیں۔ اگر تو تیار ہو جاتا ہے تو تجھے بھی مل جائیں گے۔"

کیفی سوچتا ہوا بولا "صرف ایک آدمی کو اغوا کرنے کے لیے چھ لاکھ کون بے وقوف دے رہا ہے؟"

"وہ بے وقوف نہیں ہے کیفی! وہ بہت اونچے اونچے کام کرتا ہے۔ میں نے تو اس کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ تو مستقل اس کے ساتھ نہ رہنا لیکن یہ کام تو کر لے! کسی کو اغوا کرنا تو کوئی خطرناک کام نہیں ہے۔"

"تو مجھے اپنے ساتھ کیوں رکھنا چاہتا ہے؟" کیفی نے سوچتے ہوئے پوچھا۔

"تیرے بغیر یہ کام بہت مشکل ہو جائے گا۔"

"وہ کیوں؟"

منیرے نے داور سے جو کچھ معلوم ہوا تھا' وہ اس نے کیفی کو بتا دیا۔

"تو یہ بات ہے!" کیفی نے طویل سانس لی "پھر تو اس معاملے میں میری اہمیت تجھ سے زیادہ ہوگی؟"

"ہاں۔" منیرے نے سرہلایا "تیری اہمیت مجھ سے زیادہ تو ہوگی۔"

کیفی مسکرایا "تو پھر مجھے اس سے زیادہ رقم ملنا چاہیے جتنی تجھے ملے گی۔"

منیرے نے منہ بنایا "میں نے تجھے سب کچھ سچ سچ بتا دیا تو تو پھیلنے لگا۔"

"اگر تو ابھی نہ بتاتا تو مجھے بعد میں معلوم ہو جاتا۔" کیفی مسکرایا۔

"دیکھ یار! میں اس آدمی سے اپنے معاملات بہت صحیح رکھنا چاہتا ہوں۔ میں اس سے یہ نہیں کہوں گا کہ تو زیادہ مانگ رہا ہے۔ میں یہ کر سکتا ہوں کہ میرے حصے میں سے تو ایک لاکھ روپیا اور لے لینا۔"

"یعنی تو دو لاکھ روپے لے گا اور مجھے چار لاکھ مل جائیں گے؟"

"ہاں۔"

کیفی اپنی تھوڑی کھجاتے ہوئے مسکرا کر بولا "قسمت تو مجھ پر اچانک بہت مہربان ہو گئی ہے۔ ایک جگہ سے بڑی رقم مل گئی اور اب دوسری جگہ سے ملے گی؟"

"کہیں سے کوئی بڑی رقم مل چکی ہے تجھے؟" منیرے نے حیرت سے پوچھا۔

کیفی نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سرہلایا "میں نے تجھ سے ایک لڑکی کا ذکر کیا تھا نا؟"

"ہاں ہاں۔" منیرے جلدی سے بولا۔

"وہ پتا نہیں کس چکر میں تھی لیکن میں نے ہی اسے بے وقوف بنا دیا۔"

"وہ کیسے؟"

"یہ کہانی میں بعد میں سناؤں گا۔ پہلے یہ بتا کہ وہ آدمی کون ہے جو مجھ سے اور تجھ سے کسی کو اغوا کروانا چاہتا ہے؟"

"اس کا نام داور ہے۔"

"تو اس سے میرا معاملہ کیسے طے ہوگا؟"

"کل میں تجھے اس کے پاس لے چلوں گا۔" منیرے خوش ہو گیا کہ اس نے کیفی کو آسانی سے آمادہ کر لیا تھا۔

"میں پوری رقم ایڈوانس میں لوں گا۔" کیفی نے کہا۔

"بے اعتباری مت کر یار! داور جیسے آدمیوں کے لیے دو چار لاکھ کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ تجھے ڈیڑھ لاکھ ایڈوانس مل جائے گا۔ ڈیڑھ لاکھ ایڈوانس کی بات بھی داور نے کھل کر نہیں کہی لیکن میں نے اس کے ایک جملے سے اندازہ لگا لیا تھا کہ ہمیں ڈیڑھ لاکھ روپیا ایڈوانس مل جائے گا۔"

"میں پوری رقم لوں گا۔" کیفی اڑ گیا۔

منیرے کچھ سوچنے لگا پھر بولا "اچھا داور سے کوئی بات نہیں کرنا۔ میں اپنے حصے کے ڈیڑھ لاکھ بھی تجھے دے دوں گا۔ بعد میں جب ہم دونوں کی باقی رقم ملے گی تو وہ میں لے لوں گا۔"

کیفی ہنسا "بڑا حاتم بنا ہوا ہے تو!"

"بات دوسری ہے۔" منیرے نے سنجیدگی سے کہا "میں داور کے دل میں اپنی جگہ بنانا چاہتا ہوں۔ تو تو یہ کام کر کے الگ ہو جائے گا لیکن مجھے اس کے ساتھ رہنا ہے اور مجھے اس سے بڑے فائدے ہوں گے۔"

"جیسے تیری مرضی۔" کیفی نے شانے جھٹک کر کہا "میں تو پورے تین لاکھ ایڈوانس لوں گا۔ اغوا کر کے اس آدمی کو پہنچانا کہاں ہے؟"

"یہ مجھے ابھی نہیں معلوم! میں نے ٹھیک نہیں سمجھا کہ داور سے سوالات کروں۔ وہ جب مناسب سمجھے گا' بتا ہی دے گا۔"

"بہت فرماں بردار بن رہا ہے تو اس کا!" کیفی پھر ہنسا۔

"میں بڑے فائدے کی سوچ رہا ہوں۔"

"چل ٹھیک ہے۔ تو کل کس وقت چلنا ہے۔"

"کل صبح دس بجے۔" منیرے نے کہا پھر جلدی سے بولا۔

"تو نے مجھے اس لڑکی کی بارے میں نہیں بتایا؟ اسے تو نے کس طرح بے وقوف بنایا ہے؟"

کیفی ہنسنے لگا۔

○☆○

دوسرے دن کیفی اور مُنیرے، داور کے سامنے بیٹھے تھے۔

داور نے کیفی کو غور سے دیکھنے کے بعد کہا "تمہارے بارے میں مجھے بالکل ٹھیک رپورٹ ملی تھی۔ تم یقیناً باڈی گارڈ کی جگہ لے سکتے ہو۔ معمولی سی تبدیلیوں کے بعد تم اسی جیسے بن جاؤ گے۔ تمہیں منیرے نے سب کچھ بتا دیا ہے نا؟"

"ہاں۔" کیفی نے جواب دیا۔

داور سوچتا ہوا بولا "تمہیں وہاں کسی سے بات تو کرنا نہیں ہے کہ آواز کے فرق سے یا کسی وجہ سے کسی کو تم پر شک ہو۔ تمہیں تو بس کمرے سے نکل کر اس کے پیچھے چلتے ہوئے اس کی کار میں جا بیٹھنا ہے۔"

"اغوا کسے کرنا ہے؟" کیفی نے پوچھا۔

منیرے نے نیچے سے کیفی کا گھٹنا دبایا لیکن کیفی سوال تو کر ہی چکا تھا۔

داور نے کیفی کو تیکھی نظروں سے دیکھا اور پھر مُنیرے کو گھورتے ہوئے کہا "تم نے اپنے ساتھی کو یہ نہیں سمجھایا کہ یہ مجھ سے کسی قسم کا سوال نہ کرے۔"

"مجھ سے غلطی ہوگئی داور صاحب؟" منیرے نے جلدی سے کہا "یہ سمجھانے کا مجھے خیال نہیں رہا تھا۔"

داور نے کیفی کی طرف دیکھتے ہوئے خشک لہجے میں کہا۔ "جب، جو کچھ مناسب سمجھا جائے گا، بتا دیا جائے گا۔"

کیفی چپ رہا۔

داور نے میز کی دراز کھولی اور ایک موٹا لفافہ نکال کر کیفی کے سامنے ڈال دیا۔ "یہ ڈیڑھ لاکھ ہیں۔ باقی ڈیڑھ لاکھ کام کے بعد ملیں گے۔ ابھی یہ بھی نہیں بتایا جائے گا کہ کام کب ہے۔ اس بارے میں تمہیں منیرے سے معلوم ہو جائے گا۔" پھر اس نے دراز سے ایک اور لفافہ نکال کر مُنیرے کے سامنے ڈال دیا "اس میں ایک لاکھ ہیں۔ پچاس ہزار تمہیں کل دے دیے تھے۔ تمہیں ابھی یہیں رکنا ہے۔" پھر وہ کیفی سے مخاطب ہوا "لیکن تم جا سکتے ہو۔"

کیفی نے منیرے کی طرف دیکھا۔ منیرے جلدی سے بولا۔ "ہاں تم جاؤ۔ میں تم سے آج ہی کسی وقت مل لوں گا۔ تمہارا کام ہو جائے گا۔"

"کیسا کام؟" داور نے پوچھا۔

"وہ میری اور اس کی آپس کی ایک بات ہے داور صاحب!" منیرے نے جلدی سے کہا۔

داور نے بے پروائی سے سر ہلایا اور سگریٹ کا پیکٹ کھولنے لگا۔

کیفی کھڑا ہو گیا اور مُنیرے کی طرف دیکھ کر بولا "مجھ سے ملنا بھول مت جانا۔"

"نہیں بھولوں گا یار! تو جا!" منیرے نے جلدی سے کہا۔

کیفی نے بے پروایانہ انداز میں نوٹوں کا لفافہ اٹھا کر اپنی اندرونی جیب میں رکھا اور کمرے کے دروازے کی طرف مڑ گیا۔

داور نے کیفی کے جانے کے بعد منیرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تمہارا یہ دوست کچھ ٹیڑھا آدمی معلوم ہوتا ہے۔"

"ایسا کچھ نہیں ہے داور صاحب!" منیرے نے جلدی سے کہا "بے پروا نظر آنا اس کی عادت ہے اور ابھی اسے یہ بھی نہیں معلوم کہ بڑے دھندے کرنے والوں کے ساتھ کس طرح بات کی جاتی ہے۔ ویسے میں آج اسے اچھی طرح سمجھا دوں گا۔ یہ بتایئے کہ مجھے آپ نے کیوں روکا ہے!"

"کیفی کو آمادہ کر کے تم نے بہت بڑا کام کیا ہے۔ اب میں تم پر زیادہ اعتماد کر سکتا ہوں۔"

"شکریہ داور صاحب! میں نے آپ کا ساتھ دینے کا فیصلہ بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ اب میں اپنا ہی امتحان لینا چاہتا ہوں کہ میں کیا کیا کر سکتا ہوں۔"

"گڈ!" داور نے اسے تحسین آمیز نظروں سے دیکھا "جب آدمی کچھ کر گزرنے کی ٹھان ہی لے تو پھر سب کچھ کر گزرتا ہے۔ تم بھی بہت کامیاب رہو گے۔ میں نے تمہیں اس لیے روکا ہے کہ تمہیں منصوبے کے بارے میں دو ایک باتیں اور بتا دوں۔ کیفی کو میں نے نہیں بتایا کہ منصوبے پر کب عمل کرنا ہے لیکن تمہیں بتا رہا ہوں کہ جب کیفی جو ہمارے مطلب کا آدمی ہے، ہمیں مل ہی گیا ہے تو اب اس منصوبے پر عمل درآمد میں دیر نہیں کی جائے گی۔ یہ کام اب ہمیں کل ہی کرنا ہے۔ تم آج کیفی سے صرف اتنا کہہ دینا کہ کل صبح اسے پھر مجھ سے ملاقات کرنا ہے لہٰذا وہ کل صبح تمہارے گھر پہنچ جائے۔ تم اسے لے کر آجانا۔ جب وہ یہاں آجائے گا، تبھی اسے بتا دیا جائے گا کہ کام آج ہی کرنا ہے۔ صبح دس بجے تک اس کا یہاں آجانا بہت ضروری ہے۔ اس کا جو تھوڑا بہت میک اپ کرنا ہے، اس میں دو ڈھائی گھنٹے لگ سکتے ہیں پھر اسے ایک وڈیو فلم دکھائی جائے گی۔ وہ اس آدمی

کی وڈیو فلم ہے جس کی جگہ کیفی کو لینا ہوگی۔ اس وڈیو میں اس آدمی کو جگہ جگہ چلتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ کہیں آہستہ آہستہ' کہیں تیز تیز! لیکن کیفی کو اس کی طرف تیز چال کا مشاہدہ کرکے اسی کی طرح تیز چلنے کی مشق کرنا ہوگی۔ تم سمجھ رہے ہونا؟"

"بالکل داور صاحب! بالکل سمجھ رہا ہوں' اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔"

"کیفی کو کمرے سے نکل کر کار تک پہنچنے میں ایک منٹ سے زیادہ نہیں لگے گا۔ یہ بہت کم وقت ہے۔ اتنے سے وقت میں کوئی بھی کیفی کی چال پر غور نہیں کرسکتا لیکن میں احتیاط برتنا چاہتا ہوں۔ کیفی اس شخص کی چال چلنے کی مشق دو ڈھائی گھنٹے بھی کرلے تو کافی ہوگا۔"

"تو پھر ڈھائی تین یہیں بج جائیں گے؟"

"ہاں۔ کام ہمیں ساڑھے چار بجے کرنا ہے۔ اس وقت تک دوسرے تمام کاموں کا بندوبست ہوجائے گا۔"

دوسرا بندوبست کیا ہوگا؟ یہ سوال منیرے کے دماغ میں تو آیا تھا لیکن اس نے وہ سوال زبان پر نہیں آنے دیا۔

"ایک اہم بات!" داور نے منیرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "منصوبے میں ایک تبدیلی کی گئی ہے۔ اس کار کے ڈرائیور کی جگہ تم نہیں لوگے۔ اس کے لیے دوسرے آدمی کا بندوبست کیا گیا ہے۔"

"اوہ!" منیرے کو مایوسی ہوئی "تو پھر آپ نے یہ رقم مجھے یوں دی ہے؟"

داور مسکرایا "تمہارے لیے دوسرا کام ہے۔ تم کسی زمانے میں ہیوی ٹرالر بھی چلا چکے ہونا؟"

"جی ہاں۔"

"اسی لیے تمہیں ایک بڑا ٹرک چلانا ہے۔ اس ٹرک پر بہت بڑا کنٹینر رکھا ہوا ہوگا۔ تمہارے ساتھ ایک آدمی اور بیٹھے گا۔ وہی تمہیں بتائے گا کہ ٹرک کو کس راستے پر کس رفتار سے چلانا ہے اور کب کس جگہ روکنا ہے۔ جس کار کو اغوا کیا جائے گا' وہ بھی اسی سڑک پر پہنچے گی۔ کنٹینر کا پچھلا حصہ کھول کر ایک آہنی تختہ سڑک تک پھیلا دیا جائے گا۔ کار اس پر سے گزر کر کنٹینر میں داخل ہوگی اور پھر کنٹینر بند کردیا جائے گا۔ اس کے بعد وہ ٹرک اس کار کو لے کر کس جگہ پہنچے گا' یہ تمہیں تمہارا ساتھی بتائے گا۔"

"خاصی لمبی منصوبہ بندی ہے۔" منیرے نے سرہلایا۔

"ہوں۔" داور نے بھی سرہلایا۔

"داور صاحب!" منیرے نے کہا "میں آپ سے اس منصوبے کے بارے میں کسی بھی قسم کا سوال کرنا مناسب نہیں سمجھ رہا ہوں لیکن اس وقت ایک سوال نے مجھے بے چین کردیا ہے۔"

"وہ کیا؟"

"جس آدمی کو اغوا کیا جائے گا' کیا وہ شور نہیں مچائے گا؟"

"اسے خاموش رکھنا کیفی کا کام ہوگا۔ کیفی کو ایک ریوالور دیا جائے گا۔ وہ تھوڑا سا مڑ کر اپنے ہاتھ پیچھے کرتے ہوئے ریوالور کا رخ اس آدمی کی طرف کردے گا۔"

"اس کام سے تو کیفی خوف زدہ ہوسکتا ہے داور صاحب! وہ ایسے معاملے میں پڑنے سے انکار کرسکتا ہے۔" منیرے نے پُر تشویش لہجے میں کہا۔

"اسے گولی چلانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ وہ آدمی خوف زدہ ہوجائے گا۔"

"لیکن کیفی ریوالور ہاتھ میں لیتے ہوئے بھی ڈرے گا؟"

داور کچھ سوچنے لگا پھر بولا "اسے خالی ریوالور دے دیا جائے گا۔ اسے دکھا دیا جائے گا کہ ریوالور خالی ہے۔"

"تب وہ تیار ہوسکتا ہے۔" منیرے نے سرہلایا۔

"اچھا ہوا تم نے مجھے ابھی سے اس بارے میں بتادیا۔ اگر وہ خالی ریوالور بھی ہاتھ میں لینے کے لیے تیار نہیں ہوا تو پھر اسے مجبور کرنے کے لیے کوئی اقدام اٹھایا جائے گا۔ فی الحال تم کیفی کو اس منصوبے کے بارے میں کچھ نہیں بتانا۔"

"آپ کو یہ کہنے کی ضرورت نہیں تھی سر! کیفی کو جو کچھ معلوم ہوگا' آپ ہی سے معلوم ہوگا۔"

"کیفی سے یہ بات کہہ دینا کہ وہ اپنی جیبوں میں اپنی کوئی چیز لے کر نہ آئے۔" داور نے کہا پھر جواب کا انتظار کیے بغیر بولا "مگر نہیں۔ اسے کچھ بھی نہ بتانا۔ جب وہ یہاں آئے گا' تبھی اسے بتادیا جائے گا کہ اسے اپنا سامان یہیں چھوڑنا ہے۔"

"یہی ٹھیک رہے گا داور صاحب!" منیرے نے کہا پھر پوچھا "اگر آپ مناسب سمجھیں تو بتادیں کہ میرا کام کس وقت شروع ہوگا؟"

"تمہیں ساڑھے تین بجے اس جگہ پہنچنا ہوگا جہاں تم وہ ٹرک سنبھالو گے۔" داور نے کہا پھر کچھ سوچتے ہوئے کہا "کیفی تمہارا کیسا دوست ہے؟"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا!" منیرے نے الجھی ہوئی نظروں سے داور کی طرف دیکھا۔

"تم اس کے لیے کتنی قربانی دے سکتے ہو؟" داور نے پوچھا۔

منیرے فوری طور پر فیصلہ نہیں کرسکا کہ اسے اس سوال کا کیا جواب دینا چاہیے جس کی داور توقع کررہا ہے لیکن سوچنے کے لیے اس کے پاس بالکل وقت نہیں تھا۔ اس نے سیدھا سچا جواب دے دیا "اس سے میرا کوئی ایسا تعلق نہیں ہے کہ میں اس کے لیے کوئی قربانی دے سکوں۔"

"گویا بس پیشہ ورانہ تعلق ہے؟"

"بالکل۔"

"کیا تم میری خاطر کیفی کے خلاف کوئی قدم اٹھا سکتے ہو؟"

"آپ کی خاطر تو میں سب کچھ کرسکتا ہوں داور صاحب!"

"گڈ!" داور مسکرایا "میری رپورٹ کے مطابق کیفی کے گھر میں تمہارا آنا جانا بھی رہا ہے؟"

"جی ہاں۔" منیرے نے جواب دیا۔ اس کا ذہن الجھتا ہی چلا جارہا تھا۔ یہ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ان باتوں سے داور کا مقصد کیا تھا۔

داور سنجیدگی سے بولا "کیفی کی ایک بیوی اور ایک بچہ ہے۔"

"جی۔" منیرے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

"اگر وہ دونوں ہمارے قبضے میں ہوں تو کیفی ہماری ہر بات ماننے کے لیے تیار ہوجائے گا۔ کیوں؟"

"بالکل صحیح خیال ہے آپ کا! اب آپ کی بات میری سمجھ میں کچھ کچھ آنے لگی ہے۔"

"سمجھ دار آدمی ہو تم منیرے۔" داور مسکرایا "جمیلہ نام ہے نا اس کی بیوی کا؟"

"آپ کی معلومات مکمل ہیں داور صاحب!" منیرے کے لہجے میں داد تو تھی لیکن انداز خوشامدانہ بھی تھا۔

"میں تمہیں دو آدمی دے سکتا ہوں۔ کیا تم ان کی مدد سے جمیلہ اور اس کے بچے کو اغوا کرکے لاسکتے ہو؟"

"کب؟" منیرے نے بے اختیار پوچھا۔

"یہ سب کچھ کیفی کی لاعلمی میں ہونا چاہیے اس لیے آج رات تو مناسب نہیں رہے گا۔ یہ کام کل اس وقت ہونا چاہیے جب کیفی یہاں آچکا ہو۔"

منیرے کا جسم سنسنا اٹھا۔ جمیلہ کے سلسلے میں اس کی خواہشات کو یکایک ہوا سی ملی۔ کچھ خیالات بڑی تیزی سے اس کے ذہن میں چکرا گئے۔ اس نے کہا "جمیلہ اور اس کے بچے کو اغوا کرنے کا کام آپ صرف میرے سپرد بھی کرسکتے ہیں۔ آپ کے باقی دونوں آدمی بس گھر کے باہر کار میں میرا انتظار کریں۔ میں یہ کام اتنی آسانی سے کرسکتا ہوں کہ کوئی ہنگامہ نہ ہوگا۔ میں جمیلہ کو بہلا پھسلا کر گھر سے نکال لانے میں کامیاب ہوجاؤں گا۔ مجھے اس میں تھوڑا سا وقت ضرور لگے گا۔"

"کیسے؟" داور نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ کیفی کے گھر میں میرا آنا جانا ہے۔ جمیلہ ایک بھولی بھالی لڑکی ہے۔ کیفی گھر میں نہیں ہوتا تو بھی وہ میری آؤ بھگت کرتی ہے۔ ہاں البتہ جمیلہ کا باپ دینو کاکا میرے خلاف ہے لیکن دن میں وہ گھر پر نہیں ہوتا۔"

"تم اسے بہلا پھسلا کر کس طرح لاسکتے ہو؟"

"یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیجئے! آپ کو میرے لیے بس ایک کام کرنا ہوگا۔ ابھی آپ نے بتایا تھا کہ یہاں کیفی کا لباس اتروالیا جائے گا اور اس کی سب چیزیں بھی رکھوالی جائیں گی۔ بس ان میں سے ایک چیز آپ مجھے دے دیجئے گا۔"

"وہ کیا؟"

"کیفی کے گھر کے دو دروازے ہیں۔ ایک سامنے اور دوسرا پیچھے صحن کی طرف سے ہے۔ اس میں تالا پڑا رہتا ہے جس کی چابی کیفی کے پاس رہتی ہے۔ رات کو جب وہ زیادہ دیر سے گھر جاتا ہے تو اسی دروازے سے جاتا ہے۔ وہ چابی مجھے مل جائے گی تو میں اسی دروازے سے جاؤں گا اور جمیلہ کو یقین دلادوں گا کہ مجھے کیفی نے بھیجا ہے اور اسے بلایا ہے۔ جب پچھلے دروازے کی چابی میرے پاس ہوگی تو جمیلہ میری بات پر یقین بھی کرلے گی۔"

"ہوں۔" داور نے سوچتے ہوئے سرہلایا "ترکیب تو اچھی معلوم ہوتی ہے۔ ویسے میرے خیال میں اس کا امکان کم ہے کہ کیفی خالی پستول بھی اپنے ہاتھ میں رکھنے کے لیے تیار نہ ہو۔"

"ہر امکان کو سامنے تو رکھنا چاہیے صاحب!" منیرے نے جلدی سے کہا۔ اسے اندیشہ ہوا کہ داور اچانک اپنا ارادہ تبدیل نہ کرلے۔

"ٹھیک ہے۔" داور نے سرہلا کر کہا "کیفی کے یہاں آنے کے بعد تم چابی لے کر اس کے گھر چلے جانا۔ میرے دو آدمی کار میں تمہیں لے جائیں گے۔"

"لیکن وہ دونوں باہر ہی رہیں۔ کار میں ہمارا انتظار کریں۔"

داور نے اثبات میں سرہلا دیا اور منیرے کی آنکھوں میں خواب لہرانے لگے۔ وہ بہت دن سے اس تاک میں تھا کہ جمیلہ کو بہلا پھسلا کر اپنے قابو میں لے آئے اور اس کے

خیال کے مطابق اسے اب وہ موقع مل ہی گیا تھا۔

○☆○

شام کو منیرے اور کیفی کی ملاقات ہوئی۔ منیرے نے اپنے ڈیڑھ لاکھ اس کے حوالے کر دیے۔ اسے مکمل اطمینان تھا کہ بعد میں اسے اپنے بقیہ ڈیڑھ لاکھ اور کیفی کے ڈیڑھ لاکھ مل ہی جائیں گے۔

منیرے نے ملاقات جان بوجھ کر مختصر رکھی۔ دوسرے دن کی روانگی کا وقت طے کر کے وہ اپنے گھر آگیا۔

دوسرے دن وہ مقررہ وقت پر کیفی کو لے کر داور کے پاس پہنچ گیا۔

"اب تمہیں دوسرے کپڑے تبدیل کرنے ہیں۔" داور نے کیفی سے کہا "یہ بالکل ویسے ہی کپڑے ہوں گے جیسے اس وقت وہ باڈی گارڈ پہنے ہوئے ہوگا۔ اپنی جیبوں کا سامان بھی تم یہیں چھوڑ دینا۔ واپسی پر تمہیں مل جائے گا۔"

"میرے پاس صرف پرس اور ایک رومال ہے۔"

"جو کچھ بھی ہے۔" داور نے سرسری لہجے میں کہا۔

ایک آدمی کیفی کو دوسرے کمرے میں لے گیا۔ منیرے، داور کے پاس بیٹھا رہا۔ پندرہ منٹ میں ان دونوں کی واپسی ہوئی۔ کیفی اب جیکٹ اور پتلون میں ملبوس تھا۔

دوسرے آدمی کی طرف دیکھتے ہوئے داور نے پوچھا۔ "سب سامان لے لیا۔"

"ایک چابی ہے ان کے پاس۔" آدمی نے بتایا "وہ انہوں نے اپنے ہی پاس رکھی ہے۔"

"کیوں؟" داور نے کیفی کی طرف دیکھا۔

"وہ میرے گھر کی چابی ہے۔"

"گھر کی چابی ہے' کسی خزانے کی چابی تو نہیں ہے جسے تم اپنے پاس رکھنا چاہتے ہو۔" داور نے خشک لہجے میں کہا "میں نے تم سے کہا تھا کہ تمہیں اپنا سب سامان یہیں چھوڑنا ہوگا۔"

"لیکن چابی..."

"وہ بھی!" داور نے اس کی بات کاٹتے ہوئے زور دے کر کہا۔

کیفی نے ایک طویل سانس لی اور چابی نکال کر داور کے سامنے ڈال دی۔

داور نے دوسرے آدمی سے کہا "اب اسے روم نمبر سات میں لے جاؤ۔" اس کا اشارہ کیفی کی طرف تھا۔

کیفی اس آدمی کے ساتھ وہاں سے چلا گیا۔

داور نے انگلی مار کر چابی منیرے کی طرف کھسکا دی "لو' سنبھالو۔"

منیرے نے وہ چابی اسی طرح سنبھالی جیسے وہ کسی خزانے کی چابی ہو!

پندرہ منٹ بعد وہ دو آدمیوں کے ساتھ ایک کار میں وہاں سے روانہ ہوا۔ کار کی رفتار خاصی تیز تھی۔ جلد ہی کیفی کا گھر قریب آگیا۔

"اس طرف سے چلو۔" منیرے نے ڈرائیونگ کرنے والے سے کہا "میں نہیں چاہتا کہ آس پاس کا کوئی شخص مجھے اس کار سے اترتے دیکھے۔ میں کچھ فاصلے پر ہی کار سے اتر جاؤں گا۔ تم دونوں اس طرف دیکھتے رہنا جدھر میں جاؤں گا۔ کار اس دروازے سے کچھ فاصلے پر ہی رکھنا۔"

ان دونوں آدمیوں نے سب کچھ منیرے کی ہدایت کے مطابق کیا۔

منیرے جب صحن کی طرف کے دروازے کا تالا کھول رہا تھا تو اس کے دل کی دھڑکنیں خاصی تیز تھیں۔

دروازہ کھولتے ہوئے اس نے احتیاط سے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر جلدی سے اندر داخل ہوگیا۔ جمیلہ اس وقت صحن کی الگنی پر دھلے ہوئے کپڑے پھیلا رہی تھی۔ وہ منیرے کو دیکھ کر چونکی۔ منیرے نے جلدی سے دروازہ بند کیا اور اس کی طرف مڑا اور تیزی سے بولا "مجھے کیفی نے بھیجا ہے۔ چابی مجھے اسی نے دی تھی۔"

"بات کیا ہے؟" جمیلہ پریشان ہوگئی۔

"سب بتاتا ہوں۔ کمرے میں چلو۔" منیرے نے تیزی سے قدم بڑھائے۔

جمیلہ اس کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی۔ ایک پلنگ پر ایک بچہ سو رہا تھا۔ غالباً یہ جمیلہ کی عادت تھی کہ کوئی کام کرنے سے پہلے بچے کو سلا دیتی تھی۔

"تجھے کیفی نے بلایا ہے جمیلہ! جلدی سے کپڑے بدل لے۔"

"کہاں بلایا ہے؟" جمیلہ نے پلکیں جھپکائیں۔

"جلدی سے کپڑے بدل لے۔ سب بتادوں گا۔ یہ کپڑے تو گیلے ہو رہے ہیں۔"

جمیلہ نے کھونٹی سے لٹکے ہوئے کپڑے اتارے اور دروازے کی طرف بڑھنے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ منیرے نے جلدی سے کہا "کہاں چلی؟"

"غسل خانے میں جا رہی ہوں۔" جمیلہ نے معصومیت سے کہا "کپڑے بدلنے ہیں نا!"

"نہیں بدل لے۔ میں منہ پھیر کر بیٹھ جاتا ہوں۔"
"نہیں نہیں۔ میں...."
"میں جو تجھ سے کہہ رہا ہوں۔" منیرے نے سختی سے کہا۔
"منیرے!" جمیلہ اسے گھورنے لگی "میں اتنی بھولی بھی نہیں ہوں جتنا تو مجھے سمجھتا ہے۔ بہت دن سے تیری نظر ہے مجھ پر! میں بس کیفی کی وجہ سے کچھ نہیں کہتی تھی۔"
"میں تیرے لیے کیفی سے بہت اچھا ثابت ہوں گا جمیلہ!" منیرے نے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ جمیلہ کو بڑی ہوس ناک نظروں سے دیکھ رہا تھا "تھوڑی دیر میرے ساتھ وقت گزار کر دیکھ لے پھر میں تجھے بہت دور لے چلوں گا یہاں سے!"
جمیلہ اسے گھورتی رہی "صحن کے دروازے کی چابی تیرے پاس کہاں سے آئی؟"
"بس کسی طرح آگئی۔" منیرے نے ڈھٹائی سے مسکراتے ہوئے کہا "تیرے لیے بہت پاپڑ بیلے ہیں میں نے!"
"چلا جا یہاں سے!" جمیلہ نے سخت لہجے میں کہا۔
"بے وقوفی مت کر!" منیرے اس کی طرف بڑھا۔
"میرے قریب آیا تو شور مچادوں گی۔" جمیلہ نے دانت پر دانت جما کر کہا۔
جمیلہ کے تیور دیکھ کر منیرے ٹھٹک گیا اور سخت لہجے میں بولا "تو واقعی اتنی بھولی نہیں ہے جتنی میں سمجھتا تھا۔"
"بس تو پھر اب چلا جا یہاں سے!"
"یہ سنہری موقع تو میں ہاتھ سے نہیں جانے دوں گا۔"
"تو میرے قریب آیا تو اچھا نہیں ہوگا۔"
"ٹھیک ہے۔" منیرے عیاری سے مسکرایا "اب تو خود میرے پاس آئے گی!" وہ جھپٹ کر اس پلنگ کے قریب گیا جس پر جمیلہ کا بچہ سو رہا تھا۔ اس نے اپنی جیب سے ایک چاقو نکالا جو ایک جھٹکے سے کھل گیا۔ چاقو کا پھل لمبا اور چمک دار تھا۔ منیرے نے چاقو کی نوک سوتے ہوئے بچے کی گردن پر رکھ دی اور جمیلہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اب اگر تو میرے پاس نہیں آئی تو یہ چاقو تیرے بچے کی گردن کے پار ہو جائے گا۔"
جمیلہ کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ اس نے کھونٹی سے جو کپڑے اتارے تھے، وہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر گئے۔
"بس ٹھیک ہے۔" منیرے مسکرایا "اب آجا میرے قریب!"
جمیلہ نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی۔ اس کی سانس بہت تیزی سے چلنے لگی تھی۔
"آ رہی ہے یا نہیں؟" منیرے نے سخت لہجے میں کہا۔ "تجھے یقین کر لینا چاہیے کہ میں نے جو کچھ کہا ہے، اس پر عمل بھی کروں گا۔ کیا میں تجھے یقین دلاؤں؟ کیا چاقو کی تھوڑی سی نوک تیرے بچے کی گردن میں اتار دوں؟"
"نہیں۔" جمیلہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے "میرے بچے پر یہ ظلم نہ کر منیرے!"
"میں کسی پر کوئی ظلم نہیں کرنا چاہتا۔ بس میرے قریب آجا۔"
"میں تیرے دوست کی بیوی ہوں۔" جمیلہ کی آواز کانپ گئی۔
"میں صرف تیرا دوست بننا چاہتا ہوں۔" منیرے ڈھٹائی سے مسکرایا "جلدی سے قریب آجا۔ میرا صبر مت آزما!"
"میرے بچے سے دور ہٹ جا منیرے!" جمیلہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔
"تو میرے قریب آجا۔ میں بچے سے دور ہٹ جاؤں گا۔" منیرے نے بڑے اطمینان سے کہا۔
"تو یہ بہت برا کرے گا!" جمیلہ کے ہونٹ کانپنے لگے۔
"میرے قریب آ!" منیرے کے لہجے میں سختی تھی۔
جمیلہ آنسو بہاتی ہوئی آہستہ آہستہ قریب آنے لگی اور منیرے کا دورانِ خون تیز ہونے لگا۔ آنے والے لمحوں کا تصور اس کے جسم میں ہیجان برپا کرنے لگا تھا۔
"اب میرے بچے سے دور ہٹ جا!" جمیلہ نے قریب آ کر کہا۔
"پہلے یہ سب تو اتار!" منیرے نے ایک جھٹکے سے جمیلہ کا دوپٹا کھینچ لیا۔
"او کمینے! میں ابھی زندہ ہوں۔" دینو کاکا کی آواز سنائی دی۔
منیرے نے چونک کر صحن کی طرف کے دروازے کی طرف دیکھا۔
"یہ تیری موت کا دن ہے منیرے!" دینو کاکا نے دروازے میں کھڑے کھڑے اسے گھورتے ہوئے کہا "خدا نے بہت اچھا کیا کہ آج میری طبیعت خراب کر دی اور میں کارخانے نہیں گیا۔ میں اپنے کمرے میں سو رہا تھا لیکن تیری آواز نے مجھے جگا دیا!"
منیرے کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اس وقت اس کے جسم میں نفسانی آگ بھڑکی ہوئی تھی۔ وہ دانت پیستا ہوا بولا۔

"بڈھے! تو میری آواز سے جاگا ہے اب میں تجھے چاقو سے ہمیشہ کے لیے سلا دوں گا فکر مت کر....."

دینو کاکا اس کے لہجے سے ذرا بھی خوف زدہ نہیں ہوا اور اپنی بیٹی سے بولا "اپنا دوپٹا اٹھا جمیلہ.... اس کمینے کو میں دیکھ لوں گا۔"

جمیلہ نے جلدی سے اپنا دوپٹا اٹھایا۔

منیرے چاقو سنبھالے ہوئے دینو کاکا کی طرف بڑھا۔

اسی وقت سامنے کے دروازے کو کسی نے زور سے پیٹ ڈالا اور ایک چیختی ہوئی آواز سنائی دی "جمیلہ!.... جمیلہ۔"

جمیلہ نے جلدی سے اپنے بچے کو پلنگ سے اٹھایا اور سامنے کے دروازے کی طرف دوڑی۔

منیرے بپھرے ہوئے سانڈ کی طرح بہت تیزی سے دینو کاکا کی طرف بڑھا۔ چاقو اس کے ہاتھ میں تھا۔ دینو کاکا نے اس کی زد سے بچنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہو سکا لیکن اس کا دایاں ہاتھ جو اس کی پشت پر تھا' سامنے آگیا۔ ہاتھ میں ایک لمبی چھری تھی۔ منیرے کا چاقو اس کے سینے میں اور دینو کاکا کے ہاتھ میں دبی ہوئی چھری منیرے کی گردن کے پار ہوگئی۔

دینو کاکا ایک کراہ کے ساتھ گرا۔ اس کے ساتھ ہی منیرے بھی گر گیا۔ اس کے گلے سے خرخراہٹ کی آواز نکل رہی تھی۔

جمیلہ نے سامنے کا دروازہ کھول دیا۔



آدھے گھنٹے کے اندر اندر کیفی میں اتنی تبدیلیاں کر دی گئی تھیں کہ داور نے کسی آدمی کی تصویر سے اس کا موازنہ کیا تو بہت مطمئن نظر آنے لگا۔

"تم نے شاندار کام کیا ہے۔" داور نے تحسین آمیز لہجے میں اس آدمی سے کہا جس نے کیفی میں وہ تبدیلیاں کی تھیں پھر وہ کیفی سے بولا "اب برابر کے کمرے میں آجاؤ۔ اس آدمی کی وڈیو دیکھ لو۔ اس کے چلنے کے انداز کی نقل تم آسانی سے اتار لو گے۔ اس کی چال بھی تم سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔"

کیفی خاموشی سے اٹھ کر داور کے ساتھ برابر کے کمرے میں آگیا۔ وہاں ایک تیسرے آدمی نے وی سی آر میں کیسٹ لگائی۔ ٹی وی پہلے ہی آن کر دیا گیا تھا۔

داور کی جیب میں پڑے ہوئے موبائل فون نے کسی کی کال کی آمد کا اعلان کیا۔ داور نے جیب سے موبائل نکالتے ہوئے اپنے آدمی سے کہا "ٹی وی کی آواز کم کرو۔"

آواز کم کر دی گئی۔ داور نے کال ریسیو کی "ہیلو!"

"ایک گڑبڑ ہوگئی ہے سر!" دوسری طرف سے آواز آئی۔

"کیا ہوا؟" داور نے جلدی سے پوچھا۔

"اس نے اپنا پروگرام بدل دیا ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ وہ ایک گھنٹے بعد ہی اپنے دفتر سے اٹھ جائے گا۔"

"اوہ!" داور پریشان نظر آنے لگا۔

"اب کیا کیا جائے سر؟" دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

"فوراً ایکشن میں آجاؤ۔" داور نے تیزی سے کہا "میں فوراً وہاں پہنچ رہا ہوں۔ پون گھنٹے کے اندر اندر باڈی گارڈ تمہارے قبضے میں ہونا چاہیے۔"

"اوکے سر!"

داور نے رابطہ منقطع کیا اور بے چینی سے کہا "کیسٹ چلاؤ۔ ٹی وی کی آواز بند ہی رکھو۔ آواز کی کیا ضرورت ہے؟"

وی سی آر چلایا گیا اور چند لمحے بعد ہی ٹی وی اسکرین پر ایک شخص دکھائی دیا جو تیزی سے ایک فٹ پاتھ پر چل رہا تھا۔ اس وقت کیفی کی وضع قطع اس آدمی سے بہت ملتی جلتی تھی۔

داور نے کیسٹ لگانے والے کو اشارے سے قریب بلا کر دھیمی آواز میں اس سے کچھ کہا۔ وہ آدمی سرہلا کے کمرے سے چلا گیا۔

ٹی وی اسکرین پر مناظر بدلتے رہے لیکن ہر منظر میں اسی آدمی کو دکھایا گیا تھا۔

"اس کی چال پر غور کر رہے ہو نا؟" داور نے کیفی سے پوچھا۔

"ہوں۔" کیفی نے اثبات میں سرہلا دیا۔

"تمہارے پاس صرف پانچ منٹ ہیں۔" داور نے کہا "اس کے چلنے کے انداز کی نقل شروع کردو۔"

کیفی کھڑا ہوگیا۔ اس نے ٹیلی وژن پر نظریں جمائیں اور چلنا شروع کیا۔

داور نے بے چینی سے اپنی گھڑی پر نظر ڈالی۔ کیفی چلنے کی مشق کرتا رہا۔ داور نے جس آدمی کو بھیجا تھا' وہ پانچ منٹ بعد ایک بریف کیس لے کر آیا۔ داور نے بریف کیس اپنے پاس رکھ لیا اور ایک منٹ تک کیفی کی طرف دیکھنے کے بعد سرہلا کر بولا "بس ٹھیک ہے۔ اس حد تک بھی کافی ہے۔" پھر وہ اپنے آدمی سے بولا "ٹی وی اور وی سی آر بند کر کے تم

جاؤ۔ کچھ دیر اس کمرے میں کوئی نہ آئے۔"
کیفی اسی صوفے پر آبیٹھا جس پر پہلے بیٹھا تھا۔ وی سی آر اور ٹی وی بند کرکے وہ آدمی چلا گیا تو داور نے کیفی کی طرف دیکھتے ہوئے بریف کیس پر ہاتھ رکھا۔
"یہ بالکل ویسا ہی بریف کیس ہے جیسا باڈی گارڈ کے ہاتھ میں رہتا ہے۔ تم یہ ہاتھ میں لے کر ہی اس کمرے سے نکلو گے۔ کار میں بیٹھنے کے بعد.... میرا مطلب ہے اس وقت جب کار حرکت میں آجائے گی... اس وقت تم تھوڑا سا پیچھے کی طرف مڑ کر مغوی سے کہو گے کہ وہ کار کا راستہ تبدیل کرنے پر کوئی احتجاج نہ کرے ورنہ اسے فوراً گولی مار دی جائے گی۔ تم اسے ریوالور دکھاؤ گے۔"
"ریوالور؟" کیفی چونکا۔
"ہاں۔" داور نے اپنی جیب سے ایک ریوالور نکالا "یہ تم اپنے کوٹ کی جیب میں رکھو گے۔"
"میں نے کبھی ریوالور نہیں چلایا۔" کیفی نے آہستہ سے کہا۔
"اب بھی تمہیں اس کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔" داور نے کہا۔
"یہ تو بہت خطرناک کام ہو جائے گا۔" کیفی ریوالور کی طرف دیکھتا ہوا بڑبڑایا۔
"بالکل خطرناک نہیں ہوگا۔" داور نے کہا "تمہیں گولی چلانا ہی نہیں پڑے گی۔"
کیفی نے ریوالور ہاتھ میں لے کر اس کا چیمبر دیکھا۔ اس میں گولیاں بھری ہوئی تھیں۔
کیفی کچھ سوچتا رہا پھر بولا "میں باڈی گارڈ کی جگہ کیسے لوں گا؟ میرا مطلب ہے، اس کے کمرے میں کس طرح پہنچوں گا۔"
"ابھی تم میرے ساتھ چلو گے۔ یہ کام میرا ہے کہ تمہیں اس باڈی گارڈ کے کمرے میں کس طرح پہنچایا جائے گا۔"
کیفی نے بریف کیس کی طرف دیکھا "اس میں کیا ہے؟"
"اس میں کوئی خاص چیز نہیں ہے۔ یہ بس دکھاوے کے لیے ہے چونکہ باڈی گارڈ کے پاس ایسا بریف کیس ہوتا ہے، اس لیے یہ تمہارے ہاتھ میں ہونا چاہیے۔"
"تو یہ بریف کیس لے جانے کی کیا ضرورت ہے۔ جب باڈی گارڈ تمہاری گرفت میں آجائے گا تو اس کا بریف کیس بھی تمہارے قبضے میں ہوگا۔ تم وہی بریف کیس مجھے دے دینا۔"
"تم کو یہ سب کچھ سوچنے کی ضرورت نہیں ہے۔" داور نے خشک لہجے میں کہا "تین لاکھ روپیا تمہیں کام کرنے کے لیے دیا گیا ہے، سوالات کرنے کے لیے نہیں۔"
"لیکن مجھے اپنی موت سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"
"موت تمہیں کہاں نظر آگئی؟" داور خشک لہجے میں بولا۔
"اس بریف کیس میں میری موت بھی ہو سکتی ہے۔" کیفی نے سنجیدگی سے کہا "میں چاہتا ہوں کہ یہ مجھے کھول کر دکھایا جائے۔"
داور کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں۔ وہ کیفی کو گھورنے لگا۔ کیفی نے بھی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور بولا "مجھے یقین ہے کہ اس بریف کیس میں کوئی دھماکا خیز مادہ ہوگا۔ شاید ٹائم بم ہو۔ تم کچھ عرصے پہلے بھی ایک ایسی واردات کر چکے ہو مسٹر داور! ایک گاڑی دھماکے سے اڑوا چکے ہو تم!"
داور کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اس کا دایاں ہاتھ تیزی سے اپنے کوٹ کی جیب کی طرف بڑھا۔
"نہیں داور! ریوالور یا پستول نکالنے کی حماقت نہ کرنا۔" کیفی نے تیزی سے کہتے ہوئے ریوالور کا رخ داور کی طرف کر دیا "یہ ریوالور مجھے دے کر تم اپنے حق میں کانٹا بو چکے ہو!"
داور نے ہونٹ بھینچ لیے۔ وہ کیفی کو گھورتا ہوا بھرائی ہوئی سی آواز میں بولا "تمہارے بارے میں مجھے غلط رپورٹ ملی تھی۔ تم سیدھے سادے چھوٹے موٹے جرائم پیشہ نہیں ہو۔"
"جب میں تم سے نہیں ملا تھا، ایک چھوٹا موٹا ہی جرائم پیشہ تھا۔" کیفی نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا "تم سے ملنے کے بعد ہی میرے دماغ میں خیال آیا کہ مجھے اب بڑے کام کرنا چاہئیں۔ جب میں تم سے ملا تھا تو تمہیں پہچان گیا تھا۔ جو گاڑی تم نے دھماکے سے اڑائی تھی، اس سلسلے میں پولیس کو تم پر شبہ تھا۔ اس سلسلے میں تم سے پوچھ گچھ بھی کی گئی تھی لیکن پولیس کو تمہارے خلاف کوئی ثبوت نہیں مل سکا تھا اس لیے تمہیں گرفتار نہیں کیا جا سکا تھا۔"
"تم کو یہ ساری باتیں کہاں سے معلوم ہوئیں؟"
"یہ بات چھوڑو کہ مجھے یہ سب کچھ کیسے معلوم ہوا! یہ بتاؤ کہ تم مجھے موت کے منہ میں کیوں دھکیلنا چاہتے تھے؟ کیا اس بریف کیس میں ٹائم بم نہیں ہے؟"
"تم بہت ہوشیار ہو۔" داور نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"ٹھیک ہے۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ اس بریف کیس میں ٹائم بم ہے لیکن میں تمہیں موت کے منہ میں دھکیلنا نہیں چاہتا تھا۔"

"واہ!" کیفی تلخی سے ہنسا "میں اس کار میں بیٹھا ہوتا اور یہ بریف کیس دھماکے سے پھٹتا تو....."

"تم کو میں نے ابھی اپنا پورا منصوبہ نہیں بتایا تھا۔" داور نے کہا "یہ میرا خاص طریقۂ کار ہے کہ مناسب وقت سے پہلے سب کچھ نہیں بتاتا۔ ابھی ہم یہاں سے روانہ ہوتے تو میں تمہیں بتاتا کہ کار جب ایک خاص مقام پر پہنچے گی تو روک دی جائے گی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوا آدمی پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص کو بے ہوش کردے گا۔ پھر تم اس کے ساتھ کار سے اتر کر جلد از جلد دور نکل جاؤ گے۔ بریف کیس گاڑی ہی میں چھوڑ دیا جاتا جو ایک منٹ بعد پھٹتا۔ اب تم میرے پورے منصوبے سے واقف ہوگئے ہو لہٰذا اب یہ مخالفانہ فضا ختم کرو۔ تم نے ریوالور کا رخ اب بھی میری طرف کر رکھا ہے جس کی اب ضرورت نہیں ہے۔"

"ضرورت تو ہے مسٹر داور!" کیفی نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا "جب تک پولیس اس کمرے میں نہ پہنچ جائے، یہ ضروری ہے کہ میں تمہیں کسی قسم کی حرکت نہ کرنے دوں۔"

داور کے چہرے کا رنگ ایک بار پھر بدلا "تم.... تم..." وہ اپنی بات مکمل نہیں کرسکا۔

"ہاں۔" کیفی نے مسکراتے ہوئے کہا "میں پولیس کے لیے کام کررہا ہوں اور اب تک ہم دونوں میں جو باتیں ہوئی ہیں، وہ سب پولیس بھی سن چکی ہے۔ میرے بائیں پیر کے جوتے کے تلے میں ایڑی کے پاس ایک چھوٹی سی ڈیوائس لگی ہوئی ہے جو اس کمرے کی ہر آواز نشر کرتی رہی ہے۔ اس مکان کے قریب ہی پولیس موجود ہے جس نے ایک ریسیور پر ہماری سب باتیں سنی ہوں گی اور ریکارڈ بھی کرلی ہوں گی۔ وہ لوگ حرکت میں آچکے ہوں گے داور! انہیں اب اس کمرے تک پہنچ جانا چاہیے۔ اس مکان میں تمہارے جتنے آدمی ہیں، انہیں بڑی آسانی سے گرفتار کرلیا گیا ہوگا۔"

داور کا چہرہ سفید پڑ گیا۔

اسی وقت دروازہ ایک پرشور آواز کے ساتھ کھلا۔ جو آدمی اندر آیا، اس کے ہاتھ میں ایک گن تھی جس کا رخ داور کی طرف کردیا گیا تھا۔ اس آدمی کے بعد باوردی پولیس والے بھی کمرے میں گھستے چلے آئے!



جب پولیس جیپ کے ریسیور پر داور اور کیفی کی باتیں سنی جارہی تھیں تو جیپ میں موجود پولیس افسر موبائل فون پر ایک ایک لمحے کی رپورٹ ڈی آئی جی رضا کو دیتا جارہا تھا اور اس وقت ماہین بھی اپنے چچا کے ساتھ تھی۔

ڈی آئی جی رضا کو اپنے ٹیلی فون پر بھی ایک اطلاع موصول ہوئی تھی اور اس نے ماہین کو بتایا کہ منیرے دو آدمیوں کے ساتھ ایک کار میں کیفی کے گھر کے قریب پہنچ چکا ہے۔

ماہین کے لیے وہ تشویش ناک اطلاع تھی۔ اس کے ذہن میں خیال ابھرا تھا کہ منیرے کا اس طرف جانا شاید جمیلہ کے لیے خطرناک ثابت ہو! اس نے ڈی آئی جی رضا سے اپنے خدشے کا اظہار کردیا اور پھر اپنی کار میں آندھی طوفان کی طرح کیفی کے گھر کی طرف روانہ ہوگئی تھی۔

لیکن جب وہ کیفی کے گھر پہنچی تو اسے کچھ دیر ہوچکی تھی۔ دینو کاکا کے ہاتھوں سے منیرے اور منیرے کے ہاتھوں سے دینو کاکا مارا جاچکا تھا۔

جمیلہ نے جب دروازہ کھولا تو وہ بہت خوف زدہ نظر آرہی تھی۔ اس کے چہرے پر ایسی لکیریں بھی تھیں جیسے وہ روتی رہی ہو۔



ڈیڑھ گھنٹے بعد کیفی اور ماہین کا منگیتر شہاب بھی وہاں موجود تھے۔ پولیس اپنی کارروائی میں مصروف تھی۔ دینو کاکا اور منیرے کی لاشیں اسپتال بھیجی جاچکی تھیں۔

جمیلہ کا رو رو کر برا حال ہوگیا تھا۔ پاس پڑوس کی کچھ عورتیں آگئی تھیں جنہوں نے اسے سنبھالنے کی کوشش کی تھیں۔ جمیلہ کا بچہ پڑوس کی ایک جوان لڑکی نے سنبھال لیا تھا لیکن کیفی نے وہاں آنے کے بعد بچے کو اپنی گود میں سنبھال لیا تھا۔

"کیفی!" ماہین نے افسردہ لہجے میں کہا "نیکی کی راہ پر آکر تمہیں ایک بہت بڑی قربانی دینا پڑی۔ گوکہ تم اپنے سسر کو پسند نہیں کرتے تھے لیکن اب تمہیں اندازہ ہوا ہوگا کہ گھر میں کسی بزرگ کی موجودگی کتنی اہمیت رکھتی ہے۔ اگر دینو کاکا نے اپنی زندگی قربان نہ کی ہوتی تو تمہاری بیوی کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہ جاتی۔"

کیفی نظریں جھکائے بیٹھا رہا۔ اسے بتایا جاچکا تھا کہ اس کی عدم موجودگی میں منیرے نے وہاں آکر کیا کرنا چاہا تھا۔

ماہین قدرے توقف سے بولی "میں نے تم سے یہ بھی کہا تھا کہ جرائم کی دنیا کے دوست کبھی ایک دوسرے کے دوست

نہیں ہوتے۔ تمہیں منیرے پر بہت اعتماد تھا لیکن اس نے تمہاری ہی عزت پر ڈاکا مارنے کی کوشش کی تھی۔"

کیفی کی نظریں اب بھی جھکی رہیں۔ وہ بہت اداس نظر آرہا تھا۔

چند لمحے کی خاموشی کے بعد شہاب نے ماہین سے پوچھا۔ "تم یہاں کب تک رکو گی؟"

"تم یہاں کیسے پہنچے؟" ماہین الٹا اس سے سوال کر بیٹھی۔

"یہاں کا پتا مجھے ڈیڈی نے بتایا تھا۔ تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔"

"میں چاہتی ہوں کہ جمیلہ کچھ اور سنبھل جائے۔ اس کے بعد میں اسپتال جاؤں گی۔ دینو کاکا کی لاش کا پوسٹ مارٹم ہوجائے تو میں ہی ان کی لاش لے کر آؤں گی اور ان کی تدفین کے بعد گھر لوٹوں گی۔ تم اگر چاہو تو چلے جاؤ۔"

"نہیں۔" شہاب نے سنجیدگی سے کہا "میں تمہارے ساتھ ہی جاؤں گا۔"

ماہین چپ ہوگئی۔

ایک گھنٹے بعد جمیلہ کی حالت جب کسی حد تک اطمینان بخش ہوگئی تو ماہین نے کیفی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر آہستہ سے کہا "میں دینو کاکا کی لاش لینے اسپتال جارہی ہوں۔"

کیفی نے تشکر آمیز نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر سر جھکا لیا۔

ماہین کے ساتھ شہاب بھی باہر نکلا۔ ماہین نے اپنی کار کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔ شہاب کی کار بھی وہاں موجود تھی لیکن وہ ماہین ہی کی کار میں اس کے برابر کی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

ماہین نے کار حرکت میں لاتے ہوئے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا "تم یقیناً یہ جاننے کے لیے بے چین ہو کہ یہ سب کیا ہوا ہے؟"

"میرا متجسس ہونا قدرتی بات ہے۔" شہاب نے سنجیدگی سے کہا۔

ماہین چند لمحے خاموشی سے کار چلاتی رہی پھر اس نے کہا۔ "یہاں تک تو میں تمہیں بتا ہی چکی تھی کہ میں نے کیفی کو اس کے مکان کی قیمت ادا کردی تھی جس سے وہ کوئی کاروبار شروع کرتا اور جو وہ بہرحال شروع کرے گا۔ میری توقع کے خلاف وہ بہت جلد اپنی برائیوں سے تائب ہوگیا شہاب! مجھے اس بات کی بہت خوشی ہے کہ اس نے جرائم کے خلاف قانون کا ساتھ دینے کی کوشش بھی کی۔ منیرے نے اس سے مل کر اسے بتایا تھا کہ کسی بڑے آدمی کو اغوا کرنے کے سلسلے میں کسی کو اس کی ضرورت ہے اور اس کام کے عوض کیفی کو تین لاکھ روپے مل سکتے ہیں۔ کیفی نے منیرے کی بات مان لی لیکن دل میں اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ اب جرائم پیشہ لوگوں کے خلاف کام کرے گا چنانچہ اس نے مجھے وہ سب بتادیا جو منیرے سے طے ہوا تھا۔"

"کیا طے ہوا تھا؟" شہاب نے پوچھا۔

ماہین نے وہ ساری باتیں دہرا دیں جو [illegible] کے مابین ہوئی تھیں پھر اس نے کہا "کیفی سے مجھے جو پتا [illegible] ہوا، وہاں داور رہتا تھا اور مجھے داور کے بارے میں پولیس کے شکوک و شبہات کا علم تھا۔ میں نے ان سب باتوں سے انکل کو آگاہ کیا اور اس کے بعد منصوبہ بنایا گیا کہ کیفی کے ذریعے داور پر کس طرح ہاتھ ڈالا جائے۔"

"وہ آدمی کون ہے جسے داور اغوا کروانا چاہتا تھا؟"

"اغوا کی بات بنیادی نہیں تھی۔ داور کا اصل پروگرام یہ تھا کہ مغوی کی کار بم سے اڑا دی جائے۔"

"مغوی؟"

"وہ ہوم منسٹر کا ایک اہم افسر تھا۔ کیفی کو اس افسر کے باڈی گارڈ کی جگہ لینا تھی۔ اصل باڈی گارڈ کو داور کے چند آدمیوں نے اپنے قبضے میں لے لیا تھا۔"

"یہ کیسے معلوم ہوا کہ وہ ہوم منسٹر کا کوئی افسر ہے؟"

"ابھی ذرا دیر پہلے مجھے موبائل پر انکل نے اطلاع دی تھی اور اس بارے میں بتایا تھا۔" ماہین نے جواب دیا "[illegible] باڈی گارڈ کو اپنے قبضے میں کرنے کے بعد داور کے آدمی انتظار کرتے رہے تھے کہ داور، کیفی کو لے کر وہاں پہنچے گا لیکن جب مقررہ وقت پر دونوں وہاں نہیں پہنچے تو داور کے [illegible] باڈی گارڈ کو بے ہوشی کی حالت میں چھوڑ کر وہاں سے بھاگ نکلے پھر اس وقت ہوم منسٹر کے دفتر میں ہلچل مچ گئی جب [illegible] گارڈ کو بے ہوش پایا گیا۔"

شہاب نے ایک طویل سانس لی اور بولا "تم نے مجھے [illegible] کچھ بتادیا لیکن اب بھی سب کچھ مجھے بے [illegible] ہے۔"

"وہ تو ہوگا ہی! میں تمہیں تفصیل سے اور ایک [illegible] سے سب کچھ بتاتی لیکن تم بیچ بیچ میں سوال کرتے رہے۔"

"اچھا تو اب بتاؤ شروع سے!"

ماہین نے ابتدا سے ساری کہانی بیان کرنا شروع کی۔ اس مرتبہ شہاب خاموشی سے سب کچھ سنتا رہا اور کار تیز رفتاری سے اسپتال کی طرف بڑھتی رہی!

تنہائی سے خوفزدہ ہوکر سناٹوں کو گلے لگانے والی ایک حسینہ کی پرعزم روداد

آخری رابطہ

ایچ اقبال

تن کے داغ تو دھل جاتے ہیں، پر من کے داغ کہاں جاتے ہیں... جو ہمیشہ کسی نہ کسی غلطی یا غلط فہمی کی یاد دلاتے رہتے ہیں۔ کچھ لوگ اپنے اردگرد لاتعلقی کی اتنی اونچی دیواریں اٹھا لیتے ہیں کہ انہیں نہ تو اپنی ذات سے باہر جھانکنے کی فرصت ملتی ہے اور نہ ہی موسم کے بدلنے کی کچھ خبر... اس کی ذات بھی کچھ ایسی ہی گم صم تھی جو سطر سطر بڑی خاموشی سے اپنے جذبات کو رقم تو کر رہی تھی مگر اس کے نصیبوں کے نصاب میں کوئی اور ہی داستان لکھی جارہی تھی... وہ جو مجسم ایثار تھی... جس کی شخصیت پُربہار تھی... مگر گلشنِ زیست میں اس کی حیثیت فقط خار سے زیادہ نہ تھی۔ دوسروں کی مرضی پر چلتے چلتے جب نارسائی کے مرض میں مبتلا ہوئی تو اس کے پاس ازالے کے طور پر اپنے خوابوں کو گروی رکھنے کے علاوہ اور کوئی اثاثہ نہ تھا... سو وہ یہ کام بھی کر گزری کہ... تعلق ٹوٹ جانے سے محبت مر نہیں جاتی... بلکہ کسی بھی صورت میں ڈھل جائے، زندہ رہتی ہے۔





چند باتیں کرنے کے بعد وہ دونوں بینچ پر کچھ دیر سے خاموش اور کھوئے کھوئے سے بیٹھے تھے۔ دونوں کے چہروں سے حزن و ملال کا اظہار ہو رہا تھا۔ لڑکی زیادہ اداس نظر آرہی تھی۔ اس کا نام شاہانہ تھا۔ وہ اپنے نوجوان ساتھی سے تین ساڑھے تین سال چھوٹی معلوم ہوتی تھی اس کے ساتھی کا نام عزیر تھا۔

وہ دونوں شہر کے ایک پوش علاقے کے ایک پارک میں بیٹھے تھے اس لیے وہاں آنے جانے والوں کے واسطے اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی کہ ایک نوجوان جوڑا وہاں ایک بینچ پر تنہا بیٹھا ہوا تھا۔

''خاصا وقت گزر گیا۔'' شاہانہ اس سکوت کو توڑتے ہوئے قدرے گھٹی گھٹی سی آواز میں بولی۔ ''اب اور بیٹھے رہے تو واپسی میں مجھے رات ہوجائے گی یا کم از کم اندھیرا تو پھیلنے ہی لگے گا۔''

''ہوں!'' عزیر نے گم صم انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ ''تو اٹھیں؟''

''ہاں۔'' شاہانہ نے کہا۔ ''لیکن چلتے چلتے اپنی بات ایک بار پھر دہرا دو۔''

''اس سے کیا فرق پڑے گا؟''

''میں سمجھوں گی کہ تم نے بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہوگا!''

''سوچنے سمجھنے کے لیے مجھے بہت وقت ملا تھا شاہانہ!'' عزیر نے کہا۔ ''تم نے مجھے فون پر کل رات ہی سب کچھ بتا دیا تھا۔ اس وقت کی ملاقات تو رسمی سی تھی، رسمی ملاقات...... اور شاید آخری۔''

شاہانہ جیسے تڑپ گئی۔ ''کیوں؟ آخری کیوں؟''

''شادی کے بعد یہ مناسب نہیں ہوگا شاہانہ کہ تم مجھ سے ملو!''

''مگر کیوں؟'' شاہانہ بحث پر آمادہ ہوگئی۔ ''کیا شادی کے بعد لڑکیاں اپنی سہیلیوں سے، اپنے دوستوں سے ملنا چھوڑ دیتی ہیں؟ مجھے بتایا گیا ہے کہ وہ بے حد آزاد خیال گھرانا ہے۔ وہاں میرے دوستوں کا کوئی نوٹس نہیں لیا جائے گا۔''

''عام دوستوں میں اور مجھ میں فرق ہے۔''

''کیا فرق ہے عزیز؟'' شاہانہ کے لہجے میں کرب تھا۔

''بہت فرق ہے۔'' عزیر نے سمجھانے کی کوشش کی۔ ''جب ہم ملیں گے تو ہماری آنکھیں بھی چار ہوں گی اور اس وقت ہماری آنکھوں میں جو تاثر ہوگا، وہ کسی بھی زیرک شخص سے پوشیدہ نہیں رہ سکتا۔ اس کا اثر تمہاری ازدواجی زندگی پر بھی پڑسکتا ہے۔''

''مجھ کوئی اثر نہیں پڑے گا۔'' شاہانہ ضد پر اتر آئی۔

عزیر نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''شاید میرے پاس وہ الفاظ نہیں کہ میں تمہیں سمجھا سکوں۔''

''تم چاہتے ہو کہ میری شادی کے بعد تم مجھ سے کبھی نہ ملو؟''

''ہاں، میں یہی مناسب سمجھتا ہوں۔''

''تم مجھے بھول جاؤ گے؟'' شاہانہ کی آواز بھرا گئی۔

عزیر نے کچھ رک کر جواب دیا۔ ''شاید یہ آسان نہ ہو لیکن میں کوشش کروں گا۔''

''تمہارا لہجہ کہہ رہا ہے کہ تم مجھ سے ہی نہیں، اپنے آپ سے بھی جھوٹ بول رہے ہو لیکن میں جھوٹ نہیں بولوں گی۔ میں تمہیں کبھی نہیں بھول سکتی عزیز!'' شاہانہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

''چلو اٹھو!...... دیر نہیں ہونا چاہیے تمہیں!'' عزیر نے کہا۔ ''تم جہاں سے ٹیکسی کرتی ہو، وہاں تک پہنچنے میں بھی پندرہ منٹ لگیں گے۔ ہم کچھ باتیں راستے میں بھی کرسکتے ہیں۔''

شاہانہ کھوئے کھوئے سے انداز میں کھڑی ہوگئی۔ وہ دونوں پارک کے پھاٹک کی طرف بڑھنے لگے۔

''تمہیں مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہوگا عزیر!'' شاہانہ بولی۔

عزیر نے مستفسرانہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ بڑے مضبوط لہجے میں بولی۔ ''تم شادی کے بعد بھی مجھ سے ملتے رہو گے۔ میں تمہیں دیکھ کر ہی شاید زندہ رہ لوں، اگر دیکھوں گی بھی نہیں تو مر جاؤں گی۔''

''مگر......''

''تمہیں یہ وعدہ کرنا ہی ہوگا۔'' شاہانہ نے اس کی بات کاٹی۔ ''اگر تم یہ وعدہ نہیں کرو گے تو میں یہ شادی نہیں کروں گی۔''

''خود غرض بن جاؤ گی؟ اپنے گھر والوں کا بھی خیال نہیں کرو گی؟''

''انہوں نے کب میرا خیال کیا ہے!'' شاہانہ نے تلخی سے کہا۔

''تم نے مجھے ان کی مجبوریاں بتائی تھیں۔''

''میں نہ ہوتی، تب بھی وہ مجبوریاں ہوتیں۔ اس وقت وہ کسے سہارا بناتے؟ سہارے کے بغیر بھی مجبوریوں کا وقت کسی نہ کسی طرح گزر ہی جاتا ہے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے شاہانہ لیکن......''

شاہانہ نے پھر اس کی بات کاٹ دی۔ ”میں اب کچھ اور نہیں سننا چاہتی عزیر! تمہیں یہ وعدہ کرنا ہی ہوگا، ورنہ میرا فیصلہ بھی اٹل سمجھو۔ میں یہ شادی نہیں کروں گی۔“

عزیر نے ایک طویل سانس لی۔ ”اچھا! میں وعدہ کرتا ہوں۔“

شاہانہ کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آگئی لیکن وہ مسکراہٹ بھی اداسی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس نے کہا۔ ”میں اس کے لیے تمہارا شکریہ ادا نہیں کروں گی۔“

عزیر کچھ نہیں بولا۔ وہ دونوں پارک سے نکل آئے تھے۔ عزیر کی کار کچھ ہی فاصلے پر موجود تھی۔ وہ دونوں اس کی طرف بڑھے۔ شاہانہ جب عزیر سے ملنے پارک آتی تھی تو ٹیکسی میں آتی تھی۔ واپسی پر عزیر اسے اپنی کار میں ایک ایسی جگہ تک پہنچا دیتا تھا جہاں سے وہ گھر تک ڈھائی تین میل کا فاصلہ ٹیکسی سے طے کرتی تھی۔ مقصد یہی تھا کہ اس کے گھر والے یا آس پاس کے لوگ اسے عزیر کے ساتھ اس کی کار میں نہ دیکھیں۔

جب کار چل پڑی تو عزیر نے کہا۔ ”میں نے وعدہ تو کرلیا ہے لیکن اگر اس طرح تمہاری ازدواجی زندگی پر کوئی آنچ آئی تو اس کی ذمے داری مجھ پر عائد نہیں ہوگی۔“

”مجھے اس ازدواجی زندگی سے اتنا پیار نہیں ہوجائے گا کہ اس پر کوئی آنچ آنے سے مجھے پریشانی لاحق ہو!“

عزیر نے ایک طویل سانس لی۔ ”گویا تم ایک اچھی بیوی نہیں بننا چاہتیں؟“

”میں نے یہ نہیں کہا۔“ شاہانہ بولی۔ ”لیکن کسی اچھی بیوی کو شکوک و شبہات کی نظر سے نہیں دیکھا جانا چاہیے۔ تم مجھ سے میرے ایک دوست کی حیثیت سے ملو گے اور دوست کو کچھ اور سمجھ لینا زیادتی کی بات ہے۔ میرا اور تمہارا معاملہ صرف محبت کا ہے۔ ہم نے کسی اخلاقی حد تک سے تو کبھی تجاوز نہیں کیا!“

”کسی کی زبان روکی جاسکتی ہے، سوچ پر قدغن نہیں لگائی جاسکتی!“

”مجھے بحث میں نہ الجھاؤ عزیر! میرا دل بہت دکھا ہوا ہے۔“

”کیا میرا دل خوش ہوگا؟“

”تم مرد ہو۔ مردوں کے اعصاب عورت کے اعصاب سے زیادہ مضبوط ہوتے ہیں۔“

”یہ کوئی کلیہ نہیں ہے۔“

”تم بحث بڑھاتے جارہے ہو!“

عزیر نے خاموشی اختیار کرلی۔

جلد ہی وہ مقام آگیا جہاں عموماً ایک دو ٹیکسیاں کھڑی مل جاتی تھیں۔ شاہانہ وہاں عزیر کی کار سے اترتے ہوئے بولی۔

”میں تمہیں اپنی شادی کا کارڈ دینے آؤں گی۔“

عزیر اب بھی خاموش رہا۔

شاہانہ ایک ٹیکسی میں جا بیٹھی۔ اس نے ڈرائیور کو اپنے گھر کا پتا بتایا تو ٹیکسی حرکت میں آگئی۔ شاہانہ نے مڑ کر عقبی شیشے سے دیکھا۔ عزیر کی کار ابھی تک وہیں کھڑی تھی۔ وہ وہیں کھڑی رہی، تاوقتیکہ نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

اب شاہانہ سیدھی بیٹھ گئی۔ اس نے ہونٹ بھینچ کر اپنی سسکاری کو باہر آنے سے روکا۔ وہ بہت اداس تھی۔

جب وہ گھر پہنچی تو اندھیرا پھیلنا شروع ہوگیا تھا۔

گھر دو سو گز کے پلاٹ پر تھا۔ اس میں چھ افراد رہتے تھے۔ شاہانہ کے والدین، اس کے دو چھوٹے بھائی اور ایک بہن!

دروازہ اس کی ماں سلطانہ بیگم نے کھولا۔

”اتنی دیر کہاں لگا دی!“ وہ آہستہ سے بولیں۔ ان کا انداز کچھ ایسا تھا جیسے شاہانہ سے کچھ ڈری ہوئی ہوں۔

”عزیر سے باتوں میں کچھ دیر ہوگئی۔“ شاہانہ نے صاف گوئی سے جواب دیا اور سیدھی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

اس کی چھوٹی بہن فرزانہ اس وقت کچن میں تھی۔ وہ شاہانہ سے دو سال چھوٹی تھی لیکن شادی کے قابل بہرحال ہوگئی تھی۔ اس نے کچھ ہی دن پہلے سیکنڈ ایئر کا امتحان پاس کیا تھا۔

دونوں چھوٹے بھائی آٹھ اور دس سال کے تھے جن کے بارے میں شاہانہ کا خیال تھا کہ اب وہ کرکٹ کھیل کر واپس آرہے ہوں گے۔ اپنی عمر کے باعث انہیں اندازہ نہیں تھا کہ گھر میں کیا کھچڑی پک رہی تھی اور کیوں پک رہی تھی۔

شاہانہ کے والد آذر صاحب اچھی خاصی جگہ ملازم تھے اور وہ گھرانا آسودگی کی زندگی بسر کررہا تھا لیکن ڈھائی تین سال کی تیزی سے بڑھتی ہوئی مہنگائی نے ان کی آسودگی کا جنازہ نکال دیا تھا۔ زندگی نہایت پریشانی کے عالم میں گزر رہی تھی۔ قرض خاصا ہوگیا تھا لیکن آذر صاحب نے اس رقم کو ہاتھ نہیں لگایا تھا جو انہوں نے شاہانہ اور فرزانہ کی شادی کے لیے جمع کی تھی۔

مہنگائی کی وجہ سے دور اندیش آذر صاحب نے سوچا تھا کہ ابھی تو قرض ہی بڑھ رہا تھا لیکن آئندہ دو سال میں سانس لینا بھی مشکل ہوجائے گا۔ ابھی تو صرف اتنا ہی ہوا تھا کہ دونوں لڑکوں اور فرزانہ کی تعلیم وہ کسی نہ کسی طرح

جاری رکھ سکتے تھے۔ بس گھر کے اخراجات میں ساٹھ فیصد کمی کرنا پڑی تھی۔

ان حالات میں جب شاہانہ کے لیے فیروز کا رشتہ آیا تو انہیں یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے پردۂ غیب سے ان کی مدد کی ہو۔ فیروز ایک بہت بڑے انڈسٹریلسٹ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس سے شاہانہ کی شادی آذر صاحب کی بہت سی پریشانیوں کا ازالہ کر سکتی تھی۔ وہ فیروز کے والد کی انڈسٹری ہی میں ملازم تھے۔

فیروز کے معاملے میں ایک خرابی یہ تھی کہ وہ عمر میں شاہانہ سے دس سال بڑا تھا اور چار سال قبل اس کی ایک شادی بھی ہو چکی تھی۔ اس کی بیوی کا نام زہرہ تھا۔ وہ کیونکہ ماں نہیں بن سکی تھی اور فیروز کی ماں کو دادی بننے کا بے حد ارمان تھا لہٰذا انہوں نے فیروز کی دوسری شادی کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ زہرہ اگرچہ خاصے ٹھیک ٹھاک گھرانے سے تعلق رکھتی تھی لیکن اس نے فیروز کی دوسری شادی پر بہ ظاہر کوئی احتجاج نہیں کیا تھا اور نہ ہی طلاق مانگی تھی۔ وہ بدستور فیروز کے ساتھ رہ رہی تھی۔

آذر صاحب کے لیے سب سے بڑا مسئلہ شاہانہ کو آمادہ کرنا تھا۔ ماں کی طرح وہ بھی اپنی بیٹی کی ضدی فطرت سے واقف ہونے کے ساتھ ساتھ اس بات سے بھی واقف تھے کہ وہ کالج کے زمانے ہی سے کسی عزیر نامی لڑکے کو پسند کرتی تھی اور کچھ ہی دن میں شاہانہ کے لیے عزیر کا رشتہ آنے والا تھا۔

عزیر کے بارے میں انہیں اپنی بیوی سے معلوم ہوا تھا کہ تعلق اس کا بھی ایک آسودہ حال گھرانے سے ہے لیکن مالی اعتبار سے وہ فیروز کے مقابلے پر کچھ بھی نہیں...... اس سے قطع نظر آذر صاحب کو فیروز اور شاہانہ کی شادی کے باعث یہ امید بھی تھی کہ فیروز کے باپ کی انڈسٹری میں ان کی ترقی کا امکان روشن ہو جائے گا۔

شاہانہ کو سمجھانے بجھانے کی ذمے داری سلطانہ بیگم کو سونپی گئی تھی چنانچہ اس وقت بھی وہی شاہانہ کے کمرے میں گئیں جو بستر پر اداس لیٹی کسی سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ وہ ماں کو دیکھ کر احتراماً اٹھ بیٹھی۔

سلطانہ بیگم نے بستر پر ہی اس کے قریب بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا بات ہوئی عزیر سے؟''

شاہانہ نے نظریں جھکائے رکھیں اور آہستہ سے بولی۔ ''میں نے کسی ایسے شخص سے محبت نہیں کی تھی امی جو ذہنی طور پر پستہ ہو۔ آپ نے مجھے گھر کی جو پریشانیاں بتائی تھیں، ان سے میں نے اسے بھی آگاہ کر دیا۔''

''پھر؟'' سلطانہ بیگم نے بے تابی سے پوچھا۔

''اس نے مجھے مشورہ دیا ہے کہ ہم دونوں اپنی محبت کو گلا گھونٹ کر مار ڈالیں اور میں اپنے گھر والوں کی پریشانیوں کا خیال کروں۔''

''اس پر تم نے کیا کہا؟'' سلطانہ بیگم نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

''میں کیا کہتی۔'' شاہانہ تلخی سے بولی۔ ''چڑھا دیں آپ لوگ مجھے سولی پر!''

سلطانہ بیگم نے بیٹی کو گلے سے لگا لیا لیکن شاہانہ ان کی اس شفقت سے ذرا بھی جذباتی نہیں ہوئی۔

''بیٹی!'' سلطانہ بیگم نے قدرے اداس لہجے میں کہا۔ ''چاہتے تو ہم بھی نہیں تھے کہ تم سوت پر کسی گھر میں جاؤ لیکن حالات......''

''حالات!'' شاہانہ قدرے تلخی سے بولی۔ ''اگر میں ملازمت کر کے اس گھر کا کچھ بوجھ ہلکا کرتی تو عزیر کو قطعی اعتراض نہیں ہوتا!''

''آج کل ملازمت ملنا آسان تو نہیں ہے بیٹی! اور اگر ملازمت ملتی بھی تو آٹھ دس ہزار سے زیادہ کی تو کیا ملتی...... اس سے وقتی طور پر کچھ سہارا ملتا لیکن آنے والا وقت آج سے زیادہ خوف ناک نظر آرہا ہے۔ ان دس بارہ ہزار کی اہمیت بھی ختم ہو جائے گی۔ بہت کچھ سوچ چکے ہیں تمہارے والد۔''

''مجھے اندازہ ہے کہ وہ کیا سوچ چکے ہیں!'' شاہانہ کے لہجے کی تلخی برقرار رہی۔ ''آخر مجھ پر ہی کیوں تان ٹوٹی ہے۔ فرزانہ کی شادی کرا دی جاتی فیروز سے! فرزانہ تو کسی سے محبت نہیں کرتی۔''

''مگر وہ لوگ تمہی کو پسند کر رہے ہیں۔ تم فرزانہ سے زیادہ خوب صورت ہو اور پھر فرزانہ ابھی بالغ ہونے کے باوجود بچی سی لگتی ہے۔''

''اور میں بوڑھی لگنے لگی ہوں۔''

''یہ مطلب نہیں تھا میرا۔'' سلطانہ بیگم نے جلدی سے کہا۔

''پھر چھوڑیں، اب ان باتوں سے کیا فائدہ؟ آپ پیغام بھجوا دیں فیروز کے گھر والوں کو کہ آپ کو یہ رشتہ منظور ہے۔''

سلطانہ بیگم نے پھر کچھ کہنا چاہا لیکن شاہانہ جلدی سے بول پڑی۔ ''میں اب اس معاملے میں کوئی اور بات نہیں کرنا چاہتی امی!''

سلطانہ بیگم خاموش رہ گئیں۔ چند لمحے بیٹھی رہیں، پھر

اٹھ کر کمرے سے جانے لگیں۔ ان کا انداز کچھ ایسا تھا جیسے وہ کوئی جرم کر کے جا رہی ہوں۔

شاہانہ پھر لیٹ گئی، وہ اب بھی اداس تھی لیکن اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں تھے۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ اس کے دماغ میں کوئی خاص منصوبہ پرورش پا رہا تھا۔

☆☆☆

عزیر نے ایک آرکیٹیکٹ کی حیثیت سے خود کو منوانے کے لیے خاصی جدوجہد کی تھی اور صرف سال بھر کے عرصے میں اس نے اپنا مقصد حاصل بھی کر لیا تھا، اگر یہ منزل اس کے سامنے نہ ہوتی تو وہ سال بھر پہلے ہی شاہانہ سے شادی کر چکا ہوتا لیکن اب اسے افسوس ہو رہا تھا کہ اگر اس نے اس معاملے کو ترجیح نہ دی ہوتی تو اچھا ہوتا۔

اس کے والد کا انتقال ہو چکا تھا۔ گھر میں وہ صرف اپنی ماں کے ساتھ رہتا تھا۔ چند مہینے پہلے ہی اس نے اپنا نیا بنگلا بنوایا تھا اور نئی کار بھی خرید لی تھی لیکن اب وہ سب کچھ اسے بہت فضول محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے یہ محنت شاہانہ کو ایک آسودہ زندگی میں لانے کے لیے کی تھی اور اب شاہانہ کے بغیر وہ سب کچھ اس کے لیے کسی نہ کسی حد تک بے معنی ہو کر رہ گیا تھا۔

وہ ان دنوں آرکیٹیکٹ کی حیثیت سے بھی اپنا کام دل جمعی سے نہیں کر پا رہا تھا۔ شاہانہ سے آخری ملاقات کے بعد سے اس کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ دفتر بھی دیر سے جانے لگا تھا۔

مگر اس دن اسے کوئی خاص دیر نہیں ہوئی تھی جس صبح اس نے ایک شاندار کار اپنے بنگلے کے احاطے میں داخل ہوتے دیکھی جس کی پچھلی نشست پر شاہانہ نظر آئی تھی۔ دس بجنے والے تھے لیکن ابھی اس نے ناشتا نہیں کیا تھا۔ اس کے دیر تک سونے کی وجہ سے اس کی والدہ بھی دیر سے ہی ناشتا تیار کرتی تھیں۔ اس وقت وہ نہانے کے لیے باتھ روم میں گئی ہوئی تھیں۔ عزیر برآمدے میں کرسی ڈالے اخبار پر نظریں دوڑا رہا تھا۔ سردیوں کے دن تھے اس لیے برآمدے کی دھوپ اچھی لگ رہی تھی۔

شاہانہ کو کار سے اترتے دیکھ کر عزیر کو اتنی حیرت ہوئی تھی کہ اخبار اس کے ہاتھ سے گر گیا تھا اور وہ خود بھی کھڑا ہو گیا تھا۔ شاہانہ سے اس کی ملاقات کو دس دن سے زیادہ نہیں گزرے تھے اور شاہانہ نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ اسے اپنی شادی کا کارڈ دینے ضرور آئے گی لیکن وہ شاندار کار دیکھ کر عزیر کے ذہن میں خیال آیا تھا کہ شاہانہ کی شادی ہو چکی ہے شاید اور اب وہ اپنے شوہر کی کار میں آئی ہے۔ کار برآمدے کے سامنے آن رکی۔ اسے ایک باوردی شوفر چلا کے لایا تھا۔ وہ جلدی سے اترا، اس کا مقصد یہی ہوگا کہ شاہانہ کے لیے دروازہ کھولے لیکن شاہانہ نے اتنا انتظار نہیں کیا۔ وہ خود ہی دروازہ کھول کر اتری اور تیزی سے برآمدے کی طرف چلی آئی۔

"ہیلو عزیر!" اس کا لہجہ خوش گوار تھا اور چہرے سے بھی پژمردگی ظاہر نہیں ہو رہی تھی۔

"ہیلو!" عزیر کے منہ سے مشینی انداز میں نکلا تھا۔

"اندر چلو۔" شاہانہ نے کہا۔

"ہاں ہاں، آؤ!" عزیر دروازے کی طرف مڑا۔

"ممی نہا رہی ہیں۔ دو ایک مرتبہ پوچھ چکی ہیں تمہیں...... ایک ڈیڑھ ماہ بعد آئی ہو آج یہاں!"

"پارک میں مل لیتے تھے نا!" شاہانہ نے جواب دیا۔ "یہاں پر ممی کی وجہ سے باتیں کرنے میں احتیاط برتنا پڑتی تھی۔"

وہ دونوں ڈرائنگ روم میں داخل ہو چکے تھے۔

"بیٹھو!" عزیر نے کہا اور پھر بجھی ہوئی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "شادی مبارک ہو!"

"شادی؟" شاہانہ حیرت سے بولی، پھر ہنس پڑی۔ "اچھا!...... کار کی وجہ سے سمجھے ہو یہ بات، حالانکہ میں نے تم سے کہا تھا کہ جب میری شادی ہوگی تو میں تمہیں دعوت نامہ دینے ضرور آؤں گی۔ اس وقت آئی بھی اسی لیے ہوں۔ پہلے تمہارے دفتر فون کیا، وہاں سے معلوم ہوا کہ آج کل تم بارہ بجے سے پہلے نہیں پہنچ رہے ہو لہٰذا میں تمہارے موبائل پر رابطہ کیے بغیر سیدھی یہیں آ گئی۔" ان باتوں کے دوران میں اس نے اپنے بیگ سے ایک کارڈ نکال لیا تھا جو اس نے عزیر کی طرف بڑھا دیا۔

"لیکن...... لیکن...... یہ...... کار...... میرا مطلب ہے......" عزیر کا ذہن شاید بہت زیادہ الجھ گیا تھا۔

"ہمارے ہونے والے سسر صاحب نے مہربانی فرمائی ہے۔" شاہانہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "یہ کار اس لیے بھجوائی ہے کہ شادی کی تیاریوں اور کارڈز وغیرہ کی تقسیم میں پریشانی نہ ہو۔"

"خوب! سسر تو بہت اچھے ملے ہیں، بہت خوش نظر آ رہی ہو۔"

"کیا نہیں نظر آنا چاہیے؟" شاہانہ سنجیدہ ہو گئی۔ "مجھے

یاد ہے، تم نے کچھ اس قسم کی بات کی تھی کہ میں ایک اچھی بیوی بننے کی کوشش کروں گی۔''

''اچھا!'' عزیر کی مسکراہٹ مضمحل سی تھی۔ اس نے کہا۔ ''تو فوری طور پر پریکٹس شروع کر دی ہے۔''

''مجھے جلدی واپس جانا ہوگا۔ یہ ڈر بھی ہے کہ ممی نہا کر آگئیں تو بات کرنا مشکل ہوگا، میں تم سے پوچھنا چاہتی ہوں، تم شادی کب کرو گے؟''

عزیر اس کا منہ تکتا رہ گیا۔

''پلیز عزیر!'' شاہانہ بولی۔ ''ہمیں جلدی جلدی بات کرنا ہے۔''

''تم نے سوال ہی ایسا داغ دیا کہ فوری طور پر میں کوئی جواب دے ہی نہیں سکتا تھا۔''

''اچھا اب تو دو جلدی سے!''

''تم مجھ سے ایک وعدہ لے چکی ہو کہ میں تمہاری شادی کے بعد بھی تم سے ملتا رہوں گا۔ اب کوئی دوسرا وعدہ لینے کی کوشش نہ کرو۔''

''عزیر!'' اس مرتبہ شاہانہ کچھ جذباتی نظر آئی۔ ''میں جانتی ہوں کہ تم نے مجھے دیوانہ وار چاہا ہے۔ شاید تم نے فیصلہ کیا ہو کہ اب زندگی بھر شادی نہیں کرو گے لیکن ہو سکتا ہے کہ دو چار سال بعد تم اتنے جذباتی نہ رہو۔ ممی بھی چاہیں گی کہ تمہاری شادی ہو جائے، تمہیں ان کے سامنے ہتھیار ڈالنا پڑیں گے۔ میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا!''

''مجھے نہیں معلوم۔'' عزیر کی آواز بھرا گئی۔ ''تم نے اچانک ایسی بات چھیڑی ہے کہ میرا دماغ شل ہونے لگا ہے۔''

''اچھا میں فرض کیے لیتی ہوں کہ تین چار سال بعد تم شادی کے لیے تیار ہو جاؤ گے لیکن اگر کوئی ایسی لڑکی تمہاری بیوی بننا چاہے جس کی ایک شادی ہو چکی ہو تو کیا تم اس سے شادی کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ گے؟...... یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ اس لڑکی کا نام شاہانہ ہوگا۔''

''کیا!'' عزیر چونک گیا۔ ''کیا تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ......''

''تم ٹھیک سمجھ رہے ہو، وہ میں ہی ہوں گی عزیر!'' شاہانہ کی آواز بھرا گئی۔ ''جو کچھ ہو رہا ہے، یہ وقتی بات ہے۔ میں تمہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نہیں کھونا چاہتی۔ تین چار سال بعد میں تمہاری ہو سکتی ہوں، بشرطیکہ تم بھی ایک ایسی لڑکی سے شادی کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ جو تین چار سال تک کسی کی بیوی رہ چکی ہو۔''

''تم میرے لیے ہمیشہ ویسی ہی رہو گی شاہانہ جیسی آج ہو۔'' عزیر کے جذبات جیسے امڈ پڑے۔ ''تم بوڑھی بھی ہو جاؤ تو......''

''نہیں۔'' شاہانہ کی مسکراہٹ بھیگی ہوئی سی تھی۔ ''میں بوڑھی نہیں ہو جاؤں گی تین چار سال میں......اور یہ بھی ممکن ہے کہ تین سال سے زیادہ نہ گزریں۔''

''تم نے مجھے بہت الجھا دیا ہے، کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ تم کیا کہہ رہی ہو۔''

''تین چار سال بعد مجھے طلاق مل جائے گی عزیر!''

''کیا کہہ رہی ہو تم......آخر یہ کیسے ممکن ہے؟''

شاہانہ اس کا جواب دیتی یا نہ دیتی لیکن اسی وقت عزیر کی والدہ آگئیں اور انہوں نے شاہانہ کو دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا۔

''بہت دن بعد آئیں بیٹی!'' انہوں نے گلہ کیا۔

''حالات کچھ ایسے ہی رہے!'' شاہانہ کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ ''اس وقت بھی جلدی میں آئی ہوں۔ بس اب جا ہی رہی تھی، اچھا ہوا کہ آپ آگئیں، آپ کو سلام کرنے کا موقع تو مل گیا۔''

''چائے وغیرہ کچھ......''

''نہیں ممی!'' شاہانہ نے مسکرا کر کہا۔ ''پھر کبھی آؤں گی تو پیوں گی۔ ابھی تو میں بس یہ کارڈ دینے آئی تھی عزیر کو۔''

''کیسا کارڈ ہے؟''

''شادی کارڈ ہے ممی!''

''اچھا!'' عزیر کی ماں نے خوشی کا اظہار کیا۔ ''فرزانہ کی شادی ہو رہی ہے!''

''جی نہیں۔'' شاہانہ نے ہنس کر کہا۔ ''یہ میری شادی کا کارڈ ہے۔''

''کیا!'' وہ بھونچکا رہ گئیں۔

''اچھا بس اب چلتی ہوں۔'' شاہانہ ان سے گلے ملی اور پھر تیزی سے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

عزیر دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر بیٹھا کا بیٹھا رہ گیا۔ وہ شاہانہ کو چھوڑنے کے لیے باہر تک نہیں جا سکا تھا۔ اس کی ذہنی حالت کچھ ایسی ہی ہو گئی تھی۔ کچھ ایسا ہی حال اس کی والدہ کا بھی تھا۔

باہر سے کار اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔

عزیر کی والدہ ایک صوفے پر جیسے گر سی گئیں۔

''یہ کیا ہو رہا ہے عزیر؟'' انہوں نے اپنے بیٹے سے پوچھا۔ وہ شاہانہ کو بہت پسند کرنے لگی تھیں۔

عزیر کوئی جواب نہ دے سکا۔ وہ اب بھی دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپائے بیٹھا تھا۔ ایک سوال نے تو اس کے دماغ میں زلزلے کی سی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ اس کے لیے قیاس کرنا بھی مشکل تھا کہ شاہانہ کو تین چار سال بعد طلاق کیوں ہو جائے گی؟ شاہانہ کو اس بات کا یقین کیوں تھا؟

☆☆☆

شاہانہ نے جو منصوبہ بندی کی تھی، اس کے باعث اسے یقین تھا کہ تین سال نہیں تو چار سال میں طلاق کی نوبت آ ہی جائے گی۔

فیروز سے اس کی شادی ہو گئی۔ شاہانہ نے اس میں اپنے کالج کی کئی دوست لڑکیوں اور لڑکوں کو بلایا تھا اور وہ سب ہی آئے تھے لیکن عزیر نہیں آیا تھا۔ شاہانہ کو اس کا اندازہ تھا کہ وہ نہیں آسکے گا۔ وہ کیسے، دیکھ سکتا تھا کہ جس لڑکی کو دلہن بنا کر اسے اپنے ساتھ لے جانا تھا، وہ کسی اور کی دلہن بنی بیٹھی ہو۔

لیکن شاہانہ کا یہ اندازہ غلط تھا۔ عزیر نے وہ کرب ناک منظر دیکھا۔ وہ کچھ فاصلے پر خود کو اندھیرے میں چھپائے کھڑا رہا تھا اور برات اس کی نظروں کے سامنے سے گزر گئی تھی۔ اس نے شاہانہ کو دلہن بنے ہوئے فیروز کے ساتھ جاتے ہوئے دیکھا تھا۔

شاہانہ اسے نہیں دیکھ سکی تھی۔

رات کا ایک بجا تھا جب وہ حجلۂ عروسی میں بیٹھی تھی اور فیروز بستر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ نظریں جھکائے بیٹھی رہی۔ اس نے فیروز کو دیکھا نہیں مگر احساس کیا کہ وہ بستر پر بیٹھ چکا تھا۔ شاہانہ کا دل بھر آیا۔ کبھی اس نے اس قسم کے خواب دیکھے تھے کہ جب وہ دلہن بن کر بیٹھی ہوئی ہو گی تو عزیر اس کے قریب آئے گا لیکن تقدیر نے کچھ اور ہی گل کھلا دیا تھا۔

''شاہانہ!'' فیروز کی مدھم آواز اس کے کانوں میں آئی۔

وہ کچھ نہیں بولی۔

''ہاں۔'' فیروز نے ایک طویل سانس لی۔ ''نئی دلہنوں کی زبان ذرا دیر سے کھلتی ہے۔ خیر! تم تھکی ہوئی بھی ہو۔ اب آرام کرو، باتیں کل بھی کی جا سکتی ہیں۔''

فیروز بستر سے اٹھ گیا۔ شاہانہ کو حیرت کا جھٹکا لگا۔ یہ اس کے لیے قطعی غیر متوقع تھا۔ اس نے کن انکھیوں سے دیکھا۔ فیروز شیروانی اتار کر الماری میں رکھ رہا تھا۔ پھر وہ مڑا اور شاہانہ کی طرف دیکھے بغیر کمرے کے ایک بڑے صوفے کی طرف بڑھ گیا۔ پھر صوفے پر لیٹ کر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ آرسی مصحف کی رسم میں شاہانہ اس کے چہرے پر ایک اچٹتی سی نظر ڈال چکی تھی۔ اب اس نے فیروز کو غور سے دیکھا۔ وہ صحت مند اور اچھے نقش و نگار کا مالک تھا۔ اس کی عمر واقعی شاہانہ سے آٹھ دس سال زیادہ ہو سکتی تھی۔

یہ کیا ہوا؟ شاہانہ سوچ میں پڑ گئی۔ یہ ایک ایسا معما تھا جسے حل کرنے کی اس کی کوئی بھی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ بیٹھی بس سوچتی ہی رہی۔ خاصا وقت گزر گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ فیروز سو چکا تھا۔ خود شاہانہ بھی لیٹنا چاہتی تھی۔ اس کے جسم کا جوڑ جوڑ دکھنے لگا تھا۔ اس نے اپنے زیورات اتار کر سائڈ ٹیبل پر رکھے اور آہستگی سے لیٹ گئی۔ بہ ظاہر ایسا لگ رہا تھا جیسے اس واقعے نے اس کی نیند اڑا دی ہو لیکن جب انسان بہت زیادہ تھکا ہوا ہو تو عموماً زیادہ دیر تک جاگا نہیں رہ سکتا۔ نیند نے شاہانہ کو بھی جلد ہی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

صبح شاید وہ دیر تک سوتی رہ جاتی، اگر اسے جگایا نہ جاتا۔ جگانے والا فیروز ہی تھا لیکن اس نے شاہانہ کو ہاتھ نہیں لگایا تھا، صرف آوازیں دی تھیں۔ شاہانہ ہڑبڑا کر اٹھ گئی۔

''غسل کر کے ساری باندھ لو۔'' فیروز نے کہا۔ ''ہمارے گھر میں یہ رواج نہیں کہ لڑکی شادی کے دوسرے دن بھی دلہن بنی رہے۔ ساڑھے آٹھ بجے تک تمہیں گھر والوں کے ساتھ ناشتے کی میز پر ہونا چاہیے۔''

خود فیروز اس وقت تک تیار ہو چکا تھا۔ سوٹ میں ملبوس اس کی شخصیت زیادہ دلکش نظر آ رہی تھی۔

شاہانہ اس سے نظریں ملائے بغیر بستر سے اٹھی اور کپڑے نکال کر باتھ روم میں چلی گئی۔ جب وہ تیار ہو کر باہر نکلی تو اس نے دیکھا کہ فیروز کمرے میں ٹہلتے ہوئے اس کا انتظار کر رہا تھا۔

''چلیں؟'' اس نے شاہانہ کی طرف دیکھا۔

شاہانہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

فیروز نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ''ہمارے گھر میں مشرقی انداز کے سلام کرنے کا بھی رواج نہیں ہے۔ سب سے گڈ مارننگ کہنا۔''

''بہتر۔'' شاہانہ کی زبان سے بے اختیار نکل گیا۔

''شکر ہے۔ میں نے تمہاری آواز تو سنی!''

شاہانہ نے فوراً اس کی طرف دیکھا۔ اس کا خیال تھا کہ فیروز نے یہ بات مسکرا کر کہی ہو گی لیکن ایسا نہیں تھا۔ اس وقت بھی فیروز کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔

وہ دونوں کمرے سے نکل آئے۔

''اس وقت ہمیں بیس سیکنڈ کی تاخیر ہو چکی ہے۔'' فیروز نے کہا۔ ''اس گھر کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ ساڑھے آٹھ بجے سب لوگ ناشتے کی میز پر پہنچ جائیں۔ سب پہنچ چکے ہوں گے اور ہمارا انتظار ہو رہا ہوگا...... اچھا ہاں! ایک بات کا خیال رہے! کسی پر یہ ظاہر نہیں ہونا چاہیے کہ میں نے یہ رات صوفے پر اور تم نے بستر پر گزاری تھی۔ مجھے امید ہے، تم نے سمجھ لیا ہوگا کہ میں کیا ظاہر کرنا چاہتا ہوں۔''

''اس گھر کے اصول کس نے وضع کیے ہیں؟'' شاہانہ پہلی مرتبہ کھل کر بولی۔

''ممی نے۔'' فیروز نے جواب دیا۔ ''یوں سمجھ لو کہ وہی اس گھر کی حاکم ہیں۔ ڈیڈی کو بھی ان کے اشارے پر چلنا پڑتا ہے۔''

اس موضوع پر انہیں زیادہ بات کرنے کا موقع نہیں ملا...... وہ دونوں ڈائننگ روم میں داخل ہو رہے تھے۔ شاہانہ کو توقع تھی کہ ڈائننگ روم ان قریبی عزیز داروں سے بھرا ہوا ہوگا جو اس شادی میں شرکت کے لیے آئے تھے لیکن اس کے برخلاف اسے ایک مہمان بھی نظر نہیں آیا۔ صرف گھر کے لوگ تھے جنہیں وہ گزشتہ رات دیکھ چکی تھی۔

فیروز کے والد جو عموماً لالہ عیسیٰ کے نام سے مشہور تھے۔ ان کی بیگم فریال عیسیٰ میزبان کی نشست پر بیٹھی تھیں۔ ان کی عمر شاید پچپن سال ہو لیکن دیکھنے میں وہ پچاس سال سے زیادہ کی نظر نہیں آتی تھیں۔ خاصی لمبی تڑنگی اور بھرے ہوئے جسم کی مالک تھیں۔ صحت مند لالہ عیسیٰ بھی تھے۔ ان کے سامنے کی کرسی پر فیروز کا چھوٹا بھائی اعجاز بیٹھا تھا۔ جس کی عمر پچیس سال کے لگ بھگ تھی۔ اس نے اسی سال اپنی تعلیم مکمل کی تھی۔ شاہانہ کو ان سب باتوں کا علم شادی سے پہلے ہی ہو گیا تھا۔

فیروز کی پہلی بیوی زہرہ، اعجاز کے برابر میں بیٹھی تھی۔ اسے بہت خوب صورت تو نہیں کہا جا سکتا تھا لیکن وہ ایک پرکشش شخصیت کی مالک تھی۔

سب خوش گوار موڈ میں نظر آ رہے تھے، حتیٰ کہ زہرہ بھی!

''گڈ مارننگ!'' کی آوازیں ڈرائنگ روم میں گونجیں۔

شاہانہ فیروز سے ایک قدم پیچھے ہو گئی تھی۔ فیروز نے باپ کے برابر کی سیٹ کا رخ کیا۔ شاہانہ اس کے برابر میں بیٹھنا چاہتی تھی لیکن بیگم فریال عیسیٰ بول پڑیں۔ ''نہیں شاہانہ!...... تم اس طرف بیٹھو، زہرہ کے ساتھ...... تم اس کی ہم منصب ہو۔''

''جی۔'' شاہانہ نے آہستہ سے کہا اور گھوم کر زہرہ کے برابر میں جا بیٹھی۔ زہرہ نے بڑی محبت سے شاہانہ کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ دیا۔ شاہانہ اس کی طرف دیکھ کر خفیف سا مسکرائی۔

ناشتا شروع کیا گیا۔ دو ملازم میز کے قریب موجود تھے تاکہ اگر کسی کو کسی چیز کی ضرورت پڑے تو وہ فوراً حاضر کر دی جائے۔

''چھوٹی بھابی!'' اعجاز بول پڑا۔ ''آپ کو شوگر تو نہیں ہے؟'' اس کے لہجے میں شوخی تھی۔

''کیا بکواس کرنے لگے تم!'' بیگم فریال عیسیٰ نے ڈانٹا۔

''احتیاطاً کہہ رہا ہوں ممی!' اعجاز نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''بڑی بھابی نے ان کی پلیٹ میں شاہی ٹکڑا رکھا ہے۔''

''شاہانہ بچی نہیں ہے جو یہ نہ جانے کہ اسے کیا کھانا چاہیے اور کیا نہیں!''

اعجاز نے بے پروائی سے شانے اچکائے اور اپنی پلیٹ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس وقت شاہانہ نے محسوس کیا کہ وہ اپنی ماں کے دباؤ میں زیادہ نہیں تھا۔

ناشتا جاری رہا۔

''شاہانہ!'' فریال عیسیٰ بولیں۔ ''ہمارے گھر کے رواج بہت سے گھروں سے مختلف ہیں۔ ہمارے یہاں یہ بھی نہیں ہوتا کہ شادی کی رات کے بعد دلہن چند گھنٹوں کے لیے اپنے گھر جائے لیکن تمہاری ماں کے بہت کہنے پر میں نے ان کی بات مان لی ہے۔ دس بجے تک تمہارے گھر سے کچھ لوگ آئیں گے۔ چلی جانا لیکن چار بجے شوفر تمہیں لینے آ جائے گا۔ شام کی چائے ہمارے گھر میں ساڑھے چار بجے پی جاتی ہے۔''

ہر بات کا ٹائم ٹیبل بنا ہوا ہے اس گھر میں، شاہانہ نے سوچا۔

نو بجے سب ناشتے کی میز سے اٹھ گئے۔

''چھوٹی بھابی!'' اعجاز بولا۔ ''ٹینس کھیلنا آتا ہے آپ کو؟''

''نہیں۔'' شاہانہ نے جواب دیا۔

''کیا مصیبت ہے!'' اعجاز نے منہ بنایا۔ ''گھر میں بھی کوئی ٹینس نہیں کھیلتا اور مجھے جنون ہے اس کا۔ آپ آئیں تو میں نے سوچا شاید......'' پھر اس نے ''ہونہہ'' کر کے سر جھٹکا اور ڈائننگ روم سے جانے لگا۔

''میں لاؤنج میں جا رہا ہوں ممی!'' اعجاز نے جاتے

جاتے کہا۔ کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں دی۔

لالہ عیسیٰ اور فریال عیسیٰ دوسرے دروازے سے باہر چلے گئے۔

''میں ایک ضروری کام سے جارہا ہوں ممی!'' فیروز بھی جاتے ہوئے بولا۔ ''ایک گھنٹے میں لوٹ آؤں گا۔''

''اچھا!'' فریال عیسیٰ نے پلٹ کر دیکھے بغیر کہا اور اپنے شوہر کے ساتھ ڈائننگ روم سے نکل گئی۔

''تم میرے ساتھ آؤ۔'' زہرہ نے مسکرا کر شاہانہ کا ہاتھ پکڑا۔ ''کمرے میں بیٹھ کر کچھ گپ شپ کریں گے۔''

شاہانہ نے فیروز کی طرف دیکھا۔

''ہاں ہاں۔'' فیروز بولا۔ ''تم زہرہ کو بہت اچھی دوست پاؤ گی۔''

شاہانہ خفیف سا مسکرادی۔ زہرہ اسے اپنے ساتھ لے آئی۔ شاہانہ سوچنے لگی، یہ کس قسم کی عورت ہے کہ اس نے اتنی خوش دلی سے اپنے شوہر کی دوسری شادی گوارا کرلی اور اب بھی مسرور نظر آرہی ہے۔

''یہ ہے میرا کمرا۔'' زہرہ نے شاہانہ کے ساتھ ایک کمرے میں قدم رکھا۔ ''کل رات سے پہلے یہ میرا کمرا نہیں تھا۔ تمہاری خواب گاہ جس کمرے کو بنایا گیا، وہ پہلے میری اور فیروز کی خواب گاہ تھا۔''

شاہانہ کو اس وقت بھی یہ خیال تھا کہ یہ باتیں بتاتے ہوئے زہرہ کے لہجے میں تلخی ہونا چاہیے تھی لیکن ایسا نہیں تھا۔ وہ بہ دستور خوش گوار موڈ میں تھی۔

''آپ.....'' شاہانہ نے کچھ کہنا چاہا۔

''نہیں۔'' زہرہ جلدی سے بول اٹھی۔ ''آپ نہیں، تم۔''

''میں عمر میں تھوڑی سی چھوٹی ہوں۔''

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' زہرہ نے کہا، پھر ہنس کر بولی۔ ''تم نے سنا نہیں تھا، ممی کیا کہہ رہی تھیں؟ ہم دونوں ہم منصب ہیں۔''

''ہم منصب تو شاید میں نہیں بن سکی۔'' شاہانہ نے بے اختیار کہا، پھر خود ہی اطمینان بھی محسوس کیا کہ وہ زہرہ کی ہم منصب نہیں بن سکی تھی۔

''کیا مطلب ہے تمہارا شاہانہ؟'' زہرہ سنجیدہ ہوگئی۔ ''یہ بات واضح کرو کہ تم میری ہم منصب نہیں بن سکیں۔''

''میں عمر میں چھوٹی ہوں نا!'' شاہانہ مسکرائی۔ ''ہم منصب کیسے ہوسکتی ہوں۔''

''تم بات ٹال رہی ہو!'' زہرہ نے سنجیدگی سے کہا۔ ''تم شاید بے اختیار ایک ایسی بات کہہ گئی ہو جس کا مطلب کچھ اور ہی نکلتا ہے۔''

شاہانہ کو احساس ہوگیا کہ اس سے غلطی ہوگئی تھی۔ فیروز نے اسے سمجھا بھی دیا تھا کہ گھر میں کسی کو گزشتہ رات کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہونا چاہیے۔ بات بنانے کی مزید کوشش کرتی لیکن اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔

''کون؟'' زہرہ نے چونک کر پوچھا۔

''میں ہوں بھئی!'' باہر سے آواز آئی۔

''اوہ، ڈیڈی!'' زہرہ دروازے کی طرف لپکی۔

اب شاہانہ نے سمجھا کہ وہ لالہ عیسیٰ کی آواز تھی۔ ناشتے کی میز پر تو اس نے لالہ عیسیٰ کو بولتے ہوئے سنا ہی نہیں تھا۔

زہرہ نے دروازہ کھولا۔

لالہ عیسیٰ نے اپنے منہ سے سگار نکالا اور زہرہ کے پیچھے کھڑی ہوئی شاہانہ کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر بولے۔ ''تمہارے گھر سے لوگ آگئے ہیں شاہانہ......! ڈرائنگ روم میں ہیں سب! تمہاری ممی بھی ہیں۔ انہیں یہ بات گراں گزری ہے کہ وہ لوگ وقت سے پہلے آگئے۔ ہماری بیگم صاحبہ نے دس بجے کا وقت دیا تھا نا......!''

''میرے گھر والوں کو ابھی یہاں کے اصولوں کا علم نہیں ہے نا ڈیڈی!'' شاہانہ نے کہا۔ ''میں آج سمجھا دوں گی سب کو، اب ممی کو کبھی شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔''

''اچھا اب تم وہاں جاؤ تو!'' لالہ عیسیٰ نے کہا۔ ''ہماری بیگم صاحبہ نے کسی ملازم سے کہنے کے بجائے مجھے ہی حکم دے دیا تھا کہ تمہیں مطلع کردوں۔''

''آؤ شاہانہ!'' زہرہ نے اس کا ہاتھ پکڑا۔

وہ دونوں باہر نکلیں، لالہ عیسیٰ دوسری طرف مڑ گئے۔

''آپ بھی آیئے نا ڈیڈی!'' شاہانہ بولی۔

''صرف خواتین آئی ہیں تمہیں لینے! میں کیا کروں گا وہاں جا کر۔'' لالہ عیسیٰ نے جواب دیا، پھر ہنس کر بولے۔ ''ویسے اعجاز تو پہنچ گیا ہوگا۔ اسے بہت شوق ہے عورتوں میں بیٹھنے کا!''

زہرہ مسکرا کر بولی۔ ''جب اعجاز وہاں ہوگا تو آپ بھی آجایئے!''

''ہاں آیئے نا ڈیڈی!'' شاہانہ بولی۔

''نہیں نہیں، تم لوگ جاؤ، میں آرام کروں گا۔'' لالہ عیسیٰ آگے بڑھ گئے۔

شاہانہ اور زہرہ ڈرائنگ روم کی طرف بڑھیں۔

''ممی کی بہ نسبت ڈیڈی خاصے خوش مزاج ہیں۔''

شاہانہ بولی۔

''بہت اچھے انسان بھی ہیں۔'' زہرہ نے جواب دیا۔ ''مخلص، ہمدرد، غریب پرور۔''

''فیروز بتا رہے تھے کہ گھر کے باقی لوگوں کے علاوہ ڈیڈی بھی ممی سے دبتے ہیں۔''

''دبتے نہیں ہیں، بس سمجھوتا کرلیا ہے انہوں نے، وہ گھر کا ماحول خراب نہیں کرنا چاہتے لیکن اب شاید وہ ایک دھماکا کر ہی ڈالیں۔''

''دھماکا؟'' شاہانہ حیرت سے بولی۔

اس موقعے پر ان کی گفتگو ایک بار پھر ادھوری رہ گئی کیونکہ وہ دونوں ڈرائنگ روم میں داخل ہوچکی تھیں۔

شاہانہ کو لینے کے لیے آنے والوں میں اس کی بہن فرزانہ اور اس کی دو سہیلیاں شامل تھیں۔ ان کے ساتھ چالیس بیالیس سال کی ذکیہ خاتون بھی تھیں جو کسی رشتے سے شاہانہ کی خالہ لگتی تھیں۔

شاہانہ کی دونوں سہیلیاں اٹھ کر بڑی گرم جوشی کے ساتھ شاہانہ سے ملیں۔ فرزانہ کا انداز کچھ عجیب نظر آیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اس شادی سے خوش نہ ہو۔

لالہ عیسیٰ کی یہ پیش گوئی درست ثابت ہوئی کہ اعجاز وہاں موجود تھا اور خوب چہک رہا تھا۔ ملازم چائے اور دیگر لوازمات لے آیا تھا۔

فریال عیسیٰ نے اپنے سمدھیانے سے آئے ہوئے مہمانوں کی مدارات تو کی لیکن ان کا انداز متکبرانہ ہی تھا جس کی وجہ سے شاہانہ کی خالہ ذکیہ انہیں کبھی کبھی تیکھی نظروں سے دیکھ کر رہ جاتی تھیں۔

اعجاز نے مچھلی کے ایک شکار کا قصہ سنانا شروع کردیا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے اس کی مخاطب صرف فرزانہ ہو۔ وہ اسے جس انداز سے دیکھ رہا تھا، وہ بھی شاہانہ کو اچھا نہیں لگا اور یہ بات بھی بری لگی کہ فرزانہ اعجاز کی باتوں میں بہت دلچسپی لے رہی تھی۔

ان لوگوں کو جلد ہی جانا تھا لیکن فیروز کا انتظار کرنے کی وجہ سے ان سب کو کچھ زیادہ رکنا پڑا۔

جب روانگی کے لیے سب کھڑے ہوئے تو فیروز بولا۔ ''ایک کار میں پانچ خواتین کیسے جائیں گی۔''

''یہ مسئلہ تو ہے بھائی جان!'' اعجاز بولا۔ ''میں ایسا کرتا ہوں کہ اپنی کار میں فرزانہ کو چھوڑ آتا ہوں۔''

اسی وقت خالہ ذکیہ بول پڑیں۔ ''میں بھی فرزانہ کے ساتھ چلی جاؤں گی۔''

''یہ مناسب رہے گا۔'' فیروز نے تائید کی۔

اعجاز کے چہرے سے صاف ظاہر ہوگیا کہ وہ صرف فرزانہ کو لے جانا چاہتا تھا۔ خالہ ذکیہ کی موجودگی کی بات اسے گراں گزر گئی تھی لیکن فیروز کے سامنے وہ لب کشائی کی ہمت نہیں کرسکتا تھا۔

اس دوران میں فریال عیسیٰ اتنی بے تعلقی سے بیٹھی رہیں جیسے انہیں اس سے کوئی سروکار ہی نہ ہو کہ کون کس کے ساتھ جائے گا۔

لالہ عیسیٰ کی شاندار کوٹھی سے دو کاریں روانہ ہوئیں۔ شاہانہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ جس کار میں بیٹھی، وہ وہی کار تھی جو کچھ دن سے آذر صاحب ہی کے گھر میں رہی تھی۔

''تم لوگ اسی کار میں آئی تھیں؟'' شاہانہ نے پوچھا۔

''ہاں۔'' ایک سہیلی نے جواب دیا۔ ''فرزانہ بتا رہی تھی کہ آج رات کو ویسے میں آنے کے لیے بھی یہی کار استعمال کی جائے گی۔ اس کے بعد لالہ صاحب شاید یہ واپس منگوالیں گے۔''

شاہانہ سر ہلا کے رہ گئی۔ اس کا دماغ اور کئی الجھنوں کی بھی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ گزری ہوئی رات اس کے لیے سب سے بڑا معما تھی۔ فیروز نے عملاً اسے اپنی بیوی کی حیثیت سے قبول کرنا تو درکنار اسے ہاتھ لگانے سے بھی گریز کیا تھا۔ اس نے اسے یہ ہدایت بھی کی تھی کہ گھر والوں کو اس بات کا علم نہ ہو پائے۔ اتفاقاً اس کے منہ سے ایک جملہ زہرہ کے سامنے نکل گیا تھا۔ گوکہ اس مبہم جملے سے رات کے بارے میں کوئی بات آشکارا نہیں ہوئی تھی لیکن زہرہ نے اس جملے میں وہی معنی دیکھ لیے تھے جس کا اظہار شاہانہ کو نہیں کرنا تھا۔ زہرہ یقیناً غیر معمولی طور پر ذہین تھی۔ شاہانہ کے جملے سے ہر ایک وہ مطلب اخذ نہیں کرسکتا تھا۔ وہ چونک بھی گئی تھی۔ شاہانہ بات بنانے کے لیے کچھ کہتی مگر لالہ عیسیٰ کے آجانے کی وجہ سے بات آگے نہیں بڑھ سکی تھی۔

زہرہ نے اس پر ایک انکشاف یہ بھی کیا تھا کہ لالہ عیسیٰ اپنی بیوی سے دبے ہوئے نہیں تھے بلکہ انہوں نے گھر کے ماحول کو خوشگوار رکھنے کے لیے سمجھوتا کرلیا تھا لیکن اب وہ کوئی دھماکا کرسکتے تھے۔

وہ دھماکا کیا ہوتا؟

اس کی وضاحت بھی نہیں ہوسکی تھی۔

ان خیالات میں شاہانہ کی سب سے بڑی الجھن گزشتہ رات تھی۔ فیروز کے اس رویے سے ہٹ کر یہ بات بھی تھی کہ فیروز اس سے کوئی خاص گفتگو کرنا چاہتا تھا لیکن وہ دلہن

ہونے کے باعث بالکل خاموش رہی تھی اس لیے فیروز نے اس گفتگو کو اگلے دن تک کے لیے ٹال دیا تھا۔ اب شاید آج رات وہ اس بارے میں کوئی بات کرتا۔

کار کے سفر کے دوران میں یہی سب خیالات شاہانہ کے دماغ میں چکراتے رہے۔ اس کی سہیلیوں نے بھی اس سے کسی قسم کی چھیڑ چھاڑ نہیں کی کیونکہ انہیں شوفر کی موجودگی کا خیال ہوگا۔

گھر پہنچ کر آگے پیچھے دونوں کاریں رکیں۔ پچھلی کار سے فرزانہ اور خالہ ذکیہ اتریں۔

شاہانہ نے اعجاز کے کھلنڈرے مزاج کے باعث سمجھا تھا کہ اخلاقاً اس سے رکنے اور ایک کپ چائے پینے کے لیے کہا جائے گا تو وہ انکار ہرگز نہیں کرے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ بعد میں شاہانہ کو معلوم ہوا کہ راہ میں ہی اعجاز کے موبائل پر اس کی ماں کی کال آگئی تھی اور اس سے کہا گیا تھا کہ وہ فرزانہ اور خالہ کو چھوڑ کر وہاں ہرگز نہ رکے اور فوراً واپس آجائے۔

شاہانہ کو یہ اچھا بھی لگا کہ وہ وہاں نہیں رکا تھا۔ اس کے مزاج کے کھلنڈرے پن میں شاہانہ نے کچھ اور بھی محسوس کرلیا تھا۔ اس کی نگاہیں کچھ ٹھیک نہیں تھیں۔ وہ فرزانہ کو جس انداز میں دیکھ رہا تھا، وہ کوئی اچھا انداز نہیں تھا۔

گھر میں شاہانہ کی کچھ اور دوست بھی آئی ہوئی تھیں۔ ان سب نے اسے گھیر لیا اور گزشتہ رات کے حوالے سے شاہانہ کو چھیڑنے لگیں۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد وہ سب چلی گئیں تو شاہانہ نے تنہائی ملتے ہی موبائل پر عزیر سے رابطہ قائم کیا۔

''ہیلو!'' عزیر کی مردہ سی آواز آئی۔

''تم شادی میں نہیں آئے!'' شاہانہ نے کہا مگر اس کے انداز میں شکایت نہیں تھی۔

''آیا تھا۔'' عزیر کے جواب نے شاہانہ کو چونکا دیا۔

''کیوں خوامخواہ جھوٹ بول رہے ہو عزیر!'' شاہانہ پژمردہ سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ ''تم آئے ہوتے تو مجھ سے یہ بات چھپی نہیں رہتی۔''

''یقین کرو، میں آیا تھا۔ میرے سامنے تمہاری برات رخصت ہوئی تھی۔ میں تمہارے گھر سے کچھ فاصلے پر اس جگہ کھڑا رہا تھا جہاں ایک بڑا جنرل اسٹور ہے۔''

''وہاں کیوں کھڑے رہے؟ میں نے تو تم سے یہ کہا تھا کہ......''

عزیر نے اس کی بات کاٹی۔ ''تم نے صرف شادی میں آنے کا وعدہ لیا تھا جو میں نے پورا کیا۔ تم نے شرکت کا وعدہ نہیں لیا تھا۔''

''اوہ!'' شاہانہ کے منہ سے نکلا۔

''اور وہاں کھڑے کھڑے بھی مجھ پر کیا گزرتی رہی، یہ میں ہی جانتا ہوں۔ جب تمہاری برات جارہی تھی تو میرا دل خون کے آنسو رورہا تھا۔''

شاہانہ کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''مجھے اندازہ ہے کہ تمہاری کیا حالت ہوئی ہوگی لیکن کیا میرے بارے میں تم کوئی اندازہ نہیں لگا سکتے؟''

''خوب اندازہ ہے مجھے!''

''میں نے تم سے تین چار سال انتظار کرنے کی بات کی تھی لیکن اب کسی وجہ سے مجھے شبہ ہورہا ہے کہ شاید اتنا طویل انتظار نہ کرنا پڑے۔''

''یہ خیال کیوں؟'' عزیر نے تیزی سے پوچھا۔

''زیادہ دیر گفتگو کرنا پڑے گی۔ میں کوشش کروں گی کہ ایک دو دن میں تم سے ملنے کی کوشش کروں۔ فون پر زیادہ دیر بات نہیں کی جاسکتی۔ ابھی تو میں کمرے میں اکیلی ہوں لیکن کسی وقت بھی کوئی آسکتا ہے۔''

دروازے پر قدموں کی آہٹ ہوئی۔

''لو! کوئی آہی گیا۔'' شاہانہ جلدی سے بولی اور فون بند کرکے تکیے کے نیچے گھسیڑ دیا۔

آنے والی صرف سلطانہ بیگم ہی نہیں تھیں، ان کے ساتھ فرزانہ بھی تھی۔ سلطانہ بیگم نے بڑی محبت سے شاہانہ کو گلے لگایا۔

''خوش رہو۔ سدا خوش رہو میری بچی!'' ان کی آواز رندھی ہوئی سی تھی۔

شاہانہ قطعی جذباتی نہیں ہوئی۔

''ذکیہ خالہ کہاں ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''باورچی خانہ انہی پر چھوڑ کر آئی ہوں۔''

''بڑا منا اور چھوٹا منا؟''

شاہانہ کے چھوٹے بھائیوں کے اصل نام گھر میں کوئی نہیں لیتا تھا۔ سب ہی ان کو بڑا منا اور چھوٹا منا کہتے تھے۔

سلطانہ بیگم نے منہ بنا کر کہا۔ ''کھیل رہے ہوں گے کہیں...... کھیلنے ہی میں دل لگتا ہے ان کا۔ پڑھائی سے تو بھاگتے ہیں۔ میں تو کہتی ہوں تمہارے ابا جان سے کہ وہ انہیں کوئی ہنر ہی سکھوا دیں لیکن وہ مانتے ہی نہیں۔ بس یہ کہہ دیتے ہیں کہ مرکھپ کر کچھ تو پڑھ لیں گے۔''

اس دوران میں فرزانہ خاموش اور سوچ میں ڈوبی ہوئی بیٹھی رہی تھی۔ اس کا یہ انداز شاہانہ کے لیے کسی قدر نیا تھا۔ کسی قدر نیا اس لیے کہ اس میں یہ تبدیلی اس وقت سے آئی

تھی جب شاہانہ کی شادی کا معاملہ چلا تھا۔ اس سے پہلے وہ اتنی سنجیدہ نہیں رہتی تھی۔

سلطانہ بیگم کچھ باتیں کر کے چلی گئیں۔ فرزانہ وہیں بیٹھی رہی۔ شاہانہ نے غور سے اس کی طرف دیکھا اور بولی۔

''اتنی چپ چپ کیوں ہو تم میرے سامنے!''

''ایک بات سوچ رہی تھی۔''

''ایسی کیا بات ہے کہ اتنا سوچ رہی ہو؟''

''میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ آپ کو شادی کی مبارک باد دوں یا عزیز بھائی کو فون کر کے ان سے ہمدردی کا اظہار کروں۔''

فرزانہ کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی شاہانہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی تھی۔

فرزانہ کہتی رہی۔ ''مجھے تو اس بات کا بہت افسوس ہے آپا کہ آپ نے ایک دولت مند گھرانے کی بہو بننے کے لیے عزیز بھائی کا دل توڑ دیا۔''

''فرزانہ!'' شاہانہ کو غصہ آگیا۔ ''تمہیں کچھ معلوم بھی ہے کہ میں اس شادی کے لیے کیوں تیار ہوئی ہوں؟ صرف تم لوگوں کی خاطر میں نے ابا جان کے کہنے پر یہ سولی اپنی گردن میں خود ڈالی ہے۔''

فرزانہ عجیب سے انداز میں ہنس دی۔

شاہانہ بولی۔ ''میں پہلی مرتبہ تمہارا یہ گستاخانہ انداز دیکھ رہی ہوں۔ میں نے ایسی کیا بات کہی تھی کہ تم ہنس دیں؟''

''آپی!'' فرزانہ نے سنجیدگی سے کہا۔ ''آپ کو عزیز بھائی سے سچی محبت ہوتی تو آپ انکار کر سکتی تھیں۔ مجھے تو کسی سے محبت نہیں۔ ابا جان کا مسئلہ تو اس طرح بھی حل ہو سکتا تھا کہ وہ آپ کے بجائے میری شادی کرا دیتے فیروز بھائی سے!''

جواب میں شاہانہ کے منہ سے ایک لفظ نہیں نکل سکا۔ وہ غصے اور حیرت سے فرزانہ کی طرف دیکھتی رہ گئی۔

فرزانہ ذرا سے توقف کے بعد پھر بولنے لگی۔ ''جن مردوں کو دوسری شادی کا شوق ہوتا ہے، وہ تو یہ بھی چاہتے ہیں کہ ان کی دوسری بیوی بہت کم عمر ہو اور میں آپ سے کم عمر ہوں۔''

''فرزانہ!'' شاہانہ کا جسم غصے سے لرز گیا۔ ''اس سے پہلے کہ میں تمہارے منہ پر تھپڑ ماردوں، چلی جاؤ تم یہاں سے...... ان باتوں کے لیے مناسب وقت وہ تھا جب میری شادی نہیں ہوئی تھی۔ اس وقت تم امی سے بات کر لیتیں اس بارے میں۔''

''امی سے بات کرنے کی ہمت نہیں تھی مجھ میں۔''

فرزانہ نے بڑی بے باکی سے جواب دیا۔ ''پھر مجھے یہ خیال بھی تھا کہ آپ انکار کر دیں گی لیکن پھر بات ہی پکی کر لی گئی، اس کے بعد میں کیا بات کرتی امی سے!''

''اچھا اب چلی ہی جاؤ تم میرے پاس سے!'' شاہانہ کو ڈر تھا کہ وہ فرزانہ پر ہاتھ چھوڑ بیٹھے گی۔

''جاتی ہوں۔'' فرزانہ نے سنجیدگی سے کہا۔ ''آپ کو امیر گھرانے کی بہو بننا مبارک ہو۔ اگر آپ مجھے عزیز بھائی کا موبائل نمبر دے دیں تو میں ان سے ہمدردی کے دو بول تو......''

''فرزانہ!'' شاہانہ غصے سے ہانپنے لگی۔ ''میں کہتی ہوں کہ بس چلی جاؤ اب۔''

فرزانہ سر جھٹک کر اٹھی اور تیزی سے قدم اٹھاتی کمرے سے چلی گئی۔

اس کے جاتے ہی شاہانہ بستر پر گری اور اس کے آنسو بہنے لگے۔ فرزانہ کی باتوں نے اسے شدید صدمہ پہنچایا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ جس بہن کے مستقبل کی خاطر اس نے اپنی محبت قربان کی تھی، وہ بہن اس سے اس انداز میں بات کرے گی اور یہ سمجھے گی کہ اس نے صرف دولت کی خاطر فیروز سے شادی کی تھی۔

☆☆☆

چار بجے شاہانہ ''فیروز ولا'' چلی گئی۔ لالہ عیسیٰ نے اپنی کوٹھی کا نام بیٹے کے نام پر رکھا تھا۔

ولیمہ ظاہر ہے کہ رات کو ہوتا لیکن قریبی عزیزوں کے خاندان کی عورتیں دوپہر کے بعد سے ہی آنے لگی تھیں۔ کوٹھی میں خاصی چہل پہل ہو گئی تھی۔ شاہانہ کو موقع نہیں مل سکا کہ وہ تنہائی میں زہرہ سے بات کر سکتی۔ اس نے محسوس کیا کہ زہرہ بھی اس سے تنہائی میں بات کرنا چاہتی تھی۔ اسے غالباً شاہانہ کے ایک جملے ہی کی وجہ سے کرید لگی ہوئی ہو گی۔

ولیمہ رات کو ایک شاندار میرج ہال میں تھا۔ لالہ عیسیٰ کے وسیع تعلقات کے باعث مہمانوں کی بہتات تھی۔ مہمانوں میں شاہانہ کے والد، والدہ، بہن اور چھوٹے بھائیوں کے علاوہ بھی کچھ عزیز شامل تھے۔

اس وقت شاہانہ کا ماتھا ٹھنکا جب اس نے اعجاز اور فرزانہ کو کسی جگہ کھڑے بے تکلفانہ انداز میں باتیں کرتے دیکھا۔ فرزانہ جس قسم کی باتیں کر چکی تھی، ان کی وجہ سے شاہانہ کا ماتھا ٹھنکنا ہی چاہیے تھا۔ وہ سوچنے پر مجبور ہو گئی۔ فرزانہ کے دل میں یہ خواہش مچل رہی تھی کہ وہ کسی دولت مند

گھرانے کی بہو بنے۔
شاہانہ کے لیے خوشی کی بات ہوتی کہ اس کی چھوٹی بہن کسی بڑے گھرانے میں بیاہی جائے لیکن اسے شک تھا کہ اعجاز اسے اپنی زندگی کی رفیق نہیں بنا سکے گا۔ اس کی ماں فریال عیسیٰ اس کے راستے کی رکاوٹ بنتیں۔ شاہانہ کو تو انہوں نے اس لیے قبول کیا تھا کہ وہ پوتا پوتی کی خواہش مند تھیں اور اپنی یہ خواہش پوری کرنے کے لیے صرف شاہانہ کو قبول کیا تھا۔ اس کے دوسرے عزیزوں سے وہ اچھے تعلقات نہیں رکھنا چاہتی تھیں۔ ان میں تکبر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ اسی روز صبح شاہانہ دیکھ چکی تھی کہ جو خواتین اسے لینے آئی تھیں، ان کے سامنے فریال عیسیٰ کا انداز ایسا رہا تھا جیسے وہ ان لوگوں کو طوعاً و کرہاً قبول کر رہی ہوں اور یہ بھی شروع شروع کی بات تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کا تکبر نمایاں ہوتا چلا جاتا۔ وہ شاہانہ کے عزیزوں سے حقارت سے پیش آتیں۔ ایسی صورت میں اعجاز سے فرزانہ کی بے تکلفی شادی پر تو منتج نہ ہوتی لیکن کوئی اور گل کھل سکتا تھا جو خصوصاً اس کے والدین کے لیے بدنامی کا سبب بنتا۔
شاہانہ ٹہلتے ہوئے اپنی ماں کے قریب گئی۔ آذر صاحب اس وقت لالہ عیسیٰ سے باتیں کر رہے تھے۔
''امی!'' شاہانہ نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''فرزانہ کو اپنے ساتھ رکھیے!''
''میں دیکھ چکی ہوں۔'' سلطانہ بیگم نے سنجیدگی سے کہا۔ ''میں ابھی اسے پکارنے ہی والی تھی۔''
''اب فوری طور پر ایسا نہ کیجیے گا۔ ابھی اس نے دیکھ لیا ہے کہ میں آپ کے قریب آئی ہوں، وہ سمجھ جائے گی کہ میں نے آپ سے کچھ کہا ہے۔''
''تو سمجھ جائے...... بڑی ہو تم اس کی...... اس کا خیال رکھنا تمہارا بھی فرض ہے۔''
''کوئی وجہ ہے جو میں آپ کو فوری طور پر کچھ کرنے سے روک رہی ہوں۔''
''کیا وجہ ہے؟''
''کسی وقت اطمینان سے بتاؤں گی۔ فیروز مجھے کچھ اشارہ کر رہے ہیں، کچھ دوست اور ان کی بیویاں بھی ہیں ان کے ساتھ! وہ مجھے ان سے ملانا چاہتے ہوں گے۔''
شاہانہ نے ماں کے جواب کا انتظار نہیں کیا اور فیروز کی طرف بڑھ گئی۔ ولیمے کے اختتام پر سب لوگ گھر لوٹے تو اس رات بھی سب تھکے ہوئے تھے۔
کمرے میں فیروز نے شاہانہ سے کہا۔ ''کل میں تم سے کچھ بات کرنا چاہتا تھا مگر تم کچھ بول ہی نہیں رہی تھیں۔ میں تم سے بہت ضروری بات کرنا چاہتا ہوں شاہانہ......! ہمارے آئندہ تعلقات کا انحصار ہے ان باتوں پر!''
''ایسی کوئی اہم بات ہے تو کیجیے۔'' شاہانہ اب چاہتی تھی کہ معاملات اس پر آشکارا ہوں۔
''بس دو ایک سوال کرنا ہیں تم سے!'' فیروز نے کہا۔ ''کیا تم مجھ سے شادی کے لیے یوں تیار ہوئیں کہ میں ایک بہت مال دار باپ کا بیٹا ہوں؟''
شاہانہ فوراً جواب نہیں دے سکی۔
''جواب دو شاہانہ!'' فیروز کچھ توقف سے بولا۔
''نہیں۔'' شاہانہ نے نظریں جھکا کر دھیمی آواز میں جواب دیا۔
''تو پھر کیوں کی؟ لڑکیاں عموماً کسی ایسے شخص سے شادی کرنا پسند نہیں کرتیں جس کی ایک بیوی پہلے سے موجود ہو۔''
''میں نے صرف اپنے باپ کی خواہش کا احترام کیا ہے۔'' شاہانہ کی نظریں جھکی رہیں۔
''میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے سب کچھ سچ سچ بتاؤ۔''
''میں بالکل جھوٹ نہیں بول رہی ہوں۔''
''تمہارے والد کی یہ خواہش کیوں تھی، اس کا اندازہ میں لگا سکتا ہوں۔ آج کے دور نے انسان کو شدید مالی پریشانیوں سے دوچار کر دیا ہے۔ انسان جو کچھ نہیں کرنا چاہتا، وہ بھی کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ یقین کرو کہ اس بات سے میرے دل میں تمہارے والد کا احترام کم نہیں ہوا ہے۔ بہرحال ان کا مقصد پورا ہو جائے گا۔ ڈیڈی مجھے بتا چکے ہیں کہ وہ تمہارے والد کو اپنی انڈسٹری کے کسی بڑے منصب پر بٹھا دیں گے۔ ان کی تنخواہ دوگنی ہو جائے گی بلکہ تین گنا سمجھو۔ میرے ڈیڈی بہت اچھے انسان ہیں شاہانہ! ایک دردمند دل ہے ان کے پہلو میں! وہ چند دن پہلے ہی یہ فیصلہ کر چکے ہیں کہ اپنی انڈسٹری میں کام کرنے والے ہر فرد کی تنخواہ پچاس فیصد بڑھا دیں گے۔ انہیں شدت سے احساس ہے اس دور کی بڑھتی ہوئی مہنگائی کا۔ وہ چاہتے تھے کہ کسی کے مطالبے سے پہلے ہی وہ خود یہ قدم اٹھائیں...... خیر! میں دوسری باتوں میں چلا گیا۔ اب میرا دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا تم کسی کو پسند کرتی تھیں؟ کیا مجھ سے شادی کر کے تم نے اپنی محبت قربان کی ہے؟''
شاہانہ سکتے کی حالت میں رہ گئی۔ وہ سوال ایسا نہیں تھا کہ اس کا جواب آسانی سے دیا جا سکتا۔

''شاید میں......'' فیروز پھر بول پڑا۔ ''مجھے لفظ نہیں مل رہے ہیں کہ میں اپنی بات کس طرح کہوں......شاید یوں کہا جاسکتا ہے کہ میں نے ایک بہت آگے کا سوال کر ڈالا۔ ممکن ہے کہ میرے یہ الفاظ بھی غلط ہوں لیکن میرا خیال ہے کہ میرا مقصد تم پر واضح ہو گیا ہوگا۔ مجھے تم سے جو کچھ معلوم کرنا تھا، ان میں یہ سوال تھا ہی نہیں۔ یہ غیر ارادی طور سے میری زبان پر آ گیا۔ اس سوال کا اثبات میں جواب نہیں دیا جاسکتا اور جھوٹ شاید تم بولنا نہ چاہو اور ایسے موقعوں پر منفی جواب دیتے ہوئے ایک خیال یہ بھی رہتا ہے کہ شاید اس کے سچ پر یقین نہ کیا جائے اس لیے بہتر ہوگا کہ میں تمہیں اس امتحان میں نہ ڈالوں۔''

شاہانہ نے سکون محسوس کیا۔ اس سوال نے اسے شدید ذہنی دباؤ میں ڈال دیا تھا جس سے فیروز نے ہی اسے نجات دلائی۔

فیروز پھر بولا۔ ''ابھی تم نے کہا تھا کہ یہ شادی تم نے صرف اپنے والد کی خواہش کے احترام میں کی تھی۔ میں نے اس پر یقین کرلیا ہے۔ اب تھوڑی سی وضاحت اور کردو۔ اگر میری بیوی نہ ہوتی تو بھی تم مجھ سے صرف اسی لیے شادی کرتیں کہ تمہیں اپنے والد کی خواہش کا احترام کرنا تھا؟''

''جی!''

''اور اگر میری عمر اتنی زیادہ نہ ہوتی تو بھی؟''

''جی۔''

''تمہارے ان جوابات نے مجھے یقین دلا دیا ہے کہ تم کسی سے محبت کرتی ہو لیکن میں اس موضوع پر تم سے زیادہ بات نہیں کروں گا۔ مجھے یہ اصرار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ تم اس سوال کا جواب دو۔ تم مجھے اپنے کسی راز میں شریک کرو یا نہ کرو، میں تمہیں ایک معاملے میں اپنا رازدار بنانا چاہتا ہوں۔''

شاہانہ کے دل کی دھڑکنیں خفیف سی تیز ہوگئیں۔ وہ قیاس بھی نہیں کرسکتی تھی کہ فیروز اسے اپنے کس راز میں شریک کرنا چاہتا ہے۔

فیروز ٹہلنے لگا۔ وہ بہت سنجیدہ اور سوچ میں ڈوبا ہوا نظر آرہا تھا۔ شاید اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اپنی بات کہاں سے شروع کرے! اچانک وہ شاہانہ کے سامنے رکا اور بولا۔ ''میری بیوی زہرہ کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟''

''وہ بہت اچھی ہیں، خوش مزاج ہیں۔''

''وہ میری محبت ہے شاہانہ! اس سے میری شادی محبت کا نتیجہ تھی اور میں آج بھی اس سے اتنی ہی محبت کرتا ہوں جتنی پہلے کرتا تھا۔'' فیروز جذباتی نظر آنے لگا۔ ''میں اسے یہ کرب دے ہی نہیں سکتا کہ اس کی آنکھیں میری دوسری شادی ہوتے ہوئے دیکھیں۔ تم سے میری شادی صرف ممی کے دباؤ کا نتیجہ ہے۔ میں تو اس دباؤ کو بھی برداشت نہیں کرتا لیکن زہرہ نے مجھ پر دباؤ ڈالا کہ میں گھر کی فضا خراب کرنے میں فریق نہ بنوں اور دوسری شادی کرلوں۔ میں نے اس کی بات صرف ایک شرط پر مانی تھی کہ میری دوسری بیوی بھی ممی کی یہ خواہش پوری نہیں کرے گی کہ ممی کا پوتے پوتیوں کا شوق پورا ہو جائے۔ اس پر وہ چونک گئی۔ اس نے پوچھا کہ یہ کیسے ممکن ہے، تب میں نے اسے بتایا کہ میں اپنی دوسری بیوی سے ازدواجی تعلقات قائم ہی نہیں کروں گا اور تم کل دیکھ چکی ہو کہ میں نے ایسا ہی کیا ہے۔ میں تم سے دور ہی رہوں گا۔ جب دو تین سال گزر جائیں گے تو ممی تم سے بھی مایوس ہونے لگیں گی۔ اس وقت شاید وہ میری تیسری شادی کے بارے میں سوچیں۔ زہرہ کا کہنا ہے کہ جب میں نے یہ پالیسی اپنانے کا فیصلہ کرلیا ہے تو میں تیسری شادی کے لیے بھی تیار ہو جاؤں۔ ایسی صورت حال پیش آنے پر تم مجھ سے طلاق کا مطالبہ کرسکتی ہو۔ میں تمہیں طلاق دے دوں گا۔ ممی کو اس پر کوئی اعتراض بھی نہیں ہوگا۔ وہ تو اس پر بھی حیران ہیں کہ زہرہ نے طلاق کا مطالبہ نہیں کیا۔ بہرحال اس طرح تمہیں اس بندھن سے نجات مل جائے گی اور ابھی تمہاری عمر اتنی زیادہ نہیں ہے کہ تم سے کوئی شادی کرنے کے لیے تیار نہ ہو۔ اگر تم کسی سے محبت کرتی ہو اور وہ بھی تم سے محبت کرتا ہے تو اس سے کہہ دینا کہ وہ دو تین سال انتظار کرے۔ اس کے بعد وہی تمہارا ہوگا اور تم اس کی!''

فیروز کی ان باتوں نے شاہانہ کو اتنا جذباتی کردیا کہ اس کی آنکھیں بھیگ گئیں اور اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''آپ بہت عظیم انسان ہیں۔''

فیروز ہنسا۔ ''عظیم نہیں، میں صرف انسان ہوں اور انسان بھی ایسا جو کسی سے بے وفائی نہیں کرسکتا۔ میں زہرہ کی زبان پر یہ فقرہ برداشت نہیں کرسکتا کہ میں بے وفا ہوں۔ خیر! ان سب باتوں کا مقصد یہ تھا کہ اب تم میرے رویے کی وجہ سے ذہنی انتشار میں مبتلا نہ رہو۔ اب تمہیں علم ہو چکا ہے کہ میں تمہارے قریب کیوں نہیں آیا اور نہ آئندہ آؤں گا۔ تم سکون سے وقت گزارو۔ بس کسی پر ظاہر نہ ہو کہ ہمارے مابین ایسی کوئی بات طے ہے۔''

شاہانہ نے سنجیدگی سے کہا۔ ''آج دن میں میری زبان سے ایک ایسا جملہ نکل گیا تھا کہ زہرہ چونک گئی تھیں۔''

شاہانہ کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی فیروز مسکراتے ہوئے بول پڑا۔ ''ہاں زہرہ مجھے بتا چکی ہے، تمہیں محتاط رہنا ہوگا شاہانہ! میں نے تمہیں کل ہی سمجھا دیا تھا۔ اب پھر سمجھا رہا ہوں کہ کسی کے سامنے بھی ایسی کوئی بات تمہاری زبان پر نہیں آنا چاہیے جس سے کسی کو ذرا بھی شبہ ہو۔ زہرہ بھی تمہیں یہی سمجھاتی کہ تم آئندہ خیال رکھو۔''

''میں اب بہت محتاط رہوں گی۔'' شاہانہ خوش تھی۔

''لیکن آج آپ صوفے پر نہیں سوئیں گے۔ میں اپنا بستر فرش پر لگا لیتی ہوں۔''

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' فیروز نے کہا۔ ''اب تم کمرے میں اکیلی ہی رہا کرو گی۔ میں اب زہرہ کے پاس جا رہا ہوں۔'' وہ ایک الماری کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ''آئندہ بھی ایسا ہی ہوا کرے گا۔ میں گھر والوں کو دکھانے کے لیے ابتدائی رات میں تو یہیں آیا کروں گا لیکن جب گھر میں سناٹا چھا جایا کرے گا تو میں یہاں سے زہرہ کے پاس چلا جایا کروں گا۔''

فیروز نے الماری کھولی۔ شاہانہ کی سمجھ میں نہیں آسکا کہ فیروز وہاں سے کیا نکالے گا۔ شاہانہ نے اب تک وہ الماری کھول کر نہیں دیکھی تھی۔ اسے کچھ بھی علم نہیں تھا کہ اس کمرے میں کہاں کیا رکھا تھا۔ وہ اس وقت چونکی جب اس نے دیکھا کہ فیروز نے الماری سے شراب کی دو بوتلیں نکال کر الماری بند کی تھی۔

شاہانہ کے تاثرات دیکھ کر فیروز نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''اگر تم اسے برائی سمجھو تو میں اعتراف کر لوں گا کہ مجھ میں یہ ایک برائی تو بہرحال ہے۔ زہرہ بھی جانتی ہے کہ اگر میں رات کو شراب نہ پیوں تو مجھے نیند نہیں آتی۔ یقین کرو، کل رات میں صوفے پر لیٹ تو گیا تھا لیکن مجھے رات بھر نیند نہیں آئی تھی۔ اگر آج کی طرح کل ہی تم سے یہ سب باتیں ہو جاتیں تو میں بوتلیں لے کر کل رات بھی زہرہ کے پاس چلا جاتا۔ ممی نے زہرہ کو دوسرا کمرا دے دیا تھا اور مجھے یہاں سے شراب منتقل کرنے کی مہلت نہیں مل سکی تھی۔ ابھی اس الماری میں چند بوتلیں اور رکھی ہیں۔ میں روزانہ دو دو ایک ایک کر کے سب بوتلیں یہاں سے لے جاؤں گا۔''

شاہانہ نے نظریں جھکا لیں۔ فیروز سے ایک اعتبار سے ''قطع تعلق'' ہو جانے کے باوجود اسے یہ اچھا نہیں لگا تھا کہ فیروز جیسا اچھا انسان شراب پیتا تھا لیکن پھر اسے یہ خیال بھی آیا کہ وہ جس گھرانے سے تعلق رکھتی ہے، وہاں اسی انداز میں سوچا جا سکتا ہے ورنہ زیادہ تر مالدار گھرانوں کے ماڈرن افراد اب شراب نوشی کو برا نہیں سمجھتے۔

''یہاں ابھی میری کچھ اور چیزیں بھی ہیں۔'' فیروز نے کہا۔ ''میں وقتاً فوقتاً لے جاتا رہوں گا لیکن اس سے تمہاری نیند میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اگر مجھے رات کے وقت بھی ضرورت پڑے گی تو میں آکر لے جاؤں گا۔ کمرے کی چابی ہے میرے پاس! ابھی جاتے جاتے میں کمرے کا پش بٹن دبا کر دروازہ لاک کرتا جاؤں گا۔ ابھی تم کمرا اندر سے بولٹ مت کرنا۔ جب میں یہاں سے اپنی سب چیزیں لے جاؤں گا تو تمہیں بتا دوں گا۔ اس کے بعد تم کمرا بولٹ بھی کر سکتی ہو، لیکن اس میں تمہیں ایک دشواری ہو جائے گی۔ صبح میں بہت جلدی زہرہ کے کمرے سے یہاں آیا کروں گا تاکہ جب گھر کے لوگ اٹھیں تو مجھے یہیں سے نکلتے دیکھیں۔ تمہیں میری وجہ سے اپنی نیند خراب کر کے بولٹ کھولنا پڑے گا۔''

شاہانہ نے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

اس وقت کوٹھی پر گہرا سناٹا طاری تھا۔ سب ہی لوگ گہری نیند سو چکے ہوں گے۔ فیروز بڑے اطمینان سے دروازہ کھول کر باہر نکلا اور پش بٹن دبا کر دروازہ لاک کر گیا۔

شاہانہ ایک طویل سانس لے کر بستر پر ڈھیر ہو گئی۔ وہ بہت خوش تھی۔ اس کا دل چاہا کہ ابھی عزیر کو فون کر کے ساری بات بتائے لیکن اس طرح وہ عزیر کے تاثرات سے بے خبر رہ جاتی۔

تھکن کی وجہ سے جلد ہی اسے نیند آ گئی۔ پھر نہ جانے کیا ہوا کہ ہڑبڑاہٹ کے عالم میں اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے فرش پر کھڑے ہوئے فیروز کو اپنے اوپر جھکا ہوا دیکھا۔ وہ شب خوابی کے لباس میں تھا۔ شراب کی ہلکی سی بو بھی آ رہی تھی۔ شاہانہ بوکھلا کر اٹھی تو فیروز جھجک کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔

''معاف کرنا شاہانہ!'' وہ بولا۔ ''دراصل میں اپنی ایک انگشتری تلاش کر رہا تھا۔ رات کو وہ میں عموماً تکیے کے نیچے رکھ دیا کرتا تھا۔ میں نے تکیے کے نیچے ہاتھ سرکایا تو تمہاری آنکھ کھل گئی۔''

شاہانہ کا دل بہت زور زور سے دھڑکنے لگا تھا اور کچھ ایسے خیالات اس کے دماغ میں چکرانے لگے جو خوش گوار ہرگز نہیں تھے۔

''اب تم اٹھ ہی گئی ہو تو ذرا تکیہ اٹھا کر دیکھو!'' فیروز نے کہا۔

شاہانہ نے تکیہ اٹھایا۔ وہاں ایک انگشتری موجود تھی۔

شاہانہ کے دماغ میں خیال آیا، ہوسکتا ہے وہ انگشتری فیروز نے ابھی تکیے کے نیچے رکھی ہو..... مگر کیوں؟ مقصد؟

شاہانہ کا دماغ کوئی جواب نہیں سوچ سکا۔

"شکریہ۔" شاہانہ سے انگشتری لیتے وقت فیروز اس طرح مسکرایا جیسے خوش ہوگیا ہو۔ "دراصل انگشتری پہنے پہنے سونے سے مجھے الجھن ہوتی ہے اس لیے تکیے کے نیچے رکھ دیتا ہوں۔ اس شادی کی وجہ سے میرا دماغ اتنا منتشر رہا تھا کہ میں یہ پہننا بھول ہی گیا۔ دراصل یہ زہرہ سے میری منگنی کی انگشتری ہے اس لیے مجھے بہت عزیز ہے۔ خیر! اب تم سو جاؤ۔ ابھی صرف چھ ہی بجے ہیں۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ صبح جلد ہی یہاں آجایا کروں گا۔ ابھی تم ڈیڑھ گھنٹے تو سو ہی سکتی ہو۔ ناشتے کی میز پر ساڑھے آٹھ بجے پہنچنا ہوتا ہے۔"

"جی۔" شاہانہ دل کی تیز دھڑکنوں کے ساتھ اتنا ہی کہہ سکی۔

فیروز باتھ روم میں چلا گیا۔

شاہانہ آہستگی سے دوبارہ لیٹ گئی۔ اس کے دل کی دھڑکنیں ابھی تک قابو میں نہیں آئی تھیں۔ جو واقعہ ہوچکا تھا، اس کے اثرات اس کے دماغ پر گہرے تھے۔ فیروز نے انگشتری کی جو بات کہی تھی، وہ درست بھی ہوسکتی تھی لیکن اس واقعے کی وجہ سے وہ ایک اور انداز میں سوچنے پر بھی مجبور ہوگئی۔ اس کے دماغ میں یہ خدشہ کسمسانے لگا تھا کہ فیروز کسی وقت نشے میں بھول بھی سکتا تھا کہ اس نے شاہانہ سے کیا وعدہ کیا تھا یا اس بارے میں کیا سوچا تھا۔

شاہانہ خوب صورت تھی۔ اسے احساس تھا کہ وہ جسمانی طور پر بھی پرکشش تھی۔ نشے میں ڈوبا ہوا انسان اسے دیکھ کر کسی وقت بہک بھی سکتا تھا۔

ان خیالات کے باوجود شاہانہ تھوڑی سی اونگھ گئی کیونکہ وہ واقعہ بھی اسے نیند کے غلبے سے پوری طرح باہر نہیں لا سکا تھا۔

لیکن اونگھتے اونگھتے ہی میں کسی خیال نے اسے چونکا دیا۔ اس نے دیکھا کہ فیروز پوری طرح تیار تھا اور ایک صوفے پر بیٹھا ہوا چائے پی رہا تھا جو اس نے کسی ملازم سے منگوائی ہوگی۔

شاہانہ نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ ساڑھے سات بجنے والے تھے۔ شاہانہ ایک طویل سانس لے کر رہ گئی۔ یہ اسے عجیب سا لگا کہ وہ ڈیڑھ گھنٹے تک اونگھتی رہی تھی۔

"اچھا ہوا تم جاگ گئیں۔" فیروز نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ "میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ تمہیں آواز دے کر جگاؤں۔ اب غسل وغیرہ کرکے تیار ہوجاؤ۔ آج ناشتے کی میز پر پہنچنے میں سیکنڈز کی بھی دیر نہیں ہونا چاہیے۔" وہ دھیرے سے ہنسا۔

شاہانہ پر نیند کا غلبہ اب بھی تھا لیکن وہ بستر سے اٹھ گئی۔

مکمل طور سے تیار ہونے میں اسے پون گھنٹے سے زیادہ نہیں لگا۔

"ابھی پندرہ منٹ ہیں۔" فیروز نے گھڑی دیکھ کر کہا۔ "آؤ بیٹھو.....! ہم دو منٹ پہلے بھی کمرے سے نکلیں گے تو وقت پر ڈائننگ روم میں ہوں گے۔"

شاہانہ اس کے سامنے جا بیٹھی۔

"تمہارے لیے چائے منگواؤں؟" فیروز نے پوچھا۔

"جی نہیں۔ میں ناشتے پر ہی پیوں گی۔"

"میں تو اس وقت ایک کپ ضرور پیتا ہوں۔" فیروز نے کہا۔ "منہ میں شراب کا جو ذائقہ ہوتا ہے، وہ ختم ہوجاتا ہے۔"

"جی۔" شاہانہ نے کہا، پھر بولی۔ "آپ کے گھر میں شادی کے بعد کے رسم و رواج تو ہوئے نہیں۔ اگر آج میں کہیں جانا چاہوں تو جاسکتی ہوں؟"

"ہاں ہاں، کیوں نہیں؟ ڈیڈی نے تمہیں منہ دکھائی میں کار تو دے ہی دی ہے، گھر میں ایک اضافی شوفر بھی ہے۔ اسے لے لینا۔ بس ممی کو بتائے بغیر کہیں نہیں جانا۔"

"اگر میں شوفر کو ساتھ نہ لوں تو کوئی حرج ہے؟"

"ڈرائیونگ جانتی ہو؟"

"کالج کے زمانے میں سیکھ لی تھی۔"

"ڈرائیونگ لائسنس بھی ہے؟"

"وہ تو نہیں ہے۔"

"تو بنوالو! کوئی تصویر ہے اپنی تمہارے پاس؟"

"کئی ہیں۔" شاہانہ نے جواب دیا۔ "گھر سے جو سامان لائی تھی، اس میں ہوں گی۔"

"وہ نکال لینا ابھی کسی وقت! میں دفتر کے کسی آدمی کو فون کردیتا ہوں۔ لائسنس کل تک بن کر گھر ہی آجائے گا۔ تمہیں اس کے لیے کہیں جانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔"

"آپ دفتر کس وقت جاتے ہیں؟"

"آج تک کی تو چھٹی ہی کرلی ہے۔ کل سے جانا شروع کروں گا۔ دس بجے تک روانہ ہوتا ہوں، لیکن ڈیڈی نو بجے ہی نکل جاتے ہیں۔"

''اگر آج آپ گھر پر ہیں تو میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ ممی کو ضرور خیال آئے گا کہ آپ کے ہوتے ہوئے بھی میں گھر سے کہیں جانا چاہتی ہوں۔''

''اگر کہیں جانا ضروری ہے تو میں لے چلتا ہوں۔''

''نہیں کچھ ایسا ضروری بھی نہیں ہے، ایک بہت قریبی دوست ہے میری! اس سے ملنے جاتی۔ اب کل ہی چلی جاؤں گی۔''

''قریبی دوست؟'' فیروز نے اسے غور سے دیکھا۔

شاہانہ کے دل میں چور تھا اس لیے وہ نظریں چراتے ہوئے آہستہ سے بولی۔ ''جی! لیکن خیر! کل ڈرائیونگ لائسنس بھی بن کر آجائے گا۔''

''ہاں وہ تو آجائے گا۔ اچھا یہ بتاؤ! تم کیسا محسوس کر رہی ہو؟''

''میں سمجھی نہیں۔''

''شادی کے بعد جو صورتِ حال تمہارے سامنے آئی ہے، اس کے بارے میں شاید کوئی لڑکی تصور بھی نہیں کر سکتی۔''

''جی۔'' شاہانہ خفیف سا مسکرائی۔ ''میں خود کو کسی کہانی کا کردار محسوس کرنے لگی ہوں۔''

فیروز دھیرے سے ہنسا۔ ''رات کو زہرہ سے تمہارے متعلق خاصی باتیں ہوتی رہی تھیں۔''

''کوئی خاص بات؟''

''نہیں۔ کوئی خاص بات نہیں! بس ادھر ادھر کی! وہ بھی کہہ رہی تھی کہ اس صورتِ حال نے تمہیں ششدر کر دیا ہوگا۔ اچھا خیر! اب اٹھو۔ ناشتے کے لیے چلو۔''

فیروز کے ساتھ ہی شاہانہ بھی اٹھ گئی۔

☆☆☆

گیارہ بجے تھے جب شاہانہ زہرہ کے کمرے میں تھی۔

''ایک بات میری سمجھ میں نہیں آسکی۔'' شاہانہ کہہ رہی تھی۔ ''ممی کا اتنا دباؤ کیوں ہے گھر کے لوگوں پر؟''

زہرہ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ ''جب میں شادی ہو کر اس گھر میں آئی تھی تو یہ میرے لیے بھی ایک معما تھا۔ مجھے فیروز نے ہی اس بارے میں بتایا۔ دراصل ڈیڈی شروع سے اتنے بڑے انڈسٹریلسٹ نہیں تھے لیکن ممی کے والد کی انڈسٹری بہت بڑی تھی۔ ان کا انتقال شادی کے فوراً بعد ہی ہو گیا تھا۔ ان کا سب کچھ ممی کے حصے میں آیا۔ ان کا کوئی اور بھائی بہن نہیں۔ اس طرح ڈیڈی ایک بہت بڑے انڈسٹریلسٹ بن گئے۔ ممی کو اسی کا زعم ہے۔ اسی کے بل بوتے پر انہوں نے شروع ہی سے ڈیڈی پر چھا جانے کی کوشش کی۔ ڈیڈی کیونکہ صلح پسند ہیں اس لیے وہ ہر بات نظر انداز کرتے رہے لیکن بعد میں یہ ہوا کہ ان کے بچوں پر بھی اس کا نفسیاتی اثر پڑا۔ فیروز کے بڑے بھائی تو ان سے بہت ہی ڈرنے لگے تھے۔''

شاہانہ چونکی۔ ''فیروز کے کوئی بڑے بھائی بھی ہیں؟''

''اب نہیں ہیں۔ انتقال ہو چکا ہے ان کا۔''

''کب؟''

''کئی سال ہو گئے۔ اس وقت تو میری بھی شادی نہیں ہوئی تھی۔ اخباروں میں رپورٹس چھپی تھیں۔ دراصل کچھ جرائم پیشہ افراد نے انہیں اغوا کر لیا تھا۔ تاوان میں ایک بہت بڑی رقم مانگی تھی۔ خیر وہ بڑی رقم بھی دے دی جاتی لیکن کسی وجہ سے ان لوگوں کو شبہ ہو گیا کہ پولیس سے رابطہ کر لیا گیا ہے۔ اس غلط فہمی کی بنا پر انہوں نے فیروز کے بڑے بھائی شہباز کو قتل کر دیا تھا۔ لاش ایک سڑک پر پھینک دی تھی۔''

''یہ تو بہت بڑا صدمہ گزر چکا ہے اس گھر پر!''

''ہاں، لیکن اب تو بات بہت پرانی ہو چکی ہے۔ دس سال گزر چکے ہیں اور وقت کی گرد سب صدموں کو دبا دیتی ہے۔''

''قاتلوں کا پتا نہیں چلا تھا؟''

''نہیں۔''

''اعجاز تو اس وقت خاصا چھوٹا ہوگا۔''

''بہت زیادہ چھوٹا بھی نہیں۔ ہاں بس لڑکا سا تھا۔''

''میں نے محسوس کیا ہے کہ وہ ممی سے کچھ زیادہ نہیں ڈرتا۔''

''ہاں، زیادہ لاڈ پیار کی وجہ سے کچھ سرکش ہو گیا ہے لیکن آج ممی نے اسے بہت جھاڑ پھٹکار دیا ہے۔''

''کیوں؟''

زہرہ فوراً کچھ نہیں بولی۔ وہ کسی سوچ میں پڑ گئی تھی۔

شاہانہ بولی۔ ''اگر تم وجہ نہ بتانا چاہو تو میں اصرار نہیں کروں گی۔''

''نہیں، دراصل میں سوچنے لگی تھی، کہیں تم برا نہ مان جاؤ لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ میں تمہیں بے خبر نہ رکھوں۔''

شاہانہ کو کچھ شبہ ہوا لیکن وہ خاموشی سے مستفسرانہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔

''دراصل۔'' زہرہ نے قدرے تذبذب سے کہا۔

''اعجاز لاڈ پیار سے کچھ سرکش ہی نہیں ہوا بلکہ اس کا اثر اس کے کردار پر بھی پڑا ہے۔ کل صبح جب تمہارے گھر والے تمہیں لینے آئے تھے، اس وقت بھی وہ تمہاری بہن کے ساتھ بے تکلف ہونے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ بعد میں اس کی یہ خواہش بھی تھی کہ وہ اپنی کار میں صرف فرزانہ کو ہی تمہارے گھر پہنچائے۔ پھر کل رات ویسے میں بھی اس کی کوشش رہی کہ وہ فرزانہ کے قریب رہنے کے زیادہ سے زیادہ مواقع حاصل کرے۔''

شاہانہ نے وہ سب کچھ بڑے سکون سے سنا۔ وہ اس کے لیے کوئی چونکا دینے والی بات نہیں تھی۔

زہرہ نے غور سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بہتر ہوگا کہ تم فرزانہ کو اس معاملے میں سمجھا دو۔''

''میں نے خود یہ بات محسوس کرلی تھی زہرہ! میں امی سے کہہ بھی چلی ہوں کہ وہ فرزانہ کا خیال رکھیں۔ تم تو مجھے یہ بتاؤ کہ ممی نے اعجاز کو کس بات پر ڈانٹا؟''

''اسی بات پر!'' زہرہ نے جواب دیا۔ ''انہوں نے بھی اعجاز اور فرزانہ کی بات محسوس کرلی تھی۔''

''تو انہوں نے اعجاز سے کہا کیا؟''

''وہ نہ پوچھو۔ اتنا تو میں نے بتا دیا نا کہ اعجاز کو ڈانٹ پڑی تھی۔''

''یہ کہہ کر تم نے میرا تجسس اور بڑھا دیا ہے کہ میں تم سے اس معاملے کی تفصیل نہ پوچھوں۔''

''دراصل جھوٹ بولنا مجھے پسند نہیں اور سچ سن کر تمہیں دکھ ہوگا۔''

''اب تم نے میرا تجسس اور بڑھا دیا۔ پلیز! مجھے بتاؤ زہرہ! دکھ ہوتا ہے تو ہو، مجھے تم سے گلہ نہیں ہوگا۔''

زہرہ نے ایک طویل سانس لی۔ ''دراصل تم سے فیروز کی شادی انہوں نے مجبوراً کی ہے۔ ان کے اپنے طبقے کی کوئی لڑکی تو کسی ایسے شخص سے شادی کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتی جس کی ایک شادی پہلے ہی ہوچکی ہو۔ دراصل ممی بہت مغرور خاتون ہیں۔ آہستہ آہستہ تو وہ یہ کوشش بھی کریں گی کہ تمہارے والدین بھی یہاں کم سے کم آئیں۔ فرزانہ سے اعجاز کی بے تکلفی انہوں نے اسی لیے پسند نہیں کی۔ اس پر جب انہوں نے اعجاز کو ڈانٹا تو وہ کہنے لگا کہ فرزانہ اس کی بھابی کی بہن ہے جو اس گھر میں آتی جاتی تو رہے گی لہٰذا اس سے باتیں بھی ہوں گی۔ اس پر ممی نے کہا کہ وہ فرزانہ کی آمد کو روکنے کی زیادہ سے زیادہ کوشش کریں گی۔ اس بات پر اعجاز نے سرکشی دکھائی اور کہہ بیٹھا کہ پھر وہ فرزانہ سے کہیں باہر مل لیا کرے گا کیونکہ وہ اسے اپنی دوست بنائے رکھنا چاہتا ہے۔ اس پر ممی نے اسے اور زیادہ ڈانٹا تو وہ چپ ہوگیا لیکن میرا خیال ہے، وہ مصمم ارادہ کرچکا ہے کہ فرزانہ سے کہیں نہ کہیں ملاقات کرتا رہے گا۔ اب یہ تمہارا کام ہے شاہانہ کہ تم فرزانہ کو روکنے کی کوشش کرو۔ وہ اس گھر کی بہو تو ہرگز نہیں بن سکے گی اور یہ میل ملاپ اس کے لیے مناسب نہیں رہے گا۔''

''مجھے خوب اندازہ ہوچکا ہے۔'' شاہانہ نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''میں اپنی والدہ کو اور زیادہ سمجھا دوں گی۔ مجھے ان باتوں سے کوئی دکھ نہیں ہوا زہرہ! میں خود بھی ممی کا مزاج سمجھ چکی ہوں اور کل دیکھ بھی لیا ہے کہ میرے گھر والوں کے ساتھ ممی کا رویہ تحقیر آمیز تو نہیں تھا لیکن ان کی سرد مہری سے اندازہ تو میں لگا چکی ہوں کہ آئندہ ان کا انداز کیا ہوسکتا ہے۔''

''اب تمہیں کوشش یہ کرنا ہوگی کہ اعجاز اپنی چکنی چپڑی باتوں سے فرزانہ کو شیشے میں نہ اتار سکے اور وہ دونوں گھر کے باہر ایک دوسرے سے نہ مل سکیں۔''

''میں نے امی سے کہہ تو دیا ہے لیکن ابھی موقع ملا تو ان سے فون پر ایک بار پھر بات کرلوں گی۔''

اسی دن دوپہر کے کھانے کے بعد جب سب لوگ ادھر ادھر ہوچکے تھے، شاہانہ نے موبائل فون پر سلطانہ بیگم سے رابطہ کرکے انہیں ساری بات بتا دی۔

''ہاں۔'' سلطانہ بیگم نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''یہ اندازہ تو مجھے بھی ہوچکا ہے کہ فریال عیسیٰ بہت مغرور ہیں۔ ہم لوگوں کے ساتھ ان کا رویہ ٹھیک نہیں رہے گا۔''

شاہانہ نے ان سے بات کرنے کے بعد عزیر سے رابطہ کیا اور اسے بتایا کہ وہ آج اس سے ملنے کے لیے کیوں نہیں آسکے گی۔

بات کرنے کے بعد وہ کمرے میں لیٹی تمام حالات پر غور کرتی رہی۔ فیروز گھر میں ہی کہیں تھا لیکن اس وقت کمرے میں نہیں تھا۔

سوچتے سوچتے شاہانہ کو خیال آیا کہ وہ زہرہ سے اس دھماکے کے بارے میں پوچھنا بھول گئی تھی جو زہرہ ہی کے بہ قول لالہ عیسیٰ کرنے والے تھے۔ بھول جانے کا سبب یہ تھا کہ اس کا دماغ فرزانہ اور اعجاز کے معاملے میں الجھا رہ گیا تھا۔

پھر اس روز کسی وقت بھی اس سے تو زہرہ سے تنہائی میں بات کرنے کا موقع نہیں مل سکا۔

دوسرے دن وہ فریال عیسیٰ سے اجازت لے کر گھر

سے روانہ ہوئی۔ بہانہ اس نے اپنے گھر جانے ہی کا کیا تھا اور وہ گھر جانا بھی چاہتی تھی لیکن پہلے اسے عزیر سے ملنا تھا۔

روانگی سے ذرا ہی دیر پہلے اس کا ڈرائیونگ لائسنس بن کر آگیا تھا اور وہ سوچنے پر مجبور ہوگئی تھی کہ جس ملک میں سب کام صرف تعلقات یا پیسے کے بل بوتے پر گھر بیٹھے ہوجائیں، اس ملک کی بنیادیں کب تک محفوظ رہ سکتی ہیں۔

وہ اپنی نئی کار میں گھر سے روانہ ہوئی تھی جو اسے لالہ عیسیٰ نے منہ دکھائی میں دی تھی۔ اس سے پہلے شاہانہ نے اپنی کالج کی کئی دوستوں کی کاریں چلائی تھیں۔ یہ پہلا موقع تھا جب وہ ''اپنی'' کار چلا رہی تھی لیکن ''حقِ ملکیت'' کا احساس اس کے لیے ذرا بھی خوشگوار نہیں تھا۔ وہ دولت کی متمنی کبھی نہیں رہی تھی۔ اس کی سب سے بڑی دولت عزیر تھا جو کچھ عرصے کے لیے اس سے بچھڑ گیا تھا۔

شاہانہ نے ایسی دواؤں کا انتظام کرلیا تھا کہ وہ کبھی فیروز کے بچے کی ماں نہ بن سکے لیکن حالات ایسے حیرت انگیز پیش آئے تھے کہ اسے وہ دوائیں استعمال کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی تھی۔

راہ میں اس نے کار ایک شاپنگ پلازا کی پارکنگ لاٹ میں روکی۔ اسے علم تھا کہ وہاں کی دو ایک دکانوں پر ایسے غیر ملکی پرفیوم بھی مل جاتے تھے جو اور کہیں دستیاب نہیں ہوتے تھے۔ انہی میں سے ایک پرفیوم عزیر کو بہت پسند تھا۔ شاہانہ اس کے لیے وہی پرفیوم خریدکرلے جانا چاہتی تھی۔

وہ پرفیوم لے کر لوٹ رہی تھی تو اس کا سامنا خالہ ذکیہ سے ہوگیا۔ یہ اس کی رشتے کی وہی خالہ تھیں جو شادی کے دوسرے روز اسے لینے آئی تھیں۔

انہوں نے گرم جوشی کے ساتھ شاہانہ کو گلے لگایا اور اسے اپنے ساتھ شاپنگ پلازا ہی میں واقع ایک ریسٹورنٹ میں لے گئیں۔

خالہ ذکیہ کی عمر پینتالیس سال کے لگ بھگ تھی لیکن وہ بہت اچھے نقش و نگار کی مالک تھیں۔ آسودہ حالی نے انہیں اور زیادہ نکھار دیا تھا۔ ان کا گھرانا بھی خوش حال تھا۔ وہ طبیعت کی بھی بہت اچھی تھیں۔ انہوں نے کئی مرتبہ شاہانہ کے والد کی مالی مدد کرنا چاہی تھی لیکن خوددار آذر صاحب نے ان کی مدد لینا گوارا نہیں کی تھی۔

شاہانہ کے علم کے مطابق خالہ ذکیہ کی زندگی کا ایک المیہ یہ تھا کہ وہ شادی کے بعد جب دلہن بن کر اپنے شوہر کے گھر پہنچی ہی تھیں تو نہ جانے کس وجہ سے ان کے شوہر کا ہارٹ فیل ہوگیا تھا۔ وہ شب عروسی منانے سے پہلے ہی بیوہ ہوگئی تھیں جس کے بعد انہوں نے کبھی دوسری شادی کے بارے میں سوچا تک نہ تھا۔

ان کا... مرحوم شوہر ایک بے حد دولت مند شخص تھا۔ اس کے ورثا میں سے کوئی نہ ہونے کے سبب اس کی ساری دولت خالہ ذکیہ کے حصے میں آئی تھی۔ کیونکہ وہ خود پڑھی لکھی اور ذہین تھیں اس لیے انہوں نے خود ہی اپنے مرحوم شوہر کا ادارہ سنبھال لیا تھا اور اب تک اسے بڑی خوش اسلوبی سے چلا رہی تھیں۔ ان کا رہنا سہنا اپنے والدین ہی کے ساتھ تھا اور آذر صاحب کے گھر سے ان لوگوں کا میل جول بھی تھا۔ وہ سبھی لوگ خوش حال لیکن منکسر المزاج تھے۔

خالہ ذکیہ نے شاہانہ کے لیے چائے اور کچھ اسنیکس وغیرہ منگوائے۔

''تم خوش تو ہو نا شاہانہ!'' وہ بولیں۔

''جی، جی ہاں، بالکل۔''

''کیا خریدنے آئی تھیں؟''

''ایک پرفیوم لینا تھا۔''

''فیروز کو دینا ہوگا۔''

شاہانہ خفیف سا مسکرا کر رہ گئی۔ اس نے جھوٹ بولنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ اس وقت اسے ٹوائلٹ جانے کی خواہش محسوس ہوئی جس کا اظہار اس نے خالہ ذکیہ سے بھی کیا۔

''اس طرف ہے ٹوائلٹ۔'' خالہ ذکیہ نے ایک طرف اشارہ کیا۔ ''جلدی سے ہو آؤ۔ چائے آنے میں اتنا وقت تو لگے گا۔''

شاہانہ اٹھ کر جانے لگی۔

خالہ ذکیہ جلدی سے بولیں۔ ''شاپنگ بیگ تو یہیں چھوڑ کر جارہی ہو مگر یقین کرو کہ میں موبائل چور بھی نہیں ہوں۔''

شاہانہ دھیرے سے ہنس دی۔ موبائل اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے وہ بھی میز پر رکھ دیا اور ٹوائلٹ کی طرف چلی گئی۔

کبھی کبھی ایسے اتفاقات بھی پیش آجاتے ہیں، خالہ ذکیہ نے بڑی خوش دلی سے سوچا تھا۔

نظروں سے شاہانہ کے اوجھل ہوتے ہی خالہ ذکیہ نے اس کا موبائل اٹھایا اور اس میں فیڈ کیے ہوئے نمبر دیکھنے لگیں۔ ان کے انداز میں عجلت تھی۔ ''ل'' کے حرف میں انہیں عزیر کا نمبر جلد ہی مل گیا۔ وہ انہوں نے فوراً اپنے پاس نوٹ کرکے موبائل ٹھیک اسی جگہ رکھ دیا جہاں شاہانہ

رکھ کر گئی تھی۔
ویٹر چائے وغیرہ رکھ کر گیا ہی تھا کہ شاہانہ لوٹ آئی۔
''واپس گھر ہی جاؤ گی؟'' خالہ ذکیہ نے پوچھا۔
''جی نہیں۔'' شاہانہ نے جواب دیا۔ ''پہلے تو امی سے ملنے جاؤں گی۔''
ادھر ادھر کی باتوں میں چائے پی لی گئی۔ اس کے بعد جب وہ دونوں وہاں سے اٹھیں تو خالہ ذکیہ نے کہا۔ ''کسی دن ہماری طرف بھی چکر لگاؤ! فیروز کو بھی لیتی آنا بلکہ مجھے تم دونوں کی دعوت کرنا ہے۔''
''دعوت کی کیا ضرورت ہے خالہ! ہم ویسے ہی آجائیں گے۔''
''خیر خیر! دیکھا جائے گا۔''
وہ دونوں شاپنگ پلازا سے نکل آئیں۔
''آپ کی گاڑی کہاں ہے؟'' شاہانہ نے پوچھا۔
خالہ ذکیہ نے ایک طرف اشارہ کیا۔
شاہانہ بولی۔ ''شادی کے دوسرے دن جب آپ مجھے لینے آئی تھیں تو آپ کی کار کہاں تھی؟''
''میں جان بوجھ کر نہیں لائی تھی۔''
''کیوں؟'' شاہانہ کو حیرت ہوئی۔
''مجھے پہلے ہی علم تھا کہ تمہاری ساس بہت مغرور عورت ہے۔ میں چاہتی تھی کہ وہ مجھے بھی معمولی عورت سمجھے۔''
''مگر کیوں خالہ؟ مجھے یاد ہے، آپ انہیں بڑی تیکھی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔''
''کھڑے کھڑے باتیں کرنا اچھا نہیں لگتا۔'' خالہ ذکیہ نے شاہانہ کا شانہ تھپک کر کہا۔ ''اب تم جاؤ، میں بھی چلتی ہوں، خدا حافظ۔''
خالہ ذکیہ اپنی کار کی طرف بڑھ گئیں۔
شاہانہ جب اپنی کار میں وہاں سے روانہ ہوئی تو الجھن کا شکار تھی۔ خالہ ذکیہ کی یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی کہ انہوں نے فریال عیسیٰ کو یہ کیوں باور کرانا چاہا کہ وہ ایک معمولی عورت ہیں؟
سوچنے سے اس کی یہ الجھن ختم نہیں ہوسکی اور وہ عزیر کے دفتر پہنچ گئی کیونکہ بارہ بج چکے تھے اس لیے اس کا خیال تھا کہ عزیر دفتر ہی میں ہوگا۔
خیال درست ثابت ہوا۔ عزیر اسے دیکھ کر خوش ہوا تھا۔ وہ چھوٹتے ہی بولا۔ ''فون تو کردیتیں کہ آرہی ہو!''
''خیال تھا کہ مجھے غیر متوقع طور پر دیکھ کر تم زیادہ خوش ہوگے۔''
''خوش تو میں یقیناً ہوا ہوں لیکن......'' وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ اس کی نظر شاہانہ کے لائے ہوئے پیکٹ کی طرف تھی۔ ''یہ کیا ہے؟'' اس نے پوچھا۔
''تمہارے لیے لائی ہوں۔'' شاہانہ نے پرفیوم کا ڈبا نکالا۔
عزیر کے ہونٹوں پر افسردہ سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے کہا۔ ''ایک تحفہ تو میں بھی تمہیں دینا چاہتا تھا مگر اس کا موقع نہیں ملا۔ وہ گھر پر ہے۔ کسی دن گھر آؤ گی تو دوں گا۔ یہ کیا لکھ رہی ہو؟''
شاہانہ اس کی میز ہی سے قلم اٹھا کر پرفیوم کے پیکٹ پر کچھ لکھنے لگی تھی۔ وہ لکھ کر اس نے پیکٹ عزیر کو دیا۔
عزیر نے پڑھا۔ شاہانہ نے لکھا تھا۔
''اس کی خوشبو میں تم میری خوشبو محسوس کیا کروگے۔''
عزیر خفیف سا مسکرا کر بولا۔ ''تمہاری خوشبو تو میرے رگ و پے میں رچی ہوئی ہے شاہانہ......! خیر، میں وہ باتیں جاننے کے لیے بے چین ہوں جو تم مجھے بتانا چاہتی ہو اور جو تم نے فون پر نہیں بتائی تھیں۔''
''میری شادی ایک حیرت انگیز شادی ہے عزیر!'' شاہانہ نے کہا۔ ''کیا تم یقین کروگے کہ شب عروسی ابھی میری زندگی کا حصہ نہیں بنی۔''
عزیر حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا اور پھر شاہانہ کی باتیں سنتے ہوئے اس کی حیرت میں اضافہ ہوتا ہی رہا۔ جب شاہانہ کچھ بتانے کے بعد خاموش ہوئی تو عزیر نے ایک طویل سانس لی اور کہا۔
''یہ سب کچھ ایک کہانی سی معلوم ہوتی ہے۔''
''فیروز بھی اسی قسم کی ایک بات کہہ چکے ہیں۔''
''عظیم شخص ہے وہ جو اپنی پہلی بیوی سے اتنی محبت کرتا ہے۔''
''میرے دل میں بھی اب ان کی بہت عزت بڑھ گئی ہے۔'' عزیر نے کہا، پھر بولا۔ ''تمہارے لیے کافی منگواؤں یا کچھ اور پسند......''
''کچھ نہیں۔'' شاہانہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''ابھی راستے ہی میں ایک جگہ چائے پی تھی بلکہ ہلکا پھلکا سا ناشتا بھی ہوگیا تھا۔ بس کچھ دیر باتیں کریں گے، پھر مجھے امی سے ملنے بھی جانا ہے۔''
''اچھا تو اب میں تمہیں اپنی ایک الجھن سے آگاہ کردوں۔''
''اوہ، ہاں! یہ پرفیوم کا پیکٹ دیکھ کر تم کچھ کہتے کہتے

رہ گئے تھے۔‘‘

’’ہاں۔‘‘ عزیر نے کہا۔ ’’میں تمہیں وہی بات بتانے والا تھا جو کچھ دیر سے میری الجھن کا سبب بنی ہوئی ہے۔‘‘

’’کچھ دیر سے؟‘‘

’’ہاں۔‘‘ عزیر نے کہا۔ ’’تمہاری آمد سے شاید پانچ منٹ پہلے مجھے ایک پراسرار کال موصول ہوئی تھی۔‘‘

’’پراسرار کال؟‘‘ شاہانہ الجھ گئی۔

عزیر نے جواب دیا۔ ’’میں اسے پراسرار کال اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اس عورت نے مجھے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔‘‘

’’عورت؟‘‘ شاہانہ کی الجھن میں اضافہ ہوگیا۔

’’ہاں۔ میں اسے عورت اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اس کی آواز میں کسی حد تک پختگی تھی جو لڑکیوں کی آواز میں نہیں ہوتی۔‘‘

’’کیوں فون کیا تھا اس نے؟‘‘ شاہانہ نے بے چینی سے پوچھا۔

’’وہ مجھ سے ملنا چاہتی ہے اور جلد از جلد ملنا چاہتی ہے۔ میں نے اسے شام سات بجے کا وقت دیا ہے۔ ملاقات ایک ریسٹورنٹ میں ہوگی۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ میں جب ریسٹورنٹ میں داخل ہوں تو رومال سے اپنا چہرہ بار بار صاف کرتا رہوں۔ اس طرح وہ مجھے پہچان لے گی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے میرا فون نمبر تو کہیں سے لے لیا مگر اس نے مجھے کبھی دیکھا نہیں ہے۔‘‘

’’کسی اجنبی عورت سے کسی ریسٹورنٹ میں ملنے جانا تو مخدوش بات ہے عزیر!‘‘ شاہانہ نے تشویش کا اظہار کیا۔

’’تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ میں یقیناً اس ملاقات سے گریز کرتا لیکن جب میں نے اس سے پوچھا کہ وہ مجھ سے کیوں ملنا چاہتی ہے تو اس نے تمہارا نام لیا تھا۔‘‘

’’کیا!‘‘ شاہانہ چونک گئی۔

عزیر نے اثبات میں سر ہلایا، پھر بولا۔ ’’وہ مجھ سے تمہارے بارے میں کوئی خاص گفتگو کرنا چاہتی ہے۔‘‘

’’ان باتوں سے تو میرا دماغ چکرا گیا ہے۔ کوئی عورت تم سے آخر میرے بارے میں کیا بات کرنا چاہے گی؟‘‘

’’خود میرا دماغ بھی چکرایا ہوا ہے۔ اس نے مجھ سے یہ وعدہ لینے کی بھی کوشش کی تھی کہ تمہیں اس کے بارے میں کچھ نہ بتاؤں۔ جب میں یہ وعدہ کرنے کے لیے تیار نہیں ہوا تو اس نے اصرار کیا کہ میں کم از کم ملاقات سے پہلے تک رازداری برتوں۔ میرا دماغ اس کے لیے بھی تیار نہیں تھا لیکن میں نے سوچا کہ اگر میں نے اس عورت کی کوئی بات بھی نہیں مانی تو شاید وہ مجھ سے ملاقات نہ کرے اور تمہارا نام آجانے کے باعث میں متجسس ہو چکا تھا اس لیے مجھے اس سے ایک جھوٹا وعدہ کرنا پڑا۔ میں نے اس کی دوسری شرط ماننے پر رضامندی ظاہر کردی۔ اسی لیے ملاقات کا وقت اور جگہ کا تعین ہوا۔‘‘

’’کس ریسٹورنٹ میں ملاقات ہوگی؟‘‘ شاہانہ نے جلدی سے پوچھا۔

عزیر نے ایک مشہور ریسٹورنٹ کا نام بتایا۔

’’سات بجے۔‘‘ شاہانہ بڑبڑائی۔ ’’اس کا مطلب ہے کہ اگر میں سات بج کر پانچ دس منٹ پر وہاں پہنچوں تو اس عورت کو دیکھ سکتی ہوں۔‘‘

’’لیکن اس بات کا خیال رکھنا ہوگا کہ تم اس کی نظر میں نہ آؤ۔‘‘

شاہانہ سوچ میں پڑ گئی، پھر چونک کر بولی۔ ’’اس عورت کا نمبر تو تمہارے موبائل پر آگیا ہوگا!‘‘

’’نمبر تو آیا ہے لیکن وہ کسی پی سی او کا ہے۔ وہ عورت یقیناً ذہین ہے۔ وہ اگر اپنے موبائل سے فون کرتی تو اسے خدشہ ہوگا کہ اگر اس موبائل کمپنی میں میرا کوئی جاننے والا ہو تو میں اس کا نام جاننے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔‘‘

اس عورت کے معاملے میں گفتگو آگے چلتی لیکن اسی وقت شاہانہ کے موبائل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ شاہانہ نے موبائل اٹھایا اور اس کی اسکرین پر نظر ڈالتے ہوئے بولی۔ ’’یہ نمبر تو اجنبی ہے۔‘‘

’’تو بھی کال ریسیو کرو۔ معلوم تو ہونا چاہیے، کون ہے؟‘‘

شاہانہ نے موبائل کان سے لگایا۔ ’’ہیلو!‘‘

’’کیا تم میری آواز پہچان سکتی ہو شاہانہ؟‘‘ دوسری طرف سے بڑے خشک لہجے میں کہا گیا تھا۔

’’اوہ!‘‘ شاہانہ چونکی۔ ’’آپ ممی بول رہی ہیں نا؟‘‘ اس نے فریال عیسیٰ کی آواز پہچان لی تھی۔

’’تم کہاں ہو؟‘‘ فریال عیسیٰ نے سرد لہجے میں کہا۔ ’’میں نے ابھی تمہارے گھر فون کیا تھا۔‘‘

شاہانہ گڑبڑا گئی لیکن اس نے بات بنانے میں دیر بھی نہیں لگائی۔ اس نے کہا۔ ’’راستے میں ایک دوست مل گئی تھی ممی! وہ مجھے چائے پلانے کے لیے ایک ریسٹورنٹ میں لے گئی۔ اب میں یہاں سے روانہ ہو ہی رہی ہوں۔‘‘

دوسری طرف سے مزید کچھ کہے بغیر رابطہ منقطع کر دیا گیا۔

"شکی مزاج بھی ہیں یہ محترمہ۔" شاہانہ نے منہ بناتے ہوئے کہا اور کھڑی ہوگئی۔ "میں یہ بہانہ کرکے چلی تھی کہ امی سے ملنے جارہی ہوں۔ وہ وہاں فون کربیٹھی ہیں۔ اب مجھے جانا چاہیے عزیر، لیکن میں شام سے پہلے کسی وقت تمہیں فون ضرور کروں گی اور شام کو ریسٹورنٹ میں آنے کی کوشش بھی کروں گی۔"

"بس خیال رکھنا کہ اس عورت کے سامنے نہ آؤ۔"

شاہانہ نے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

وہاں سے وہ اپنے والدین کے گھر کی طرف روانہ ہوگئی مگر اس دوران میں بھی اس کا دماغ اس سوال میں الجھا رہا۔

وہ عورت کون ہوسکتی ہے؟ اس کی سمجھ میں یہ بھی نہیں آرہا تھا کہ اس عورت کو عزیر کا موبائل نمبر کہاں سے مل گیا۔ شاہانہ کے گھر والے یہ تو جانتے تھے کہ وہ عزیر نامی کسی نوجوان سے محبت کرتی ہے اور اپنی ماں پر اس کا اظہار خود شاہانہ ہی نے کیا تھا لیکن اس نے عزیر کا نمبر کسی کو نہیں بتایا تھا۔

یکایک شاہانہ کو خیال آیا کہ ریسٹورنٹ میں وہ اپنا موبائل میز پر ہی چھوڑ کر ٹوائلٹ چلی گئی تھی۔ خالہ ذکیہ اس کے موبائل میں عزیر کا نمبر تلاش کرسکتی تھیں۔

مگر کیوں؟

شاہانہ کے دماغ میں دوسرا سوال ابھرا۔ خالہ ذکیہ ایسا کیوں کریں گی؟...... وہ اس کے بارے میں عزیر سے کیا بات کرسکتی ہیں؟

نہیں! اس نے سر جھٹکا۔ وہ خالہ ذکیہ نہیں ہوسکتیں۔

اسی الجھن میں وہ گھر پہنچ گئی۔

"کہاں رہ گئی تھیں بیٹی؟" سلطانہ بیگم نے چھوٹتے ہی پوچھا۔ "دو مرتبہ فون آچکا ہے تمہاری ساس کا؟"

"دوسرا فون کب آیا تھا؟" شاہانہ نے پوچھا۔

"بس ابھی کوئی دو ایک منٹ پہلے......"

شاہانہ نے فوراً فریال عیسٰی سے رابطہ کیا اور کہا۔ "میں گھر پہنچ گئی ہوں ممی!"

"ٹھیک ہے۔" دوسری طرف سے مختصر جواب دینے کے بعد رابطہ منقطع کردیا گیا۔

"اس کا منہ کیوں پھولا ہوا ہے؟" شاہانہ نے فرزانہ کی طرف اشارہ کیا۔

"شہر کے حالات روز بروز خراب ہوتے جارہے ہیں شاہانہ!" سلطانہ بیگم نے جواب دیا۔ "اسی لیے میں نے اس سے کہا تھا کہ اسے کالج چھوڑنے میں اس ساتھ جایا کروں گی اور لینے بھی آیا کروں گی۔ بس ا بات پر منہ پھلا لیا ہے۔ کالج بھی نہیں گئی کہہ رہی ہے کہ ا جائے گی بھی نہیں۔"

اسی وقت فرزانہ اٹھی اور پیر پٹخنے کے انداز میں ہوئے کمرے سے نکل گئی۔

"دیکھا تم نے!" سلطانہ بیگم بولیں۔ "اسے کچھ د سے اچانک نہ جانے کیا ہوگیا ہے...... تمہارے ابا تو دفتر ہیں۔ وہ آجائیں تو میں انہیں بتادوں گی۔ وہی گوشمالی کر گے اس کی۔"

"آپ نے اس سے اعجاز کی کوئی بات تو نہیں کی؟"

"نہیں۔ اس طرح تو اسے اور زیادہ کھل کر سوا جواب کرنے کا موقع مل جاتا۔"

"اچھا کیا آپ نے...... فی الحال ابا سے بھی کچھ کہیے گا، خود ہی ٹھنڈے مزاج کے ساتھ سمجھاتی بجھا رہیے۔"

سلطانہ بیگم نے کچھ سوچتے ہوئے سر ہلایا۔ پھر جیس چونک کر اور خوش ہوجانے والے انداز میں بولیں۔ "تمہارے ابا کی ترقی بھی تو ہوگئی ہے۔ تنخواہ تین گنا بڑھ گ ہے۔ کچھ دن میں دفتر سے کار بھی مل جائے گی۔"

شاہانہ کو پہلے ہی اس کا علم فیروز سے ہوچکا تھا۔ وہ بھی جانتی تھی کہ اگر اس نے فیروز سے شادی نہ کی ہوتی تو سب کچھ نہ ہوتا۔ اس کے والد کی تنخواہ میں بس پچاس فیص اضافہ ہوتا لیکن وہ یہ باتیں اپنی زبان پر نہیں لائی۔

"اب کھانا تو کھا کے جاؤ گی نا؟" سلطانہ بیگم پوچھا۔

"نہیں اماں! میں جلدی واپس جاؤں گی۔ ویسے راستے میں دیر ہوگئی۔ دراصل خالہ ذکیہ مل گئی تھیں۔ وہ چا پلانے کے لیے ایک ریسٹورنٹ میں لے گئیں۔ آپ ابھی ک کررہی تھیں؟"

"باورچی خانے میں تھی۔"

"تو آپ اپنا کام دیکھیں۔ میں ذرا فرزانہ کو سمجھا ہوں۔"

"تم بھی کوشش کرکے دیکھ لو۔" سلطانہ بیگم نے ٹھنڈ سانس لے کر کہا اور باورچی خانے کی طرف چلی گئیں۔

شاہانہ نے اس کمرے کا رخ کیا جہاں فرزانہ گئی تھی۔ گزشتہ روز ان دونوں میں تلخی ہوچکی تھی لیکن شاہانہ نے مناسب یہی سمجھا تھا کہ ان باتوں کو بھلا کر چھوٹی بہن سے تعلق

....بہتر کرلے۔ اس نے بڑے ہوتے ہوئے بھی چھوٹی بہن کے سامنے جھک جانے میں کوئی مضائقہ اس لیے نہیں سمجھا کہ اس گھر کی بہتری اسی میں تھی۔

وہ فرزانہ کے قریب بیٹھ گئی اور ہنس کر بولی۔ ''کیا بی اے کرنے کا ارادہ نہیں ہے؟''

''پرائیویٹ امتحان دے دوں گی۔ کالج تو نہیں جاؤں گی اب!'' فرزانہ نے اس کی طرف دیکھے بغیر سرد لہجے میں جواب دیا۔

''یہ تو ٹھیک نہیں رہے گا۔ اماں بتارہی تھیں کہ دفتر سے ابا کو کار ملنے والی ہے۔ کار ملے گی تو شوفر بھی ملے گا۔ تم کار میں چلی جایا کرنا کالج! اماں کو ساتھ نہیں جانا پڑے گا۔''

''میں اس کار میں بیٹھنا پسند نہیں کروں گی جو آپ کی شادی کی وجہ سے اس گھر میں آرہی ہے۔'' فرزانہ نے تلخی سے کہا۔

شاہانہ کو اس جواب پر غصہ آگیا مگر وہ پی گئی اس نے مناسب نہیں سمجھا کہ اس موضوع پر بات آگے بڑھائے۔ فی الحال فرزانہ کو سمجھانا بجھانا بے کار تھا۔ حالات کو وقت پر چھوڑ دینا زیادہ بہتر ہوتا۔

''اچھا جیسا تم مناسب سمجھو!'' شاہانہ نے فرزانہ کا گال تھپک کر کہا۔ ''انسان خود ہی اپنے بارے میں زیادہ بہتر فیصلہ کرسکتا ہے۔ اچھا میں اب چلوں گی۔ تم آنا کسی دن مجھ سے ملنے۔''

''اماں کے ساتھ تو نہیں آؤں گی۔''

''چلو ٹھیک ہے، میں کار بھیج دوں گی اپنی۔'' شاہانہ نے ہنس کر کہا۔ اس نے سوچا تھا کہ فرزانہ کو اعجاز سے دور کرنے کے لیے نرمی سے کام لینا پڑے گا۔ اسے یہ باور کرانے کی ضرورت تھی کہ فریال عیسٰی کے گھر میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں بن سکے گی۔

تھوڑی دیر اور بیٹھ کر وہ وہاں سے روانہ ہوگئی۔

ڈرائنگ روم میں فریال عیسٰی کے ساتھ فیروز بھی موجود تھا۔ وہ اس روز دفتر تو گیا تھا لیکن جلد ہی لوٹ آیا ہوگا۔

''راستے میں کسی بھی وجہ سے کہیں نہ رکا کرو شاہانہ!'' فیروز نے نرمی سے کہا۔ ''ممی پریشان ہوجاتی ہیں۔''

شاہانہ سمجھ گئی کہ اس کی شکایت فیروز سے کی گئی تھی۔

''میں آئندہ خیال رکھوں گی۔ مجھے معاف کردیجیے ممی!''

فریال عیسٰی نے جواب میں کچھ نہیں کہا اور اٹھ کر چلی گئیں۔

''وقتی ناراضی ہے۔'' فیروز نے ہنس کر کہا۔

وہ نہیں چاہتا تھا کہ فریال عیسٰی کے رویے کی وجہ سے شاہانہ کے دل پر کوئی اثر ہو۔

''مجھے اندازہ ہے۔'' شاہانہ نے بھی ہنس کر بات ختم کردی اور کہا۔ ''آپ جلدی آگئے دفتر سے یا یہ آپ کا معمول ہے؟''

''نہیں، معمول تو نہیں ہے۔ آج جلدی آگیا۔ دراصل کئی دن کی چھٹی کے بعد گیا تھا اس لیے آج دل نہیں لگا۔''

''میں جا کے کپڑے بدل لوں؟''

''ٹھیک ہے، کھانے کا وقت بھی قریب ہے۔'' فیروز نے کہا۔ ''اور ہاں! شام کو تمہیں میرے ساتھ چلنا ہے۔''

''شام کو؟'' شاہانہ چونکی۔ ''کہاں؟''

''ایک دوست کا فون آگیا تھا۔ بہت بے تکلف دوست ہے۔ اس نے ہم دونوں کو رات کے کھانے پر بلایا ہے۔''

''کس وقت چلنا ہے؟'' شاہانہ نے پوچھا۔

''اب چھ بجے تو اندھیرا ہونے لگتا ہے۔ سات بجے تک نکلیں گے۔ سردیاں ہیں نا! واپسی بھی جلدی ہوجائے گی۔ دس بجے تک لوٹ آئیں گے۔''

شاہانہ نے اس وقت شدید بے بسی محسوس کی۔ سات بجے اسے اس عورت کو دیکھنے جانا تھا جو عزیز کو فون کرچکی تھی لیکن شاہانہ کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ فیروز کے ساتھ جانے سے انکار کردیتی۔

کمرے میں جا کر اس نے کپڑے تبدیل کیے اور موبائل فون پر عزیز سے رابطہ بھی کیا۔ ''میں ریسٹورنٹ نہیں آسکوں گی عزیز! تم مجھے بعد میں بتادینا کہ اس عورت نے تم سے کیا باتیں کیں۔''

''تم نے اپنا ارادہ کیوں بدل دیا؟'' عزیز نے پوچھا۔

شاہانہ نے اسے مختصر طور پر وجہ بتا کر ایک آدھ بات کے بعد رابطہ منقطع کردیا۔

کچھ دیر بعد وہ سب کے ساتھ کھانے کی میز پر تھی۔ اعجاز اس وقت تک اپنے کالج سے واپس آجایا کرتا تھا اس لیے وہ بھی موجود تھا۔ لنچ کے لیے لالہ عیسٰی بھی دفتر سے آجاتے تھے۔ شاہانہ نے انہیں کچھ پریشان سا دیکھا۔ باقی لوگوں کو بھی اس کا احساس ہوا تھا۔

فریال عیسٰی بولیں۔ ''کیا بات ہے لالہ صاحب؟ کچھ

”پریشان ہیں آج آپ؟“
لالہ عیسیٰ اس طرح مسکرائے جیسے جبراً مسکرائے ہوں، پھر کہا۔ ”بھئی کاروبار میں پریشانیاں تو لگی رہتی ہیں۔“
”ڈیڈی!“ فیروز بولا۔ ”جب میں دفتر سے آیا تھا تو میں نے کوئی خاص بات محسوس نہیں کی تھی۔“
”بینک کے معاملات ہیں کچھ!“ لالہ عیسیٰ نے کہا۔ ”اور وہ فائل میں صرف اپنے پاس رکھتا ہوں۔“
”تو بینک کا کچھ معاملہ ہے؟“ فیروز نے پوچھا۔
”ہاں۔ لیکن تمہیں اس سلسلے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ جو گڑبڑ ہونے والی ہے، اسے میں سنبھال لوں گا۔“
”کیا گڑبڑ ہورہی ہے ڈیڈی؟“
”تم کھانا کھاؤ۔“ لالہ عیسیٰ نے جھنجلائے ہوئے انداز میں کہا۔
فیروز چپ ہوگیا لیکن فریال عیسیٰ بولیں۔ ”دفتر جانے سے پہلے مجھے کچھ بتا کر جایئے گا۔“ ان کے انداز میں حاکمیت تھی۔
لالہ عیسیٰ نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن کھانے کے بعد وہ فریال عیسیٰ کے ساتھ اپنے کمرے میں چلے گئے۔
شاہانہ نے دیکھا کہ زہرہ کسی سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔
فیروز شاہانہ کے ساتھ کمرے میں آگیا۔
”آپ زہرہ کے پاس کیوں نہیں جاتے؟“ شاہانہ نے اس سے کہا۔ ”آخر وہ بیوی ہے آپ کی...... ٹھیک ہے کہ آپ نے دوسری شادی مجھ سے کرلی ہے لیکن پہلی بیوی کو اس طرح نظرانداز تو نہیں کیا جاسکتا۔“
”میں رات کو تو اسی کے پاس ہوتا ہوں۔“
”وہ بھی چوری چھپے۔“
”دراصل ممی کا حکم ہے کہ میں شادی کا یہ پہلا ہفتہ صرف تمہارے ساتھ گزاروں۔“ فیروز نے کہا اور سگریٹ سلگا کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔
شاہانہ نے غور سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ایسا لگتا ہے کہ ڈیڈی کی پریشانی کی وجہ سے آپ بھی پریشان ہوگئے ہیں۔“
”بات ہی ایسی ہے شاہانہ!“ فیروز نے جواب دیا۔ ”کوئی چھوٹا موٹا تو کیا، اچھا خاصا بحران بھی ڈیڈی کو اتنا پریشان نہیں کرتا۔ یہ کوئی بہت بڑی بات معلوم ہوتی ہے۔“
”اور آپ کو شاید وہ بتانا نہیں چاہتے؟“
”وہ ممی کے ساتھ گئے ہیں۔ انہیں تو بتا ہی دیں گے۔ بات اگر میرے خیال کے مطابق بہت بڑی ہے تو مجھ سے بھی چھپی نہیں رہ سکے گی بلکہ میں ابھی دفتر کا ایک چکر لگا لیتا ہوں۔“
”ڈیڈی کے جانے کے بعد؟“
”ہاں۔“
شاہانہ چپ ہوگئی۔
تھوڑی دیر بعد جب معلوم ہوا کہ لالہ عیسیٰ جاچکے ہیں تو فیروز بھی چلا گیا۔
کیا آفت آنے والی ہے اس گھر پر؟ شاہانہ بستر پر پڑی سوچتی رہی۔ اسے خیال آیا کہ زہرہ کے پاس جاکر اس سے بات کرے لیکن یہ سوچ کر رہ گئی کہ زہرہ سے اس کا زیادہ میل جول فریال عیسیٰ کو شک میں ڈال سکتا تھا۔ شکی مزاج تو وہ تھی ہی! شاہانہ کو اس کا ثبوت مل چکا تھا۔ اس سے غلطی یہ ہوئی تھی کہ اس نے زہرہ سے اس کا موبائل نمبر نہیں پوچھا تھا ورنہ بات ہوجاتی۔
زہرہ کو اس نے سوچ میں ڈوبا ہوا دیکھا تھا جب لالہ عیسیٰ کی پریشانی کی بات سامنے آئی تھی۔ اس کا مطلب یہ بھی ہوسکتا تھا کہ شاید اسے معاملے کا کچھ اندازہ ہو۔ شاہانہ اس سے یہ بھی نہیں پوچھ سکی تھی کہ لالہ عیسیٰ کیا دھماکا کرنے والے تھے۔ اب اسے خیال آیا کہ لالہ عیسیٰ کی وہ پریشانی اسی پُراسرار دھماکے کا حصہ یا پیش خیمہ ہو۔ شاہانہ کے دماغ میں ”پُراسرار دھماکے“ کے الفاظ اس لیے آئے تھے کہ وہ اس دھماکے کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی۔
وہ لیٹے لیٹے اچھل پڑی کیونکہ دروازہ بڑی زور سے کھولا گیا تھا۔ اس نے دیکھا کہ کمرے میں آنے والا اعجاز تھا۔
شاہانہ کو غصہ آگیا۔ ”یہ کیا بدتمیزی ہے؟ تمہیں دروازہ کھٹکھٹا کر اندر آنے کی اجازت لینا چاہیے۔“
”میں اس وقت آپ سے تمیزداری کا سبق سیکھنے نہیں آیا ہوں۔“ اعجاز نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔
شاہانہ بھی اسے گھورتی رہ گئی۔
”مجھے بتایئے بھابی صاحبہ!“ اعجاز چبھتے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”کیا آپ کی پیاری بہن میں ہیرے جواہرات ٹنکے ہوئے ہیں جو میں چرالوں گا؟“
”جو کہنا ہے، صاف صاف کہو۔“ شاہانہ خشک لہجے میں بولی۔
اعجاز نے کہا۔ ”اگر آپ کی بہن سے میری دوستی ہوگئی

ہے، تو اس میں حرج ہے کوئی؟"

"تمہاری بات اب بھی میری سمجھ میں نہیں آئی۔"

"فرزانہ نے مجھے فون کرکے بتایا ہے کہ اس پر گھر سے باہر نکلنے کی پابندی لگا دی گئی ہے۔"

شاہانہ کو شک تو تھا کہ ان دونوں نے ایک دوسرے کے موبائل نمبر لے لیے ہوں گے لیکن اس نے اعجاز پر اپنے شک کا اظہار نہیں کیا اور طنزیہ لہجے میں بولی۔ "بہت خوب......! اتنی جلدی دوستی اتنی بڑھ گئی ہے کہ موبائل نمبروں کا تبادلہ بھی ہوگیا؟"

"میری بات کا جواب دیجیے! آپ نے اس پر یہ پابندی کیوں لگوائی ہے؟"

"پابندی لگائی ہوگی تو امی نے لگائی ہوگی، میں نے کچھ نہیں کیا۔"

"آگ تو آپ ہی نے بھڑکائی ہے۔" اعجاز نے تلملائے ہوئے انداز میں کہا۔ "ولیمے کے وقت آپ نے مجھے اور فرزانہ کو باتیں کرتے ہوئے دیکھا تو آپ اپنی امی کے پاس گئی تھیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ نے ان سے ہم ہی دونوں کے بارے میں کچھ کہا ہوگا۔"

"تمہیں مجھ سے اس قسم کی باتیں کرنے کا حق کس نے دیا ہے؟" شاہانہ کا لہجہ تیز ہوگیا۔

"مجھے کسی سے اپنا حق مانگنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"لیکن میں تمہیں یہ حق نہیں دے سکتی کہ تم مجھ سے اس قسم کی باتیں کرو۔ مت بھولو کہ میں تمہاری بڑی بھابی ہوں۔"

"آپ بھی نہ بھولیں کہ میں بھی بہت ضدی ہوں۔ اگر میں کچھ کر گزرنے پر تل جاؤں تو مجھے کوئی روک نہیں سکے گا۔" اعجاز نے کہا اور پھر ایک جھٹکے سے مڑ کر تیزی سے چلتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

شاہانہ کھلے ہوئے دروازے کو گھورتی رہ گئی۔ اعجاز کی باتوں نے اس کا دماغ خاصا گرم کر دیا تھا۔ وہ خود کو نارمل کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ غصے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ اس نے اٹھ کر کمرے کا دروازہ بند کیا اور پھر واش روم میں جا کر منہ پر پانی کے چھینٹے مارے۔ تولیے سے منہ خشک کرکے اس نے برش سے بال درست کیے اور پھر کمرے میں آکر بستر پر لیٹ گئی۔ اس طرح متحرک ہوکر اس نے خود پر خاصی حد تک قابو پالیا تھا۔ وہ اعجاز کی باتوں پر غور کرنے لگی۔ اسے خیال آیا کہ اعجاز کچھ ذہین نہیں ہے۔ اگر اسے اس معاملے میں اس کا ہاتھ نظر آیا تھا تو بھی اسے یہ بات ظاہر نہیں کرنا چاہیے تھی۔

ایک اعتبار سے وہ اسے دھمکی بھی دے کر گیا تھا۔ شاہانہ سوچنے لگی کہ وہ اسے محض دھمکی ہی سمجھے یا واقعی اعجاز کے دماغ میں کوئی زہریلا منصوبہ پرورش پانے لگا ہے؟

وہ سوچتی رہی لیکن کوئی اندازہ نہیں لگا سکی، کسی حتمی نتیجے تک نہیں پہنچ سکی۔ اس نے ایک اور پہلو پر بھی غور کیا۔ کیا وہ فیروز کو یہ ساری بات بتا دے؟

بتانے کی صورت میں قوی امکان تھا کہ فیروز بھی اعجاز کو سرزنش کرتا۔ ماں سے وہ پہلے ہی ڈانٹ کھا چکا تھا۔ ایسی صورت میں اس کی جھلاہٹ اور بڑھتی۔ ضدی وہ یقیناً تھا، پھر تو جوان خون...... وہ سرپھرا کوئی زیادہ سنگین حرکت بھی کرسکتا تھا۔

شاہانہ نے فیصلہ کیا کہ وہ خاموشی اختیار کرکے اعجاز کو باور کرائے گی کہ وہ اس کے خلاف نہیں ہے۔ فی الحال تو وہ شاہانہ کے جوابات سے بھڑک کر ہی رہ گیا تھا لیکن اس کے ازالے کی کوشش کی جاسکتی تھی۔ اعجاز جیسے سرپھرے نوجوان کو نرمی ہی سے سنبھالا جانا زیادہ بہتر ہوتا۔

یہ سب کچھ سوچتے ہوئے شاہانہ کے گمان میں بھی نہ تھا کہ فرزانہ پر پابندی لگنے سے اعجاز بے حد مشتعل ہو چکا تھا اور اس نے اپنے دل میں ٹھان لی تھی کہ اب جو ہو، سو ہو!

ساڑھے پانچ بجے کے قریب فیروز واپس آگیا۔ شاہانہ نے محسوس کیا کہ اب وہ بھی لالہ عیسیٰ ہی کی طرح پریشان تھا۔

شاہانہ نے اس سے کچھ معلوم کرنا چاہا لیکن وہ ٹال گیا۔ شاہانہ نے اصرار نہیں کیا۔ اس کے خیال کے مطابق وہ بیوی بن جانے کے باوجود فیروز کی بیوی نہیں تھی کہ فیروز کے پیچھے ہی پڑ جاتی۔

"ڈیڈی بھی آگئے ہوں گے۔" اس نے دوسری بات کی۔

"نہیں۔ وہ مشاورت کے لیے کسی سے ملنے گئے ہیں۔ شاید آٹھ بجے تک آئیں یا شاید اس سے پہلے!"

شاہانہ سوچنے لگی کہ ان حالات کی وجہ سے ممکن ہے کہ فیروز دعوت میں جانے کا ارادہ منسوخ کردے۔ ایسی صورت میں شاہانہ کو اپنا کام کرنے کا موقع مل سکتا تھا۔ اس نے ایسی تدبیر سوچ لی تھی کہ شام کو تنہا گھر سے نکل سکے۔

وہ آہستہ سے بولی۔ "اب تو دعوت میں جانا شاید ممکن نہ ہو۔ میرا مطلب ہے، آپ بھی پریشان ہیں۔"

"وہ پریشانی اپنی جگہ! دعوت میں تو جانا ہی ہوگا۔ میں

وعدہ کر چکا ہوں۔ بس یہ ہے کہ ذرا جلدی واپسی ہوگی۔''
اس جواب نے شاہانہ کو مایوس کر دیا۔

☆☆☆

ٹھیک سات بجے عزیر رومال سے اپنا چہرہ صاف کرتا ہوا اس ریسٹورنٹ میں داخل ہوا جہاں اسے ایک نامعلوم عورت سے ملنا تھا۔

وہ اپنا چہرہ صاف کرتا ہوا ایک خالی میز پر جا بیٹھا۔ وہ اِدھر اُدھر نظر دوڑا رہا تھا کہ کسی میز سے اٹھ کر ایک عورت اس کی میز کی طرف آنے لگی۔ عزیر کی نظریں اس پر جم گئیں۔ وہ پختہ عمر کی ایک خوش شکل عورت تھی جسے عزیر نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اگر دیکھا ہوتا تو پہچان لیتا کہ وہ شاہانہ کی خالہ ذکیہ تھیں۔

وہ بڑی بے تکلفی سے عزیر کے سامنے کی کرسی پر بیٹھ گئیں اور مسکراتے ہوئے بولیں۔ ''تم وقت کے بہت پابند ہو، اور یہ بہت اچھی بات ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ تم نے ابھی شاہانہ سے میرا ذکر نہیں کیا ہوگا۔''

''آپ کا نام؟'' عزیر نے پوچھا۔

''تمہاری والدہ کی کیا عمر ہے؟''

عزیر نے عمر بتا دی، پھر بولا۔ ''لیکن اس بات سے میرے سوال کا کیا تعلق؟''

''تعلق ہے۔'' خالہ ذکیہ نے کہا۔ ''میں تمہاری والدہ سے دس سال چھوٹی ہوں اس لیے تم مجھے خالہ کہہ کر مخاطب کر سکتے ہو۔ کچھ دن بعد نام بھی جان لو گے۔ مجھے اُمید ہے کہ تم نام جاننے پر اصرار نہیں کرو گے۔''

عزیر خاموش رہا۔ ویٹر قریب آ گیا تھا۔ خالہ ذکیہ نے اس سے چائے اور کچھ اسنیکس لانے کے لیے کہا۔

''یقیناً تم یہ جاننے کے لیے بے چین ہو گے کہ میں تم سے شاہانہ کے بارے میں کیا بات کرنا چاہتی ہوں۔'' خالہ ذکیہ نے ویٹر کے جانے کے بعد کہا۔

''ظاہر ہے۔'' عزیر نے کہا۔

''شاہانہ کی شادی سے تمہیں بہت صدمہ پہنچا ہوگا؟''

''یہ بھی ظاہر ہے۔ اگر آپ کو میرے اور شاہانہ کے بارے میں معلومات ہیں تو آپ کو یہ سوال کرنا ہی نہیں چاہیے تھا۔''

''شاہانہ نے تم سے بے وفائی نہیں کی ہے۔ وہ حالات سے مجبور ہو گئی تھی۔''

عزیر کو ان باتوں کا علم تھا۔ شاہانہ اسے سب کچھ بتا چکی تھی۔ اس عورت کو غالباً ان باتوں کا علم نہیں تھا۔

''یقین کرو کہ میں تمہاری اور شاہانہ کی ہمدرد ہوں۔''

خالہ ذکیہ نے کہا۔ ''اسی لیے میں چاہتی ہوں کہ شاہانہ کے لیے اگر تمہارے دل میں منفی جذبات پیدا ہوئے ہوں تو میں انہیں ختم کروں۔ میں تمہیں وہ حالات بتانا چاہتی ہوں جن کی وجہ سے شاہانہ نے یہ شادی کی۔''

عزیر خاموش رہا۔ خالہ ذکیہ نے شاہانہ کے والد آذر صاحب کی مجبوریاں بتانا شروع کیں۔ عزیر وہ بھی خاموشی سے سنتا رہا حالانکہ وہ سب کچھ اسے بہت پہلے ہی شاہانہ سے معلوم ہو چکا تھا۔

خالہ ذکیہ کے خاموش ہونے کی دیر تھی کہ ویٹر وہ سب کچھ لے آیا جو اس سے منگوایا گیا تھا۔

خالہ ذکیہ نے چائے بناتے ہوئے کہا۔ ''یہ سب کچھ جاننے کے بعد تم شاہانہ کے بارے میں کیا رائے قائم کرو گے؟''

''ایک اچھی بیٹی کو اپنے باپ کی مجبوری کے باعث یہ کرنا ہی چاہیے تھا۔''

''مجھے خوشی ہوئی تم سے یہ جواب سن کر۔'' خالہ ذکیہ نے کہا۔ ''اب یہ بھی بتا دو کہ آئندہ کے لیے تمہارا کیا پروگرام ہے؟''

''میں سمجھا نہیں۔''

''شاہانہ کو بے وفا سمجھنے کے بعد تم نے کیا فیصلہ کیا تھا؟ کیا یہ سوچا تھا کہ تم بھی کسی دوسری لڑکی سے شادی کر لو گے؟''

''ابھی میں نے اس بارے میں کچھ نہیں سوچا تھا۔''

''سوچنا بھی مت...... ! میں تم سے یہی کہنے کے لیے ملی ہوں۔ شاہانہ کچھ عرصے بعد پھر تمہاری ہو جائے گی اور یقین کرو کہ وہ اس وقت بھی دوشیزہ ہی ہوگی۔ فیروز نے اپنی ماں کے مجبور کرنے پر یہ شادی کی ہے لیکن شاہانہ کو اپنی بیوی نہیں بنایا۔ میرا مطلب ہے کہ عملاً ایسا نہیں کیا۔ اس نے شاہانہ کے جسم کو ہاتھ بھی نہیں لگایا ہے۔''

عزیر حیرت سے خالہ ذکیہ کی طرف دیکھنے لگا۔ اگرچہ یہ سب باتیں بھی اسے شاہانہ سے معلوم ہو چکی تھیں لیکن وہ حیران اس بات پر تھا کہ یہ عورت وہ سب کچھ کیسے جانتی تھی؟

''ایسی صورت میں ......'' خالہ ذکیہ کچھ کہتے کہتے رکیں، پھر اشارہ کرتے ہوئے بولیں۔ ''یہ چائے وغیرہ لو نا؟''

عزیر نے ایک بسکٹ اٹھا لیا۔

خالہ ذکیہ بولیں۔ ''ہاں تو میں یہ کہہ رہی تھی کہ اگر تم نے کسی دوسری لڑکی کے بارے میں سوچا تو یہ تمہاری غلطی ہوگی۔

تمہیں شاہانہ کا انتظار کرنا چاہیے۔‘‘
’’مگر یہ کیسے ممکن ہے کہ شاہانہ پھر سے میری ہو جائے۔‘‘ عزیر نے عورت کو مزید کریدنے کے لیے پوچھا۔ شاہانہ اسے پہلے ہی بتا چکی تھی کہ یہ سب کچھ کیونکر ہوگا۔
’’دراصل......‘‘ خالہ ذکیہ نے وہ ہی سب کچھ بتایا تھا جو شاہانہ اسے وضاحت سے پہلے ہی بتا چکی تھی۔
’’آپ کو یہ سب کیسے معلوم؟‘‘ عزیر نے بے ساختہ پوچھ ہی ڈالا۔
’’فی الحال میں تمہارے اس سوال کا جواب نہیں دے سکوں گی۔‘‘ خالہ ذکیہ نے کہا۔ ’’مناسب وقت آنے پر تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ مجھے یہ سب کچھ کیسے معلوم ہوا اور میں کون ہوں۔‘‘
’’اور وہ مناسب وقت کب آئے گا؟‘‘
’’غالباً اس وقت کے آنے میں بہت زیادہ وقت نہیں لگے گا۔‘‘
’’مگر میں ان سب باتوں پر اعتبار کیسے کرلوں؟‘‘
’’کیا شاہانہ سے تمہارا رابطہ نہیں ہے؟‘‘
’’دو ایک مرتبہ بات ہو چکی ہے۔‘‘
’’وہ کیا کہتی ہے اس شادی کے بارے میں؟‘‘
’’شرمندہ ہے۔‘‘ عزیر نے جھوٹ بولا۔
خالہ ذکیہ کچھ سوچنے لگیں، پھر بولیں۔ ’’مجھے خیال تھا کہ وہ شاید حجاب کے باعث تمہیں یہ سب کچھ نہیں بتا سکے گی، اسی لیے میں نے تم سے ملنا اور تمہیں یہ سب کچھ بتانا ضروری سمجھا۔ تم نے اتنی توجہ سے میری باتیں سنی ہیں کہ مجھے یقین ہو گیا ہے کہ شاہانہ نے تمہیں کچھ نہیں بتایا۔ بہرحال! اب تم خود کھل کر شاہانہ سے بات کر لینا۔ بھول جاؤ کہ میں نے تم سے رازداری کا کوئی وعدہ لیا تھا۔ بتا دو شاہانہ کو کہ ایک عورت نے تمہیں یہ سب کچھ بتایا ہے۔ وہ بھی الجھن میں پڑ جائے گی کہ میں کون ہوں لیکن وہ میری ان باتوں کی تصدیق ضرور کر دے گی۔ پھر تم آئندہ ملاقات میں مجھ سے یہ سوال نہیں کر سکو گے کہ تم میری ان باتوں پر یقین کیوں کرو۔‘‘
’’مجھے یقیناً اب شاہانہ سے کھل کر بات کرنا ہی ہوگی۔‘‘
’’ضرور کرو۔ میں خود کہہ چکی ہوں۔‘‘
’’ابھی آپ نے آئندہ ملاقات کی بات کی تھی۔ ہماری آئندہ ملاقات کا کیا امکان ہے؟‘‘
’’شاہانہ سے تمہاری شادی کے موقعے پر تو ملاقات ہونا ہی ہے لیکن اس سے پہلے بھی ہو سکتی ہے۔‘‘
’’گویا مجھے تین چار سال انتظار کرنا ہے۔‘‘
’’اب شاید تمہیں اتنا انتظار نہ کرنا پڑے۔ شاہانہ اب جلد ہی تمہاری بیوی بن جائے گی۔‘‘
’’وہ کیسے؟‘‘
’’بس اب زیادہ سوالات نہ کرو۔‘‘
عزیر چپ ہو گیا۔
کچھ دیر بعد وہ دونوں ریسٹورنٹ سے نکلے اور ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ عزیر نے اپنی کار میں وہاں سے روانہ ہوتے ہی موبائل پر شاہانہ سے رابطہ کیا۔
’’ہیلو!‘‘ شاہانہ کی مدھم آواز سنائی دی۔
’’عزیر بول رہا ہوں۔ کیا تم نے میرا نام نہیں دیکھا؟‘‘
’’رانگ نمبر۔‘‘ دوسری طرف سے شاہانہ نے کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔
عزیر سمجھ گیا کہ وہ اس وقت فیروز کے ساتھ ہوگی اس لیے اس کا بات کرنا ممکن ہی نہیں تھا۔
عزیر اپنے گھر پہنچنے کے بعد بہت بے چین رہا۔
رات کے دس بجے تھے جب شاہانہ کی کال آئی۔
’’یہ کیا حرکت تھی؟‘‘ عزیر کی آواز سنتے ہی وہ بولی۔ ’’میں نے تم سے کہا تھا کہ موقع ملنے پر میں ہی تمہیں فون کیا کروں گی۔‘‘
’’آئی ایم سوری! میں اس عورت سے ملنے کے بعد دماغی طور پر شاید حاضر نہیں رہا تھا۔ بس بے چین ہو گیا تھا تم سے بات کرنے کے لیے۔‘‘
’’میں خود بے چین تھی لیکن مجھے موقع اب ملا ہے۔ یہاں حالات کچھ ڈرامائی سے ہو گئے ہیں۔ ابھی فیروز کو ڈیڈی نے اپنے کمرے میں بلایا ہے تو مجھے موقع مل گیا کہ تم سے بات کروں۔ اب بتاؤ۔ اس عورت سے کیا بات ہوئی؟‘‘
عزیر نے بے کم و کاست سب کچھ بیان کر دیا۔ بیچ بیچ میں شاہانہ صرف حیرت کا اظہار کرتی رہی۔ آخر عزیر نے خاموش ہو کر کہا۔ ’’یہ عورت کون ہو سکتی ہے شاہانہ؟‘‘
’’خود میرا دماغ بھی چکرا گیا ہے۔ میں تمہیں کیا بتاؤں۔‘‘

☆☆☆

بات یہیں تک پہنچی تھی کہ شاہانہ نے کمرے کے دروازے پر ہونے والی دستک سنی۔ اگر وہ فیروز ہوتا تو اسے دستک دینے کی ضرورت نہیں تھی۔ شاہانہ نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر بلند آواز میں پوچھا۔ ’’کون؟‘‘
باہر سے ایک ملازم کی آواز آئی۔ اس نے بتایا کہ لالہ عیسیٰ نے اسے ڈرائنگ روم میں بلایا ہے۔

شاہانہ نے ماؤتھ پیس سے ہاتھ ہٹا کر عزیر سے کہا۔ ''میں اب تم سے پھر کسی وقت بات کروں گی۔ ڈیڈی نے بلایا ہے۔'' اس نے جواب سنے بغیر رابطہ منقطع کر دیا۔

کمرے سے وہ بڑی تیزی کے ساتھ نکلی تھی۔ یہ بھی اس کے لیے ایک ڈرامائی معاملہ تھا کہ رات کے ساڑھے دس بجے اسے لالہ عیسیٰ نے ڈرائنگ روم میں بلایا تھا، لیکن اس بات کے ساتھ ہی شاہانہ کے دماغ میں عزیر کی بتائی ہوئی باتیں بھی گونجتی رہی تھیں اور وہ الجھن کا شکار ہوگئی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ نامعلوم عورت ان باتوں سے کیونکر آگاہ ہوگئی تھی۔ اس کا اور فیروز کا یہ راز گھر میں صرف زہرہ جانتی تھی لیکن کیا یہ ممکن تھا کہ وہ اس راز سے کسی اور کو بھی آگاہ کر دیتی؟

اس عورت کی یہ بات بھی عجیب تھی کہ عزیر اسے ''خالہ'' کہہ کر مخاطب کرسکتا ہے۔ اس بات کی وجہ سے شاہانہ کا دماغ اپنی خالہ ذکیہ کی طرف بھی گیا تھا اور اسے دوبارہ یہ بات بھی یاد آئی تھی کہ ریسٹورنٹ میں وہ اپنا موبائل فون خالہ ذکیہ کے سامنے میز پر ہی چھوڑ گئی تھی جس سے خالہ ذکیہ عزیر کا موبائل نمبر حاصل کرسکتی تھیں۔

گزشتہ روز تو شاہانہ نے خالہ ذکیہ کا خیال اپنے ذہن سے جھٹک دیا تھا لیکن اب وہ پھر ان کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہوگئی تھی۔ سمجھ میں بس یہ نہیں آرہا تھا کہ انہیں وہ سب باتیں اگر کسی سے معلوم ہوسکتی ہیں تو صرف زہرہ سے معلوم ہوسکتی ہیں لیکن زہرہ سے ان کا تعلق بعید از قیاس سا معلوم ہو رہا تھا۔

اسی ساری الجھن کے ساتھ وہ ڈرائنگ روم میں پہنچی تو صورتِ حال اس کے لیے مزید ڈرامائی ہوگئی۔ وہاں گھر کے سبھی افراد جمع تھے۔ فیروز، اعجاز، زہرہ اور فریال عیسیٰ بھی۔ زہرہ کے چہرے پر کسی قسم کے تاثرات نہیں تھے لیکن اعجاز الجھن کا شکار معلوم ہو رہا تھا۔ تفکرات کے سائے صرف لالہ عیسیٰ، فیروز اور فریال کے چہروں پر بھی تھے۔ اس سے شاہانہ نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ فیروز کے بعد فریال عیسیٰ کو بھی اپنے شوہر کی پریشانی کا علم ہوچکا تھا۔

''آؤ شاہانہ! بیٹھو!'' لالہ عیسیٰ بولے۔

شاہانہ فیروز کے قریب بیٹھ گئی۔

''تم حیران ہوگی کہ میں نے سب لوگوں کو کیوں جمع کیا ہے۔'' لالہ عیسیٰ نے کہا۔ ''دراصل کچھ دیر پہلے تک تو میں صرف اپنی اہلیہ اور فیروز سے اس معاملے پر بات کر رہا تھا لیکن پھر میں نے فیصلہ کیا کہ تم لوگوں کو بھی صورتِ حال کا علم ہوجانا چاہیے۔ تم سب اسی گھر کے فرد ہو۔ تم سب کے علم میں ہونا چاہیے کہ اس گھر پر کیا آفت آنے والی ہے۔''

''ایسی کیا بات ہوگئی ہے ڈیڈی؟'' شاہانہ بے چینی سے پوچھ بیٹھی۔

''میں نے کچھ عرصے پہلے ایک بینک سے ایک کثیر سرمایہ قرض لیا تھا۔ جو میں نے کسی اور کاروبار میں لگایا تھا۔ میں تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ بس یہ جان لو تم لوگ کہ وہ سرمایہ ڈوب گیا ہے۔ وہ میں بینک کو واپس کر ہی نہیں سکتا تھا۔ مجھے اپنی ساری انڈسٹری ختم کرنا پڑتی اس لیے میں اپنے اثر و رسوخ سے کسی نہ کسی طرح اس معاملے کو ٹالتا رہا مگر کچھ عرصے پہلے...... یہ تو تم سبھی کے علم میں ہوگا کہ حالیہ دنوں میں ایک عدالتی فیصلے کے باعث تمام قرضوں کی واپسی ضروری ہوگئی تھی۔ اگرچہ ایسے لوگ موجود ہیں جنہوں نے مجھ سے کئی گنا زیادہ قرضے لیے ہیں لیکن کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ نزلہ تو عضوِ ضعیف ہی پر گرتا ہے۔ مجھ جیسے بہت سے لوگ اس کی زد پر آئے ہیں اور اب تو معاملہ یوں ہے کہ پانی ناک تک آچکا ہے۔ میں نے سب کاغذات فیروز کو دکھا بھی دیے ہیں۔'' لالہ عیسیٰ نے خاموش ہوکر ایک طویل سانس لی۔

''بات کہاں تک پہنچ گئی ہے ڈیڈی؟'' اس مرتبہ اعجاز بول پڑا۔

''خطرناک حد تک۔'' لالہ عیسیٰ نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''اگر میں نے پرسوں صبح تک رقم بینک کو واپس نہیں کی تو مجھے گرفتار کیا جاسکتا ہے۔ بات عدالت میں بہرحال جائے گی لیکن میں اپنا دفاع نہیں کرسکتا۔ مجھے اگر جیل نہ بھی بھیجا گیا تو یہ ضرور ہوگا کہ ساری انڈسٹری نیلام کر دی جائے۔ میرا بینک اکاؤنٹ بھی منجمد کر دیا جائے گا۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ کیا، کیا ہوجائے گا۔ رسوائی بھی ہوگی اور ہم سڑک پر آجائیں گے۔''

اعجاز کا چہرہ دھواں دھواں ہونے لگا۔

''بچاؤ کی کوئی صورت نہیں ہے ڈیڈی؟'' شاہانہ پوچھ بیٹھی۔

''صرف ایک صورت ہے لیکن میرا اندازہ ہے کہ وہ مشروط ہوگی۔ میں فیروز کو اور انہیں بتا چکا ہوں۔'' لالہ عیسیٰ کا اشارہ فریال عیسیٰ کی طرف تھا۔ ''ابھی یہاں کوئی آنے والا ہے۔ میں نے ملازمین کو ہدایت کر دی ہے کہ آنے والے کو ڈرائنگ روم میں آنے سے نہ روکا جائے۔''

''مناسب ہدایت کی تھی آپ نے لالہ صاحب!'' وہ خالہ ذکیہ کی آواز تھی، جس نے سب کو چونکا دیا۔

''میں آگئی ہوں۔'' خالہ ذکیہ نے قریب آتے ہوئے کہا، پھر ہنس کر بولیں۔ ''کیسے ممکن ہے کہ آپ بلائیں اور ہم نہ

آئیں۔"
"تم!" فریال عیسٰی کے منہ سے نکلا۔
"تم......ذکیہ......"
خالہ ذکیہ کی پیشانی شکن آلود ہوگئی۔ انہوں نے لالہ عیسٰی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "لالہ صاحب! آپ نے اپنی اہلیہ کو یہ نہیں سکھایا کہ کسی معزز مہمان کو کس طرح مخاطب کیا جاتا ہے؟"
فریال عیسٰی نے جھٹکے سے لالہ عیسٰی کی طرف سر گھما کر کہا۔ "آپ نے مجھے کسی بانو کا نام بتایا تھا۔"
"ہاں۔" لالہ عیسٰی بولے۔ "ان کا پورا نام ذکیہ بانو ہے۔"
شاہانہ اس وقت اس طرح بیٹھی ہوئی تھی جیسے اسے سکتہ ہوگیا ہو۔
"بیٹھیے بانو!" لالہ عیسٰی نے کہا۔
"کیسی ہو شاہانہ؟" خالہ ذکیہ نے ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے مسکرا کر پوچھا۔
"جی......جی......ٹھیک ہوں۔" شاہانہ کا دماغ شدت سے چکرایا ہوا تھا۔
"جی لالہ صاحب! فرمایئے، میں آپ کی کیا خدمت کرسکتی ہوں۔" خالہ ذکیہ بولیں۔ "فون پر آپ نے مجھے اپنی پریشانی سے تو آگاہ کردیا تھا لیکن میں اتنی بارسوخ نہیں ہوں کہ آپ کے معاملے کی فائل دبوا سکوں۔"
"یہ تو میں بھی جانتا ہوں۔"
"تو پھر آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟"
"میرا قرض......" لالہ عیسٰی ہچکچا کر خاموش ہوگئے۔
"میں سمجھی نہیں۔"
"میرا مطلب ہے۔" لالہ عیسٰی نے تذبذب سے کہا۔ "کسی طرح اس قرض کی ادائیگی ہوجائے۔"
"اوہ!" خالہ ذکیہ سنجیدہ نظر آئیں۔ "کیا آپ کا مطلب ہے کہ وہ قرض میں ادا کروں؟"
"یہ مجھ پر بہت بڑا احسان ہوگا۔" لالہ عیسٰی نے کہا۔ "میں کوشش کروں گا کہ دھیرے دھیرے آپ کا قرض اتار سکوں۔"
خالہ ذکیہ ہنس پڑیں۔ "کمال کررہے ہیں آپ! جو رقم آپ نے بتائی ہے، وہ آپ انتہائی کوشش کے باوجود بھی برسوں میں ادا نہیں کرسکتے۔ خیر! اس بات کو چھوڑیے! قرض کی واپسی کا ذکر تو بے کار ہے لیکن میں آپ کا یہ قرض ادا کردوں گی۔ اس کے لیے میری دو شرطیں ہیں۔"
"کیا؟" لالہ عیسٰی نے پوچھا۔
خالہ ذکیہ نے سب پر ایک طائرانہ نظر ڈالی، پھر کہا۔ "میرا خیال تھا کہ آپ اس معاملے میں مجھ سے تنہائی میں بات کریں گے لیکن آپ نے سارا گھر جمع کر رکھا ہے۔ مناسب ہوگا کہ ہم اس معاملے پر تنہائی میں بات کریں۔"
لالہ عیسٰی نے فریال عیسٰی کی طرف دیکھا جن کے چہرے کا رنگ بار بار بدل رہا تھا۔
لالہ عیسٰی سے نگاہیں ملیں تو انہوں نے سر جھکالیا۔ یہ گویا اس بات کی اجازت تھی کہ لالہ عیسٰی خالہ ذکیہ سے تنہائی میں ملاقات کرلیں۔
"آیئے!" لالہ عیسٰی نے کھڑے ہوتے ہوئے خالہ ذکیہ سے کہا۔
وہ خالہ ذکیہ کو قریب کے ایک کمرے میں لے گئے۔
ڈرائنگ روم میں سکوت چھا گیا۔ سب اپنی اپنی جگہ کچھ نہ کچھ سوچ رہے تھے۔ یہ سکوت دس بارہ منٹ تک طاری رہا۔ آخر لالہ عیسٰی اور خالہ ذکیہ واپس آئے۔ لالہ عیسٰی بدستور پریشان نظر آرہے تھے لیکن خالہ ذکیہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ انہوں نے کچھ طنزیہ سی نگاہوں سے فریال عیسٰی کی طرف دیکھا، پھر بیرونی دروازے کی طرف مڑتے ہوئے بولیں۔ "سوچنے کے لیے آپ کے پاس صرف آج رات کا وقت ہے لالہ صاحب! اگر میری شرطیں مان لی گئیں تو ہمارے پاس صرف کل کا دن ہوگا۔ قرض کی ادائیگی، قانونی معاملات اور یہ سب مراحل کل ہی طے کرنا ہوں گے۔"
لالہ عیسٰی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
خالہ ذکیہ نے وہاں موجود کسی شخص سے کوئی الوداعی بات نہیں کی اور ڈرائنگ روم سے باہر جاتے جاتے بولیں۔ "مجھے آپ کے فون کا انتظار رہے گا لالہ صاحب!"
وہ چلی گئیں۔
لالہ عیسٰی تھکے تھکے سے انداز میں اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ اب سبھی کی نظریں ان پر جمی ہوئی تھیں۔
چند لمحے کی خاموشی کے بعد لالہ عیسٰی نے کھنکار کر کہا۔ "ابھی اس نے مجھے بتایا ہے کہ اس کے خاندان میں اسے سب ذکیہ کہتے ہیں لیکن بزنس کمیونٹی میں اسے بانو کے نام سے جانا پہچانا جاتا ہے۔ مناسب ہوگا کہ میں اس کی شرائط بتانے سے پہلے تم لوگوں کو اس کے بارے میں بتادوں۔ جب یہ چوبیس پچیس سال کی تھی تو اس کی شادی ہوگئی تھی لیکن شادی کی رات اس کا مقدر نہیں بن سکی۔ نہ جانے کیا ہوا کہ اس کا شوہر ہارٹ فیل ہوجانے کے باعث دنیا سے رخصت ہوگیا۔ وہ بھی ایک

بہت بڑا انڈسٹریلسٹ تھا اور دنیا میں اکیلا تھا۔ اس کی ساری انڈسٹری اور جائداد بانو کے حصے میں آگئی۔ یہ بہت ذہین ہے اور تاجرانہ صلاحیتوں کی مالک بھی۔ اس نے اپنے مرحوم شوہر کی انڈسٹری اس خوبی سے چلائی کہ اسے کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ اس سے میری ملاقاتیں چیمبر آف کامرس یا کاروباری قسم کے عشائیوں اور عصرانوں میں ہوتی رہی ہیں۔"

"اس کی شرطیں کیا ہیں؟" فریال عیسٰی نے بے چینی سے پوچھا۔

"اب میں اسی طرف آرہا تھا۔" لالہ عیسٰی نے کہا۔ "اس سے ابتدا میں جو چند ملاقاتیں ہوئیں......"

فریال عیسٰی پھر بول پڑیں۔ "اس کی شرطیں بتایئے آپ!"

لالہ عیسٰی نے ایک طویل سانس لی اور پھر نظریں جھکا کر کہا۔ "اس کی ایک شرط تو یہ ہے کہ یہ مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہے۔"

یہ شرط کیا تھی، ایک دھماکا تھا۔ ایک ایسا دھماکا جس میں آواز بالکل نہیں تھی۔ اس کے برخلاف ڈرائنگ روم میں ایسا سکوت چھا گیا تھا جیسے وہ ازلی اور ابدی ہو۔

اس وقت فریال عیسٰی کے چہرے کا رنگ اس طرح اڑا کہ میک اپ کے باوجود اس کا چہرہ سفید سا نظر آنے لگا۔

شاہانہ کے دماغ میں اس وقت ایک اور ہی خیال چکرانے لگا تھا۔ زہرہ نے اس سے کسی دھماکے کی بات کی تھی جو لالہ عیسٰی کرنے والے تھے۔ شاہانہ سوچنے پر مجبور ہوگئی کہ زہرہ نے کیا اسی دھماکے کی بات کی تھی؟ اور اب تک جو باتیں ہوتی رہی تھیں، وہ اسی ڈرامے کا ایک حصہ تھیں۔

اس سکوت میں لالہ عیسٰی کی آواز ابھرنے لگی۔ "میں بتا رہا تھا کہ برسوں پہلے ابتدائی چند ملاقاتوں میں ہی یہ مجھے پسند کرنے لگی تھی اور اشاروں کنایوں میں اس نے مجھ پر ظاہر بھی کر دیا تھا کہ یہ مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہے۔" لالہ عیسٰی نے فیروز کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ اس وقت کی بات ہے جب تمہارے بڑے بھائی کا انتقال ہوئے صرف ایک سال گزرا تھا۔"

"یہ کسی وقت کی بات بھی ہو۔" فریال عیسٰی نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا اور ایک جھٹکے سے کھڑی ہوگئیں۔ "اس کی یہ شرط کسی صورت میں نہیں مانی جاسکتی۔"

"میں بھی اسے ٹال ہی گیا تھا لیکن......"

"لیکن کچھ نہیں۔" فریال عیسٰی نے کہا اور تیزی سے چلتے ہوئے ڈرائنگ روم سے چلی گئیں۔

لالہ عیسٰی نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور پھر جیسے وہاں موجود سب لوگوں سے بولے۔ "گویا وقت آگیا ہے کہ اب لالہ عیسٰی اور اس کا گھرانا فٹ پاتھ پر آجائے گا۔"

فیروز کھڑا ہوا۔ "ایک خیال آیا ہے میرے ذہن میں......! میں ممی سے بات کرتا ہوں۔" وہ تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا اسی طرف چلا گیا جدھر فریال بیگم گئی تھیں۔

لالہ عیسٰی شکست خوردہ سے انداز میں کھڑے ہوئے اور مردہ سے لہجے میں بولے۔ "بس! تم لوگوں کو یہی بتانا تھا۔" وہ اندرونی دروازے کی طرف مڑ گئے۔

اعجاز بھی کھڑا ہو کر سوچ میں ڈوبا ہوا وہاں سے جانے لگا۔ ان دونوں کے جانے کے بعد شاہانہ نے زہرہ کی طرف دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ زہرہ خفیف سا مسکرا دی۔ "میں نے کہا تھا نا تم سے!" وہ دھیرے سے بولی۔ "دھماکے کے بارے میں بتایا تھا تمہیں! ہوگیا نا دھماکا!"

شاہانہ اٹھ کر تیزی سے زہرہ کے قریب جا بیٹھی۔ "تمہیں اس کا علم کیسے ہوا تھا؟"

"پھوپی ذکیہ نے ہی بتایا تھا۔"

"پھوپی؟"

"ہاں۔" زہرہ نے جواب دیا۔ "ددھیال کی طرف سے میرا اور ان کا ایک دور دراز کا رشتہ ہے۔ تمہارا ان سے دور دراز کا رشتہ ننھیال کی طرف سے ہے، اس لیے ہم دونوں ہمیشہ ایک دوسرے سے ناواقف رہے۔"

شاہانہ کے لیے یہ انکشاف تھا لیکن اس کا ذہن اس سے کہیں زیادہ اہم باتوں میں الجھا ہوا تھا، وہ بولی۔ "تو ابھی یہ سب کچھ ڈراما ہوتا رہا تھا؟"

"سو فیصد۔" زہرہ نے جواب دیا۔ "پھوپی ذکیہ سے ڈیڈی کی شادی ہوئے تو ایک عرصہ گزر چکا ہے۔"

"کیا!" شاہانہ چونک پڑی۔

"ہاں۔" زہرہ نے جواب دیا۔ "لیکن ڈیڈی نے اسے خفیہ رکھا ہوا تھا۔ پھوپی ذکیہ نے بھی اپنے خاندان میں میرے علاوہ کسی کو کچھ نہیں بتایا ہے۔"

"خفیہ رکھنے کا مقصد؟"

"ڈیڈی نہیں چاہتے تھے کہ ممی سے جھگڑا فساد ہو۔ وہ اس انکشاف کے لیے کسی مناسب موقعے کا انتظار کرنا چاہتے تھے۔ جب تمہاری اور فیروز کی شادی ہوئی تو ان کو موقع ہاتھ آگیا۔ وہ ممی سے کہہ سکتے تھے کہ اگر وہ فیروز کی دوسری شادی کرا سکتی ہیں تو وہ دوسری شادی کیوں نہیں کر سکتے۔"

"ممی کہتیں کہ وہ تو انہوں نے اولاد کی وجہ سے کروائی

ہے۔“

”اور ڈیڈی کہتے کہ انہیں بھی بیٹی کا باپ بننے کی شدید خواہش ہے اور ممی ان کی یہ خواہش پوری نہیں کر سکتیں۔ صرف لڑکوں ہی کو جنم دیتی رہیں اور پھر انہوں نے اپنا آپریشن بھی کرالیا تاکہ مزید اولاد پیدا نہ ہو۔“

شاہانہ کا جسم سنسنانے لگا۔ ”تمہیں یہ سب کچھ خالہ ذکیہ سے معلوم ہوا ہے؟“

”ظاہر ہے۔“

”لیکن اس وقت تو کوئی اور ہی ڈراما کھیلا گیا ہے۔“

”مجھے اس بارے میں پھوپی ذکیہ سے کچھ نہیں معلوم ہوسکا لیکن میرا اندازہ ہے کہ ڈیڈی کو یہ تدبیر اچانک سوجھی ہوگی اور انہوں نے محسوس کیا ہوگا کہ یہ طریقہ زیادہ موثر ہوسکتا ہے۔“

”لیکن ممی تو اکڑ گئی ہیں۔“

”میں اسے وقتی بات سمجھتی ہوں۔“ زہرہ نے کہا۔ ”یکایک جھٹکا لگا ہے ان کے دماغ کو۔ وہ جذباتی تو ہوں گی لیکن فیروز گئے ہیں نا ان کے پیچھے! وہ انہیں سمجھائیں گے۔ ممی کو ماننا تو پڑے گا۔ انہیں گھر کی تباہی پر اس کو ترجیح دینا ہی ہوگی کہ ڈیڈی دوسری شادی کرلیں۔“

”اور وہ قرض کی بات؟“

”وہ بھی مجھے فرضی کہانی معلوم ہوتی ہے۔“

”انہوں نے فیروز کو کاغذات دکھائے ہیں۔“

”جعلی کاغذات تیار کرائے ہوں گے۔“ زہرہ نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔ ”اب یہ تو ممکن نہیں کہ فیروز ان کاغذات پر شبہ کریں اور ان کی جانچ پڑتال کروائیں۔“

”گویا فیروز کچھ نہیں جانتے؟“

”پھوپی ذکیہ نے مجھے قسم دی تھی کہ میں کسی کو کچھ نہ بتاؤں۔ یہ میرے لیے ایک امتحان تھا۔ میں فیروز سے اتنی محبت کرتی ہوں کہ ان سے کوئی بات نہیں چھپاسکتی لیکن پھوپی ذکیہ نے کہا کہ میں اس محبت ہی کی خاطر کچھ دن صبر کرلوں۔ وہ اس گھر میں آنے کے بعد ایسے حالات پیدا کریں گی کہ تمہیں جلد طلاق ہوجائے اور فیروز صرف میرے لیے وقف ہوجائیں۔ وقف تو وہ اب بھی میرے لیے ہی ہیں لیکن سب کچھ راز داری سے ہورہا ہے۔ تمہیں طلاق ہوجانے کے بعد اس کی ضرورت نہیں رہے گی۔“

”یہ تمہی نے خالہ ذکیہ کو بتایا ہے کہ فیروز نے عملی طور پر مجھے اپنی بیوی نہیں بنایا ہے؟“

”ہاں۔“

اب شاہانہ کو یقین ہوگیا تھا کہ عزیر سے ملنے والی وہ پُراسرار عورت خالہ ذکیہ ہی ہیں۔

زہرہ نے مسکرا کر کہا۔ ”انہوں نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ تم کسی سے محبت کرتی ہو۔ وہ چاہتی ہیں کہ تمہیں تمہاری محبت جلد از جلد مل جائے۔“

”انہیں میری محبت کا اتنا خیال تھا تو انہوں نے یہ شادی پہلے ہی کیوں نہ رکوادی؟ وہ ڈیڈی سے بات کرسکتی تھیں۔“

”شاید تمہیں اس کا علم نہیں کہ جن دنوں تمہاری اور فیروز کی شادی کی بات چیت چل رہی تھی، وہ بیرون ملک گئی ہوئی تھیں۔ کوئی کاروباری معاملہ تھا۔ اتفاق ہے کہ وہ بیرون ملک سے اس دن واپس آئی تھیں جس روز فیروز سے تمہارا نکاح ہورہا تھا۔ جب وہ تمہاری امی سے ملنے گئیں تو انہیں اس کا علم ہوا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے مجھ سے فون پر بات کی تھی تو میں نے انہیں فیروز کے ارادے سے آگاہ کیا تھا...... پھر تمہارے نکاح کے بعد ہی انہیں تمہاری امی سے ہی معلوم ہوا تھا کہ تم نے اپنے باپ کی خاطر اپنی محبت قربان کی ہے۔ وہ اگر ملک میں ہی ہوتیں تو تمہاری اور فیروز کی شادی ہرگز نہ ہونے دیتیں۔ تم سے ان کا دور کا رشتہ سہی لیکن وہ تمہیں بہت چاہتی ہیں۔“

اس موضوع پر بات آگے چلتی لیکن اسی وقت فیروز تیزی سے وہاں آیا۔ ”ڈیڈی کہاں ہیں؟“

”وہ تو اسی وقت اٹھ گئے تھے۔“

فیروز تیزی سے واپس جانے لگا۔

”ہوا کیا؟“ زہرہ اس کی طرف لپکی۔

”میں نے ممی کو سمجھا بجھا کر آمادہ کرلیا ہے۔ اب ڈیڈی کو ان کے پاس لے جانا ہے اور انہیں بتانا ہے کہ میں نے کیا تدبیر سوچی ہے جس کی وجہ سے ممی تیار ہوئی ہیں۔“

”کیا تدبیر سوچی ہے؟“

”ابھی میں جلدی میں ہوں۔ بعد میں بتاؤں گا۔“

وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے ڈرائنگ روم سے نکل آئے تھے۔ فیروز کا جواب سننے کے بعد زہرہ رک گئی اور فیروز آگے نکل گیا۔ زہرہ ڈرائنگ روم کی طرف لوٹ آئی۔

☆☆☆

فیروز نے جو تدبیر سوچی تھی، اس کا اظہار اس نے اس وقت کیا جب وہ لالہ عیسیٰ کو تلاش کرکے اسٹڈی سے بیڈروم میں لے گیا جہاں فریال عیسیٰ گم صم بیٹھی ہوئی تھیں۔

”تدبیر یہ ہے ڈیڈی!“ فیروز نے کہا۔ ”فی الحال آپ اس عورت کی بات مان لیں۔ جب قرضہ ادا ہوجائے تو آپ شادی سے انکار کردیجیے گا۔ اس کے بعد وہ آپ کا

کیا بگاڑ سکتی ہے۔''
''اتنی بے وقوف نہیں ہے وہ۔'' لالہ عیسیٰ نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''وہ چاہتی ہے کہ صبح دس بجے ہمارا نکاح ہوجائے۔ اس کے بعد ہی وہ قرضے کی رقم میرے بینک میں ٹرانسفر کروائے گی۔''
''اوہ!'' فیروز کے منہ سے نکلا۔
فریال عیسیٰ اس کا منہ تکنے لگیں۔
فیروز نظریں جھکا کر اپنے ہونٹ کاٹنے لگا، پھر یکایک سر اٹھائے بولا۔ ''تو پھر ایک صورت اور ہوسکتی ہے ممی!'' وہ فریال عیسیٰ کی طرف متوجہ ہوا۔ ''نکاح کا کڑوا گھونٹ تو آپ پی ہی لیں۔ بعد میں ڈیڈی اسے طلاق بھی دے سکتے ہیں۔''
''نہیں دے سکتا۔'' لالہ عیسیٰ نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔ ''اسے خود بھی یہ اندیشہ ہے اور یہ ابھی سامنے بھی آگیا ہے کہ تم لوگوں کے دباؤ میں آکر میں اسے طلاق دے سکتا ہوں اس لیے وہ اپنی پوزیشن پوری طرح مضبوط کرلینا چاہتی ہے۔ ابھی اس کا فون آیا تھا۔ کہہ رہی تھی کہ یہ ہر صورت میں آخر کار تیار ہوہی جائیں گی۔'' ان کا اشارہ فریال عیسیٰ کی طرف تھا۔ ''لہٰذا اس نے اسی وقت اپنے وکیل کو اپنے گھر بلا کے کاغذات تیار کروانا شروع کردیے ہیں۔ ان میں کچھ باتیں ایسی بھی ہوں گی جو میرے دفتر کے کاغذات دیکھنے کے بعد درج کی جاسکیں گی۔ یہ کام وہ کل صبح ساڑھے آٹھ بجے سے دس بجے تک کروا لینا چاہتی ہے۔ نکاح نامے پر دستخط کرنے سے پہلے مجھے ان کاغذات پر دستخط کرنا ہوں گے۔''
''کاغذات کیا ہیں؟'' فیروز نے بے تابی سے پوچھا۔
''میری انڈسٹری اس کے نام ہوجائے گی۔''
''کیا!'' فیروز اچھل پڑا۔
یہی حالت فریال عیسیٰ کی ہوئی تھی۔
''ہاں۔'' لالہ عیسیٰ نے کہا۔ ''اسی طرح وہ اپنی پوزیشن مضبوط کرنا چاہتی ہے۔''
''پھر تو وہ ہمیں فٹ پاتھ تک پہنچا سکتی ہے۔'' فیروز نے ہیجانی انداز میں کہا۔ ''آپ نے اس سے شادی سے انکار کیا تھا۔ اب وہ اس موقعے سے فائدہ اٹھا کر آپ سے اپنی توہین کا انتقام لے سکتی ہے۔''
''ایسا نہیں ہوگا۔''
''یہ یقین کیوں ہے آپ کو؟''
''تم میرے بیٹے ہو فیروز......! اور بچے بھی نہیں ہو۔ تم سے یہ کہنا مجھے اچھا نہیں لگے گا لیکن تم لوگوں کو مطمئن کرنے کے لیے یہ بات مجھے اپنی زبان پر لانا ہی پڑے گی۔ وہ ہمارے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کرسکتی فیروز! وہ آج بھی مجھے ٹوٹ کر چاہتی ہے۔''
فیروز دم بہ خود بیٹھا رہ گیا۔ اب اس کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں بچا تھا۔
''تو پھر ٹھیک ہے۔'' فریال عیسیٰ تیز تیز سانسیں لیتے ہوئے بولی۔ ''جو ہو، سو ہو۔ آپ اس سے شادی تو نہیں کریں گے۔'' پھر وہ اٹھیں اور بستر پر جا گریں۔
فیروز لالہ عیسیٰ کا منہ تکنے لگا۔
''تم انہیں سمجھا چکے۔'' لالہ عیسیٰ نے اس سے کہا۔ ''اب تم جا کے آرام کرو۔''
فیروز اٹھا اور سر جھکائے کمرے سے نکل آیا۔
شاہانہ اس وقت بھی خواب گاہ میں نہیں تھی۔ فیروز کو اسے لینے کے لیے پھر ڈرائنگ روم ہی کا رخ کرنا پڑا۔
''چلو شاہانہ!'' فیروز کا لہجہ تھکا تھکا سا تھا۔
''کیا بات نہیں بن سکی؟'' زہرہ نے پوچھا۔ اس نے فیروز کے چہرے پر مایوسی دیکھی تھی۔
''اب شاید ڈیڈی خود انہیں سمجھائیں گے۔ دیکھو کیا ہوتا ہے۔''
فیروز شاہانہ کے ساتھ کمرے میں آگیا۔
''تمہاری خالہ ذکیہ اتنی مال دار ہیں؟'' اس نے شاہانہ سے پوچھا۔
''مجھے یہ تو معلوم تھا کہ وہ بہت آسودہ ہیں لیکن یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ اتنی دولت مند ہوں گی۔''
''تمہارے گھر کی پریشانیوں کے لیے تو وہ بہت کچھ کرسکتی تھیں۔''
''ابا نے اسے گوارا نہیں کیا۔ انہوں نے تو ایک بار یہ کوشش بھی کی تھی کہ ابا ایک اچھی تنخواہ میں ان کے ادارے میں آجائیں لیکن ابا نے یہ بھی گوارا نہیں کیا۔''
فیروز چپ ہوگیا۔ پھر اٹھا اور الماری سے شراب کی بوتل نکالی۔ شاہانہ سے کچھ کہے بغیر خود ہی ایک پیگ بنایا اور اس کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لینے لگا۔ شاہانہ اس کے قریب ہی صوفے پر بیٹھی تھی۔ اسے خوف محسوس ہونے لگا۔ فیروز کا وہیں بیٹھ کر شراب پینا اس کی خوف زدگی کا سبب بنا تھا۔ نشے میں وہ بہک بھی سکتا تھا۔
وہ دھڑکتے دل کے ساتھ خاموش بیٹھی سوچتی رہی اگر فیروز بہک گیا تو وہ اسے کسی ایسی بات سے نہیں روک سکے گی جس کا وہ مجاز تھا۔
فیروز نے اس کی طرف نہیں دیکھا ورنہ اس کے چہرے

پر نظر آنے والی پریشانی سے کوئی نتیجہ اخذ کرسکتا تھا۔
ایک پیگ ختم کرنے کے بعد اس نے دوسرا پیگ بنانے کے لیے بوتل اٹھائی ابھی دوسرا پیگ بنا ہی رہا تھا کہ اس کے موبائل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے جلدی سے موبائل فون نکالا، اس کی اسکرین پر نظر ڈالی اور پھر اسے کان سے لگا کر بولا۔ ''جی ڈیڈی!''
''ذرا آؤ تو کمرے میں۔''
''جی، بہتر۔''
دوسری طرف سے رابطہ منقطع ہوگیا۔ فیروز کھڑا ہوتا ہوا شاہانہ سے بولا۔ ''ڈیڈی اپنے کمرے میں بلا رہے ہیں۔ معلوم نہیں اب کیا ہوا ہے۔'' وہ جواب کا انتظار کیے بغیر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔
فیروز لالہ عیسیٰ کے کمرے میں پہنچا۔ فریال عیسیٰ سرہانے سے ٹیک لگائے بیٹھی تھیں اور ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ لالہ عیسیٰ بھی بستر پر بیٹھے ہوئے تھے۔
''اپنی ماں کو سمجھاؤ بیٹے!'' لالہ عیسیٰ نے کہا۔ ''انہوں نے میری بات سمجھ تو لی ہے اور مان بھی گئی ہیں کہ میں بانو سے شادی کرلوں مگر اس کے بعد مسلسل روئے جارہی ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ وہ مجھ سے انتقام لے گی اور انڈسٹری وغیرہ پر قبضہ کرنے کے بعد ہمیں دربدر کی خاک چھاننے پر مجبور کردے گی۔''
''ایسا نہیں ہوگا ممی!'' فیروز نے فریال عیسیٰ سے کہا۔ ''ڈیڈی آپ کو یقین دلا چکے ہیں کہ وہ ایسا نہیں کرے گی کیونکہ وہ ڈیڈی کو چاہتی ہے۔ ڈیڈی نے دنیا دیکھی ہے۔ تجربہ ہے انہیں زندگی کا.....! اور پھر آپ دوسرا پہلو بھی تو دیکھیں۔ اگر اس کی بات نہ مانی گئی تو بھی ہم کنگال ہوجائیں گے۔ ایسی صورت میں اگر کوئی چانس مل رہا ہو تو اسے نظرانداز نہیں کرنا چاہیے۔''
فیروز کا اس انداز میں سمجھانا موثر ثابت ہوا اور فریال عیسیٰ کا رونا دھونا تقریباً بند ہوگیا۔ انہوں نے بس خاموشی اختیار کرلی۔ اس وقت لالہ عیسیٰ کے اشارے پر فیروز کمرے سے نکل آیا۔
اپنی خواب گاہ میں پہنچ کر اس نے شاہانہ کو ساری بات بتائی۔
شاہانہ بولی۔ ''میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ خالہ ذکیہ کا ڈیڈی سے کوئی تعلق ہوگا لیکن یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ وہ ڈیڈی سے اتنی محبت کرتی ہیں کہ انہوں نے کسی اور سے اب تک شادی نہیں کی۔ ایسی صورت میں ڈیڈی کا یہ خیال ٹھیک ہی نظر آتا ہے کہ خالہ ذکیہ کے دل میں انتقام کی کوئی بات نہیں ہوگی۔''
فیروز سر ہلا کر بیٹھا۔ اس نے گلاس میں جو تھوڑی سی شراب انڈیلی تھی، وہ پانی ملائے بغیر ہی حلق سے اتار گیا اور پھر بوتل بند کرتے ہوئے بولا۔ ''اب تم آرام کرو، میں زہرہ کے پاس جارہا ہوں۔''
شاہانہ نے سکون کی سانس لی۔ فیروز بوتل لے کر چلا گیا۔

☆☆☆

دوسری صبح لالہ عیسیٰ اور فیروز جلد ہی گھر سے چلے گئے تھے۔
شاہانہ نے اس موقعے سے فائدہ اٹھا کر موبائل پر عزیر سے رابطہ کیا اور اسے ساری صورت حال سے آگاہ کیا۔ اس نے اپنے اس خیال کا اظہار بھی کردیا کہ عزیر سے ملنے والی خاتون خالہ ذکیہ کے علاوہ کوئی اور نہیں ہوسکتیں۔
ان کی باتیں دس بارہ منٹ تک جاری رہیں۔ پھر دروازے پر قدموں کی آہٹ سن کر شاہانہ نے رابطہ منقطع کردیا۔ آنے والی زہرہ تھی۔ زہرہ کو بھی فیروز بتاچکا تھا کہ فریال عیسیٰ اپنے شوہر کی دوسری شادی کے لیے تیار ہوچکی ہیں۔
''اب تمہارے حق میں سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا۔'' وہ مسکرا کر بولی۔ ''پھوپی ذکیہ اس گھر میں آنے کے بعد تمہاری نجات کا ذریعہ بن جائیں گی۔''
''مگر کس طرح؟''
''انہوں نے کیا سوچا ہے، مجھے اس کا علم نہیں۔ انہوں نے کل رات ہی مجھ سے فون پر کہا ہے کہ وہ تمہیں بہت جلد طلاق دلوادیں گی۔''
''اس وقت کیا ہورہا ہوگا؟''۔
''وہی...... انڈسٹری کے کاغذات کی تیاری......! اس پر ڈیڈی کے دستخط ہوں گے۔ اس کے بعد نکاح۔''
''نکاح کہاں ہوگا؟''
''میرا خیال ہے، یہیں گھر پر ہی ہوگا۔''
''تم بتارہی تھیں کہ ان کی شادی ہوچکی ہے۔''
''سول میرج۔'' زہرہ نے جواب دیا۔ ''اور سول میرج باقاعدہ نکاح میں کوئی رکاوٹ نہیں بنتی۔''
شاہانہ نے سر ہلا دیا۔
سردیوں کی وجہ سے وہ دونوں اس وقت برآمدے میں تھیں جب لالہ عیسیٰ کی کار اور اس کے پیچھے کئی دوسری کاریں بھی آتی دکھائی دیں۔ اگلی کار میں لالہ عیسیٰ اور خالہ ذکیہ تھے۔

پچھلی کار میں آنے والوں کو زہرہ نے پہچانا اور چونک کر بولی۔

"یہ تو پھوپی ذکیہ کے رشتے دار ہیں۔ انہیں نکاح میں شرکت کے لیے لایا گیا ہوگا۔"

☆☆☆

زہرہ کا خیال درست ہی تھا۔ سب سے پیچھے کی کار میں نکاح خواں اور لالہ عیسیٰ کے چند دوست تھے۔ نکاح میں وہی گواہ و وکیل بنے۔ نکاح کے بعد مہمانوں کی خاطر مدارات ہوئی جس کے بعد وہ چلے گئے۔

فریال عیسیٰ اس نکاح میں شریک نہیں ہوئی تھیں، انہوں نے خود کو اپنے کمرے تک محدود کرلیا تھا۔

کچھ دیر بعد لالہ عیسیٰ اپنے دفتر چلے گئے۔ فیروز نہیں گیا تھا۔ وہ شاہانہ کے ساتھ کمرے میں آ گیا۔ شاہانہ بے چین تھی کہ موبائل فون پر اپنے گھر والوں کو سارے واقعات سے آگاہ کرے لیکن فیروز کے سامنے اس نے مناسب نہیں سمجھا۔

زہرہ اور اعجاز بھی اپنے کمروں میں چلے گئے تھے۔

خالہ ذکیہ نے فریال عیسیٰ کے کمرے کا رخ کیا۔

"کیوں؟" فریال عیسیٰ نے پیشانی پر بل ڈالتے ہوئے کھردرے لہجے میں کہا۔ "میرے کمرے میں کیوں آئی ہو؟"

"میں نے سوچا، خود آ کر تم سے شادی کی مبارک باد لے لوں!" خالہ ذکیہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "تم تو نکاح میں بھی شریک نہیں ہوئیں۔"

"یہ میرے لیے خوشی کی کوئی بات نہیں کہ میں تمہیں مبارک باد دوں۔" فریال عیسیٰ نے اپنی نظریں دوسری طرف کرلیں۔

خالہ ذکیہ دھیرے سے ہنسیں۔ "شاید تم میرا چہرہ بھی نہیں دیکھنا چاہتیں۔"

فریال عیسیٰ خاموش رہیں۔

"لیکن۔" خالہ ذکیہ بولیں۔ "ہمیں ایک ہی گھر میں رہنا ہے۔ آمنا سامنا تو ہوتا رہے گا، یا تم خود کو بس اس کمرے تک مقید کرلینا چاہتی ہو؟"

"میں کیوں رہوں گی قید میں!" فریال عیسیٰ نے تڑخ کر کہا۔ "میرا گھر ہے یہ! جب چاہوں، باہر نکلوں۔"

"وہی تو میں کہہ رہی ہوں کہ آمنا سامنا تو ہوگا۔"

"تم مجھ سے یہ باتیں کرنے کیوں چلی آئی ہو؟" فریال عیسیٰ نے اس مرتبہ خالہ ذکیہ کو گھورتے ہوئے کہا۔

"بس تمہی سے باتیں کرنے کے لیے رکی تھی۔" خالہ ذکیہ نے فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "لالہ صاحب تو دفتر چلے گئے ہیں۔ اب مجھے بھی جانا ہے۔ اب رات کے کھانے پر ملاقات ہوگی۔"

خالہ ذکیہ نے جواب کا انتظار نہیں کیا اور کمرے سے نکل آئیں۔

پھر ان دونوں کا آمنا سامنا رات کے کھانے پر ہی ہوا تھا۔ اس سے کچھ دیر پہلے لالہ عیسیٰ کمرے میں جا کر فریال عیسیٰ کو سمجھاتے رہے تھے کہ گھر میں کشیدگی کی فضا قائم رکھنا مناسب نہیں رہے گا۔

ان باتوں کے بعد فریال عیسیٰ کھانے میں تو شریک ہوگئی تھیں لیکن کسی سے بھی کوئی بات نہیں کی تھی۔ خالہ ذکیہ کی طرف تو دیکھا بھی نہیں تھا۔ اس رویے کے باعث کشیدگی میں کوئی کمی آنے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا اور اس کشیدگی کا نقصان فریال عیسیٰ ہی کو پہنچتا لیکن یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔

شاہانہ نے کھانے کی میز پر محسوس کیا کہ اعجاز جب بھی خالہ ذکیہ کی طرف دیکھتا تھا، اس کی آنکھوں میں شدید نفرت ہوتی تھی۔

اسی رات فیروز جب کہیں ادھر ادھر تھا تو شاہانہ کو فون پر اپنی ماں سے بات کرنے کا موقع مل گیا۔

سب کچھ جان کر سلطانہ بیگم بہت حیران ہوئیں۔ انہوں نے اس کا اظہار بھی کیا کہ وہ اسی وقت خالہ ذکیہ سے ملنے آئیں گی۔

"اب رات کو تو نہ آئیں!" شاہانہ نے کہا۔ "بلکہ کل دن میں بھی نہ آیئے گا۔ وہ دونوں ہی دفتر میں ہوں گے۔ شام کو چھ سات بجے آیئے گا۔"

سلطانہ بیگم نے اس کی بات مان لی، پھر کہا۔ "فرزانہ کا مزاج کچھ ٹھیک ہوگیا ہے۔ وہ مجھ سے اپنی باتوں کی معافی مانگ چکی ہے اور تم سے بھی معافی مانگنا چاہتی ہے۔"

"یہ تو اچھی بات ہے امی! کل آپ اسے بھی اپنے ساتھ لیتی آیئے گا۔ اب اس کا دماغ ٹھنڈا ہوگیا ہے تو اب میرے سمجھانے بجھانے سے وہ بالکل ٹھیک ہوجائے گی۔"

اس گفتگو کے بعد شاہانہ کو عزیر سے بات کرنے کا موقع بھی مل گیا۔ سارے حالات جان کر وہ بھی حیران ہوا۔

شاہانہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ اب ہم دونوں بہت جلد ایک دوسرے کے پاس ہوں گے۔ خالہ ذکیہ جلد ہی کوئی ایسی تدبیر کریں گی کہ مجھے یہاں سے نجات مل جائے۔"

"میں بے چینی سے اس وقت کا منتظر رہوں گا شاہانہ!" عزیر نے جذباتی لہجے میں کہا۔

''میں بھی تم سے کم بے چین تو نہیں ہوں عزیزہ!''
وہ دونوں بہت خوش تھے، اور تقدیر شاید ان دونوں کی خوشی پر مسکرا رہی ہو۔
دوسری صبح ناشتے کی میز پر بھی فریال عیسیٰ سب کے ساتھ تھی لیکن اس کے اکڑے ہوئے انداز میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔
اس کے برخلاف خالہ ذکیہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔
ناشتے کے بعد لالہ عیسیٰ، خالہ ذکیہ اور فیروز، تینوں ہی دفتر چلے گئے۔ ذرا دیر بعد ہی زہرہ شاہانہ کے کمرے میں چلی آئی۔
وہ ہنس کر بولی۔ ''جب تک ممی کا موڈ ٹھیک نہیں ہو جاتا ہم دونوں بے دھڑک ایک دوسرے سے مل سکتے ہیں۔ انہیں کچھ معلوم ہی نہیں ہوگا۔ وہ تو اپنے کمرے سے باہر نکلنا ہی بھول گئی ہیں۔''
''اس طرح کب تک چل سکے گا زہرہ؟''
''دیکھو کب تک چلتا ہے! فی الحال تو ممی پر آج ایک اور دھماکا ہونے والا ہے۔''
''کیا مطلب!'' شاہانہ چونکی۔
''پھوپی ذکیہ سے مجھے زیادہ بات کرنے کا موقع نہیں ملا۔ میں ان سے بس اتنا ہی جان سکی کہ وہ آج تمہارے بارے میں کوئی بات چھیڑیں گی۔''
''اوہ!'' شاہانہ کے منہ سے اتنا ہی نکل سکا۔
''آج دوپہر کو وہ لنچ کے لیے آئیں گی تو دوبارہ دفتر نہیں جائیں گی۔ آج کا باقی دن انہوں نے اسی مسئلے کے لیے وقف کر دیا ہے۔ وہ ڈیڈی کو بھی نہیں جانے دیں گی، یا شاید وہ ان سے کہہ بھی چکی ہوں۔''
''یہ بھی بتا دیا ہوگا ڈیڈی کو کہ انہیں کیا بات کرنا ہے؟''
''میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔''
ان باتوں نے شاہانہ کے جسم میں سنسناہٹ پھیلا دی۔ پہلے اس کا خیال تھا کہ خالہ ذکیہ اتنی تیزی سے اقدامات نہیں کریں گی۔ ورنہ اس گھر میں ایک اور بھونچال آئے گا۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ فریال عیسیٰ کا کیا ردعمل ہوگا۔
دوپہر کو لالہ عیسیٰ، خالہ ذکیہ اور فیروز لنچ کے لیے گھر آئے۔ اس وقت شاہانہ نے دیکھا کہ خالہ ذکیہ کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔ جب سے وہ اس گھر میں آئی تھیں، ان کے ہونٹوں پر مسلسل مسکراہٹ کھیلتی رہی تھی لیکن اس وقت وہ پہلی مرتبہ اتنی سنجیدہ نظر آرہی تھیں۔

''کیا بات ہے بانو!'' لالہ عیسیٰ بولے۔ ''تم اچانک کچھ فکرمند نظر آنے لگیں؟''
''فکرمند تو نہیں۔'' خالہ ذکیہ نے جواب دیا۔ ''بس سوچ رہی تھی کہ گفتگو کا آغاز کس طرح ہو۔''
''کوئی خاص بات کرنی ہے؟''
''بہت خاص۔''
اس وقت فریال عیسیٰ نے خالہ ذکیہ کو بڑی گہری نظر سے دیکھا تھا۔
''اتنے سوچ بچار میں مت پڑو۔'' لالہ عیسیٰ نے کہا۔ ''جو بات بھی ہے، بس کہہ ڈالو۔''
''بچوں کے سامنے نہیں۔'' خالہ ذکیہ کا اشارہ فیروز، شاہانہ، زہرہ اور اعجاز ہی کی طرف ہوسکتا تھا۔
فریال عیسیٰ نے پہلو بدلا اور بجائے خالہ ذکیہ کے، لالہ عیسیٰ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''وہ گفتگو میرے سامنے ہونا چاہیے۔''
خالہ ذکیہ بول پڑیں۔ ''یقیناً وہ گفتگو تمہارے سامنے ہوگی۔ کھانے کے بعد کمرے میں چل کر بات کریں گے۔''
لالہ عیسیٰ کسی سوچ میں پڑ گئے۔ فریال عیسیٰ نے بھی خاموشی اختیار کرلی۔ سوچ بچار کا تاثر اعجاز کے چہرے پر بھی نظر آیا۔ صرف شاہانہ اور زہرہ کے چہروں پر سنجیدگی رہی۔ زہرہ نے ایک مرتبہ کن انکھیوں سے شاہانہ کی طرف دیکھا تھا۔
کھانے کے بعد لالہ عیسیٰ اور خالہ ذکیہ، فریال عیسیٰ کے ساتھ اس کے کمرے میں پہنچے۔ فریال عیسیٰ اپنے بستر پر جا بیٹھیں۔ لالہ عیسیٰ ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ خالہ ذکیہ ٹہلنے لگیں۔
''تم بھی بیٹھ جاؤ۔'' لالہ عیسیٰ نے خالہ ذکیہ سے کہا۔
''بیٹھ جاؤں گی۔'' خالہ ذکیہ نے کہا۔ ''مجھے معلوم ہوا ہے کہ فیروز کی دوسری شادی اس کی خوشی سے نہیں، دباؤ سے کروائی گئی تھی۔''
خالہ ذکیہ نے فریال عیسیٰ کی طرف دیکھا بھی نہیں تھا لیکن بھڑک کر جواب میں وہی بولیں۔ ''تمہیں ہمارے گھریلو معاملات میں نہیں بولنا چاہیے۔''
''کیوں؟'' خالہ ذکیہ کی پیشانی پر سلوٹ پڑ گئی۔ ''کیوں فریال؟ کیا میں اب اس گھر کی فرد نہیں؟ اب یہ گھر میرا بھی ہے۔ اس گھر کے ہر غلط یا صحیح معاملے پر نظر رکھنا میری بھی ذمے داری ہے۔''
''فیروز میرا بیٹا ہے۔'' فریال عیسیٰ تڑخیں۔
''وہ میرا بیٹا بھی ہے۔'' خالہ ذکیہ نے کہا۔ ''لالہ صاحب کی سب اولادیں میری اولادیں ہیں۔''

''سوتیلی۔'' فریال عیسیٰ نے کہا۔
''میں ایسا نہیں سمجھتی۔ تم مجھے ایک سوال کا جواب دو فریال! مجھ سے لالہ صاحب کی دوسری شادی ہوئی تو پہلی بیوی کی حیثیت سے تم نے کیا محسوس کیا؟ تمہیں جواب دینے کی بھی ضرورت نہیں۔ میں محسوس کرچکی ہوں کہ تم بری طرح تڑپ گئی ہو۔''
''یقیناً تڑپ گئی ہوں۔'' فریال عیسیٰ کچھ سوچے سمجھے بغیر بول پڑیں۔
''میں یہی سننا چاہتی تھی تم سے!'' خالہ ذکیہ کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ نظر آئی۔ ''تمہیں ایک عورت کی حیثیت سے زہرہ کے لیے بھی سوچنا چاہیے تھا۔ اس کے دل پر کیا گزر گئی ہوگی؟''
''مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ اس کے دل پر کیا گزری ہوگی!''
''یہ تو سفاکی ہوئی فریال!''
لالہ عیسیٰ جو اس دوران میں خاموش رہے تھے، بول پڑے۔ ''میری بات سنو بانو! دوسری شادی فریال نے اس لیے کروائی تھی کہ انہیں دادی بننے کا بہت ارمان ہے۔ زہرہ کا میڈیکل چیک اپ کروایا گیا تھا۔ وہ ماں نہیں بن سکتی۔ کچھ اس قسم کی گڑبڑ ہے جس کا علاج بھی نہیں ہوسکتا۔''
''کیا شادی سے پہلے شاہانہ کا چیک اپ کروالیا گیا تھا؟'' خالہ ذکیہ نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ایسی کوئی گڑبڑ اس میں بھی ہوسکتی ہے۔''
''سیدھا سیدھا مطلب بیان کرواپنا۔'' فریال عیسیٰ بھڑک کر بولی۔
''زہرہ کے ساتھ جو زیادتی ہوئی ہے، اس کا ازالہ ہونا چاہیے۔'' خالہ ذکیہ نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ''فیروز کو چاہیے کہ اسے طلاق دے دے۔''
''بانو!'' لالہ عیسیٰ نے حیرت کا اظہار کیا۔ ''تم اپنی بھانجی کو مطلقہ بنانا چاہتی ہو؟''
''زیادتی زہرہ کے ساتھ ہوئی ہے۔ میں اسی کا ساتھ دوں گی۔''
یہ بات فریال عیسیٰ پر آشکارا نہیں ہوئی تھی کہ خالہ ذکیہ کا کچھ رشتہ زہرہ سے بھی تھا۔
فریال عیسیٰ غصے میں بستر سے کھڑی ہوگئیں۔ ''یہ نہیں ہوسکتا۔''
اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔
''آجاؤ فیروز!'' خالہ ذکیہ نے بلند آواز میں کہا۔

فیروز دروازہ کھول کر اندر آیا۔
''تم کیوں آئے ہو؟'' فریال عیسیٰ اس پر بگڑ گئیں۔
''چھوٹی ممی نے۔'' فیروز کا اشارہ خالہ ذکیہ کی طرف تھا۔ اس نے مزید کہا۔ ''کھانے کی میز سے اٹھتے وقت انہوں نے چپکے سے مجھے ایک پرچا دیا تھا۔ اس پر لکھا تھا کہ میں تھوڑی دیر بعد یہاں آجاؤں۔''
''تو اب تم اپنی سوتیلی ماں کا حکم مانا کرو گے!'' فریال عیسیٰ کا لہجہ بہت تیز تھا۔
''میرے لیے اب فیصلہ کرنا مشکل ہوگیا ہے کہ میں کس کی بات مانوں اور کس کی نہ مانوں!''
فریال عیسیٰ پھر کچھ کہتیں لیکن اس سے پہلے ہی خالہ ذکیہ بول پڑیں۔ ''فیروز! کیا تم شاہانہ کو طلاق دینے کے لیے تیار ہو؟''
فیروز چونکا اور پھر جواب دینے کے بجائے اپنی ماں کی طرف دیکھنے لگا۔
فریال عیسیٰ نے فیصلہ سنایا۔ ''یہ طلاق نہیں دے گا۔''
''دباؤ......؟'' خالہ ذکیہ کے لہجے میں تلخی آگئی۔
''جو دل چاہے، سمجھو!''
''فیروز!'' خالہ ذکیہ نے نرم لہجے میں کہا۔ ''اب تم جاؤ۔''
فیروز اپنے چہرے پر الجھن کے تاثرات کے ساتھ کمرے سے چلا گیا۔
''میں اس گھر میں کسی کے ساتھ کوئی زیادتی ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔'' خالہ ذکیہ نے فریال عیسیٰ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''فیروز نے میرا سوال سن کر تمہاری طرف دیکھا تھا۔ اس سے میں نے یہی نتیجہ اخذ کیا ہے کہ وہ شاہانہ کو طلاق دینے کے لیے تیار ہے لیکن تمہارے دباؤ کی وجہ سے مجبور ہے۔ تمہیں یہ دباؤ ختم کرنا ہوگا فریال! میں زہرہ کے ساتھ زیادتی ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔''
''اور مجھ پر زیادتی کرسکتی ہو؟'' فریال عیسیٰ نے تیزی سے کہا۔
''کیا مطلب!'' خالہ ذکیہ بولیں۔
''تم بھی مجھ پر سوکن بن کر آئی ہو! کیا میرے ساتھ زیادتی نہیں ہوئی؟''
خالہ ذکیہ نے فوراً جواب نہیں دیا لیکن کچھ توقف کے بعد ٹھنڈی سانس لے کر بولیں۔ ''تم ٹھیک کہہ رہی ہو فریال! یہ احساس مجھے یہاں آنے کے بعد ہوا۔ زہرہ ہنستی مسکراتی رہتی ہے لیکن میں نے اس کے دل کی تڑپ محسوس کرلی ہے۔ اسی

لیے جب میں نے سوچا کہ اس کے ساتھ ہونے والی زیادتی کا ازالہ ہو تو مجھے تمہارا خیال بھی آیا تھا۔ میں لالہ صاحب سے محبت کرتی ہوں اس لیے پہلے میں نے اس بارے میں سوچا ہی نہیں تھا۔ یقیناً تمہارے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔''

''تو پھر اس زیادتی کا ازالہ بھی ہونا چاہیے۔'' فریال عیسیٰ کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

خالہ ذکیہ کے چہرے پر سوچ بچار کے تاثرات گہرے ہو گئے، پھر انہوں نے لالہ عیسیٰ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ مجھے طلاق دیں گے تو میں یہ کڑوا گھونٹ پی لوں گی لیکن زہرہ کے ساتھ زیادتی نہیں ہونا چاہیے۔'' پھر اس نے فریال عیسیٰ کی طرف دیکھتے ہوئے بڑے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''کل صبح تک شاہانہ کو طلاق ہو جانا چاہیے۔''

پھر وہ جواب کا انتظار کیے بغیر تیزی سے چلتے ہوئے کمرے سے نکل گئیں۔

''ٹھیک ہے۔'' فریال نے لالہ عیسیٰ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں شاہانہ کو طلاق دلوا دوں گی۔ آپ بھی اسے طلاق دے دیجیے۔''

''شاید تمہارے دماغ نے ٹھیک طور سے کام کرنا چھوڑ دیا ہے۔'' لالہ عیسیٰ نے کہا۔ ''تم بھول رہی ہو کہ اب ہمارا سب کچھ اس کے نام ہو چکا ہے۔ اگر میں نے اسے طلاق دی تو وہ کچھ بھی کر سکتی ہے۔''

''کیوں!'' فریال عیسیٰ نے کہا۔ ''آپ کو تو بڑا یقین تھا کہ وہ ہمارے ساتھ یہ زیادتی نہیں کرے گی۔''

''مگر اس صورت میں کہ وہ میری بیوی رہے۔'' لالہ عیسیٰ نے کہا۔ ''اگر میں نے اسے طلاق دی تو پھر وہ انتقام پر آمادہ ہو سکتی ہے۔''

''تو پھر میں بھی شاہانہ کو طلاق نہیں دلواؤں گی۔''

''اس صورت میں وہ کوئی ایسا قدم اٹھا سکتی ہے جو صرف تمہارے لیے تکلیف دہ ثابت ہو۔''

''کیا مطلب!'' فریال عیسیٰ چونکی۔ ''کیا وہ آپ پر دباؤ ڈال سکتی ہے کہ آپ مجھے طلاق دیں۔''

''میرا خیال ہے کہ وہ ایسا کوئی انتہائی قدم نہیں اٹھائے گی۔''

''تو پھر وہ کیا کر سکتی ہے؟''

''مجھے اس کا بالکل اندازہ نہیں لیکن وہ شاہانہ کو طلاق دلوانے پر تل چکی ہے۔''

''وہ میرے ساتھ اور کسی قسم کی زیادتی نہیں کر سکتی۔''

لالہ عیسیٰ کچھ نہیں بولے لیکن چہرے پر تشویش کے تاثرات تھے۔

ٹھیک اسی وقت خالہ ذکیہ موبائل فون پر زہرہ کو ان تمام حالات سے آگاہ کر رہی تھیں۔

سب کچھ سننے کے بعد زہرہ نے کہا۔ ''کیا لالہ عیسیٰ آپ کو طلاق دے دیں گے؟''

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' خالہ ذکیہ نے ہنس کر کہا۔

''تو پھر وہ بھی شاہانہ کو طلاق دلوانے کے لیے تیار نہیں ہوں گی۔''

''اس صورت میں اس پر اذیت کا وہ وقت آ جائے گا کہ وہ پاگلوں کی طرح اپنے بال نوچنے لگے گی۔''

''وہ کیسے؟''

''فیروز تم سے چوری چھپے ملتا ہے نا؟''

''جی!''

''گھر کے لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ فریال نے اسے تم سے دور کر دیا ہے!''

''جی۔''

''میں یہی سزا فریال کے لیے مقرر کروں گی۔ لالہ عیسیٰ پر یہ پابندی لگاؤں گی کہ وہ اب فریال کے کمرے کا رخ نہیں کریں گے اور ان کا وقت اب صرف میرے لیے وقف ہو گا۔''

''اوہ! یہ تو واقعی ان کے لیے قیامت ہو گی۔''

''بس اب انتظار کرو۔'' دیکھو کیا ہوتا ہے۔''

خالہ ذکیہ نے رابطہ منقطع کیا اور مسکرانے لگیں۔ وہ بڑے سکون سے بستر پر لیٹی ہوئی تھیں۔ انہیں یقین تھا کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں گی۔ انہوں نے یہ فیصلہ بھی کیا تھا کہ شاہانہ کو طلاق ہو جانے کے بعد وہ فریال عیسیٰ کے ساتھ کوئی اور زیادتی نہیں کریں گی۔ ان کی کوشش یہی ہوتی کہ ان کے ساتھ فریال عیسیٰ بھی لالہ عیسیٰ کے گھر میں ایک پرسکون زندگی گزاریں۔

☆☆☆

خالہ ذکیہ سے ملنے، سلطانہ بیگم کے ساتھ آذر صاحب کو بھی جانا تھا مگر سہ پہر کو انہیں حرارت ہو گئی۔ ان کی ناسازی طبع کے باعث جب سلطانہ بیگم نے جانے کا ارادہ ملتوی کرنا چاہا تو فرزانہ بے چین ہو گئی۔ اس کی موبائل فون پر اعجاز سے بات ہو چکی تھی۔ طے پایا تھا کہ اس رات فرزانہ اپنی بہن کے پاس رکنے کی پوری پوری کوشش کرے گی اور کامیاب ہو جانے کی صورت میں اسے کسی وقت اعجاز سے تنہائی میں ملنے کا موقع مل سکتا تھا۔

اعجاز نے اس بات چیت میں کہا تھا۔ ''ہم ایک

دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائیں گے فرزانہ کہ اب ہمیں دنیا کی کوئی طاقت ایک دوسرے کا ہونے سے نہیں روک سکے گی۔ میرے گھر والوں نے اعتراض کیا تو میں بغاوت کر دوں گا۔ میری ماں مجھ کو بہت چاہتی ہیں۔ وہ جب میرے یہ تیور دیکھیں گی تو نرم پڑ جائیں گی اور پھر ڈیڈی کو تو ان کی بات ماننا ہی پڑتی ہے۔"

اعجاز کی ان باتوں سے فرزانہ پر ایک نشہ سا طاری ہو گیا تھا۔ وہ اس عیش و عشرت کی زندگی کے خوابوں میں ڈوب گئی تھی جو اسے اعجاز سے شادی کر کے ہی حاصل ہو سکتی تھی۔

بہت کم وقت میں صرف موبائل فون پر باتیں کرتے کرتے ہی وہ ایک دوسرے سے اتنے بے تکلف ہوئے تھے۔ اس سرعت سے آگے بڑھنے کی کوشش اعجاز ہی نے کی تھی اور فرزانہ مسحور ہوتی چلی گئی تھی۔ اس کے کانوں میں جیسے کسی نے پھونک دیا تھا کہ وہ بے حد خوب صورت تھی، اتنی خوب صورت کہ اعجاز اس کا دیوانہ ہو گیا ہے۔ وہ اس سے عہد و پیماں کرنے کے لیے تیار تھا۔ فرزانہ چاہتی تھی کہ اس معاملے میں تاخیر نہ ہو لیکن جب اس کی ماں نے جانے کا ارادہ ملتوی کرنے کی بات کی تو یہ التوا اس کے لیے مایوس کن ہونا ہی چاہیے تھا۔

پھر اس وقت اس کی جان میں جان آئی جب آذر صاحب نے بہ اصرار اپنی بیوی سے کہا کہ ان کی طبیعت اتنی زیادہ خراب نہیں ہے کہ ان کے لیے متفکر رہا جائے۔ انہوں نے زور دے کر کہا کہ سلطانہ بیگم، فرزانہ کو ساتھ لے کر چلی جائیں۔ فرزانہ کا ڈوبتا ہوا دل خوشی سے دھڑکنے لگا جب سلطانہ بیگم نے اس سے تیار ہونے کے لیے کہا۔ تیاری کرتے ہوئے فرزانہ ان خوابوں میں کھوئی رہی جو اسے اعجاز کی باتوں نے دکھائے تھے۔

ساڑھے چھ بجے وہ اور سلطانہ بیگم کار میں گھر سے روانہ ہوئیں۔ وہ کار آذر صاحب کو دفتر کی طرف سے ملی تھی اور کار کے ساتھ شوفر بھی تھا جس کی تنخواہ عیسیٰ انڈسٹریز ہی کی طرف سے دی جاتی تھی۔

سلطانہ بیگم بہت خوش تھیں کہ ان کے گھریلو حالات سنبھل گئے تھے بلکہ بہت اچھے ہو گئے تھے۔ انہیں کچھ خجالت شاہانہ سے بہر حال تھی جس کی قربانی سے حالات تبدیل ہوئے تھے۔

جب وہ اپنی بیٹی کے ساتھ وہاں پہنچیں تو خالہ ذکیہ نے بڑی گرم جوشی سے ان کا استقبال کیا۔

"تم نے آنے کی اطلاع نہیں دی۔" خالہ ذکیہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "لیکن تمہاری اس اچانک آمد نے مجھے حیران نہیں کیا۔ مجھے یقین تھا کہ شاہانہ نے تمہیں فون پر سب کچھ بتا دیا ہو گا۔"

اس وقت فرزانہ خود ہی شاہانہ کے سینے سے جا لگی اور ایسی جذباتیت کا اظہار کیا جیسے اپنے سابقہ رویے پر بے حد پشیمان ہو۔ شاہانہ محبت سے اس کی پیٹھ تھپکنے لگی۔

وہ چاروں ڈرائنگ روم میں بیٹھی تھیں کہ زہرہ، فیروز اور لالہ عیسیٰ بھی وہاں آ گئے۔

لالہ عیسیٰ کو جب آذر صاحب کے نہ آنے کی وجہ معلوم ہوئی تو انہوں نے اسی وقت موبائل فون پر آذر صاحب سے رابطہ کیا اور ان کی مزاج پرسی کے ساتھ تاکید کی کہ اگر ان کی طبیعت پوری طرح بحال نہ ہو تو وہ دوسرے دن دفتر نہ آئیں۔

اسی دوران میں ملازم نے خاطر مدارات کے تمام لوازمات میز پر لگا دیے جس کی ہدایت اسی وقت دے دی گئی تھی جب سلطانہ بیگم اور فرزانہ وہاں پہنچی تھیں۔

اعجاز ڈرائنگ روم میں نہیں آیا۔ شاہانہ نے یہ بات خاص طور سے محسوس کی۔ اس کے علم کے مطابق اعجاز بھی اس وقت گھر پر ہی تھا اور اس کا امکان بہت کم تھا کہ اسے مہمانوں کی آمد کا علم نہ ہوا ہو۔ شاہانہ کو خیال آیا کہ اس کے نہ آنے کی وجہ یہی ہو سکتی تھی کہ فریال عیسیٰ اسے خاصا سخت سست کہہ چکی تھیں اس لیے وہ فرزانہ کے سامنے آنے سے گریز کر سکتا تھا۔

اصل حقیقت صرف فرزانہ جانتی تھی۔

"جب تم اپنی والدہ کے ساتھ آؤ گی تو میں تمہارے سامنے نہیں آؤں گا۔" اعجاز نے اس سے فون پر کہا تھا۔ "میں سب لوگوں کو اور خصوصاً تمہاری بڑی بہن صاحبہ کو یہ تاثر دینا چاہتا ہوں کہ مجھے تم سے اب کوئی دلچسپی نہیں۔"

اسی لیے فرزانہ کے چہرے پر ایسا کوئی تاثر نہیں آیا جس سے ظاہر ہوتا کہ اعجاز کا سامنے نہ آنا اس کے لیے مایوس کن رہا ہو۔

سلطانہ بیگم نے چائے پینے کے دوران میں ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "ہماری سمدھن کیا گھر میں نہیں ہیں؟ یا ہم سے کچھ ناراض ہیں؟"

"ارے نہیں۔" لالہ عیسیٰ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "دراصل فریال کی طبیعت کچھ ناساز ہے۔"

خالہ ذکیہ خاموشی سے مسکراتی رہی تھیں۔

"ارے!" سلطانہ بیگم بولیں۔ "تب تو مجھے خود ان کے کمرے میں جانا چاہیے۔"

"ہاں ہاں، ضرور۔" لالہ عیسیٰ نے کہا۔ "چائے پی کر چلیے گا۔"

اس وقت فرزانہ نے شاہانہ سے کہا۔ ''آپ کا گھر بہت خوب صورت ہے آپا!''

فوراً ہی لالہ عیسیٰ نے شاہانہ سے کہا۔ ''اپنی بہن کو سارا گھر دکھاؤ شاہانہ بیٹی!''

''جی ڈیڈی! دکھادوں گی۔''

فرزانہ خوش ہوگئی۔ جو بات اسے کہنا تھی، وہ لالہ عیسیٰ نے کہہ دی تھی۔

تھوڑی دیر بعد جب سلطانہ بیگم، فریال عیسیٰ کی مزاج پرسی کے لیے جانے لگیں تو لالہ عیسیٰ نے دوبارہ شاہانہ سے کہا۔ ''تم اتنی دیر میں اپنی بہن کو گھر دکھادو۔''

''جی، بہتر۔''

سلطانہ بیگم، لالہ عیسیٰ اور خالہ ذکیہ کے ساتھ فریال عیسیٰ کی طرف چلی گئیں۔

''مجھے ایک ضروری کام ہے۔'' فیروز کھڑا ہوتا ہوا بولا۔ ''لیکن میں ایک گھنٹے میں واپس آجاؤں گا۔ آپ اب کھانا کھا کے جایئے گا۔'' اس کی مخاطب سلطانہ بیگم تھیں۔ ''میں اس سے پہلے ہی واپس آجاؤں گا۔ میرا مطلب ہے، کھانے کے وقت سے پہلے۔''

سلطانہ بیگم نے اس دعوت سے گریز کرنا چاہا لیکن پھر خالہ ذکیہ نے بھی اصرار کیا تو انہیں چپ ہونا پڑا۔

زہرہ اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

شاہانہ نے فرزانہ کو اپنے ساتھ لیا۔ ''آؤ، تمہیں گھر دکھاؤں۔''

''پہلے تو اپنے کمرے میں چلیے!'' فرزانہ نے کہا۔

''کیوں؟''

''بس چلیے نا!'' فرزانہ نے شاہانہ کا ہاتھ پکڑ لیا اور بچوں کی طرح ٹھنک کر کہا۔

''آؤ۔'' شاہانہ نے محبت سے اس کا گال تھپکا۔

شاہانہ کے ساتھ اس کے کمرے میں پہنچتے ہی فرزانہ نے رونا شروع کر دیا اور شاہانہ سے لپٹ کر اپنے سابقہ رویے پر معافی مانگنے لگی۔

''میں جب سے آئی ہوں، بڑی مشکل سے اپنے جذبات کو قابو میں رکھا ہے۔'' وہ سسکتے ہوئے بولی۔

شاہانہ اس کی اداکاری نہیں سمجھ سکی اور پیار کرتے ہوئے بولی۔ ''بھول جاؤ اب وہ سب باتیں!''

''آپ نے اور امی نے مجھے ٹھیک ہی سمجھایا تھا۔'' فرزانہ نے اپنی آنکھیں خشک کرتے ہوئے کہا۔ ''اب تو میں اعجاز کا منہ بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔''

''وجہ؟'' شاہانہ نے اسے غور سے دیکھا۔

''فون پر وہ مجھ سے بڑی بے ہودہ باتیں کرنے لگا تھا آپا!'' فرزانہ نے نظریں جھکا کر کہا۔ ''میں وہ باتیں آپ کو بتا بھی نہیں سکتی۔ میں نے اسے ڈانٹ کر فون بند کر دیا تھا۔ اس کے بعد ہی میں نے امی سے معافی مانگی تھی۔''

''ہوں......!'' شاہانہ نے طویل سانس لی۔ ''اب میں سمجھی کہ وہ اسی لیے آج سامنے نہیں آیا۔''

''میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ ایسا ہوگا!''

''شکر ہے کہ تمہیں جلد ہی عقل آگئی۔ چلو اب میں تمہیں گھر دکھاؤں۔''

''چلیے!''

شاہانہ نے اسے کوٹھی کے وہ سب حصے دکھائے جو آرائش کے اعتبار سے واقعی دیدنی تھے۔ لالہ عیسیٰ نے ان کی آرائش پر بہت پیسا خرچ کیا تھا۔ اس طرح کوٹھی دیکھنے کے بہانے فرزانہ کو یہ جاننے کا موقع بھی مل گیا کہ اعجاز کا کمرا کہاں تھا۔

''آپ کا گھر بہت اچھا ہے آپا!'' فرزانہ بولی۔ ''کیا میں آج یہاں رک جاؤں؟ کمرے تو یہاں بہت ہیں۔ کہیں بھی سو جاؤں گی۔ پھر کل کا دن بھی آپ کے ساتھ گزاروں گی۔ شام کو چلی جاؤں گی۔''

شاہانہ بولی۔ ''اگر تم رکنا چاہتی ہو تو رک جاؤ لیکن تمہیں امی سے اجازت لینا ہوگی۔''

''ان سے اجازت بھی آپ ہی دلوایئے!'' فرزانہ نے شاہانہ کی گردن میں بانہیں ڈالتے ہوئے کہا۔ ''میری اچھی آپا!'' اس کے انداز میں محبت بھی تھی اور خوشامد بھی۔

''اچھا میں بات کروں گی امی سے۔'' شاہانہ نے ہنس کر کہا۔

''آپ کی بات وہ نہیں ٹالیں گی۔'' فرزانہ خوش ہوکر بولی۔

اور واقعی ایسا ہی ہوا۔ شاہانہ کے کہنے کی وجہ سے فرزانہ کو اگلے روز شام تک کے لیے وہاں رہنے کی اجازت مل گئی۔

رات کے کھانے کے بعد سلطانہ بیگم چلی گئیں۔

فرزانہ نے شاہانہ سے کہا۔ ''میں کچھ دیر تو آپ سے اور فیروز بھائی سے گپ شپ کروں گی، پھر سونے کے لیے چلی جاؤں گی۔ بس یہ بتا دیجیے گا کہ مجھے کس کمرے میں......''

''کسی دوسرے کمرے میں نہیں۔'' شاہانہ نے اس کی بات کاٹی۔ ''تم میرے ساتھ سونا۔''

''مگر...... فیروز بھائی؟''

"وہ آج کسی دوسرے کمرے میں سو جائیں گے۔ میں نے ان سے بات کر لی ہے۔"

شاہانہ یہ بتانا ہی نہیں چاہتی تھی کہ فیروز اس کے کمرے میں سوتا بھی نہیں تھا۔

مگر یہ فرزانہ کے لیے پریشان کن بات تھی لیکن اس نے اصرار نہیں کیا کہ وہ کسی اور کمرے میں سونا چاہتی ہے۔ اسے خیال تھا کہ اس کی اس بات سے شاہانہ کھٹک سکتی تھی۔

فرزانہ نے شاہانہ سے اپنے کالج کی باتیں چھیڑ دیں۔ وہ خود کو بہت خوش ظاہر کر رہی تھی اور وہ خوش تھی بھی! اس نے سوچ لیا تھا کہ رات گئے تک شاہانہ سو ہی جائے گی۔ اس کے بعد وہ کمرے سے نکل سکتی تھی۔ واپسی تو جلد ہی ہو جائے گی، اس نے سوچا تھا۔ اعجاز سے بس اتنی دیر کی ملاقات تھی کہ وہ ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر عہد و پیماں کر لیتے۔ بعد کا لائحہ عمل طے کرنے کے لیے وہ موبائل فون پر رابطے میں رہتے۔

☆☆☆

اعجاز نے رات کا کھانا بھی اپنے کمرے ہی میں کھایا تھا۔ اس نے دانستہ سب کا سامنا کرنے سے گریز کیا تھا لیکن اس بات سے بے خبر نہیں رہا تھا کہ فرزانہ وہاں رکنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

رات کو گیارہ بجے اسے فرزانہ کا ایس ایم ایس ملا، لکھا تھا۔

"میں آپا کے واش روم سے تمہیں ایس ایم ایس کر رہی ہوں۔ آپا کہہ رہی تھیں کہ وہ بارہ ایک بجے کے دوران میں سو جاتی ہیں لیکن میں اس کے بعد بھی انتظار کروں گی۔ جب مجھے یقین ہو جائے گا کہ آپا کو گہری نیند آ گئی، تبھی میں یہاں سے نکلوں گی۔ اس وقت میں تمہیں صرف "یس" کا میسج بھیجوں گی۔ تم اپنے کمرے کا دروازہ کھلا رکھنا۔ میں تیزی سے اندر آ جاؤں گی۔"

ایس ایم ایس پڑھ کر اعجاز کے ہونٹوں پر مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ اب اسے اپنی کامیابی یقینی نظر آ رہی تھی۔ وہ بے چینی سے وقت گزارنے لگا۔ بارہ بجے تھے جب اس نے شراب کی بوتل نکالی۔ پیگ بنا کر پہلا گھونٹ لیتے ہوئے اس نے سوچا، یہ لڑکی واقعی بے وقوف ہے یا وہ بھی وہی چاہتی ہے جو وہ چاہتا ہے؟

دماغ اس سوال کا جواب نہیں دے سکا۔ آنے والا وقت ہی بتا سکتا تھا کہ فرزانہ کے دل میں کیا تھا۔

کچھ بھی ہو، اعجاز نے سوچا، ہوگا وہی جو وہ چاہتا ہے۔

اگر فرزانہ نے اس سے بچنے کی کوشش کی تو وہ اسے کامیاب نہیں ہونے دے گا۔

اس نے ڈیڑھ بجے تک دو پیگ پیے۔ تیسرا پیگ بنا کر اس نے بوتل بند کر دی۔ تیسرا پیگ اور بوتل ایسی جگہ رکھ دی کہ اس پر فرزانہ کی نظر فوری طور پر نہ پڑ سکے۔ تیسرا پیگ وہ اس وقت پینا چاہتا تھا جب فرزانہ اس کا ساتھ دینے پر آمادہ ہو جاتی۔

ڈیڑھ بج چکا تھا اس لیے اعجاز کو امید تھی کہ اب اسے جلد ہی فرزانہ کا ''یس'' کا میسج ملے گا۔

اس کی یہ توقع دو بجے پوری ہوئی۔ ''یس'' کا ایس ایم ایس ملتے ہی وہ دروازے کے قریب جا کھڑا ہوا۔ اس نے دروازہ تھوڑا سا کھول دیا تا کہ فرزانہ فوراً اندر آسکے۔ اس نے جو کچھ سوچا تھا، اس پر عمل اس کے لیے کوئی نئی بات نہیں ہوتی۔ وہ کالج کی کئی لڑکیوں کے ساتھ یہ کھیل، کھیل چکا تھا مگر نہ جانے کیوں اسے احساس تھا کہ فرزانہ اس کے لیے شاید ایک نیا تجربہ ثابت ہوتی۔ ''شاید'' کا لفظ اس کے ذہن میں اس لیے آیا تھا کہ فرزانہ اس کے کمرے میں آنے کے لیے بہت جلد آمادہ ہو گئی تھی۔

جلد ہی دروازہ کھول کر فرزانہ اس کے کمرے میں آ گئی۔ وہ دروازہ بولٹ کر کے اس کی طرف مڑا۔

''میں جلدی واپس جاؤں گی اعجاز!'' فرزانہ نے کسی قدر شرمیلے انداز میں کہا۔ ''تمہیں مجھ سے جو قسم لینا ہے، جلدی لے لو!''

''محبت کے عہد و پیماں جلدی نہیں ہوتے فرزانہ!'' اعجاز نے اس کے قریب جا کر اسے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا، پھر اپنا ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''صرف پیمانِ وفا باندھنے میں دیر نہیں لگتی لیکن اس کو نباہنے میں کچھ وقت لگ جاتا ہے۔''

فرزانہ نے کچھ ہچکچاتے ہوئے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ اعجاز نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور بولا۔ ''میں قسم کھاتا ہوں کہ تمہیں اب کبھی نہیں چھوڑوں گا۔''

''میں...... میں بھی قسم کھاتی ہوں۔'' فرزانہ کی آواز میں لرزش تھی اور اس نے اپنی نظریں جھکا لی تھیں۔

''کیا قسم کھاتی ہو؟'' اعجاز نے اس کے ہاتھ پر اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ کہو کہ اب تم صرف میرے لیے ہو!''

''ہاں۔'' فرزانہ کے تنفس کی رفتار کچھ بڑھ گئی تھی۔

''صرف ہاں نہیں۔'' اعجاز نے اس کا ہاتھ کھینچتے ہوئے اسے اپنے قریب کرنے کی کوشش کی۔

''ہاں۔'' فرزانہ کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ ''میں اب تمہارے لیے ہوں۔''

''یہ ہوئی نا بات؟'' اعجاز نے جھٹکے سے اسے اپنے بالکل قریب کرتے ہوئے اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔

''یہ...... یہ ...... کیا ...... کیا کر رہے ہو...... اعجاز!'' فرزانہ کچھ گھبرائی۔

''اب تم میرے لیے ہو نا!'' اعجاز اسے زیادہ طاقت سے بھینچتے ہوئے بولا۔ ''تو اب اسے ثابت بھی کرنا ہوگا۔ میں نے ابھی کہا تھا نا!...... پیمانِ وفا نبھانے میں کچھ وقت لگتا ہے۔ تم اپنے ہونٹوں کو میرے ہونٹوں میں جذب ہو جانے دو۔''

''یہ...... یہ...... تمہارے منہ سے...... بو......''

اعجاز نے اس کے ہونٹ بند کر دیے۔

فرزانہ بڑی شدت سے مچلی۔ اس نے اپنے ہونٹ آزاد کر لیے لیکن اعجاز کی گرفت سے نہیں نکل سکی۔

''نہیں اعجاز!'' وہ ہانپنے لگی۔ ''یہ مت کرو۔ یہ مت کرو۔ تم کو میری قسم!''

''پہلے اپنی قسم یاد کرو۔ تم نے کہا تھا کہ اب تم میرے لیے ہو۔''

''لیکن...... لیکن......'' فرزانہ اپنی بات مکمل نہیں کر سکی۔

اس وقت اعجاز نے ایک ایسی حرکت کی کہ فرزانہ نے ایک بار پھر شدت سے مچل کر اس کی گرفت سے نکلنا چاہا مگر نکل نہیں سکی۔

''یہ مت کرو اعجاز!'' وہ کسی حد تک چیخ پڑی۔ ''دیکھو میں بہت زور سے چیخ پڑوں گی۔''

اعجاز نے اسے اس انداز میں زور سے دھکا دیا کہ وہ بستر پر جا گری۔

''اب آواز نکالی تو میں تمہیں گولی مار دوں گا۔'' اعجاز نے کہتے ہوئے اپنے جیب سے پستول نکال لیا۔

فرزانہ بری طرح سہم گئی۔ اسی وقت اس کے موبائل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ چھوٹا سا موبائل اس کے بلاؤز میں تھا۔

''خبردار فرزانہ!'' اعجاز نے اس کی طرف جھپٹتے ہوئے کہا اور اس کے بلاؤز میں ہاتھ ڈال کر موبائل نکال لیا۔ فرزانہ نے اس وقت غیر ارادی طور پر مزاحمت کی تھی اس لیے موبائل پر اعجاز کی گرفت مضبوط نہیں رہ سکی۔ وہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر بستر پر ہی ایک طرف گر گیا۔

''دیکھو فرزانہ!'' اعجاز نے بائیں ہاتھ سے فرزانہ کا

بازو پکڑتے ہوئے کہا۔ ”اب تم نے میری بات نہیں مانی تو بہت برا ہوگا۔“

”یہ نہ کرو اعجاز!“ فرزانہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

لیکن اعجاز پر اب جنون طاری ہو چکا تھا۔ اس نے فرزانہ کا دوپٹا کھینچ کر ایک طرف پھینک دیا۔ فرزانہ اب اتنی سہمی ہوئی نظر آرہی تھی جیسے کوئی معصوم چڑیا کسی عقاب کے پنجے میں پھنس کر موت کے خوف سے خود کو ڈھیلا چھوڑ دیتی ہے۔

بستر پر پڑے ہوئے موبائل فون کی گھنٹی اب بھی بج رہی تھی لیکن اعجاز نے اس کی طرف دھیان ہی نہیں دیا۔ اس کی ساری توجہ فرزانہ کے سراپا پر مرکوز تھی۔

”تم بہت گداز ہو فرزانہ!“ اعجاز نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر چومتے ہوئے کہا۔ پھر جب اس نے فرزانہ کا ہاتھ چھوڑا تو وہ فرزانہ کی گود میں اس طرح گر گیا جیسے کوئی بے جان چیز ہو۔ فرزانہ بری طرح دہشت زدہ ہو چکی تھی کیونکہ اعجاز کے دائیں ہاتھ میں پستول اب بھی موجود تھا۔

اعجاز فاتحانہ انداز میں مسکرایا۔ اب اسے یقین ہو گیا تھا کہ فرزانہ بالکل مزاحمت نہیں کرے گی اور نہ چیخنا چاہے گی۔

”بس ایک پیگ اور پی لوں۔“ اعجاز نے بستر سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”پھر تم دیکھو گی کہ......“ اس نے ہنس کر اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

اس وقت موبائل کی گھنٹی بجنا بند ہوگئی۔

”شٹ!“ اعجاز نے حقارت سے موبائل کی طرف دیکھا اور آڑ میں رکھا ہوا شراب کا گلاس اٹھا لیا۔

فرزانہ سہمی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔

اعجاز نے آدھا گلاس ایک ہی سانس میں خالی کر دیا اور گلاس ہاتھ میں لیے لیے بستر کی طرف بڑھتے ہوئے بڑے پیار بھرے انداز میں بولا۔ ”ابھی تو تم خوف زدہ ہو لیکن ذرا دیر بعد جب ہم ایک ہو جائیں گے تو تم شور مچانے کا خیال بھی دل میں نہیں لاؤ گی۔“

اسی وقت باہر سے پکارتی ہوئی آواز آئی۔ ”تم کہاں ہو فرزانہ؟“

وہ آواز شاہانہ کی تھی۔

اعجاز نے بڑی پھرتی سے فرزانہ کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا لیکن اگر وہ ایسا نہ کرتا تو بھی فرزانہ خاموش ہی رہتی۔ وہ کسی مجسمے کی طرح ساکت رہ گئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی شدید صدمے نے اس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت اور اس کی قوتِ گویائی ختم کر دی ہو۔ بس اس کی سانسیں بہت تیزی سے چلنے

ویٹریات

☆ویٹر، آج دال بہت اچھی پکی ہے اس میں کیا ڈالا ہے۔

O کل کی بچی ہوئی دال سر۔

☆ویٹر، تمہارے ہاں چٹنی کس چیز کی بنتی ہے۔

O گاہک کی سر۔

☆ویٹر، آج سالن میں بدبو محسوس ہو رہی ہے۔

O بدبو؟ ہرگز نہیں سر، آج تو باورچی نے گوشت صابن سے دھو کر پکایا ہے۔

☆ویٹر! کیا میں تمہاری شکایت مالک سے کر سکتا ہوں؟

O ہرگز نہیں سر! البتہ مالک کی شکایت آپ مجھ سے کر سکتے ہیں۔“

☆ویٹر کیا تم کو پتا ہے کہ تمہارے ہاں کا کھانا کھا کر میں کیا سوچتا ہوں۔

O بالکل سر! یہی کہ بیوی کے ہاتھ کی پکی ہوئی چیزوں کی قدر کرنی چاہیے۔

وقت

”اگر میں وقت ہوتا تو لوگ میری کتنی قدر کرتے۔“

”جی نہیں! لوگ تمہیں دیکھ کر ڈر جاتے۔“

”وہ کیوں؟“

”کیونکہ لوگ کہتے کہ وہ دیکھو، برا وقت آرہا ہے۔“

ماہا ایمان، حافظ آباد

لگی تھیں۔

”فرزانہ!“ اس مرتبہ شاہانہ کی پکارتی ہوئی آواز کچھ دور سے آتی محسوس ہوئی تھی۔

اس موقعے پر بھی فرزانہ نے کچھ بولنے یا چیخنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

”گڈ!“ اعجاز نے اس کے ہونٹوں سے اپنا ہاتھ ہٹاتے

ہوئے کہا۔ ”اب مجھے یقین ہے کہ تم خاموش ہی رہوگی۔ تمہاری بہن تمہیں ساری کوٹھی میں ڈھونڈتی پھرے گی اور ہم......“ اس نے دھیرے سے ہنس کر گلاس اپنے ہونٹوں سے لگالیا۔ باقی شراب بھی اس نے ایک ہی سانس میں ختم کی اور ہاتھ نیچے کرکے گلاس قالین پر لڑھکا دیا۔

اس کے بعد جس عمل کا آغاز ہوا، اس کے اختتام پر فرزانہ بے ستر ہوچکی ہوتی۔ اس وقت بھی فرزانہ کی حالت اس سہمی ہوئی چڑیا کی سی رہی جسے اپنی موت کا یقین آچکا ہو۔ اس کی حالت میں صرف اتنا فرق آیا کہ اس کا سارا جسم کانپنے لگا تھا۔

☆☆☆

شاہانہ کی آنکھ کھل جانا ایک اتفاقی امر تھا۔ وہ کروٹ بدل کر پھر سوجاتی لیکن بستر پر فرزانہ کی عدم موجودگی کا احساس ہوتے ہی وہ جلدی سے اٹھ بیٹھی تھی۔

کہاں چلی گئی۔ اس نے سوچتے ہوئے باتھ روم کی طرف دیکھا تھا۔ پھر اٹھ کر باتھ روم کی طرف گئی تھی۔

”فرزانہ!“ اس نے پکارا تھا۔

پھر جواب نہ ملنے پر اس نے دروازہ کھولا۔ دروازہ کھلنے کا مطلب ہی یہ تھا کہ فرزانہ وہاں نہیں تھی۔

کہاں چلی گئی؟ کہاں چلی گئی؟

دماغ میں گونجتے ہوئے اس سوال کے ساتھ ہی شاہانہ نے اپنا موبائل اٹھا کے اس پر فرزانہ کا موبائل نمبر ملایا تھا۔

رابطہ ہوجانے کے بعد دوسری طرف گھنٹی بجتی رہی تھی لیکن کال ریسیو نہیں کی گئی تھی۔

پھر جب رابطہ منقطع ہوگیا تو شاہانہ ننگے پیر دوڑتے ہوئے باہر نکلی۔ اس کے دماغ میں اچانک ہی خیال آیا تھا کہ فرزانہ نے وہاں رکنے کی خواہش ہی اس لیے کی تھی کہ اعجاز سے مل سکے۔

وہ دوڑتے ہوئے اعجاز کے کمرے کے قریب پہنچ گئی تھی۔

”تم کہاں ہو فرزانہ!“ اس کی یہی آواز اعجاز اور فرزانہ نے بھی سنی تھی۔

جواب نہیں ملا تو شاہانہ پر دیوانگی سی طاری ہوگئی۔ وہ فیروز اور زہرہ کے کمرے کی طرف بڑھتی ہوئی چیخی۔ ”فرزانہ!“

یہ آواز بھی فرزانہ اور اعجاز نے سنی تھی۔

شاہانہ کی دیوانگی کا اس وقت یہ عالم تھا کہ وہ فیروز اور زہرہ کے کمرے کا دروازہ بری طرح پیٹ ڈالتی لیکن زہرہ اور فیروز خود ہی ہڑبڑائے ہوئے انداز میں باہر آگئے تھے۔

”کیا ہوا شاہانہ؟“ زہرہ نے تیزی سے پوچھا۔

”فرزانہ غائب ہے۔“ شاہانہ ہانپتے ہوئے بولی۔

زہرہ نے چونکے ہوئے انداز میں فیروز کی طرف دیکھا اور بولی۔ ”میں نے آپ سے کہا تھا نا......! میں پہلے ہی شبہے میں پڑگئی تھی اس کے یہاں رکنے کی وجہ سے!“ پھر اس نے شاہانہ سے کہا۔ ”تم سے کچھ کہتے ہوئے مجھے اچھا نہیں لگا لیکن اب میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ وہ اعجاز کے کمرے میں ہوگی۔“

”میں وہاں آواز دے کر آئی ہوں۔“ کسی اندیشے سے شاہانہ کا چہرہ فق پڑگیا۔

”وہ جواب تو نہیں دے گی تمہیں۔“ زہرہ نے کہا۔

”میرے ساتھ آؤ!“ فیروز کہتے ہوئے دوڑا۔ اس کا رخ اعجاز کے کمرے کی طرف تھا۔

یہ شور غل اور بھاگ دوڑ کی آواز سن کر کسی طرف سے دو ملازم بھی نکل آئے۔

یہ سب آوازیں اعجاز اور فرزانہ کے کانوں تک بھی پہنچیں۔ یہ وہ وقت تھا جب فرزانہ تقریباً بے ستر ہوچکی تھی۔

”اعجاز!“ باہر سے فیروز کی چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔

اعجاز نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر فرزانہ کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

”فرزانہ!“ یہ آواز شاہانہ کی تھی۔

”چیخنے دو ان لوگوں کو!“ اعجاز نے فرزانہ کو اپنی آغوش میں سمیٹتے ہوئے بہت دھیمی آواز میں کہا۔ ”دو تین آوازیں لگا کے سب چلے جائیں گے۔ میں کبھی کبھی رات کو گھر سے غائب رہتا ہوں۔ سب سمجھ لیں گے کہ میں گھر میں نہیں ہوں اور اپنا کمرا لاک کرگیا ہوں۔“

اس وقت باہر کھڑی ہوئی شاہانہ کو ایک تدبیر سوجھی۔ جب وہ اپنے کمرے سے نکلی تھی، اس وقت سے اب تک موبائل اس کے ہاتھ میں ہی رہا تھا۔ اس نے جلدی سے فرزانہ کا نمبر ملایا۔

لائن ملتے ہی کمرے میں بستر پر پڑے ہوئے موبائل فون کی گھنٹی بجنے لگی اور شاہانہ چیخ پڑی۔ ”تم یہیں ہو فرزانہ! مجھے تمہارے موبائل کی گھنٹی سنائی دے رہی ہے۔“

”اعجاز!“ فیروز بڑے غصے سے چیخ پڑا۔

اس وقت اعجاز کو خیال آیا کہ بستر پر پڑے ہوئے موبائل نے اس کی اور فرزانہ کی خاموشی کا راز افشا کردیا تھا۔ اس نے بڑے غصے سے موبائل اٹھایا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے

موبائل کو کسی دیوار سے دے مارے گا لیکن پھر نہ جانے کیوں وہ رک گیا اور اس نے موبائل کا سوئچ آف کرنے پر اکتفا کیا۔
"اعجاز!" فیروز کی غصیلی آواز آئی۔ "اگر تم نہیں کھولو گے تو مجھے دروازہ توڑنا پڑے گا۔"
"کچھ نہیں ہوگا۔" اعجاز نے بہت دھیمی آواز میں کہتے ہوئے دانت پیسے۔ اس کا جنون پہلے سے زیادہ بڑھ چکا تھا۔ اس نے فرزانہ کو ایک بار پھر اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔ وہ اپنی سی کر گزرنے کا تہیہ کر چکا تھا۔
"دھکے مار کر توڑ دو دروازہ۔" فیروز نے ملازموں سے کہا۔
اس شور غل نے کچھ اور ملازموں کے علاوہ لالہ عیسیٰ، خالہ ذکیہ اور فریال کو بھی جگا دیا تھا۔
کئی ملازموں کے بار بار کے دھکوں سے دروازہ شاید نہ ٹوٹتا لیکن اس کے بولٹ اور اس کی چولیں اپنی جگہ چھوڑ سکتی تھیں۔ اس بات کا احساس جب اعجاز کو ہوا تو وہ غصے سے چیخ پڑا۔ "کسی نے بھی اندر آنے کی کوشش کی تو میں گولیاں برسا دوں گا۔"
"اعجاز!" لالہ عیسیٰ بڑے غصے سے چیخے۔
خالہ ذکیہ اور فریال عیسیٰ کے چہروں پر سفیدی سی چھانے لگی تھی۔ ان تینوں کو زہرہ ہی نے بتایا تھا کہ بات کیا تھی۔
شراب کے نشے نے اعجاز کا جنون اور بڑھا دیا تھا۔ فرزانہ کے منہ سے اس وقت بھی کوئی آواز نہیں نکلی تھی لیکن آنکھوں سے آنسو رواں ہوگئے تھے۔ اعجاز کی کیفیت یہ تھی کہ وہ ہر صورت میں فرزانہ کو روند ڈالنا چاہتا تھا لیکن اس کی یہ خواہش پوری ہونے سے پہلے ہی دروازہ اکھڑ کر زوردار آواز کے ساتھ فرش پر گرا۔
"لعنت ہو سب پر!" اعجاز پاگلوں کی طرح چیخا اور پستول کا رخ دروازے کے خلا کی طرف کرتے ہوئے ٹریگر دباتا ہی چلا گیا۔
پستول میں چھ گولیاں تھیں......! ان میں سے ایک فریال عیسیٰ کے سینے میں پیوست ہوئی اور وہ کراہ کے ساتھ گرنے لگی۔ ایک گولی نے خالہ ذکیہ کا شانہ زخمی کیا۔ تیسری گولی نے زہرہ کی پیشانی رنگین کر دی تھی اور وہ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح گری تھی۔ چوتھی گولی فیروز کی دائیں گھٹنے پر لگی۔ کراہ کے ساتھ وہ بھی ڈگمگا گیا۔ باقی دو گولیاں ادھر ادھر نکل گئی تھیں۔
"پکڑ لو اس مردود کو!" ملازموں نے لالہ عیسیٰ کا حکم سنا۔
ملازمین جھپٹے!

عقل مند

ایسا انسان جو غلطی پر ہو اور معافی مانگ لے۔ اسے عقل مند کہتے ہیں اور ایسا انسان جو غلطی پر نہ ہو اور معافی مانگ لے۔ اسے شوہر کہتے ہیں۔

مرسلہ: تفسیر عباس بابر، اوکاڑہ

خالہ ذکیہ نے زخمی ہونے کے باوجود فریال عیسیٰ کو سنبھالنے کی کوشش کی اور چیخیں۔ "کوئی اسپتال تو فون کرے!" انہوں نے زہرہ کو گرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔
اعجاز ملازموں کی گرفت میں آ گیا۔
شاہانہ نے تیزی سے آگے بڑھ کر بستر کی چادر فرزانہ پر الٹ دی۔ فرزانہ نے اب پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا تھا۔

☆☆☆

جو کچھ ہوا، وہ رات کے ڈھائی بجے کے قریب ہوا تھا اس لیے دوسرے دن کے اخبارات میں اس کی کوئی خبر نہیں آسکی لیکن تمام ٹی وی چینلز نے یہ خبر ہر طرف پھیلا دی۔
ناشتا کرتے ہوئے عزیر نے وہ خبر سنی اور اس کے ہاتھ سے چائے کی پیالی گر گئی۔
خبر کے مطابق فریال عیسیٰ اسپتال پہنچنے سے پہلے ہی دنیا سے رخصت ہو چکی تھیں۔ اس سے پہلے زہرہ نے گولی لگتے ہی دم توڑ دیا تھا۔ خالہ ذکیہ اتنی معمولی زخمی ہوئی تھیں کہ ان کی بس مرہم پٹی کر دی گئی تھی۔ فیروز کی ٹانگ کا آپریشن کیا گیا تھا کیونکہ گولی نے اس کے گھٹنے کی ہڈی توڑ دی تھی۔ لالہ عیسیٰ نے خود پولیس کو فون کر کے بلایا تھا اور اعجاز کی گرفتاری عمل میں آئی تھی۔
ٹی وی چینلز اس وقت تک اس بات سے بے خبر تھے کہ جو کچھ ہوا تھا، اس کے پس منظر میں کیا بات تھی؟
عزیر نے موبائل پر شاہانہ سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی تھی لیکن کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ دوسری طرف گھنٹی بجتی رہی تھی لیکن ریسیور نہیں اٹھایا گیا تھا۔
عزیر کے ساتھ اس کی والدہ بھی پریشان تھیں۔
دوپہر کے قریب شاہانہ سے عزیر کا رابطہ ہو سکا۔ لیکن اس رابطے کے باعث جو کچھ معلوم ہوا، وہ بھی کچھ کم پریشان کن نہیں تھا۔
شام سے پہلے پہلے ٹی وی چینلز نے اس اندوہناک واقعے کے پس منظر سے بھی نقاب اٹھا دیا۔ خود اعجاز نے ہی نشے میں پولیس کو سب کچھ بتا دیا تھا۔ یہ خبر نشر ہونے سے

فرزانہ کی شخصیت پوری طرح سامنے آ گئی۔ سلطانہ بیگم اور آذر صاحب کے لیے یہ بہت بڑا صدمہ تھا۔ جو رسوائی ہوئی تھی، اسے سلطانہ بیگم تو نہ جانے کیسے جھیل گئیں لیکن آذر صاحب پر دل کا دورہ پڑا اور انہیں فوری طور پر اسپتال پہنچا دیا گیا۔

''سب برباد کر دیا تو نے۔'' شاہانہ نے دونوں ہاتھوں سے فرزانہ کے بال کھینچتے ہوئے چیخ کر کہا تھا۔

جواب میں فرزانہ نے روتے ہوئے اور قسمیں کھاتے ہوئے بتایا تھا کہ وہ دھوکا کھا گئی تھی اور اعجاز نے اسے پستول دکھا کر اتنا دہشت زدہ کر دیا تھا کہ اس کے منہ سے ذرا بھی آواز نہیں نکل سکی تھی۔

اس واقعے کے بعد کے دنوں میں جو کچھ ہوتا رہا، اس کے بارے میں عزیر کو موبائل فون پر شاہانہ سے مختصر طور پر معلوم ہوتا رہا۔ شاہانہ کے والد دل کا دورہ پڑنے کے باعث موت کے قریب تو پہنچ گئے تھے مگر ابھی ان کی زندگی باقی تھی۔

فیروز جب اسپتال سے گھر لوٹا تو وہیل چیئر پر تھا۔ اس کی ایک ٹانگ ہمیشہ کے لیے ناکارہ ہو چکی تھی۔

''فیروز ولا'' پر ایک ہولناک سکوت طاری تھا۔ وہاں سے دو لاشیں اٹھ چکی تھیں اور اس گھر کا ایک نوجوان پولیس کی تحویل میں تھا۔

اس رات وہیل چیئر پر بیٹھے ہوئے فیروز نے شراب پیتے ہوئے ایک گہری سانس لے کر شاہانہ سے کہا۔ ''تم کیا محسوس کر رہی ہو شاہانہ؟ مجھے تو یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے کسی قبرستان میں ہوں۔''

''جی۔'' شاہانہ نے نظریں جھکا کر بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''اور یہ سب کچھ میری بہن کی وجہ سے ہوا ہے۔''

''وجہ۔'' فیروز نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''یہ سب بے کار کی باتیں ہیں۔ کہنے کو تو یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اگر میری مرحومہ ماں نے تم سے میری شادی نہ کرائی ہوتی تو یہ سب کچھ نہ ہوتا۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اگر زہرہ ماں بن جاتی تو تم سے میری شادی کی نوبت ہی نہ آتی۔ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ کہا جا سکتا ہے شاہانہ! بہت کچھ!...... مگر وہ سب کچھ کہنے سننے سے حاصل کیا؟...... سامنے کی بات تو صرف یہ ہے کہ میرا گھر ختم ہو گیا۔ ماں بھی چلی گئی اور میری زندگی کی ساتھی بھی۔''

زہرہ کو یاد کر کے فیروز کی آنکھوں میں نمی چمکنے لگی اور شاہانہ کی آنکھوں سے آنسو ڈھلک گئے۔

فیروز نے شراب کا ایک بڑا گھونٹ لے کر اپنے امڈتے ہوئے جذبات پر قابو پایا اور بولا۔ ''میری ایک ٹانگ بھی جاتی رہی۔ اگر زہرہ زندہ ہوتی تو شاید وہ مجھے ایک ٹانگ کی کمی کا احساس نہ ہونے دیتی، یا اس احساس سے دور رکھنے کے لیے ہر ممکن کوشش کر ڈالتی لیکن میرا تو مقدر ہی یہ تھا کہ میں بے سہارا ہو جاؤں اور اس گھر کے سناٹے میں وہیل چیئر پر بیٹھا پاگلوں کی طرح دیواریں تکتا رہوں...... کیسا پاگل کر دینے والا سناٹا ہے یہ شاہانہ......! اور کل اس سناٹے میں مزید اضافہ ہو جائے گا۔''

شاہانہ چونکی۔ ''کیسے؟''

''میں نے جو عہد کیا تھا، وہ تو پورا کروں گا۔ کل تم شادی کے اس بندھن سے آزاد ہو جاؤ گی جس نے تمہیں میرا قیدی بنا دیا ہے۔ میں فون پر وکیل سے کہہ چکا ہوں کہ وہ طلاق نامہ تیار کر کے لے آئے۔ کل تم بھی یہاں سے چلی جانا۔ میں نے ابھی کہا تھا نا...... میرا مقدر ہی یہ ہے کہ میں تنہا رہ جاؤں۔''

شاہانہ کی نظریں جھک گئیں۔ اس کی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسوؤں کی لکیریں صاف نظر آ رہی تھیں۔

اسی رات کو نہ جانے کون سا پہر تھا کہ فیروز نے غنودگی میں یوں محسوس کیا جیسے زہرہ نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھا ہو۔

''خوابوں میں آ کر بھی تڑپاتی رہو گی زہرہ!'' وہ بڑے کرب میں بڑبڑایا۔

''زہرہ نہیں، یہ میں ہوں۔''

جواب نے فیروز کو چونکا دیا۔ اس کی کھلی ہوئی آنکھوں نے دیکھا کہ شاہانہ اس کے پہلو میں لیٹی ہوئی تھی۔ فیروز کے سینے پر اسی کا ہاتھ تھا۔

''میں ہوں نا آپ کا سہارا۔'' وہ فیروز کی طرف دیکھتے ہوئے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

اور اگلے دن عزیر جب کمپیوٹر پر بیٹھا اپنی ڈاک دیکھ رہا تھا تو اسے شاہانہ کا پیغام بھی نظر آیا۔

''عزیر! کاش تم مجھے معاف کر سکو!...... یہ تم سے میرا آخری رابطہ ہے۔ ہاں عزیر! میں فیروز کو اپنا چکی ہوں۔ وہ بہت اچھے انسان ہیں۔ انہوں نے اپنی ماں کھو دی، اپنی محبوب بیوی کو کھو دیا، اپنی ایک ٹانگ کھو دی اور یہ سب کچھ میری بہن کی وجہ سے ہوا ہے۔ میں نے اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر سوچا ہے عزیر! میری بہن کی عزت بچی ہے تو فیروز کی وجہ سے!...... ان کا مجھ پر بہت بڑا احسان ہے۔ اس کا جواب کیا میں اس طرح نہ دوں کہ ان کی زندگی کی ویرانی کم کرنے کی کوشش کروں؟''

عزیر پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اس پیغام کو دیکھتا رہ گیا۔

عجیب بحران

ایچ اقبال

ایک شریرلڑکی کا قصہ! وہ شادی سے پہلے ھی اپنے سُسر کو شرارت کا نشانہ بنا بیٹھی ! بعد میں ایک غیر متوقع صورتِ حال نے اسے اور اس کے محبوب کو ایک عجیب بحران میں مبتلا کردیا۔ اس کی بیوہ لیکن خوب صورت ماں اور اس کے محبوب ریحان کے والد کا معاشقہ سامنے آگیا۔ ریحان کی ماں امریکا میں تھیں ریحان اور کنول کا مستقبل ڈاؤ ںپر لگ گیا۔

معاشرتی رشتوں ناتوں کی کشاکش سے جنم لینے والی شوخ کہانی

مسرور کمال اور فریحہ کمال کو ان کے شناسا حلقے میں ”اسمارٹ کپل“ کہا جاتا تھا۔ ان دونوں کی شادی بہت کم عمری میں ہوئی تھی اور محبت کا نتیجہ تھی۔ ان کی عمریں بالترتیب پینتالیس اور اکتالیس سال تھیں لیکن اب بھی اپنی اپنی جگہ ان دونوں ہی میں صنفِ مخالف کے لیے خاصی کشش تھی۔ ان کی شادی تعلیم کے دوران میں ہی ہوگئی تھی اور جب مسرور کمال کے والد نے اپنے بیٹے کو مزید تعلیم کے لیے امریکا بھیجا تھا تو فریحہ کمال بھی ان کے ساتھ گئی تھیں۔ انہوں نے بھی وہیں تعلیم حاصل کی تھی۔ وہیں وہ کم عمری ہی میں ایک بیٹی اور ایک بیٹے کے ماں باپ بن گئے تھے۔ شادی کے ایک ہی سال بعد ایک بیٹی اور پھر ایک سال بعد بیٹے کا ہونا ان کی تعلیم کے حصول میں رکاوٹ بن سکتا تھا لیکن فریحہ کی بڑی بہن ساحرہ شادی کے بعد امریکا ہی میں جابسی تھیں۔ انہوں نے اپنی چھوٹی بہن کی دونوں اولادوں کو اپنی نگرانی میں لے لیا تھا۔

فریحہ کمال نے اپنے شوہر کی خواہش پر ٹیکسٹائل ڈیزائننگ بھی امریکا ہی میں سیکھی تھی۔ مسرور کمال کی یہ خواہش اس لیے تھی کہ مستقبل میں انہیں ایک بہت بڑی ٹیکسٹائل مل کا مالک بننا تھا۔ وہ ٹیکسٹائل مل انہیں اپنے والد سے وراثت میں ملنا تھی۔

مسرور کمال جب دس سال کے تھے تو ان کی والدہ کا انتقال ہوگیا تھا پھر آٹھ سال بعد وہ اپنی بیوی بچوں کے ساتھ وطن لوٹے تو ان کے والد علیل رہنے لگے اور دو سال بعد ان کا انتقال ہوگیا۔ مسرور کمال نے اکتیس سال کی عمر میں ٹیکسٹائل مل کی تمام ذمے داریاں سنبھال لی تھیں اور فریحہ کمال ایک بہت اچھی ٹیکسٹائل ڈیزائنر کی حیثیت سے ان کی دستِ راست بن گئی تھیں۔

ان دونوں کے بیٹے کا نام ریحان اور بیٹی کا نام تمثیلہ تھا۔ تمثیلہ کی شادی اس وقت کردی گئی جب وہ بیس سال کی تھی۔

فریحہ کی بڑی بہن ساحرہ ان دنوں کچھ بیمار تھیں اس لیے شدید خواہش کے باوجود بھانجی کی شادی میں شرکت کے لیے نہیں آسکی تھیں اسی لیے فریحہ کمال نے بیٹی کی شادی کے بعد اپنی علیل بہن کو دیکھنے کے لیے امریکا جانے کا پروگرام بنایا۔

مسرور کمال ان دنوں ایک اور ٹیکسٹائل مل قائم کرنے کے سلسلے میں خاصے مصروف تھے اس لیے فریحہ کمال کو اکیلے ہی امریکا جانا تھا۔

روانگی سے چند گھنٹے پہلے جب کھانے کی میز پر ان کا نوجوان بیٹا ریحان بھی موجود تھا، مسرور کمال نے فریحہ سے کہا۔ ”تم نے بھی امریکا روانگی کا پروگرام ایسے وقت پر بنایا ہے جب میں تمہارے ساتھ نہیں جاسکتا۔“

”میں تم سے کوئی شکایت تو نہیں کررہی ہوں مسرور!“ فریحہ کمال بولیں ”اب اسے کیا کہا جائے کہ باجی کی طبیعت انہی دنوں میں خراب ہوئی ہے۔“

”کل میں نے فون پر ساحرہ باجی سے بات کی تھی۔ خدانخواستہ وہ کسی تشویش ناک بیماری کا شکار نہیں ہوئی ہیں، بس اتنی سی بات ہے کہ کسی وجہ سے ڈاکٹروں نے انہیں کوئی لمبا سفر کرنے کی اجازت نہیں دی تھی ورنہ وہ تمثیلہ کی شادی میں ضرور آتیں۔“

فریحہ کمال ہنس دیں ”میں جانتی ہوں مسرور! خدا نہ کرے کہ باجی کسی خطرناک بیماری کا شکار ہوں۔ میرا بس دل چاہ رہا ہے کہ ان سے ملنے جاؤں۔“

”ارے تو یہ پروگرام کچھ دن بعد بنالیتیں۔ میں بھی چلا چلتا۔“

”جب تمہیں فرصت ہوگی تو پھر چلے جائیں گے۔ اب کوئی گھریلو فکر تو رہی نہیں ہے۔ تمثیلہ کی شادی ہوچکی ہے۔

جب وہ گھر میں تھی تو میں نے زیادہ دن کے لیے کہیں جانے کا کوئی پروگرام نہیں بنایا تھا' ایسے کسی پروگرام کے بارے میں سوچا تک نہیں تھا۔"

"تمہیں یہ ڈر نہیں لگ رہا ہے کہ میں یہاں ایک ہفتے کے لیے بالکل آزاد ہو جاؤں گا؟"

"اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے؟" فریحہ کمال نے تعجب سے کہا۔

"ارے جناب!.... آپ جانتی ہیں کہ آپ کے شوہر اب بھی جوان بچوں کے باپ نہیں لگتے' اور خیر سے حسن پرست بھی واقع ہوئے ہیں۔"

ریحان خاموشی سے ناشتا کر رہا تھا۔ اس وقت اس نے اپنا سر تھوڑا سا جھکا لیا تاکہ اس کے ہونٹوں پر آجانے والی مسکراہٹ اس کے والدین کی نظر میں نہ آسکے۔

مسرور کمال کا مزاج کچھ ایسا ہی تھا۔ وہ ریحان سے بھی عشق و محبت کے موضوع پر بے جھجک گفتگو کیا کرتے تھے۔ انہیں تو یہ خواہش بھی تھی کہ ان کے بیٹے کی کوئی گرل فرینڈ ہو لیکن ریحان نے ان سے ابھی تک یہ بات پوشیدہ ہی رکھی تھی کہ وہ ایک لڑکی کنول سے محبت کرتا تھا بلکہ وہ دونوں ہی ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے اور ان میں عہد و پیماں بھی ہو چکے تھے۔



مسرور کمال کی بات کے جواب میں فریحہ کمال نے مسکراتے ہوئے کہا "میں تمہیں خوب اچھی طرح جانتی ہوں مسرور.....! خوب صورت عورتوں کو تم اب بھی کن انکھیوں سے ضرور دیکھتے ہو لیکن میں اس میں کوئی حرج نہیں سمجھتی اور یہ بھی سمجھتی ہوں کہ بات اس سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔"

"اس کا مطلب ہے تم مرد کی فطرت سے واقف ہی نہیں ہو۔" مسرور کمال نے منہ بنا کر کہا "ارے کوئی بھی مرد کسی وقت بھی پھسل سکتا ہے۔"

"کم از کم تم نہیں پھسل سکتے۔" فریحہ کمال مسکرائیں۔

"عجیب بے ہودہ سی خوش گمانی ہے تمہیں!" مسرور کمال نے بدستور منہ بنائے رکھا۔

"خوش گمانی نہیں' اعتماد ہے اپنے اوپر۔"

"چوٹ کھاؤ گی کسی دن۔"

مسرور کمال کا لہجہ ایسا تھا کہ ریحان کو اپنی ہنسی روکنے میں خاصی دقت ہوئی لیکن مسرور کمال نے کچھ محسوس کرلیا اور اسے گھورتے ہوئے بولے "تم چپکے چپکے کیوں ہنس رہے ہو' پھسڈی قسم کے!"

"پھسڈی کیوں کہہ رہے ہو تم اسے!" فریحہ کمال بولیں "اب تک ہر امتحان میں اول آتا رہا ہے میرا بیٹا!..... اب دیکھنا بی اے میں بھی فرسٹ کلاس فرسٹ آئے گا۔"

"صرف تعلیم میں آگے آگے رہنا کوئی خاص بات نہیں! آخر زندگی کے اور شعبوں میں بھی ترنگ لانا ضروری ہوتا ہے جبکہ ہمارے صاحب زادے نے اب تک کوئی لڑکی نہیں تاکی!"

ریحان کے لیے ہنسی روکنا مشکل ہوگیا لیکن وہ یہ بھی نہیں کرسکتا تھا کہ اچانک اٹھ کر ڈرائنگ روم سے بھاگ نکلتا۔

فریحہ کمال ہنس پڑیں "کیا بے ہودہ باتیں سکھانا چاہتے ہو اپنے بیٹے کو؟"

"یہ بے ہودگی ہے؟" مسرور کمال نے آنکھیں نکالیں "ارے تم صرف سولہ سال کی اور میں بیس سال کا تھا جب ہم نے عشق کی ناؤ کھینا شروع کی تھی اور صرف ایک سال بعد ہماری شادی بھی ہوگئی تھی پھر ایک سال بعد ہی تمثیلہ اور دوسرے سال میں یہ حضرت۔" انہوں نے ریحان کی طرف اشارہ کرکے کہا "تشریف لے آئے تھے دنیا میں۔"

"اگر تم اس طرح موازنہ کروگے تو میں کہوں گی کہ سکندر نے تو اس عمر میں ساری دنیا فتح کرلی تھی۔" فریحہ کمال کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

"یہ تو کوئی موازنہ نہیں ہوا۔" مسرور کمال بحث پر اتر آئے "ہمارا پیشہ' آبا' سپہ گری نہیں تھا۔ ہم تو میدانِ عشق کے سپاہی ہیں اور ہم نے بیس سال کی عمر میں یہ میدان تاکا تھا اور اکیس سال کی عمر میں اسے سر بھی کرلیا تھا۔"

فریحہ کمال ہنسیں "بس ایک ہی میدان سر کیا تھا نا؟"

وہ ریحان کی طرف اشارہ کرکے بولے "صاحب زادے نے تو ابھی آدھا میدان بھی سر نہیں کیا! یعنی کوئی لڑکی تاکی بھی نہیں لیکن تم جو ہمیں چھوڑ کر امریکا جارہی ہونا' یہ خاصی مخدوش بات ہے۔ کوئی میدان نظر آگیا نا ہمیں .... تو پھاند پڑیں گے اس میں۔"

"تمہاری ان باتوں کی وجہ سے میں امریکا جانے کا پروگرام کینسل نہیں کرسکتی۔" فریحہ کمال نے مسکراتے ہوئے کہا "میں تمہیں خوب جانتی ہوں مسرور! تئیس سال گزارے ہیں تمہارے ساتھ! تم خوب صورت عورتوں کو بس کن انکھیوں سے دیکھ سکتے ہو' براہِ راست دیکھنے کی ہمت نہیں ہے تم میں لہٰذا اس سے آگے کی کسی بات کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا!"

مسرور کمال نے ٹھنڈی سانس لی "یہ خوش گمانی تمہیں کسی دن نقصان پہنچائے گی۔"

فریحہ کمال پھر ہنس دیں۔ "تم صرف یہ چاہتے ہو کہ میں اتنے دن کے لیے تم سے دور نہ جاؤں۔"

"خیر!" مسرور کمال بظاہر سنجیدہ نظر آئے "ریحان بیٹا!"

"جی ڈیڈی!" ریحان نے کوشش کی کہ باپ کی طرف نظر اٹھاتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کا شائبہ تک نہ ہو۔

"ہمارے لیے کچھ کرنا۔" مسرور کمال نے سنجیدگی سے کہا "تم اپنے لیے کچھ نہیں کرسکتے تو نہ کرو لیکن ہمارے لیے کوئی خوب صورت خاتون تلاش کرو....! محبت کے بغیر پندرہ بیس دن گزارنا ہمارے لیے مشکل ہے۔ اس پریشانی کے وقت میں ہمارا ساتھ دو بیٹا۔"

اس موقع پر ریحان کے لیے ہنسی روکنا مشکل ہوگیا اور وہ کرسی سے اٹھ کر دروازے کی طرف بھاگا۔



بستر پر لیٹی ہوئی کنول نے سرہانے رکھا ہوا موبائل فون اٹھایا جس کی گھنٹی بج رہی تھی۔ اس نے کال کرنے والے کا نمبر دیکھا اور پھر موبائل فون کان سے لگالیا "ہاں ریحان! میں انتظار ہی کررہی تھی تمہاری کال کا!"

"میں اور ڈیڈی ابھی آئے ہیں ائرپورٹ سے! ممی چلی گئیں امریکا۔"

"میری سمجھ میں یہ بات ابھی تک نہیں آئی ریحان.... تمہیں آخر اتنی بے چینی کیوں تھی کہ تمہاری ممی امریکا چلی جائیں۔"

"ممی سے مجھے تھوڑا سا ڈر لگتا ہے۔ ان کے سامنے میں وہ قدم نہیں اٹھا سکتا جو اٹھانا چاہتا ہوں۔"

"تم نے مجھے بتایا ہی نہیں ہے کہ تم کیا قدم اٹھانا چاہتے ہو!"

"کل میں تمہیں اپنے ڈیڈی سے ملاؤں گا۔"

"کیا!.... کیا.... کیا....!" کنول بوکھلا سی گئی "دماغ تو ٹھیک ہے تمہارا؟"

"میرا دماغ بالکل ٹھیک ہے۔" ریحان نے کہا "میں تمہیں یہ تو بتا چکا ہوں کہ میرے ڈیڈی کس قسم کی باتیں کیا کرتے ہیں! اب میں انہیں دکھانا چاہتا ہوں کہ میں پھسڈی نہیں ہوں۔"

"نا بابا نا!.... یہ تم انہیں کسی اور طرح بتاؤ! میں تو اس طرح ان کا سامنا نہیں کر سکتی۔"

"ارے وہ بہت خوش ہوں گے تم سے مل کر!"

"کیوں پاگل ہوئے جارہے ہو؟ مجھ سے یہ نہیں ہوگا۔"

"ہوگا۔" ریحان نے زور دے کر کہا "کل شام کی چائے تم ہمارے ساتھ پیو گی! یہ بتاؤ.... کل ساڑھے چار بجے میں تمہیں کہاں سے "پک" کروں؟"

"پلیز ریحان!.... میں اس طرح ان کا سامنا نہیں کر سکوں گی۔"

"کرلو گی تم.... میں جو ہوں گا تمہارے ساتھ!.... مجھے بس یہ بتاؤ کہ میں تمہیں کہاں سے پک کروں؟"

"تم سمجھنے کی کوشش کرو ریحان! میں ایک لڑکی...."

"اچھا' بات ختم!" ریحان نے فیصلہ کن انداز میں کہا "کل ساڑھے چار بجے تم میکڈونلڈ کے سامنے مل جانا۔ اپنی کار قریب میں کہیں پارک کر دینا۔ میں بعد میں تمہیں وہیں چھوڑ دوں گا۔ اوکے؟"

"ہیلو۔" کنول زور سے بولی لیکن دوسری طرف سے رابطہ منقطع کیا جا چکا تھا۔ کنول نے موبائل فون اپنی گود میں اس طرح ڈالا جیسے پٹخا ہو پھر وہ دائیں ہاتھ سے اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

اٹھارہ سال کی کنول کوئی شرمیلی لڑکی نہیں تھی۔ اس کی تعلیم و تربیت خاصے آزاد ماحول میں ہوئی تھی اور یہ مزاج اسے اپنی ماں کوثر جہاں سے ورثے میں ملا تھا۔ وہ بھی شادی سے پہلے اپنی کالج لائف تک بہت شرارتی ہوا کرتی تھیں۔ کنول ان سے شاید ایک آدھ ہاتھ آگے ہی تھی۔ اپنے کالج میں بھی وہ نہایت شرارتی لڑکی سمجھی جاتی تھی۔ کبھی کبھی تو بعض نہایت تیز و طرار لڑکے بھی اس کی شرارت کا نشانہ بن جاتے تھے لیکن اس قسم کی لڑکی ہونے کے باوجود اسے ریحان سے بات کرنے کے بعد اس تجربے کے تصور ہی سے ہول آنے لگا تھا کہ وہ ریحان کے والد کے سامنے جائے گی اور ریحان اپنے باپ کو یہ بھی بتادے گا کہ وہ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔

کچھ دیر تک سوچنے کے بعد اس نے موبائل فون اٹھا کر ریحان کا نمبر ملایا۔ وہ ایک بار پھر ریحان کو سمجھانے کی کوشش کرنا چاہتی تھی کہ وہ اس طرح اس کے والد کا سامنا نہیں کر سکے گی لیکن ریحان سے اس کا رابطہ نہیں ہو سکا۔

"ریحان کے بچے!" وہ زیر لب بڑبڑائی "تم نے جان بوجھ کر اپنا موبائل فون بند کیا ہے۔"

دوسرے دن اتوار تھا۔ کنول نے صبح سے تیسرے پہر تک کئی مرتبہ ریحان سے رابطے کی کوششیں کی مگر کامیاب نہ ہو سکی۔

"اچھا بچو!" زیر لب بڑبڑانا کنول کی عادت تھی "میں تمہیں اس کی کچھ سزا تو دوں گی۔"

○☆○

ریحان' کنول کو لینے کے لیے اپنے گھر سے روانہ ہونے ہی والا تھا کہ مسرور کمال نے اسے اپنے کمرے میں بلایا۔

"جی ڈیڈی!" وہ کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولا۔

"تم نے مجھے بتایا تھا کہ آج تم اپنے کسی دوست کو چائے پر بلا رہے ہو اور مجھے اس سے ملانا چاہتے ہو!" مسرور کمال نے اپنے پائپ میں تمبا کو بھرتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں ڈیڈی!"

"لیکن میں جو تیاری دیکھ رہا ہوں گھر میں' اس سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے تم نے کئی افراد کو بلایا ہے!"

"جی نہیں ڈیڈی! کئی افراد نہیں ہوں گے۔ میں بس شاندار پارٹی دینا چاہتا ہوں اسے' وہ بھی کیا یاد کرے گی۔"

"کرے گی؟" مسرور کمال چونکے۔

"توبہ!" ریحان نے اپنے منہ پر ہلکا سا تھپڑ مارا "میں چاہتا تھا کہ آپ کو سرپرائز دوں لیکن.... اصل بات نکل گئی منہ سے۔"

"تو وہ کوئی لڑکی ہے؟" مسرور کمال نے پُرمسرت لہجے میں

کہا۔

"جی ڈیڈی!" ریحان مسکرایا "میں چاہتا ہوں کہ اب آپ مجھے چھُٹّی کہنا چھوڑ دیں۔"

"یومین .... یومین ...." مسرور کمال مسرت آمیز حیرت سے تیزی کے ساتھ ریحان کے قریب پہنچے "یو آر ان لو؟"

"یس ڈیڈی!"

"او' مائی گریٹ سن!" مسرور کمال نے دونوں ہاتھ ' ریحان کے گرد کس کر اسے اپنے سینے سے چپکا لیا "یہ ہوئی نا بات ..... میں تو یہ سمجھ رہا تھا کہ تم ...." مسرور کمال نے ہنس کر اپنی بات ادھوری چھوڑ دی اور پھر ریحان کو اپنے بازوؤں سے آزاد کرتے ہوئے سرگوشی کرنے والے انداز میں پوچھا "کیسی ہے وہ؟ کون ہے؟"

"جیسی بھی ہے، آپ خود دیکھ لیجئے گا۔" ریحان نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ کہا "اور کون ہے؟ یہ بھی آپ اسی سے پوچھئے گا۔ مجھے اب اجازت دیں۔" ریحان نے اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی میں وقت دیکھا۔ "میں اسے لینے جا رہا ہوں۔ میں نے میکڈونلڈ پر بلایا ہے۔"

"تو وہ خود ہی یہاں کیوں نہیں آ رہی ہے؟ کیا اس کے پاس گاڑی نہیں ہے۔"

"بہت خوب صورت کار ہے اس کے پاس ڈیڈی!.... دراصل اسے آپ کے سامنے آنے سے گھبراہٹ ہو رہی ہے اس لیے مجھے خود جانا ہے اسے لینے!"

"چلو ٹھیک ہے۔ اب میں بھی جلدی سے تیار ہو جاتا ہوں۔ میں نے تو سوچا تھا کہ گاؤن میں ہی جا کر اس سے مل لوں گا لیکن بات جب یہ ہے تو مجھے ٹھیک سے تیاری کرنا چاہیے کیوں؟"

"یقیناً ڈیڈی!" ریحان نے خوش دلی سے کہا "اسے معلوم تو ہو کہ میرے ڈیڈی اس عمر میں بھی کتنے اسمارٹ نظر آتے ہیں۔"

"ارے ہم تو بڑھاپے تک اسمارٹ نظر آئیں گے بیٹے!" مسرور کمال نے بڑی گرم جوشی سے ریحان کا شانہ دبا کر کہا "عورتیں ہمیں .... ہمیشہ کن انکھیوں سے دیکھتی رہیں گی۔"

"لیکن۔" ریحان نے ہنس کر کہا "ممی تو کہہ رہی تھیں کہ عورتوں کو آپ دیکھتے ہیں کن انکھیوں سے۔"

"ہم بھی دیکھتے ہیں۔ بس موقع محل کی بات ہوتی ہے۔ اچھا اب تم جاؤ اسے لینے! کیا نام ہے اس کا؟"

"کنول۔"

"نام بھی خوب صورت ہے۔" مسرور کمال نے گاؤن اتارنے کے لیے اس کی ڈوری کھولتے ہوئے کہا "تم جاؤ.... میں جلدی سے تیار ہوتا ہوں۔"

"بس ابھی آیا میں اسے لے کر۔" ریحان نے چٹکی بجا کر کہا اور کمرے سے نکل آیا۔

جب اس کی کار پھاٹک سے نکلی تو اسے گھڑی دیکھ کر اندازہ ہوا کہ میکڈونلڈ پہنچنے میں اسے پانچ منٹ کی دیر ہو جائے گی۔

گیارہ بارہ منٹ کی ڈرائیو تھی لیکن ریحان نے قدرے تیز رفتاری سے کار چلا کر وہ فاصلہ دس منٹ میں طے کر لیا اور صرف تین منٹ کی تاخیر سے میکڈونلڈ پہنچا۔ کار روک کر اس نے ہر طرف نظر دوڑائی لیکن کنول دکھائی نہیں دی۔ اسے تھوڑی سی الجھن ہوئی۔ اس کی دانست میں یہ ممکن نہیں تھا کہ کنول ذرا دیر بھی اس کا انتظار کیے بغیر واپس چلی جاتی اور یہ خیال تو اسے بالکل نہیں آیا کہ کنول ذہنی طور پر اس کے باپ کا سامنا کرنے کے لیے تیار نہیں تھی للہٰذا آئی ہی نہیں ہوگی۔ اس نے سڑک پر کھڑی ہوئی کاروں کی لمبی قطار پر نظر دوڑائی۔ اتوار کی وجہ سے ساحلِ سمندر پر تفریح کی غرض سے وہاں خاصے لوگ آئے ہوئے تھے۔ ریحان نے سوچا کہ انہی کاروں میں کہیں کنول کی بھی کار ہوگی اور وہ فٹ پاتھ پر کھڑے کھڑے ریحان کا انتظار کرنے کے بجائے ریسٹورنٹ میں چلی گئی ہوگی۔ وہ دونوں وہاں اکثر آیا کرتے تھے۔

ریحان ایک مناسب جگہ کار پارک کر کے میکڈونلڈ میں داخل ہوا لیکن اسے مایوسی ہوئی۔ کنول وہاں بھی نہیں تھی۔ ریحان باہر نکل آیا اور جیب سے موبائل نکال کر کنول کا نمبر ملانے لگا۔

"جی جناب! فرمائیے!" دوسری طرف سے کنول کی طنزیہ آواز سنائی دی۔

"تم اب تک پہنچی نہیں' میں انتظار کر رہا ہوں۔"

"کل سے تم نے اپنا موبائل فون بند کیوں کر رکھا تھا؟"

ریحان مسکرایا "اسی لیے کہ تم کوئی حیلہ سازی نہ کر سکو!"

"اچھا تو اب میں اپنا موبائل فون بند کر رہی ہوں۔"

"سنو تو!" ریحان نے جلدی سے کہا لیکن دوسری طرف سے رابطہ منقطع کیا جا چکا تھا۔

ریحان نے منہ بنا کر دوبارہ نمبر ملائے لیکن رابطہ نہیں ہو سکا۔ کنول نے واقعی اپنا موبائل فون بند کر دیا تھا۔

ریحان تھوڑا سا کھسیا گیا لیکن پھر اس نے کنول کے گھر کا ٹیلی فون نمبر ملایا۔ دوسری طرف سے کسی ملازم نے کال ریسیو کی اور بتایا کہ کنول پندرہ بیس منٹ پہلے گھر سے کہیں جا چکی ہے۔

ریحان نے ایک بار پھر موبائل نمبر ملایا لیکن کنول کا موبائل فون بدستور بند تھا۔ ریحان پریشان ہو گیا۔ اسے کنول سے اس "جوابی کارروائی" کی توقع ذرا بھی نہیں تھی۔ اب اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ گھر واپس جائے تو کیسے جائے؟ وہ اپنے باپ کو کیا بتاتا کہ کنول کیوں نہیں آئی۔



مسرور کمال اپنے کمرے میں جلدی جلدی تیاری کر رہے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ انہوں نے چونک کر بلند آواز میں پوچھا "کون ہے؟"

باہر سے ایک ملازم کی آواز آئی۔ اس نے بتایا "چھوٹے صاحب کی کوئی دوست آئی ہیں۔ جب انہیں بتایا گیا کہ چھوٹے صاحب گھر پر نہیں ہیں تو انہوں نے کہا کہ ان کے ڈیڈی تو ہوں گے!"

"اوہ!" مسرور کمال نے جلدی سے پوچھا "کنول تو نہیں ہے؟"

"جی ہاں صاحب! یہی نام بتایا ہے انہوں نے۔"

"ٹھیک ہے۔ اسے ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ۔ میں آتا ہوں۔"

مسرور کمال نے سوچا تھا کہ ریحان کو پہنچنے میں دیر ہو گئی ہو گی لہٰذا وہ خود ہی چلی آئی۔ وہ جلدی جلدی تیار ہو کر کمرے سے نکلے اور ڈرائنگ روم میں پہنچے جہاں انہیں ایک ذہنی جھٹکے سے دوچار ہونا پڑا۔ انہیں وہاں ایک ماڈرن خوب صورت لڑکی کو دیکھنے کی توقع تھی مگر انہیں وہاں ایک برقع پوش دکھائی دی البتہ برقع کی تراش خراش نئے طرز کی تھی۔ لڑکی کا نقاب آنکھوں سے نیچے تک تھا مگر ایک خوب صورت چشمے کی وجہ سے آنکھیں بھی چھپی ہوئی تھیں۔

"السلام علیکم!"

"وع... وعلیکم السلام.... تم.... تم کنول ہو؟"

"جی۔"

"بیٹھو.... بیٹھو! ریحان تمہیں ہی لینے گیا ہے۔ تم...."

"مجھے معلوم ہے۔" کنول نے بات کاٹتے ہوئے کہا "میں چاہتی تھی کہ اس کی عدم موجودگی میں آپ سے چند باتیں کر لوں۔"

"اوہ!" مسرور کمال نے غور سے کنول کی طرف دیکھا اور پھر جلدی سے کہا "تم بیٹھو تو!"

"آپ کھڑے ہیں، میں کیسے بیٹھ جاؤں!"

"اوہ، ہاں!" مسرور کمال کی ذہنی حالت اس وقت کچھ عجیب سی تھی۔ وہ کنول کے سامنے ایک صوفے پر بیٹھنے لگے تو وہ بھی بیٹھ گئی۔

"میرا خیال ہے۔" کنول بولی "ریحان نے آپ کو میرے بارے میں سب باتیں نہیں بتائی ہوں گی حالانکہ میں نے ریحان کو بہت سمجھایا تھا کہ بزرگوں سے کوئی بات چھپانا مناسب نہیں ہوتا!"

"ایسی.... ایسی کیا بات؟" مسرور کمال ابھی تک پوری طرح نہیں سنبھل سکے تھے اور کنول کی بات سے ان کا دماغ مزید چکرا گیا تھا۔

"ریحان نے آپ کو کیا بتایا ہے؟" کنول نے پوچھا۔

"یہی کہ وہ تم سے.... میرا مطلب ہے کہ.... تم دونوں ایک دوسرے سے.... یعنی...."

"میں سمجھ گئی۔" کنول نے بات کاٹتے ہوئے کہا "بس اتنا ہی بتایا ہے ریحان نے؟"

"ہاں۔" مسرور کمال نے ایک طویل سانس لی اور خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے غور سے کنول کی طرف دیکھنے لگے۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ریحان کو مجھ سے اتنی محبت کیوں ہے!" کنول نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "آپ بہت بڑے آدمی ہیں انکل!.... اور میرا تعلق ایک اوسط درجے کے گھرانے سے ہے۔ صورت شکل کی بھی بہت معمولی ہوں۔ کالج میں تو خیر میں نقاب الٹ دیتی ہوں لیکن اس کے علاوہ کسی جگہ بھی خود کو بے نقاب نہیں کرتی ورنہ ابھی نقاب الٹ دیتی۔ آپ بھی دیکھ لیتے کہ میں بہت معمولی شکل و صورت کی لڑکی ہوں۔"

مسرور کمال نے اس کے گورے ہاتھوں اور سینڈل سے جھانکتی ہوئی انگلیوں پر نظر ڈالتے ہوئے کہا "تمہارا رنگ تو صاف ہے!" نہ جانے کیوں ان کی آواز تھوڑی سی بھرا گئی تھی۔

"رنگ صاف ہونے سے کیا ہوتا ہے انکل! چیچک نے میرا سارا چہرہ برباد کر دیا ہے۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ اس کا علم آپ لوگوں کو بعد میں ہو۔"

"اچھا.... اچھا...." مسرور کمال نے پہلو بدلا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ انہیں کیا کہنا چاہیے۔

"مجھے حیرت ہے کہ ریحان کو مجھ جیسی لڑکی سے اتنی

محبت ہو گئی ہے۔" کنول نے پھر ٹھنڈی سانس لی "لیکن میں نہیں چاہتی کہ آپ لوگ دھوکے میں رہیں! کہاں آپ کا یہ شاندار بنگلا اور کہاں میں.... اور کہاں میرا چھوٹا سا گھر!"

"ریحان بتا رہا تھا کہ.... تمہارے پاس... بہت شاندار کار ہے۔" مسرور کمال نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

"کار" کنول افسردگی سے ہنسی "میں تو ٹیکسی میں یہاں آئی ہوں انکل! اسی لیے تو ریحان مجھے لینے گئے ہوئے ہیں! وہ نہیں چاہتے کہ آپ کو میری غربت کا علم ہو لیکن میں آپ کو کسی بات سے بے خبر نہیں رکھنا چاہتی تھی۔"

مسرور کمال نے پھر پہلو بدلا۔

○☆○

ریحان کے لیے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں رہ گیا تھا کہ وہ مایوسی کے عالم میں اپنے گھر لوٹتا.... لیکن گھر پہنچتے ہی ایک اطلاع نے اسے چونکا دیا۔

"آپ کی کوئی دوست آئی ہوئی ہیں چھوٹے سرکار!" ایک ملازم نے کہا تھا۔

"کہاں ہیں؟" ریحان نے چونک کر پوچھا۔

"ڈرائنگ روم میں ہیں' بڑے صاحب کے ساتھ بیٹھی ہیں۔"

ریحان ڈرائنگ روم کی طرف لپکا۔ وہ خوش ہو گیا تھا کہ کنول نے اسے زیادہ پریشانی میں نہیں ڈالا۔ وہ نہ آتی تو ریحان کے لیے مسرور کمال سے بات کرنا مشکل ہو جاتا۔ وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے وقت خوش تھا لیکن یکایک اسے جھٹکا سا لگا۔ وہاں مسرور کمال کے سامنے ایک برقع پوش لڑکی بیٹھی ہوئی تھی اور وہ کنول ہی تھی۔ ریحان اسے برقع اور چشمے کے باوجود پہچان سکتا تھا۔

کنول کی "برقع پوشی" نے ریحان کے ذہن پر جھلاہٹ کا دوسرا حملہ کیا۔

مسرور کمال کھڑے ہو گئے "آؤ! اب تم ہی اپنی دوست کو انٹرٹین کرو۔" ان کا لہجہ کچھ طنزیہ تھا "مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔" وہ ریحان کے جواب کا انتظار کیے بغیر تیزی سے بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئے۔

ریحان سمجھ گیا کہ وہ اس کا "برقع پوش انتخاب" دیکھ کر کھسیا گئے تھے۔

ریحان تیزی سے کنول کے برابر میں جا بیٹھا اور غصے سے بولا "یہ کیا حرکت کی ہے تم نے؟"

"کونسی حرکت؟" کنول نے معصومیت سے پوچھا۔

"یہ... یہ... اب یہ بھی بتاؤں؟... یہ برقع..."

"اور تم نے جو حرکت کی تھی....!" کنول نے چشمہ اتار کر ریحان کو گھورا۔

"میں نے؟... میں نے کیا کیا تھا؟"

"کل سارا دن اپنا موبائل فون کیوں بند رکھا تھا؟"

"اس لیے کہ تم نہ آنے کے لیے مزید بحث مباحثہ نہ کرو۔"

"تم نے طے کر لیا تھا کہ مجھے مشکل میں ڈالو گے؟"

"مشکل تو اب ہو گی!" ریحان نے منہ بنا کر کہا "ابھی تو ڈیڈی غصے میں چلے گئے ہیں لیکن واپس آئیں گے تو مجھ پر ضرور برسیں گے!"

"تم نے مجھے پریشان کیا تھا لہٰذا تمہیں اس کی کچھ سزا تو ملنی چاہیے!"

"سزا تو تمہیں بھی ملے گی!.... اب ہماری شادی ہونا مشکل ہے۔"

"کوئی مشکل نہیں ہے۔" کنول نے اطمینان سے کہا۔ "مناسب وقت پر انہیں حقیقت سے آگاہ کر دیا جائے گا۔"

"اب یہ آسان نہیں ہو گا!" ریحان بڑبڑایا اور دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بیٹھ گیا۔

کنول ہنسی "محبت میں تھوڑی بہت مشکلات سے ضرور گزرنا چاہیے ورنہ محبت کا مزہ ہی کیا!... اچھا اب سر پکڑ کر نہ بیٹھو!.... میں پہلی مرتبہ تمہارے گھر آئی ہوں۔ کچھ خاطر مدارات نہیں کرو گے؟"

"سارا مزہ کرکرا کر دیا ہے تم نے!" ریحان نے منہ بنایا "بڑا زبردست اہتمام کیا تھا میں نے تمہارے لیے!"

"ارے تو وہ اہتمام ختم تو نہیں ہو گیا ہو گا!" کنول نے آنکھیں نکالیں "اب کچھ خاطر کرنا ہے تو کرو ورنہ میں چلتی ہوں۔" وہ کھڑی ہو گئی۔

"نخرے نہ دکھاؤ زیادہ!" ریحان ایک جھٹکے سے کھڑا ہو گیا "آؤ۔" اس نے کنول کا بازو پکڑ لیا۔

کنول ہنستی ہوئی اس کے ساتھ چلنے لگی۔

ڈائننگ روم میں سجی ہوئی ڈائننگ ٹیبل دیکھ کر کنول نے آنکھیں پھاڑیں "یہ اہتمام... میرے لیے کیا گیا ہے یا سات آٹھ آدمیوں کے لیے؟"

"اسی سے اندازہ کر لو کہ میں کتنا خوش تھا۔" ریحان کے لہجے میں بدمزگی تھی۔

"اب بھی خوش رہو۔ خوش رہنے سے صحت اچھی رہتی ہے۔" کنول نے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا اور اپنے چہرے سے نقاب ہٹادی۔

ریحان بدستور اس الجھن میں پڑا ہوا تھا کہ اب اپنے باپ کا سامنا کس طرح کرے گا؟

"ڈیڈی سے کیا باتیں ہوئی تھیں؟" اس نے کنول سے پوچھا۔

"وہ تمہیں سب کچھ بتا دیں گے۔" کنول نے کہا اور پھلوں کی پلیٹ سے ایک سیب اٹھا کر چھری بھی سنبھال لی۔ میں بعد میں دہی بڑے تو خوب کھاؤں گی لیکن پہلے آدھا سیب کھا لوں.... لو' آدھا سیب تم لو...." کنول نے سیب کاٹ کر ریحان کی طرف بڑھایا۔

"میرا اب.... کچھ جی نہیں چاہ رہا ہے۔"

"دیکھو اب اپنا موڈ ٹھیک کر لو۔" کنول نے آنکھیں نکالیں "میں اس کی پروا نہیں کروں گی کہ یہ تمہارا گھر ہے۔ الٹ دوں گی میں یہ میز' اور چلی جاؤں گی فوراً۔"

ریحان کھسیائے ہوئے انداز میں ہنس پڑا۔ اسے اندازہ تھا کہ کنول وہ کر بھی گزارے گی جو اس نے کہا تھا۔ وہ اسی قسم کی شیطان لڑکی تھی۔

"جلدی جلدی کھاؤ پیو!" کنول نے دوسری قاش منہ میں ڈالتے ہوئے کہا "ابھی مجھے چھوڑنے کے لیے بھی جانا ہے تمہیں!"

"ہاں!" ریحان چونکا "اب مجھے یاد آیا کہ تمہاری کار نظر نہیں آئی!"

"میں ٹیکسی میں آئی تھی۔" کنول نے اطمینان سے جواب دیا "کار میں اچانک نہ جانے کیا خرابی ہو گئی تھی!.... میں نے سوچا کہ دیر نہ ہو جائے اس لیے ایک ملازم سے ٹیکسی منگوا لی تھی۔"

"بیڑا غرق!" ریحان نے منہ بنایا "میں نے ڈیڈی سے کہا تھا کہ تمہارے پاس بڑی شاندار کار ہے۔"

"بعد میں وہ شاندار کار بھی دیکھ لیں گے!" کنول نے بے پروائی سے کہا۔

"تم سے ان کی باتیں کیا ہوئیں؟"

"وہ تمہیں سب کچھ بتا دیں گے۔" کنول نے دہی بڑے کی قاب اٹھائی۔

ریحان کے اصرار کے باوجود کنول نے کچھ نہیں بتایا۔

تھوڑی دیر بعد ریحان اسے اپنی کار میں بٹھا کر اس کے گھر کی طرف روانہ ہوا۔

"کل کہاں ملو گی؟" ریحان نے سوچتے ہوئے پوچھا۔

"کل تو مشکل ہو گا ملنا۔"

"کیوں؟"

"ممی کے ساتھ خاصی شاپنگ کرنی ہے۔ شام کو ممی کے ساتھ ایک شادی میں جانا ہے۔ ان کی کسی دوست کی بیٹی کی شادی ہے پی سی میں۔"

"پی سی میں!" ریحان چونکا۔

"ہاں۔" کنول نے اس کی طرف دیکھا "اس میں چونکنے والی کیا بات ہے؟"

ریحان کچھ سوچنے لگا۔

"بتاؤ نا!" کنول پھر بولی۔

"پہلے تم بتاؤ کہ ڈیڈی سے کیا باتیں ہوئی تھیں!"

"پھر وہی مرغ کی ایک ٹانگ؟"

"تو پھر میں بھی نہیں بتاؤں گا کہ میں کیوں چونکا تھا۔"

"نہ بتاؤ۔" کنول نے بے پروائی سے شانے اچکائے اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔



اسی رات ریحان کو مسرور کمال کی جھاڑ پھٹکار سننا پڑی۔ کنول نے مسرور کمال کو جو کچھ بتایا تھا' وہ سن کر ریحان کے پیروں تلے زمین نکلنے لگی۔

مسرور کمال نے بات جاری رکھی "اس نے سب کچھ مجھے بتا کر یہ تو ثابت کر دیا کہ وہ ایک شریف اور اچھی لڑکی ہے لیکن یہ ممکن نہیں کہ میں اس سے تمہاری شادی منظور کر لوں۔ تمہاری بیوی صرف ایسی لڑکی بن سکتی ہے جو خوب صورت' ماڈرن اور ہمارے اسٹیٹس کی ہو۔"

"وہ ایسی ہی ہے ڈیڈی!" ریحان نے اصرار کیا۔

"اسی لیے برقع میں آئی تھی!" مسرور کمال چبھتے ہوئے لہجے میں بولے۔

"اس نے میرے ساتھ ایکٹوٹی کی ہے۔" ریحان نے ایک لمبی سانس لی۔

"کیا مطلب!"

جواب میں ریحان نے ساری حقیقت بتا دی۔

مسرور کمال نے منہ بنایا "مجھے بے وقوف نہ بناؤ۔" وہ شریف لڑکی پہلے ہی مجھ سے کہہ چکی ہے کہ تم بعد میں اس قسم کی باتیں بنا سکتے ہو۔"

"مائی گاڈ!" ریحان اپنی پیشانی مسلنے لگا "حد کر دی کنول نے!"

"بہرحال۔" مسرور کمال نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "اس لڑکی سے تمہاری شادی نہیں ہو سکتی۔"

"میری شادی آپ اسی لڑکی سے کریں گے۔" ریحان مسکرایا۔

"تمہارا دماغ درست ہے؟" مسرور کمال اسے گھورنے لگے۔

"میں کل ہی آپ کو اس کا اصل چہرہ دکھا دوں گا اور آپ مان لیں گے کہ میرا انتخاب آپ کی توقعات کے مطابق ہے۔"

"کچھ... نئی جعلسازی سوچ رہے ہو!" مسرور کمال نے تیکھے لہجے میں کہا۔

"کل اشرف کی شادی میں تو چلنا ہے نا؟"

"ظاہر ہے۔ وہ میرے بہت عزیز دوست کا بیٹا ہے۔ تمہیں بھی چلنا ہے میرے ساتھ!... اگر تمہاری ممی امریکا نہ گئی ہوتیں تو اس شادی میں وہ بھی شرکت کرتیں لیکن اس شادی کا ذکر کیوں چھیڑ بیٹھے ہو اس وقت؟"

"وہاں میں آپ کو کنول کا اصل چہرہ دکھا دوں گا۔ اپنی ماں کے ساتھ وہ بھی آئے گی اس شادی میں!" ریحان کے ہونٹوں پر پُراعتماد مسکراہٹ تھی۔

مسرور کمال نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"وہ وہاں برقع میں نہیں آئے گی۔" ریحان مسکراتا رہا "آپ اسے اس کی آواز سے تو پہچان ہی لیں گے!"

مسرور کمال کے چہرے سے الجھن کا اظہار ہونے لگا۔

"کیا اب مجھے اجازت ہے؟" ریحان بولا "میں جاؤں اپنے کمرے میں؟"

"جاؤ۔" مسرور کمال سوچ میں پڑ گئے تھے۔

ریحان ان کے کمرے سے نکل آیا۔ اسے جھاڑنے پھٹکارنے کے لیے مسرور کمال نے اسے اپنے ہی کمرے میں بلایا تھا۔



ہوٹل پہنچنے والی برات کی کاروں میں مسرور کمال کی کار بھی تھی۔ ان کے ساتھ ریحان بھی تھا اور بہت خوش تھا کہ صرف چوبیس گھنٹے بعد ہی وہ کنول کی ایکٹوٹی کا بھانڈا پھوڑنے میں کامیاب ہو جائے گا۔

کاروں سے اتر کر لوگ دولہا کے پیچھے پیچھے ہوٹل میں جانے لگے۔ ریحان اور مسرور کمال سب لوگوں کے پیچھے تھے۔ لابی سے گزرتے ہوئے مسرور کمال یکایک چونکے، پھر ریحان سے بولے "تم چلو۔ میں آتا ہوں۔"

"کہاں جا رہے ہیں آپ؟"

"جا تو کہیں نہیں رہا۔ لابی میں ابھی ایک شناسا چہرہ دکھائی دیا ہے۔ مل کر ابھی آتا ہوں۔ تم چلو۔"

"بہتر۔"

ریحان لوگوں کے پیچھے پیچھے ہال میں داخل ہوا جہاں خواتین کے رنگارنگ آنچل اور خوشبوئیں لہرا رہی تھیں۔ ریحان کو ان خوشبوؤں میں اپنی "خوشبو" تلاش کرنا تھی۔ اس کی نظریں اِدھر اُدھر بھٹکتی رہیں اور جلد ہی اسے اپنی "خوشبو" نظر آ ہی گئی۔



لابی میں کنول کی والدہ کوثر جہاں اور مسرور کمال ایک صوفے پر ایک دوسرے کی طرف رخ کیے بیٹھے تھے۔ کوثر جہاں مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

"یہ ایک پُرمسرت اتفاق ہے کہ تم نے مجھے دیکھ لیا۔"

"لیکن تم... یہاں... میرا مطلب ہے لابی میں... کیا کسی کا انتظار..."

"نہیں۔" کوثر جہاں نے بات کاٹتے ہوئے کہا "میں یہاں ایک شادی میں آئی ہوں اور...."

مسرور کمال چونکے اور انہوں نے بھی کوثر جہاں کی بات کاٹی۔ "شادی میں؟"

"ہاں..."

"میرا خیال ہے کہ یہاں آج ایک ہی شادی ہے اور میں ابھی برات کے ساتھ آیا ہوں۔"

"اور میں یہاں پہلے سے موجود ہوں۔" کوثر جہاں نے ہنس کر بتایا "دلہن کی ماں میری دوست ہیں۔ میں اس وقت لابی میں اس لیے ہوں کہ میرے اردگرد اگر اچانک ہجوم بڑھے تو مجھے گھبراہٹ ہونے لگتی ہے پھر اگر شور بھی ہو تو گھبراہٹ اور بڑھ جاتی ہے۔ یہ تو ہے کہ مہذب لوگ دھیمی آواز میں باتیں کرتے ہیں لیکن جب بہت سے لوگ آپس میں باتیں کرنے لگیں تو ان کی دھیمی آوازوں کے باوجود کچھ شور تو ہو ہی جاتا ہے... جیسے ہی برات آئی تھی میں یہاں آ کر بیٹھ گئی تھی... میں نے سوچا تھا کہ جب سب لوگ اپنی اپنی جگہ بیٹھ جائیں گے تو میں بھی واپس چلی جاؤں گی۔"

"لیکن اگر تم لابی میں نہ آتیں تب بھی ہماری ملاقات تو ہو جاتی۔"

"ضروری تو نہیں ہے کہ اتنے ہجوم میں ہمارا آمنا سامنا ہو ہی جاتا...!"

"یہ بھی تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ خیر یہ بتاؤ کہ تم کراچی میں کب سے ہو؟ تمہاری شادی تو لاہور میں ہوئی تھی نا!"

"ہاں۔" کوثر جہاں نے جواب دیا۔ "چار سال پہلے میرے شوہر کا انتقال ہو چکا ہے۔"

"اوہ!"

کوثر جہاں کہتی رہیں "اس کے بعد سسرال والوں سے میرا نباہ نہیں ہو سکا میری ایک بیٹی ہے۔ میں اسے لے کر یہاں آگئی۔ ڈیڈی اس وقت زندہ تھے۔ میں نے ان کی تجارتی سوجھ بوجھ کی مدد سے اپنی کمپنی کھول لی۔ اب تو ڈیڈی کے انتقال کو بھی دو سال گزر چکے ہیں لیکن میں اپنی کمپنی بڑے اطمینان سے سنبھالے ہوئے ہوں۔"

مسرور کمال نے کچھ رک کر کہا "ابھی تم نے اپنی بیوگی اور اپنے والد کے انتقال کے بارے میں بتایا ہے لیکن میں اظہارِ افسوس نہیں کروں گا۔ تم میرے مزاج سے اچھی طرح واقف ہو۔ میں اداسیوں سے بہت دور بھاگتا ہوں۔"

"گویا بالکل نہیں بدلے ہو!" کوثر جہاں نے ہنس کر کہا۔

"ایک اعتبار سے تو تم بھی نہیں بدلی ہو! جتنی خوب صورت کالج کے زمانے میں تھیں' اتنی ہی خوب صورت اب بھی ہو!"

"اس بڑھاپے میں!" کوثر جہاں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

"اسے بڑھاپا کہہ رہی ہو!" مسرور کمال نے مصنوعی انداز میں ڈانٹا "ابھی تمہاری عمر چالیس سال سے زیادہ تو نہیں ہوئی ہوگی۔"

○☆○

شادی کے ہنگامی ماحول میں ریحان کو آخر موقع مل ہی گیا کہ کنول کو مخاطب کر سکے۔ "ہیلو!"

کنول چونک کر اس کی طرف مڑی اور پھر حیرت زدگی کے عالم میں اس کے منہ سے نکلا۔ "تم؟"

"خاکسار بھی یہاں مدعو ہے۔" ریحان نے مسکرا کر کہا۔

"اوہ!" کنول نے طویل سانس لی۔ "اسی لیے کل تم مجھ سے پی سی کا نام سن کر چونکے تھے؟"... پھر اس نے ادھر ادھر دیکھا "اکیلے آئے ہو؟"

"ڈیڈی بھی آئے ہیں۔" ریحان کے ہونٹوں پر شرارت آمیز مسکراہٹ تھی "اور مجھے یقین ہے کہ تمہاری آواز سن کر وہ تمہارا برقع میں چھپا ہوا چیچک زدہ چہرہ آسانی سے پہچان جائیں گے۔"

کنول ہنس پڑی۔ "وہ... ہیں کہاں؟"

"ہم برات کے ساتھ آئے ہیں۔ لابی میں ڈیڈی کو کوئی شناسا مل گیا۔ وہ وہیں رک گئے ہیں۔ ابھی آ جائیں گے۔ تمہاری ممی کہاں ہیں؟"

"یہیں کہیں ہوں گی۔" کنول نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔

"چلو یہ بڑا اچھا موقع نکل آیا۔ ڈیڈی سے تو اب تم دوسری بار ملو گی لیکن آج تمہاری ممی سے بھی میری ملاقات ہو جائے گی۔"

کنول نے شرارت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا "اگر تمہارے ڈیڈی مجھے نہ پہچان سکیں تو کیسی رہے گی؟"

"ممکن ہی نہیں! تمہاری آواز..."

"میں آواز بدل لوں گی اور ان سے کہوں گی کہ میرا نام تو کنول ہی ہے لیکن وہ کوئی دوسری کنول ہو گی جس سے وہ پہلے مل چکے ہیں۔"

"فضول بات ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تم اپنی آواز اس حد تک نہیں بدل سکتیں!"

"چلو دیکھ لینا۔" کنول نے ہنس کر کہا۔

"تم کہاں بیٹھی ہو؟"

"شادی میں کسی ایک جگہ نہیں بیٹھا جاتا۔"

"بیشتر مہمان بیٹھ چکے ہیں۔"

"لیکن کچھ ایسے بھی ہیں جو اِدھر اُدھر گھوم رہے ہیں۔ میں بھی ٹک کر ایک جگہ بیٹھنے والی نہیں ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ رہو گی تو تم یہیں! میں تمہیں تلاش کر لوں گا۔"

اسی وقت ایک لڑکی نے آکر کنول کا بازو پکڑا "یہاں کھڑی کیا کر رہی ہو۔ وہ ادھر ساجدہ تمہیں ڈھونڈ رہی ہے۔ تم نے اس سے کہا تھا کہ...."

"چلو۔" کنول نے اس کی بات کاٹ دی اور پھر ریحان پر شرارت آمیز نظر ڈالتی ہوئی اپنی دوست کے ساتھ ایک طرف بڑھ گئی۔

○☆○

مسرور کمال کو جب کچھ دیر ہو گئی تو ریحان ہال سے نکال کر لابی میں پہنچا۔ وہاں وہ یہ دیکھ کر چونک گیا کہ اس کے والد ایک صوفے پر بیٹھے' ایک خوب صورت خاتون سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔

خوب' ریحان نے منہ بناتے ہوئے سوچا' ڈیڈی کو ممی کے امریکا جاتے ہی رومانس لڑانے کا موقع مل گیا!

وہ اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا آگے بڑھا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے صوفے کے پاس سے گزرتا ہوا آگے نکل جائے گا لیکن اس کا مقصد یہ جاننا تھا کہ اس کے والد' اس خوب صورت خاتون سے کس قسم کی باتیں کر رہے تھے۔ اس کی کوشش یہ بھی تھی کہ مسرور کمال کی نظر فوری طور پر اس پر نہ پڑے۔ جب وہ صوفے کے قریب پہنچا تو اس نے مسرور کمال کی

آواز سنی۔ "تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ ہمیں اب ہال میں جانا چاہیے۔ پہلے تم چلی جاؤ۔ میں یہاں سے ایک منٹ بعد اٹھوں گا۔"

"ٹھیک ہے۔ فون پر رابطہ رہے گا۔ طے کرلیں گے کہ اگلی ملاقات کہاں ہوگی۔"

خاتون کے جاتے ہی ریحان بڑی بے تکلفی سے مسرور کمال کے برابر میں جا بیٹھا۔ مسرور کمال چونک پڑے۔

"خاتون تو یہ خوب صورت تھیں!" ریحان نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"تمہارے باپ کو صرف خوبصورت خواتین ہی سے دوستی کرنا پسند ہے برخوردار! مجھے تمہاری طرح چیچک زدہ چہرے پسند نہیں ہیں۔"

"خیر، وہ تو آپ کو ابھی دکھادوں گا کہ جسے میں نے پسند کیا ہے، وہ کتنی چیچک زدہ ہے مگر یہ بتائیے کہ ان خاتون کو آپ کب سے جانتے ہیں؟"

مسرور کمال اپنے بیٹے سے اس قسم کے معاملات پر اتنی ہی بے تکلفانہ گفتگو کرتے تھے کہ ریحان کو بھی ان سے اس طرح بات کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی تھی۔

"کوثر آج مجھے برسوں بعد نظر آئی تھی۔" مسرور کمال نے مسکراتے ہوئے کہا "اس کے شوہر کا انتقال ہوچکا ہے۔ آج کل وہ خود ہی ایک بزنس کر رہی ہے۔"

"گویا دونوں جانب سے کوئی رکاوٹ نہیں ہے!" ریحان نے سنجیدگی سے کہا۔

"کیا مطلب!" مسرور کمال نے اسے غور سے دیکھا۔

"ان کے شوہر کا انتقال ہوچکا ہے اور ممی آج کل امریکا گئی ہوئی ہیں۔"

"اوہ!" مسرور کمال ہنس پڑے، پھر کھڑے ہوگئے "چلو، اب ہال میں چلیں۔ نکاح جلد ہی ہوگا۔"

ریحان کھڑا ہوکر ان کے ساتھ چلنے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس کے والد اپنی اس قسم کی حرکتوں سے کبھی باز نہیں آسکتے اور ممی ہیں کہ ان کی ایسی حرکتوں پر کوئی قدغن نہیں لگاتیں۔ کہیں انہیں کسی دن پچھتانا نہ پڑجائے!

"تو یہاں تم مجھے کنول سے ملواؤ گے؟" مسرور کمال بولے۔

"جی۔" ریحان نے کہا "ابھی میں اس سے مل چکا ہوں۔ وہ موجود ہے۔"

"تمہارا یہ اعتماد مجھے اب الجھن میں ڈالنے لگا ہے۔"

"میں آپ کو بتاچکا ہوں ڈیڈی کہ کنول نے وہ حرکت مجھ سے اس بات کا انتقام لینے کے لیے کی تھی کہ میں نے اسے گھر پر مدعو کرنے کے بعد اپنا موبائل بند کرلیا تھا۔ وہ بہت ہی شریر ہے ڈیڈی!... ابھی وہ کہہ رہی تھی کہ آپ سے آواز تبدیل کرکے بات کرے گی تاکہ آپ اسے اس کی آواز سے پہچان نہ سکیں۔"

مسرور کمال نے اسے غور سے دیکھا "کیا تم پیش بندی کر رہے ہو؟"

"کیا مطلب؟"

"اب تم مجھے کسی اور لڑکی سے ملواؤ گے اور مجھ سے کہو گے کہ وہ آواز بدل کر بول رہی ہے!"

ریحان ہنس پڑا "نہیں ڈیڈی!... دراصل میں جانتا ہوں کہ اسے آواز بدلنے میں مہارت نہیں ہے۔"

"چلو دیکھتے ہیں۔" مسرور کمال ہونٹوں ہی ہونٹوں میں بڑبڑائے۔

وہ ہال میں داخل ہوئے۔ ریحان اِدھر اُدھر نظریں دوڑانے لگا۔

"کہاں ہے وہ؟" مسرور کمال نے پوچھا۔

"یہیں کہیں ہوگی۔ اس ہجوم میں تلاش تو کرنا پڑے گا۔"

"میں ادھر بیٹھتا ہوں۔" مسرور کمال نے ایک طرف اشارہ کیا۔

"ٹھیک ہے۔" ریحان نے کہا "میں اسے تلاش کرکے لاتا ہوں۔"

مسرور کمال ایک طرف بڑھ گئے اور ریحان، کنول کی تلاش میں اِدھر اُدھر منڈلانے لگا۔



کنول اس وقت ہال میں نہیں تھی۔ کار میں وہ بڑی تیز رفتاری سے اپنے گھر کی طرف جارہی تھی۔ اس کے رگ و روپے میں غصے کی لہریں دوڑ رہی تھیں۔ وہ کوثر جہاں کی تلاش میں ہال سے نکلی تھی تو وہ اسے وہاں نظر آگئی تھیں۔ کنول نے انہیں ہنس ہنس کر مسرور کمال سے باتیں کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ وہ پہلے تو حیران ہوئی تھی، اس کے بعد اسے اپنی ماں پر غصہ آنے لگا تھا۔ مسرور کمال کا مزاج اسے ریحان سے معلوم ہوچکا تھا لیکن اپنی ماں کے بارے میں وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ مسرور کمال جیسا کوئی شخص انہیں اپنی باتوں سے رجھالے گا۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ وہ اپنی ماں کے کردار پر شک کرنے لگی تھی۔

گھر پہنچ کر اس نے کار شوفر کے ذریعے ہوٹل.... بھجوا

دی۔ ہوٹل میں اسے اپنی ماں کی تلاش اسی لیے ہوئی تھی کہ وہ ان سے کوئی بہانہ کرکے گھر چلی آئے۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ ریحان اسے پکڑ کر اپنے والد کے سامنے لے جا سکے۔ اسے اپنی آواز بدلنے پر قدرت حاصل نہیں تھی اور وہ چاہتی تھی کہ ابھی اپنی ایکٹویٹی جاری رکھے اور ریحان اپنے باپ سے بات کرتے ہوئے مشکلات کا شکار رہے۔

لیکن ماں کو مسرور کمال کے ساتھ دیکھ کر کنول کو اتنا غصہ آیا تھا کہ اس نے کوثر جہاں سے اجازت لینا بھی ضروری نہیں سمجھا تھا۔

اپنے کمرے میں جا کے کنول بستر پر لیٹ گئی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے وہ منظر لہراتا رہا کہ اس کی ماں اور مسرور کمال ہنس ہنس کر باتیں کر رہے ہیں۔

موبائل فون کی گھنٹی نے کنول کو چونکا دیا۔ اس نے پرس سے موبائل فون نکال کر دیکھا۔ کال اس کی ماں نے کی تھی۔

"جی ممی!" کنول نے کال ریسیو کی۔

"تم یہاں کہیں نہیں دکھائی دے رہی ہو۔ کہاں ہو؟"

"میں گھر آگئی ہوں ممی!"

"کیا!" کوثر جہاں چونکیں اور پھر انہوں نے تیزی سے پوچھا "کیوں؟ گھر کیوں چلی گئیں؟"

"اچانک میری طبیعت خراب ہوگئی تھی۔"

"کیا ہوا؟" کوثر جہاں کے لہجے میں تشویش تھی۔

"کوئی ایسی گھبرانے کی بات نہیں ہے ممی!... وہ مجھے کبھی آدھے سر کا درد ہو جاتا ہے نا!"

"دوا لی؟"

"جی ہاں۔ اس کی دوا تو گھر میں رہتی ہی ہے۔ میں نے ایک ٹیبلیٹ لے لی ہے آپ کے لیے کار میں نے شوفر سے بھجوا دی ہے۔"

"اگر طبیعت زیادہ خراب ہو تو ڈاکٹر کو فون کر کے بلا لینا اور مجھے بھی اطلاع دینا۔"

"میرا خیال ہے کہ اس کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ آپ میری طرف سے فکر مند نہ رہیے گا۔ تقریب ختم ہو جائے، تبھی آئیے گا۔"

"اچھا ٹھیک ہے، لیکن میری ہدایات کا خیال رکھنا۔"

"آپ مطمئن رہیے۔"

گفتگو ختم کر کے کنول نے موبائل فون بند کیا ہی تھا کہ گھنٹی پھر بجنے لگی۔ اس مرتبہ کال ریحان کی تھی۔

"کہاں بھاگ نکلی ہو؟" ریحان کی شوخ آواز سنائی دی۔

"بہت دعوے تھے کہ آواز بدل لوگی!"

"میں بہت پریشان ہوں ریحان!" کنول کی آواز بھرّا گئی۔

"کیا ہوا؟" ریحان شاید اس کے لہجے سے گھبرایا تھا۔

"میں گھر آگئی ہوں۔ کیا تم ابھی آکے مجھ سے مل سکتے ہو؟"

"ابھی؟..... آخر بات کیا ہے؟"

"فون پر اچھا نہیں لگے گا۔"

"یہاں میں ڈیڈی کے ساتھ ہوں۔ تقریب ختم ہونے کے بعد ہی آسکوں گا۔"

"وہ تو بہت دیر ہو جائے گی۔ اس وقت ممی بھی گھر آجائیں گی۔"

"تو تمہاری ممی....."

"وہ ابھی وہیں ہیں۔ میں تو کسی بہانے سے گھر آگئی ہوں۔ اسی لیے تو کہہ رہی ہوں کہ ابھی گھر آجاؤ تو اچھا ہے۔ ممی کے سامنے میں تم سے وہ بات نہیں کر سکوں گی۔ اگر یہاں نہ آسکو تو کسی ریسٹورنٹ میں مل لو!"

"آخر بات کیا ہے کنول؟ تم نے مجھے پریشان کیوں کر دیا ہے۔"

"بات ایسی ہے جو تمہیں بھی پریشان کر دے گی اور ہم دونوں کو مل کر ہی اس کا کوئی حل تلاش کرنا ہوگا۔"

"تمہاری اس بات نے میرا خلجان اور بڑھا دیا.... پلیز! کچھ تو بتا دو ابھی۔"

"فون پر اتنی لمبی بات نہیں ہو سکتی۔" کنول نے جھنجلا کر کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔



پھر دو دن گزر گئے۔ ان دو دنوں میں کنول نے مسرور کمال اور ریحان نے کوثر جہاں پر کڑی نظر رکھی۔ اسی طرح ان دونوں کو معلوم ہوگیا کہ ایک دن مسرور کمال، کوثر جہاں سے ملنے ان کے دفتر پہنچے تھے اور ایک دن کوثر جہاں ان کے دفتر گئی تھیں۔

"مجھے بہت غصہ آ رہا ہے اپنی ماں پر!" کنول نے تیسرے دن ریحان سے کہا "کل رات وہ ٹیلی فون پر تمہارے ڈیڈی سے باتیں کر رہی تھیں۔ چند باتیں میرے کان میں پڑ گئیں۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ ابھی اس کا علم ہمارے بچوں کو نہیں ہونا چاہیے۔ میں ڈر رہی ہوں کہ یہ معاملہ کہیں زیادہ آگے نہ بڑھ جائے۔ آخر وہ دونوں ہم سے کیا بات چھپانا چاہتے ہیں؟"

"کیا مطلب!"

"تم میرا اشارہ نہیں سمجھ سکتے؟" کنول نے ریحان کو گھورا۔

"ہوں۔" ریحان سوچنے لگا قدرے توقف سے بولا "ان دونوں کو علم بھی نہیں ہے کہ ان کی اولادیں ایک دوسرے کو چاہتی ہیں۔ انہوں نے تو ہمیں دیکھا بھی نہیں ہے۔ تقریب میں ڈیڈی تمہاری والدہ سے دوبارہ نہیں ملے تھے۔ شاید ڈیڈی ہی یہ چاہتے ہوں گے کہ تمہاری والدہ مجھ سے نہ ملیں۔ میں نے تو انہیں لابی میں ڈیڈی کے ساتھ دیکھ لیا تھا مگر اس وقت مجھے یہ بات نہیں معلوم تھی کہ وہ تمہاری والدہ ہیں۔ یہ تو مجھے تم سے ہی معلوم ہوا۔"

"یہی تو بہتر ہوا ہے کہ وہ ہم دونوں سے واقف نہیں۔ اسی لیے تو مجھے تمہارے والد کی نگرانی میں اور تمہیں میری والدہ کی نگرانی میں دشواری نہیں ہوئی!"

"اگر وہ دونوں ہم سے واقف ہوتے تو اچھا تھا۔"

"کیوں؟" کنول نے پوچھا۔

"ممکن ہے کہ وہ اپنے تعلقات پر نظرثانی کرتے!"

"اس بڑھاپے میں ان لوگوں کو سوجھی کیا ہے؟" کنول نے جھنجلا کر کہا۔

ریحان ہنس پڑا "تمہاری والدہ ابھی بوڑھی تو نہیں! اب بھی خاصی دلکش ہیں اور ابھی ڈیڈی کی عمر بھی زیادہ نہیں۔"

"تو اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟" کنول نے آنکھیں نکالیں۔

"اس تماشے پر ہنسی نہ آئے تو کیا ہو!"

"یہ تماشا ہم دونوں کا مستقبل برباد کردے گا۔" کنول دانت پر دانت جما کر بولی۔

ریحان سنجیدہ ہوگیا۔ "تم ٹھیک کہہ رہی ہو کنول! ہمیں کچھ سوچنا پڑے گا۔ کوئی تدبیر کرنا پڑے گی۔ آج میں امریکا فون کرتا ہوں۔ ممی سے بات کروں گا۔"

"کیا کہو گے ان سے؟"

"ابھی تو میں نے نہیں سوچا۔ ابھی ابھی بس اتنا خیال ہے کہ انہیں فون کروں!"

کنول متفکر نظروں سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔



رات کے بارہ بج رہے تھے جب ریحان نے موبائل فون پر امریکا میں موجود اپنی ماں فریحہ کمال سے رابطہ کیا۔

"کیا بات ہے بیٹا؟" فریحہ کمال کی حیرت زدہ آواز سنائی دی "غالباً وہاں اس وقت آدھی رات ہوگی۔"

"ہمارے شہر میں آدھی رات کے بعد زندگی جاگتی رہتی ہے ممی!"

"پھر بھی.... آخر...."

"بات کچھ ایسی ہے ممی کہ...." ریحان متذبذب ہوگیا۔

"کیا بات ہے؟ خیریت تو ہے نا؟" فریحہ کمال کے لہجے میں تشویش تھی۔

"اگر آپ فوراً واپس آجاتیں تو اچھا تھا!"

"آخر ہوا کیا ہے؟"

"پلیز! آپ واپس آجائیں۔"

"بچوں کی طرح باتیں نہ کرو ریحان! امریکا آنا جانا ایسا تو نہیں ہے جیسے تم بیٹھے بیٹھے اٹھو اور شاپنگ کرکے گھر لوٹ آؤ!"

"کوئی اہم بات ہو تو انسان دنیا کے دوسرے کنارے پر جاکے بھی فوراً واپس آسکتا ہے۔"

"یہی تو میں پوچھ رہی ہوں کہ ایسی کیا اہم بات ہے!"

ریحان اپنے باپ کی شکایت کرتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔ وہ کچھ سوچتا ہوا بولا۔

"ایک وعدہ کیجئے ممی! آپ کسی سے کہیں گی نہیں کہ میں نے آپ کو کچھ بتایا تھا۔"

"نہ جانے تم کیا بتانا چاہتے ہو!" فریحہ کمال نے ایک طویل سانس لی "خیر! میں وعدہ کرتی ہوں۔ میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گی۔"

"جی.... وہ...."

"اب کہہ بھی چکو ریحان!" فریحہ کمال کے انداز میں تھوڑی سی جھنجلاہٹ تھی۔

"مجھے آپ سے.... ڈیڈی کے بارے میں کچھ کہنا ہے۔"

"مگر کہہ تو چکو!"

"وہ.... وہ آج کل...."

"ہاں ہاں! بولو بھئی!"

"وہ آج کل ایک خوب صورت خاتون کے پیچھے لگ گئے ہیں۔" ریحان نے جلدی سے کہا اور پھر ایسی لمبی سانس لی جیسے سر سے کوئی بھاری بوجھ اتار دیا ہو۔

"کیا!" فریحہ کمال ہنس پڑیں۔

"میں مذاق نہیں کررہا ہوں ممی!" ریحان نے جلدی سے کہا "آپ ڈیڈی کے مزاج سے اچھی طرح واقف ہیں۔"

"اچھی طرح واقف ہوں' اسی لیے تو ہنسی آگئی تمہاری بات پر!"

"بات صرف اتنی نہیں ہے ممی جتنی آپ کے سامنے

ہوئی تھی۔" ریحان نے جزبز ہو کر کہا "وہ اس خاتون سے ایک ہوٹل میں ملے تھے اور غالباً ایک دوسرے کو بہت پہلے سے جانتے ہیں۔"

"تو کیا ہوا ریحان؟ اگر وہ کسی عورت کو پہلے سے جانتے ہیں تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

"ممی! یہ بات مجھے معمولی نظر نہیں آ رہی ہے۔"

"وجہ؟"

"وہ اس عورت سے ملنے اس کے دفتر جا چکے ہیں اور وہ خاتون بھی ڈیڈی کے دفتر جا کے ان سے مل چکی ہیں۔"

"نام کیا ہے اس عورت کا....؟ وہ کرتی کیا ہے؟"

"کوثر جہاں نام ہے.... کچھ بزنس کرتی ہیں۔ ایک کمپنی ہے ان کی۔"

دوسری طرف سے کچھ رک کر کہا گیا "تو پھر.... بزنس ہی کا معاملہ ہوگا!"

"ایسی بات نہیں معلوم ہوتی ممی۔"

"تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ ایسی بات معلوم نہیں ہوتی!"

"آپ یہاں ہوتیں، اپنی آنکھوں سے دیکھتیں تو آپ کو اندازہ ہوتا۔"

"میں یہاں بیٹھ کر بھی اندازہ لگا سکتی ہوں کہ ایسا ویسا کچھ نہیں ہوگا۔"

"ممی! مجھے ڈر ہے کہ بعد میں کہیں.... آپ کو پچھتانا نہ پڑے۔"

"بے وقوف ہو!" فرخندہ کمال پھر ہنسیں "تم اپنے ڈیڈی کو مجھ سے زیادہ نہیں جانتے! بے وقوفی کی باتیں چھوڑو اور پڑ کر سو جاؤ۔ خواہ مخواہ ڈرا دیا تھا مجھے کہ نہ جانے کیا ہو گیا ہے۔"

"ممی!" ریحان نے زچ ہو جانے والے انداز میں کہا "ڈیڈی کے بارے میں آپ کچھ زیادہ ہی خوش فہمی کا شکار ہیں۔"

"اب تم مجھ سے ڈانٹ کھاؤ گے۔ اپنے دماغ میں فضول خیالات نہ لاؤ۔ بس اب سو جاؤ پڑ کر! خدا حافظ۔"

دوسری طرف سے سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔

ریحان نے جھنجلاہٹ میں اپنا موبائل فون "آف" کر کے بستر پر پھینکا اور دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ مشکل سے دو منٹ گزرے تھے کہ موبائل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے جھپٹ کر ریسیور اٹھایا۔ اسے خیال آیا تھا کہ اس کی ماں نے کچھ سوچ کر خود ہی اس سے رابطہ کیا ہو گیا لیکن اپنے موبائل فون پر کنول کا نمبر دیکھ اسے مایوسی ہوئی۔ بہرحال اس نے کال ریسیو کی۔

"بولو کنول!" وہ طویل سانس لے کر بولا۔

"میں یہ جاننے کے لیے بے چین ہوں کہ اپنی ممی سے تمہاری کیا بات ہوئی؟ تم نے کہا تھا ناکہ بارہ بجے کے قریب فون کرو گے!"

"کر چکا ہوں فون!" ریحان نے منہ بنا کر کہا "انہیں ڈیڈی کے سلسلے میں بہت زیادہ خوش فہمی ہے۔"

"کیا مطلب؟"

ریحان نے مختصر طور پر ساری گفتگو دہرا دی جو وہ فون پر اپنی ماں سے کر چکا تھا۔ سب کچھ سننے کے بعد کنول بڑی تشویش سے بولی "گویا انہیں فون کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوا؟"

"ہاں۔" ریحان نے ٹھنڈی سانس لی۔

"یہ تو برا ہوا ریحان! اب کیا ہوگا؟ ہم لوگ اب کیا کریں گے؟ مجھے تو کچھ امید بندھی تھی کہ تم اپنی ممی کو فون کرو گے تو معاملہ کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔"

"اب ہمیں ہی کچھ کرنا پڑے گا۔" ریحان نے متفکر لہجے میں کہا۔

"لیکن ہم ان کی نگرانی کے علاوہ کیا کر سکتے ہیں؟"

"کچھ تو کرنا ہی ہوگا۔"

"مگر کیا؟"

"یہ تو سوچنا پڑے گا کنول! اور تم بھی سوچو.... کل شام کو ملیں گے تو کوئی نہ کوئی لائحہ عمل طے کر لیں گے۔"

"اچھا!" کنول نے ایک طویل سانس لی۔

"شب بخیر!"

"شب بخیر!"

ریحان نے فون بند کر کے ایک طرف رکھا اور بستر پر لیٹ گیا لیکن اس کی آنکھوں میں نیند کا شائبہ تک نہ تھا۔



دوسری صبح ناشتے کی میز پر کنول نے اچانک کوثر جہاں سے کہا "ممی!... ایک بات پوچھوں آپ سے؟"

"ہاں ہاں۔" کوثر جہاں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا "ضرور پوچھو ڈیئر!"

"ڈیڈی کی موت کے بعد میں نے آپ کو اتنا خوش کبھی نہیں دیکھا جتنا خوش آپ آج کل ہیں!"

"کیا تم اپنی ماں کو خوش دیکھنا نہیں چاہتیں؟"

"کیوں نہیں ممی؟" کنول نے جلدی سے کہا "لیکن کیا آپ اپنی خوشی میں مجھے شریک نہیں کریں گی؟"

"کیوں نہیں کروں گی! کون ہے جو اپنی خوشیوں میں اپنی اولاد کو شریک نہ کرے۔ مناسب وقت آنے پر تمہیں میری خوشی کی وجہ معلوم ہو جائے گی۔" کوثر جہاں نے جواب دیا اور پھر کنول کی طرف دیکھے بغیر بولیں "بزنس میں پڑ کر میں مشینی سی زندگی گزارنے لگی تھی لیکن ایک واقعے نے ماضی کی کچھ یادیں تازہ کردی ہیں۔ میں تمہیں یہ تو بتا چکی ہوں ناکہ میں کالج کے زمانے میں بہت شوخ وشنگ ہوا کرتی تھی۔" کوثر جہاں کنول کی طرف دیکھ کر ہنسیں، پھر اچانک بولیں "تم ناشتا کرلو۔"

کنول جو غور سے ماں کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لینے لگی تھی، چونک کر ناشتے کی طرف متوجہ ہو گئی۔ اس وقت اس کا دماغ بری طرح سنسنانے لگا تھا۔ کوثر جہاں کی آواز اس کے دماغ میں بگولے کی طرح چکرانے لگی تھی "بزنس میں پڑ کر میں مشینی سی زندگی گزارنے لگی تھی لیکن ایک واقعے نے ماضی کی یادیں تازہ کردی ہیں۔"

یہ بات صاف ظاہر کر رہی تھی کہ ماضی کا کوئی ٹوٹا ہوا رشتہ ایک بار پھر استوار ہوا تھا۔

کوثر جہاں اپنی کسی سوچ میں ڈوبی ناشتا کرتی رہیں اور کنول ناشتا کرتے ہوئے تلملاتی رہی کہ ان "بڈھوں" کا رومانس تو اس کا اور ریحان کا مستقبل تباہ کردے گا۔

موبائل فون کی گھنٹی نے کوثر جہاں اور کنول کے خیالات کا سلسلہ درہم برہم کیا۔ وہ موبائل فون کوثر جہاں کا تھا ڈائننگ ٹیبل ہی پر رکھا ہوا تھا۔ کوثر جہاں نے فوراً موبائل فون اٹھایا۔ کال کرنے والے کا نمبر دیکھا اور پھر اسے آن کر کے کان سے لگالیا اور مسکراتے ہوئے بولیں "ابھی تم فون نہ کرتے تو میں خود تھوڑی دیر بعد تمہیں فون کرتی۔"

کنول کے کان کھڑے ہو گئے لیکن اس نے بظاہر اپنی توجہ کھانے پر مرکوز رکھی۔

کوثر جہاں کہہ رہی تھیں "یاددہانی کی ضرورت ہی نہیں تھی... میں تو تمہیں اس لیے فون کرتی کہ آج سہ پہر کی ملاقات منسوخ سمجھو!... کچھ وجہ ہے اس کی... سہ پہر کو میری ایک کاروباری میٹنگ ہے۔ اب یہ ہو سکتا ہے کہ رات کے کھانے پر مل لیں... آج ساڑھے آٹھ بجے شیرٹن میں آ جاؤ... ہاں... ہاں... ٹھیک ہے... او کے۔"

کوثر جہاں نے رابطہ منقطع کر کے موبائل فون پھر ڈائننگ ٹیبل پر رکھ دیا اور کنول کی طرف دیکھا لیکن وہ سر جھکائے ناشتا کرتی رہی۔

تھوڑی دیر بعد کوثر جہاں گھر سے جا چکی تھیں اور کنول اپنے موبائل فون پر ریحان سے کہہ رہی تھی "مجھے آج تو چھٹی مل گئی ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"یہ غیر ضروری ہو گیا ہے کہ آج میں تمہارے ڈیڈی پر نظر رکھوں اور تمہیں بھی آج ممی کی نگرانی کی ضرورت نہیں۔"

"کیوں؟" ریحان نے تعجب سے پوچھا۔

"آج ان کی جو ملاقات تھی، وہ منسوخ ہو گئی ہے۔ اب وہ دونوں شیرٹن میں رات کے کھانے پر ملیں گے۔ ساڑھے آٹھ بجے کا وقت طے ہوا ہے۔"

"تمہیں کیسے معلوم؟"

"موبائل فون پر ان کی گفتگو میرے سامنے ہی ہوئی تھی۔" کنول نے جواب دیا اور ذہن پر زور دے کر کوثر جہاں کا ایک ایک جملہ دہرا دیا۔

ریحان بولا "یہ بھی تو ممکن ہے کہ سہ پہر کو کسی سے ان کی کاروباری میٹنگ ہو جو انہوں نے رات کے لیے ملتوی کر دی ہو تاکہ سہ پہر کو ڈیڈی سے مل سکیں۔"

"ممی کا لہجہ وہ نہیں تھا جو کسی کاروباری شخص سے گفتگو کرتے ہوئے ہوتا ہے۔ کیا میں اتنا بھی نہیں سمجھ سکتی؟... مجھے یقین ہے کہ وہ باتیں انہوں نے تمہارے ڈیڈی سے کہی تھیں۔"

"اس کا... مطلب... ہے... کہ..." ریحان نے سوچتے ہوئے کہا "شام کو ہم دونوں شیرٹن میں ملیں گے اور چھپ کر ان کی نگرانی کریں؟"

کنول نے ایک طویل سانس لی "سمجھ میں نہیں آتا کہ ان لوگوں کی نگرانی کرنے سے ہمیں کیا فائدہ ہو گا!... ہمیں کوئی ایسی تدبیر سوچنا ہو گی ریحان کہ یہ معاملہ زیادہ آگے نہ بڑھ سکے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو، لیکن کوئی تدبیر سمجھ میں تو آئے!... ممی کو فون کرنا تو بے کار ہی رہا ہے۔ خیر!... آج شیرٹن میں ان دونوں کو دیکھنے کے بعد ہم دونوں سر جوڑ کر بیٹھیں گے۔"

"اب تک تو اس کا کوئی نتیجہ نکلا نہیں ہے!"

"اب تک نہیں نکلا تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ کبھی نہیں نکلے گا! بعض اوقات کوئی ایسی صورتِ حال بھی سامنے آجاتی ہے جو کوئی بات بجھا دیتی ہے۔"

"اچھا!" کنول نے ایک طویل سانس لی "ٹھیک ہے۔"



رات کو شیرٹن میں کوثر جہاں پہلے سے موجود تھیں جب مسرور کمال نے ان کے قریب پہنچ کر انہیں گلاب کا پھول پیش کیا۔

کچھ فاصلے پر آڑ میں کھڑے ہوئے ریحان اور کنول نے یہ منظر دیکھا۔ کنول کو تو یہ منظر دیکھ کر جیسے آگ لگ گئی "چلو یہاں سے... فوراً۔" اس نے اپنا ہونٹ کاٹتے ہوئے ریحان سے کہا "ان بڈھوں سے خدا ہی سمجھے گا۔"

ریحان بہت سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔ وہ اور کنول شیرٹن کے ایک اور حصے میں جا بیٹھے۔ ریحان نے سنجیدگی سے کہا "بات بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے کنول!"

"وہ تو میں بھی دیکھ چکی ہوں۔" کنول نے دانت پیسے "گلاب کا پھول!... ہونہہ! میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ممی کو اس عمر میں یہ سوجھے گا اور ایک خوابیدہ رومانس جاگے گا!"

"خوابیدہ رومانس؟ کیا مطلب؟"

"آج صبح میں نے ممی سے کہا تھا کہ آج کل وہ بہت خوش نظر آ رہی ہیں۔ اس پر وہ کہنے لگیں کہ بزنس میں پڑ کر وہ مشینی سی زندگی گزارنے لگی تھیں لیکن ایک واقعے نے ماضی کی یادیں تازہ کر دی ہیں۔"

"واقعہ۔" ریحان سوچتا ہوا بڑبڑایا۔ "یعنی پی سی میں ان کی اتفاقیہ ملاقات!"

"غالباً... اسی کی طرف اشارہ ہو گا ان کا۔"

"ساری گڑبڑ تمہاری وجہ سے ہوئی ہے۔" ریحان نے منہ بنا کر کہا۔

"کیوں؟" کنول نے اسے گھورا۔

"اگر اس دن تم برقع پہن کر نہ آتیں' ڈیڈی کو سب کچھ معلوم ہو جاتا تو وہ اس معاملے میں محتاط ہو جاتے۔ ان کا کوئی خوابیدہ رومانس اس طرح بیدار نہیں ہوتا۔"

کنول سوچنے لگی' پھر بولی "اب بھی یہ ہو سکتا ہے کہ میں ممی کو تمہارے بارے میں سب کچھ بتا دوں اور تم اپنے ڈیڈی سے مجھے ملوا دو۔ میں اپنی اس دن کی ایکٹویٹی پر ان سے معافی مانگ لوں گی۔"

"میرا خیال ہے کہ بات اب زیادہ آگے بڑھ چکی ہے۔ تمہاری ایکٹویٹی کی آڑ لے کر ڈیڈی تمہیں ایک بدتمیز لڑکی قرار دے دیں گے اور مجھ سے تمہاری شادی کے امکان کو مسترد کر دیں گے۔"

"تو پھر آخر اب کیا کیا جائے!" کنول نے جھنجلا کر کہا "مجھے ممی پر بہت غصہ آ رہا ہے۔"

"غصہ کرنے سے تو کوئی بات نہیں بنے گی کنول! کچھ سوچنا ہو گا!"

"تو سوچو نا!"

"میں آج ایک بار پھر ممی سے بات کروں گا۔ میرا خیال ہے "گلاب کے پھول کی بات ایسی نہیں ہے جسے ممی نظرانداز کر سکیں۔"

"کرنا تو نہیں چاہیے انہیں!... اور میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ میری ممی اتنی پاگل کیوں ہو گئی ہیں۔ کیا انہیں یہ نہیں معلوم ہو گا کہ تمہارے ڈیڈی کی ایک بیوی خدا کے فضل سے زندہ ہیں۔"

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ میں ڈیڈی کو ایسا سمجھتا تو نہیں ہوں کہ وہ تمہاری ممی کو دھوکے میں رکھیں گے!"

"اس کا پتا لگنا چاہیے!" کنول نے سوچتے ہوئے کہا۔ "ممی کو اس کا علم ہے یا نہیں' اس کا پتا لگنا چاہیے ریحان!"

"اس کا پتا تو صرف ایسی صورت میں چل سکتا ہے کہ تم اپنی ممی سے بات کرو اور میں بھی ڈیڈی کو ٹٹولنے کی کوشش کروں لیکن کیا ہم دونوں میں سے کوئی اس کی ہمت کر سکتا ہے؟"

"یہ آسان تو نہیں ہے... لیکن کچھ... کرنا تو پڑے گا نا!... آج تم اپنی ممی سے بات کر لو پھر کوئی انتہائی قدم اٹھانا ہی پڑے گا۔"



اس رات بھی ریحان نے فریحہ کمال کو بارہ بجے ہی فون کیا۔

"تمہیں کیا ہو گیا ہے ریحان؟" فریحہ کمال نے کہا "کیا آج پھر 'کل کی کہانی دہرانا چاہتے ہو؟"

"بات تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے ممی!... کل رات وہ دونوں شیرٹن میں ملے تھے اور ڈیڈی نے انہیں گلاب پیش کیا تھا۔"

"کیا بکواس کر رہے ہو!" فریحہ کمال ہنس پڑیں "اب تم مجھے جلدی بلانے کے لیے کہانیاں بھی گھڑو گے؟"

"یہ کہانی نہیں ہے ممی!" ریحان نے پُرجوش انداز میں کہا "میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ..."

"جھوٹی قسمیں کھانے کی ضرورت نہیں۔" اس مرتبہ فریحہ کمال نے بگڑ کر کہا "میں یہ سوچنے کے لیے بھی تیار نہیں ہوں کہ مسرور کوئی ایسا ویسا قدم اٹھائیں گے!"

"ٹھیک ہے۔" ریحان بھی جھنجلا گیا "نہ سوچیے آپ... جب بجلی گرے گی آپ پر' تبھی ہوش آئے گا آپ کو!"

"اب تم بدتمیزی سے بھی بات کرو گے!" فریحہ کمال کا لہجہ بے حد سخت تھا۔

ریحان نے کچھ رک کر اپنے لہجے پر قابو پاتے ہوئے کہا "آئی ایم سوری ممی!"

"اب تم مجھے اس معاملے میں فون نہیں کرنا۔" دوسری طرف سے کہا گیا اور پھر رابطہ منقطع کر دیا گیا۔

ریحان جھٹکے سے بستر پر لیٹ گیا اور موبائل فون اپنے ہاتھ میں اس طرح دبانے لگا جیسے کسی دشمن کی گردن دبا رہا ہو۔

ذرا دیر بعد اس نے موبائل فون پر کنول سے رابطہ کیا اور اس سے کہا "میں ناکام ہو گیا ہوں کنول!.... ممی تو ڈیڈی کے خلاف کچھ سننے کے لیے تیار ہی نہیں ہیں۔"

"کیا بات ہوئی؟" کنول نے بے چینی سے پوچھا۔

ریحان نے ساری باتیں دہرا دیں۔

سب کچھ سن کر کنول بڑبڑائی "عجیب چکر ہو گیا ہے!... آخر کس قسم کی عورت ہیں تمہاری ممی؟"

"ڈیڈی پر اندھا اعتماد کرتی ہیں۔"

"ان کی واپسی کب ہے؟"

"پروگرام کے مطابق تو انہیں پرسوں یا اور ایک دن بعد آ جانا چاہیے۔"

"زیادہ دیر تو نہیں ہے ان کے آنے میں، لیکن...."

"لیکن کیا؟"

"تمہارے ڈیڈی عجلت بھی تو کر سکتے ہیں.... شاید وہ ان کی واپسی سے پہلے ہی کوئی قدم اٹھا بیٹھیں۔"

"دماغ خراب ہونے لگتا ہے یہ سب کچھ سوچتے ہوئے!" ریحان نے ایک طویل سانس لی، پھر بولا "آج ڈیڈی گیارہ بجے کے قریب گھر آئے تھے۔ میں چاہتا تھا کہ ان سے بات کروں، لیکن ہمت نہیں ہو سکی۔"

"ممی بھی گیارہ بجے ہی آئی تھیں! میری بھی ہمت نہیں ہو سکی ان سے بات کرنے کی، لیکن ابھی کچھ دیر پہلے ایک تدبیر آئی ہے میرے ذہن میں۔ میں ابھی تمہیں ممی کا موبائل فون نمبر بتاتی ہوں۔ تم انہیں کل صبح آٹھ بجے فون کرو۔"

"میں فون کروں؟" ریحان بوکھلا گیا۔

"تم انہیں اپنا نام نہیں بتاؤ گے! تم ممی کے لیے ایک نامعلوم آدمی ہو گے۔ تم انہیں بتانا کہ مسرور کمال ایک شادی شدہ شخص ہے اور ان کی بیوی آج کل امریکا گئی ہوئی ہیں۔ تم یہ باتیں ان سے کس طرح کرو گے، یہ تم خود بھی سوچ سکتے ہو!"

ریحان نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

کنول کی آواز آئی "سمجھ گئے نا میری بات؟"

"سمجھ تو گیا!" ریحان نے سوچتے ہوئے کہا "لیکن صبح آٹھ بجے ہی کیوں؟"

"ان کا معمول ہے کہ وہ صبح آٹھ بجے سے پہلے پہلے ناشتے کی میز پر پہنچ جاتی ہیں۔ اس وقت میں بھی ان کے ساتھ ہوتی ہوں۔ جب تم فون کرو گے تو ان کا جواب سننے کے ساتھ ساتھ میں ان کے چہرے کے تاثرات بھی دیکھ لوں گی۔"

"کیا اس سے.... کچھ بات بن سکے گی!"

"کوشش کر لینے میں حرج کیا ہے!"

"اچھا!" ریحان نے طویل سانس لی "دیکھتے ہیں اس تدبیر پر عمل کر کے!"



دوسری صبح ریحان نے ٹھیک آٹھ بجے کوثر جہاں کے موبائل فون پر رابطہ کیا۔

"ہیلو!" دوسری طرف سے آواز آئی۔

"مجھے کوثر جہاں سے بات کرنا ہے۔" ریحان نے آواز بدلنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ اس وقت اس کے دل کی دھڑکنیں خاصی تیز ہو گئی تھیں۔

"فرمائیے! میں بول رہی ہوں۔"

"کیا آپ مسرور کمال صاحب کو اچھی طرح جانتی ہیں؟" ریحان نے سوچے سمجھے انداز میں گفتگو کا آغاز کیا تھا۔

"اس سوال کا مقصد؟.... آپ کون ہیں؟" کوثر جہاں کے لہجے میں سختی آ گئی۔

"میں آپ کا ہمدرد ہوں اور آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ مسرور کمال صاحب ایک شادی شدہ شخص ہیں۔"

"آپ مجھے یہ کیوں بتانا چاہتے ہیں؟"

"میں نہیں چاہتا کہ آپ کوئی دھوکا کھائیں! مسرور کمال صاحب سے آپ کا تعلق جس تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے، اس سے آپ کو...."

"شٹ اپ.... ہو آر یو؟"

"میں آپ کا ایک ہمدرد ہوں۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں بتا سکتا۔ میں آپ کو صرف مسرور کمال صاحب کے بارے میں بتانا چاہتا ہوں۔ وہ ایک شادی شدہ بیٹی اور ایک جوان بیٹے کے باپ ہیں۔"

"معلومات فراہم کرنے کا شکریہ۔" طنزیہ لہجے میں کہا گیا۔

"تم آئندہ مجھے فون نہ کرنا۔"

"آپ ...." ریحان کہتے کہتے خاموش ہو گیا کیونکہ

دوسری طرف سے رابطہ منقطع کیا جا چکا تھا۔

○☆○

کوثر جہاں نے موبائل فون آف کرکے رکھا تو کنول نے مصنوعی تعجب سے پوچھا "کون تھا ممی؟"

"معلوم نہیں۔" کوثر جہاں سوچتی ہوئی بولیں "اس نے اپنا نام نہیں بتایا۔"

"کیا کہہ رہا تھا؟ آپ کو اس پر غصہ کیوں آ گیا؟"

"کوئی بے وقوف آدمی تھا۔" کوثر جہاں نے منہ بنایا "مجھے خواہ مخواہ غصہ آیا۔ بے وقوف آدمیوں پر غصہ نہیں کیا جانا چاہیے۔"

"آخر کہہ کیا رہا تھا؟"

"مجھے ایک معاملے میں بدگمان کرنا چاہتا تھا۔" کوثر جہاں کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی۔

"کس معاملے میں؟"

"مناسب وقت آنے پر بتا دوں گی۔ پرسوں تمہاری سالگرہ ہے نا؟"

"جی۔"

"میں پرسوں تمہیں ایک سرپرائز گفٹ دوں گی۔"

"سرپرائز گفٹ!" کنول دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ زیرِلب بڑبڑائی۔

"ہوں۔" کوثر جہاں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ قائم رہی۔

"پرسوں تک کے لیے آپ نے میرا ذہن الجھا دیا۔"

"ہوں۔" کوثر جہاں نے اثبات میں سر ہلایا "مجھے ابھی سے اس کا ذکر نہیں کرنا چاہیے تھا لیکن تم الجھو مت.... گفٹ کبھی پریشانی کا سبب تو نہیں بنتا۔"

"بعض گفٹ بن سکتے ہیں۔" کنول نے اپنے دل میں کہا۔ وہ یہ بات اپنی زبان پر لانے کی ہمت نہیں کر سکی تھی۔

"تھوڑی دیر میں کارڈز چھپ کر آ جائیں گے۔ تم اپنی جن دوستوں کو بلانا چاہو' انہیں کارڈ پہنچا دینا۔ ویسے ٹیلی فون پر تو تم نے سب سے کہہ دیا ہوگا۔"

کنول نے آہستگی سے سر ہلایا۔ حقیقتاً اس نے کسی کو بھی فون نہیں کیا تھا۔ وہ ان دنوں ذہنی طور پر اتنی منتشر رہی تھی کہ اس کا دھیان اپنی سالگرہ کی طرف گیا ہی نہیں تھا۔ تھوڑی دیر میں کوثر جہاں چلی گئیں تو کنول نے موبائل فون پر ریحان سے رابطہ کیا۔

"ہاں! کیا رہا؟" ریحان نے پوچھا۔

"تم اس وقت کہاں ہو؟"

"میں تمہاری ممی کو فون کرنے کے بعد فوراً تمہارے گھر کی طرف روانہ ہو گیا تھا۔ مشکل سے پندرہ منٹ کی تو ڈرائیو ہے۔ اب میں تمہاری ممی کی کار کے پیچھے لگا ہوا ہوں۔ ڈیڈی ساڑھے آٹھ بجے تک گھر سے نکلیں گے۔ اب تمہیں بھی اپنے گھر سے چل پڑنا چاہیے۔"

"میرا خیال ہے کہ اب ہمیں اس طرح وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ تم بھی ممی کا تعاقب نہ کرو اور مجھ سے میکڈونلڈ میں ملو۔ میں ادھر آ رہی ہوں۔"

"لیکن...."

"جب میں تمہیں سمجھاؤں گی تو بات تمہاری سمجھ میں آ جائے گی۔ تم ممی کا تعاقب چھوڑو اور میکڈونلڈ پہنچو۔"

"اچھا!" ریحان نے ایک طویل سانس لی۔

کنول نے اپنا موبائل آف کیا اور گھر سے روانگی کی تیاری کرنے لگی۔ پندرہ منٹ بعد وہ گھر سے روانہ ہوئی۔ یہ اتفاق تھا کہ اس کی اور ریحان کی کاریں ساتھ ساتھ ہی میکڈونلڈ پہنچیں۔

وہ دونوں ریسٹورنٹ میں جا بیٹھے۔

"نگرانی کرتے رہنا لا حاصل ہے ریحان!" کنول نے کہا "نگرانی کرکے ہمیں جو کچھ معلوم کرنا تھا' وہ ہمیں معلوم ہو چکا ہے۔ اگر ان کی ملاقاتیں جاری رہتی ہیں اور جو یقیناً جاری رہیں گی تو اب انہیں ملاقات کرتے ہوئے دیکھنے سے کیا فائدہ....؟ اب تو کوئی انتہائی قدم اٹھانے کی ضرورت ہے ریحان اور اس میں تاخیر بے حد نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے۔"

"یہ بات تو میری سمجھ میں آ گئی کہ اب نگرانی کرتے رہنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔" ریحان نے کہا "لیکن کسی انتہائی اقدام کے لیے عجلت کا خیال تمہیں کیوں آیا ہے؟"

"تم نے ممی کو فون کیا تھا تو ان سے میری کچھ گفتگو ہوئی تھی۔"

"وہ کیا؟"

کنول نے وہ ساری باتیں دہرا دیں۔

"سرپرائز گفٹ۔" ریحان بڑبڑایا۔

"ہاں۔" کنول بولی "اسی بات نے مجھے پریشان کیا ہے۔"

"تمہارا خیال کدھر گیا ہے؟"

"وہ دونوں آج کل میں ہی شادی کرنے والے ہیں۔" کنول نے تلخ لہجے میں کہا "ممی اس کا اعلان میری سالگرہ کے موقع پر کریں گی۔ غالباً یہی میرے لیے وہ سرپرائز گفٹ ہوگا کہ وہ میرے سر پر ایک نئے باپ کا سایہ فراہم کر رہی ہیں۔"

ریحان عجیب سے انداز میں ہنسا اور بولا "یہ ایسی سچویشن بنی ہے کہ اس پر ہنسی بھی آرہی ہے اور غصہ بھی آرہا ہے۔"

"مجھے تو صرف غصہ آرہا ہے۔" کنول نے دانت پر دانت جما کر کہا۔

"غصے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ ہمیں ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ سوچنا ہوگا کہ ہمارا انتہائی قدم کیا ہوسکتا ہے۔"

"صرف ایک۔" کنول نے فیصلہ کن انداز میں کہا "ہم اپنے والدین کو بتادیں کہ ہم ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اور شادی کرنا چاہتے ہیں۔"

ریحان سوچنے لگا۔ قدرے توقف سے اس نے کہا "میں ایک مرتبہ.... آخری مرتبہ، ممی کو پھر فون کرلوں.... بلکہ یہ میں ابھی کرتا ہوں، تمہارے سامنے۔"

"لیکن اس وقت تو...." کنول نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا "اس وقت تو وہاں رات ہوگی۔ شاید تمہاری ممی سوچکی ہوں۔"

"میں آج یہ جسارت بھی کرگزروں گا کہ انہیں جگا کے بات کروں۔ فون کی گھنٹی انہیں جگا ہی دے گی۔"

"میرا مشورہ ہے کہ ایسا نہ کرو۔ انہیں غصہ آجائے گا تو وہ تمہاری بات ٹھیک سے سنیں گی بھی نہیں۔"

ریحان سوچ میں ڈوبی ہوئی آنکھوں سے کنول کی طرف دیکھنے لگا۔

کنول پھر بولی "انہیں رات کو ہی فون کرنا۔"

"ابھی تم کہہ چکی ہو کہ ہمیں عجلت سے کوئی قدم، کوئی انتہائی قدم اٹھانا چاہیے۔"

"لیکن جب تم اپنی ممی سے کوئی بات ایک بار پھر کرنا چاہتے ہو تو ایک دن اور گزارلیتے ہیں۔ اگر تمہارا آج کا فون بھی بے کار رہو گیا تو ہم کل دن میں اپنا اقدام کرگزریں گے۔"

"ہوں۔" ریحان پھر سوچ میں ڈوب گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ وہاں سے اٹھ گئے۔

"اگر کوئی خاص بات سامنے آئی تو ہم فون پر رابطہ کرلیں گے۔" کنول نے باہر نکلتے ہوئے کہا تھا۔

○☆○

رات بارہ بجے ریحان نے اپنی ماں کو فون کیا تو اسے فوراً ہی جھاڑ سننا پڑی۔ "تم پاگل ہوگئے ہو ریحان!" فریحہ کمال نے بڑے غصے سے کہا "غالباً اب تمہارے دماغ کے علاج کی ضرورت ہے۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ اب مجھے اس سلسلے میں فون نہیں کرنا لیکن تم باز نہیں آئے!"

"مجھے آپ سے ایک دوسری بات کہنا ہے ممی!" ریحان نے دھیمی آواز میں کہا۔

"اب دوسری بات کیا ہوگئی ہے۔"

"ایک لڑکی ہے .... کنول .... ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اور شادی کرنا چاہتے ہیں۔"

"اوہ، گاڈ!" فریحہ کمال نے ایک طویل سانس لی پھر عجیب سے انداز میں ہنسیں "میرا خیال تھا کہ تم اس قسم کے معاملات میں اپنے باپ سے مختلف ہو!"

ریحان خاموش رہا۔

فریحہ کمال نے قدرے توقف سے پوچھا "یہ رومانس کیا ابھی دو تین روز میں ڈیولپ ہوا ہے؟" انداز کچھ طنزیہ تھا۔

"نہیں ممی!" ریحان نے جواب دیا "خاصا عرصہ گزر چکا ہے۔"

"جب میں وہیں تھی تو تم نے کیوں نہیں بتایا؟ اور دوسری بات یہ بھی کہ میری بہ نسبت تم اپنے ڈیڈی سے یہ بات زیادہ آسانی سے کہہ سکتے تھے! تمہارے ڈیڈی تو عشق و محبت کے معاملات پر تم سے باتیں کرتے ہی رہتے ہیں۔" فریحہ کمال کا لہجہ پھر طنزیہ ہوگیا "انہیں تو تم سے یہ گلہ بھی رہا ہے کہ اب تک تمہاری کوئی گرل فرینڈ نہیں ہے!"

"میں یہ بات ڈیڈی کو نہیں بتاسکتا تھا۔"

"کیوں؟"

"کوثر جہاں.... کنول کی ماں ہیں۔"

"اوہ!"

ریحان خاموش رہا۔

چند لمحے بعد دوسری طرف سے ہلکی سی ہنسی سنائی دی پھر کہا گیا "پھر تو یہ رشتہ آسانی سے ہوجائے گا۔ تم مجھے بتاچکے ہو کہ آج کل تمہارے ڈیڈی کوثر جہاں کے دوست بن گئے ہیں۔"

"بات پھر وہیں آرہی ہے ممی!" ریحان نے کہا "میری اور کنول کی شادی اسی صورت میں ممکن ہے جب ڈیڈی اور کوثر جہاں کی شادی نہ ہو۔"

"ٹانگ پھر وہیں توڑی تم نے؟" فریحہ کمال کو پھر غصہ آگیا "میں کہہ چکی ہوں کہ یہ ناممکن ہے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے دوست تو ہوسکتے ہیں، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔"

"ٹھیک ہے ممی!" ریحان نے اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا "ہوسکتا ہے یہ میری غلط فہمی ہو۔"

"بس تو پھر اطمینان سے بیٹھو۔ میں آؤں گی تو سب معاملات طے کرا دوں گی۔"

"لیکن معاملہ کچھ ایسا ہے کہ فوراً طے ہونا چاہیے۔"

"کیوں؟" فریحہ کمال کا لہجہ کچھ سوچ میں ڈوبا ہوا سا تھا "کیا تم اور کنول کوئی غلطی...."

"نہیں ممی!" ریحان نے جلدی سے کہا "ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ کنول بہت اچھی لڑکی ہے اور میرا خیال تھا کہ میرے کردار پر بھی آپ کبھی شبہ نہیں کر سکتیں۔"

"تو پھر عجلت کی کیا بات ہے!"

"جب آپ آئیں گی تو آپ کو بتا دوں گا۔"

"لیکن میں کل ہی تو نہیں آسکتی۔"

"میری خاطر.... کوشش کیجئے کہ آجائیں۔"

"میں کل نہیں آسکتی۔"

"پلیز ممی! یہ بہت ضروری ہے۔"

"تم مجھے بہت پریشان کر رہے ہو ریحان!.... اچھا خیر! میں ابھی تو تمہارے ڈیڈی کو فون نہیں کر سکتی۔ یہ ان کی عجیب سی عادت ہے کہ سونے سے جاگ جائیں تو پھر انہیں رات بھر نیند نہیں آتی۔ میں انہیں سات آٹھ گھنٹے بعد فون کروں گی۔"

فریحہ کمال کی ان باتوں کے دوران میں ریحان بے چینی سے پہلو بدلنے لگا تھا۔ اس نے ماں کے خاموش ہوتے ہی کہا "اس طرح تو گڑبڑ ہو جائے گی ممی!"

"کیوں؟"

"ڈیڈی سوچیں گے کہ میں نے یہ بات آپ سے کیوں کی؟ وہ اسے آپ سے میری شکایت قرار دیں گے۔"

"اس کی فکر نہ کرو۔ میں ان سے دوسرے انداز میں بات کروں گی۔"

"لیکن وہ سمجھ جائیں گے۔"

"نہیں سمجھیں گے۔" فریحہ کمال نے جھنجلا کر کہا "ہر معاملے میں اپنی نہ چلاؤ۔ وہ کوثر جہاں کے دوست ہیں تو تم دونوں کا رشتہ آسانی سے اور فوری طور پر طے ہو جائے گا۔ بس!..... اب میں فون بند کر رہی ہوں۔ اگر تم نے دوبارہ فون کیا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔"

دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔

ریحان نے غصے میں اپنے بال مٹھی میں جکڑ لیے۔ اب اسے خیال آرہا تھا کہ اسے اپنی ماں سے یہ بات کرنی ہی نہیں چاہیے تھی۔ اسے اندیشہ تھا کہ صورتِ حال بگڑ جائے گی۔ اس نے اسی وقت موبائل فون پر کنول سے رابطہ کیا اور اسے ساری بات بتائی۔

کنول نے طویل سانس لے کر کہا "گویا تم انتہائی قدم اٹھا ہی بیٹھے!"

"لیکن یہ قدم غلط انداز میں اٹھ گیا ہے۔"

"یہ تو تمہیں بات کرنے سے پہلے سوچنا چاہیے تھا۔"

"میں نے فون کرنے سے پہلے یہ بات کرنے کے بارے میں سوچا ہی نہیں تھا۔ بس جب بات شروع ہوئی تو میں بے اختیار ہی یہ کہہ بیٹھا!"

"تو پھر.... اب؟" کنول کے لہجے میں تشویش تھی۔

"اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا کہ کل کا انتظار کیا جائے۔ ڈیڈی پر جو ردِ عمل ہوگا' اس کا سامنا تو اب مجھے کرنا ہی پڑے گا۔"

"تم نے میری آج رات کی نیند اڑا دی۔ ساری رات سوچتے ہوئے اور پریشانی میں گزر جائے گی۔"

"اگر میں تمہیں فون نہ کرتا تو تم فون کرتیں اور اس وقت بھی میں تم سے یہ سب باتیں چھپاتا تو نہیں۔"

"بہرحال!.... اب یہ فیصلہ کر لو کہ اپنے ڈیڈی کے ردِ عمل کا سامنا دیدہ دلیری سے کرو گے۔ اگر تم نے ایسا نہیں کیا تو پھر شاید ہمارے سامنے کوئی راستہ نہ رہ جائے۔ شاید ہم ساری زندگی کا پچھتاوا مول لے لیں گے۔"

"اچھا اب آرام کرو۔ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔"



اس رات خود ریحان بھی اتنا پریشان رہا کہ رات گئے تک نیند اس کی آنکھوں سے اوجھل رہی۔

دوسری صبح اس نے اپنے باپ کو خاصا سنجیدہ دیکھا اور اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں۔ اس نے اپنے خوش مزاج باپ کو برسوں میں کبھی سنجیدہ دیکھا تھا۔ انہوں نے دفتر روانگی سے قبل ریحان سے کہا "صبح تمہاری ممی کا فون آیا تھا۔"

"جی!" ریحان نے چونک کر ان کی طرف دیکھا اور نظریں جھکا لیں۔

"کنول.... کوثر جہاں کی بیٹی ہے؟"

"جی۔" ریحان کی نظریں جھکی رہیں۔

"وہی لڑکی جو برقع میں مجھ سے ملنے آئی تھی؟"

"جی۔"

"اگر کسی باعث .... اس لڑکی سے تمہاری شادی نہ ہو سکے؟"

"مم .... میں اس سے بہت محبت کرتا ہوں ڈیڈی!"

ریحان تیزی سے بولنے کی کوشش میں ہکلا گیا ”اور وہ بھی مجھ سے بہت محبت کرتی ہے۔“
”اس نے مجھ سے جو باتیں کی تھیں‘ وہ سب غلط تھیں؟“
”جی ڈیڈی!“
”اسے ڈر نہیں تھا کہ اس کی وہ باتیں اس کی اور تمہاری شادی میں رکاوٹ بن سکتی ہیں؟“
”وہ بہت شوخ اور شریر ہے ڈیڈی! اس کا خیال تھا کہ وہ بعد میں سب سنبھال لے گی۔“
مسرور کمال چند لمحے خاموشی سے اس کی طرف دیکھتے رہے پھر یکایک ریحان کی طرف دیکھ کر کہا ”تم نے اپنی ممی کو میرے اور کوثر جہاں کے بارے میں کیا بتایا تھا؟“
”کوئی.... کوئی خاص بات تو نہیں ڈیڈی؟“
”عام بات بھی بتائی تو وہ کیا تھی؟“
ریحان نے کچھ سوچ کر کہا ”کیونکہ کوثر جہاں آپ کی دوست ہیں اس لیے میں نے ممی سے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ میرا اور کنول کا رشتہ آسانی سے طے ہو سکتا ہے۔“
مسرور کمال نے اس وقت بڑی طنزیہ نظروں سے ریحان کی طرف دیکھا اور ریحان جو اس وقت انہی کی طرف دیکھ رہا تھا‘ بوکھلا کے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔
”خیر!“ مسرور کمال نے قدرے توقف سے کہا ”کل کوثر جہاں نے مجھے اپنے گھر مدعو کیا ہے۔ ان کی بیٹی کی سالگرہ ہے۔ اس خوشی کے موقع پر.... دوسرے مہمانوں کی آمد سے پہلے .... کوثر جہاں یہ فیصلہ سنا دیں گی کہ تمہاری اور کنول کی شادی ہو سکتی ہے یا نہیں۔“
”جی!“ ریحان نے پریشان ہو کر باپ کی طرف دیکھا۔
”تمہاری ممی کا فون آنے کے بعد میں نے فوراً کوثر جہاں کو فون کیا تھا۔ ہم نے آپس میں ہی طے کیا ہے کہ فیصلہ کل کیا جائے گا اور اس وقت تمہاری ممی بھی یہاں ہوں گی۔“
ریحان چونکا۔ مسرور کمال کہتے رہے ”کوثر جہاں سے بات کرنے کے بعد میں نے تمہاری ممی کو فون کیا تھا۔ میں نے ان سے کہا ہے کہ وہ کل یہاں پہنچ جائیں۔ ان کا پروگرام دو دن بعد آنے کا تھا لیکن میرے کہنے سے وہ کل ہی آ رہی ہیں۔ بہتر ہو گا کہ جو فیصلہ ہونا ہے‘ وہ کل ان کے سامنے ہو۔“
مسرور کمال کھڑے ہو گئے۔ ”دفتر کا وقت ہو گیا ہے۔ میں جا رہا ہوں۔“
اس سے پہلے کہ ریحان کچھ کہنے کی ہمت کر پاتا‘ مسرور کمال تیزی سے چلتے ہوئے باہر نکل گئے!

○☆○

اس گفتگو سے تھوڑی دیر پہلے ناشتے کی میز پر کوثر جہاں نے کنول سے کہا تھا ”کنول کیا تمہیں اپنی زندگی میں مجھ سے کوئی شکایت ہوئی ہے؟“
”جی.... نہیں.... جی نہیں ممی!“
”کیا میں نے تمہاری خواہش.... ہر خواہش پوری نہیں کی؟“
”یقیناً.... کی ہے ممی!“
”میں نے تمہیں ہمیشہ خوشیاں دی ہیں۔“
”جی ممی!“
تو کیا تم مجھے ایک خوشی نہیں دے سکتیں؟“
”کیوں نہیں.... کیوں نہیں ممی!“
”کل تمہاری سالگرہ ہے۔ اس موقع پر تم مجھے ایک خوشی دو گی؟“
”آپ.... آپ کیا چاہتی ہیں ممی؟“
”یہ تمہیں کل ہی معلوم ہو گا۔“
یہ گفتگو کنول کے ذہنی انتشار کا سبب بنی ہوئی تھی کہ موبائل فون پر ریحان کی کال آ گئی ”کیا صورتِ حال ہے؟“ ریحان نے پوچھا۔
”ممی نے مجھے خوفزدہ کر دیا ہے۔“ کنول نے کہا
”وہ کیسے؟“
کنول نے ساری بات بتا دی۔
ریحان نے ایک طویل سانس لی اور گفتگو دہرائی جو اس کے اور مسرور کمال کے مابین ہوئی تھی۔
کنول روہانسی آواز میں بولی ”اب کیا ہو گا ریحان!“
”تمہاری ممی تم سے یہی خوشی مانگ سکتی ہیں کہ تمہیں ان کی شادی پر کوئی اعتراض نہ ہو۔“ ریحان نے غصیلی آواز میں کہا ”اور میرے ڈیڈی بھی اب سرکشی پر آمادہ ہو گئے ہیں۔ وہ مجھے دکھانا چاہتے ہیں کہ انہیں جو کچھ کرنا ہے‘ وہ میری ممی کے سامنے بھی کر سکتے ہیں۔ اسی لیے انہوں نے ممی کو کل بلا لیا ہے۔“
”پھر اب کیا ہو گا ریحان؟“ کنول نے اپنا سوال دہرایا۔
”اب میرے دماغ نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے۔“ اس مرتبہ ریحان کی آواز بھرا گئی تھی۔
کنول کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس کی ساری شوخی و شرارت‘ ریت کے ڈھیر کی طرح بکھر چکی تھی۔

○☆○

دوسرے دن شام کو مسرور کمال نے ریحان کو اپنے ساتھ لیا اور کوثر جہاں کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ ڈرائیونگ وہ خود کر رہے تھے۔

ریحان نے جھجکتے ہوئے کہا "می تو ابھی تک نہیں آئیں!"

"ان کی فلائٹ کچھ لیٹ ہو گئی ہے۔ میں نے گھر پر ان کا پیغام چھوڑ دیا ہے وہ خود ہی کوثر جہاں کے گھر پہنچ جائیں گی۔"

"ہم ان کا.... انتظار نہیں کر سکتے تھے؟" ریحان کی جھجک برقرار تھی۔

"نہیں۔" مسرور کمال نے جواب دیا "کوثر جہاں نے جو وقت دیا ہے' اس وقت ہمیں وہاں پہنچ جانا چاہیے!"

ریحان چپ ہو گیا۔ اس کے سوا کر بھی کیا سکتا تھا اندرونی غصے کی وجہ سے اس کے دورانِ خون میں تیزی آ گئی تھی۔

تھوڑی دیر میں کار کوثر جہاں کے گھر پہنچ گئی۔

کوثر جہاں نے برآمدے میں ان کا استقبال کیا اور گھر کے ایک چھوٹے ڈرائنگ روم میں لے گئیں۔

"بڑے ڈرائنگ روم میں سال گرہ کا بندوبست کیا گیا ہے۔" وہ بولیں "لیکن ابھی مہمانوں کی آمد شروع ہونے میں کچھ دیر ہے۔"

"ہماری بیگم صاحبہ کی فلائٹ کچھ لیٹ ہو گئی ہے۔" مسرور کمال نے سنجیدگی سے کہا "لیکن مجھے توقع ہے کہ انہیں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔"

کوثر جہاں نے ایک ملازم سے کہا "کنول اپنے کمرے میں ہو گی۔ اس سے کہو کہ میں اسے بلا رہی ہوں۔"

ملازم چلا گیا۔ ایک ملازم ٹرالی لے کر آیا جس پر مشروبات کے گلاس رکھے ہوئے تھے۔

"اور بیٹے!" کوثر جہاں نے مسکرا کر ریحان سے کہا "کیسے ہو؟"

"جی.... ٹھیک ہوں۔" ریحان نے اپنا نچلا ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔

"کاروبار کیسا چل رہا ہے مسرور!" کوثر جہاں مسرور کمال کی طرف متوجہ ہوئیں۔

"معمول کے مطابق!"

ان میں دو چار جملوں کا تبادلہ ہوا تھا کہ کنول وہاں آ گئی۔

"سلام کرو انہیں!" کوثر جہاں نے کنول کی طرف دیکھتے ہوئے مسرور کمال کی طرف اشارہ کیا۔

کنول نے سلام کیا۔

"گلاس بھی اٹھا کر دو اپنے مہمانوں کو!" کوثر جہاں نے کہا۔

کنول نے ٹرالی سے مشروبات کے گلاس اٹھا کر مسرور کمال اور ریحان کو دیے' پھر ایک گلاس اپنی ماں کو دیا اور بیٹھ گئی۔

"تم نہیں پیو گی؟" کوثر جہاں نے پوچھا۔

"میرا جی نہیں چاہ رہا ہے می!" کنول نے نظریں جھکا لی تھیں۔

"عجیب بات ہے۔" کوثر جہاں دھیرے سے ہنسیں اور مسرور کمال کی طرف دیکھ کر بولیں "یہ پہلا موقع ہے کہ اپنی سال گرہ کے موقع پر میری بیٹی کو صبح ہی سے چپ لگی ہوتی ہے۔"

"کیا بات ہے بیٹی!" مسرور کمال نے مسکرا کر کنول کی طرف دیکھا۔

"جی.... کچھ نہیں.... ایسے ہی.... بس طبیعت ڈل ہے ذرا۔"

"مہمانوں کی آمد تھوڑی دیر میں شروع ہو جائے گی۔" کوثر جہاں نے مسرور کمال کی طرف دیکھ کر کہا "تمہاری بیگم کب تک آئیں گی؟"

"لو وہ آ گئیں!" مسرور کمال نے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

ریحان جلدی سے کھڑا ہوا لیکن اس سے پہلے کوثر جہاں اٹھیں اور لپکتی ہوئی فریحہ کمال کی طرف گئیں۔ ریحان اور کنول نے حیرت سے دیکھا کہ وہ دونوں بڑی گرم جوشی سے ملی تھیں "میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اتنے برسوں بعد تم سے اس طرح ملاقات ہو گی۔" کوثر جہاں نے کہا تھا۔

"میں بھی کہاں سوچ سکتی تھی یہ بات!" فریحہ کمال نے کہا تھا۔

وہ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ہوئے' صوفوں کی طرف آئیں۔

"یہ میری بیٹی ہے.... کنول۔" کوثر جہاں نے فریحہ کمال کا تعارف کرایا "اور تمہارے بیٹے سے میں مل ہی چکی ہوں۔ مجھے یقین ہے فریحہ کہ تمہیں یہ جوڑی پسند آئے گی؟"

ریحان اور کنول بھونچکا رہ گئے۔

فریحہ کمال نے کنول کی پیشانی چومی "تمہاری بیٹی بہت خوب صورت ہے کوثر!.... اور تم!" فریحہ کمال نے ریحان کو گھورا "تم بہت ڈفر ہو!.... گدھے! تم نے آخر کیا سمجھ لیا تھا؟"

"ڈانٹ ڈپٹ چھوڑو فریحہ!" کوثر جہاں نے ہنس کر کہا "میری بیٹی بھی کچھ کم نہیں ہے۔ یہ خود کو بہت شوخ، شریر اور ذہین سمجھتی رہتی ہے۔"

فریحہ کمال نے ہنس کر کوثر جہاں کے گلے میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا "کالج میں تم جیسی تھیں، میرا مطلب ہے، شوخ و شریر!... اس کا پاسنگ بھی تمہاری بیٹی نہیں ہوگی ورنہ یہ تمہارے اور مسرور کے ڈرامے کو سمجھ لیتی۔"

"مسرور ہی کی وجہ سے مجھے اپنی پرانی زندگی شدت سے یاد آگئی تھی اور پھر مسرور ہی کے کہنے سے یہ ڈراما کرنے میں مجھے مزہ آنے لگا تھا۔"

ریحان اور کنول ہکا بکا بیٹھے ہوئے تھے۔

"کنول!" کوثر جہاں اپنی بیٹی کی طرف متوجہ ہوئیں "آج میں تم سے صرف ایک خوشی مانگ رہی ہوں۔ اور میری خوشی یہ ہے کہ تم اچھی تعلیم حاصل کرو۔ ان دنوں تو تم نے کالج جانا بھی چھوڑ رکھا تھا۔"

"اور میں بھی یہی چاہتی ہوں۔" فریحہ کمال نے ریحان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تم دونوں ابھی بچے ہو۔ شادی سے پہلے اچھی تعلیم حاصل کرلو۔ اس کے بعد تم دونوں کی شادی بھی کردی جائے گی۔ کوثر!... کیوں نہ ان دونوں کو تعلیم کے لیے باہر بھیج دیا جائے۔"

"تم نے میرے منہ کی بات چھین لی فری!"

کنول کے چہرے پر بشاشت واپس آنے لگی لیکن ریحان کی طرح حیرت اس کی آنکھوں میں بھی تھی۔ ان دونوں کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کیا ہوا۔

ساری بات شاید وہیں کھل جاتی لیکن اسی وقت ایک ملازم نے اطلاع دی کہ مہمانوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو رہا ہے۔

"تو ٹھیک ہے نا!" کوثر جہاں نے کنول کی طرف دیکھا۔ "تم مجھے یہ خوشی دوگی نا؟ شادی سے پہلے تعلیم کے لیے باہر جانا ہو گا!... تمہاری شادی ریحان ہی سے ہو گی۔ یہی وہ سرپرائز گفٹ ہے جو تمہیں دینے کا وعدہ میں نے کل کیا تھا۔"

کنول نے اپنا سرماں کی گود میں رکھ دیا۔ اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔

ریحان نے کئی مرتبہ مسرور کمال کی طرف دیکھا لیکن وہ اس سے نظریں چرا رہے تھے۔ ان کے ہونٹوں پر شرارت آمیز مسکراہٹ تھی۔

"چلو" کوثر جہاں نے کنول کا بازو پکڑ کر اسے اٹھاتے ہوئے کہا "چل کر مہمانوں کا استقبال کرو۔"

کنول اور کوثر جہاں کے ساتھ فریحہ کمال بھی اٹھیں۔ مسرور کمال نے بھی اٹھنا چاہا لیکن ریحان نے آہستگی سے ان کا ہاتھ پکڑلیا "پلیز ڈیڈی!.... آپ ذرا دیر یہیں رک جائیں!"

"فریحہ!" مسرور کمال نے بلند آواز میں کہا "آپ کے صاحب زادے مجھے یہیں روکنا چاہتے ہیں۔ کچھ بات کرنا ہے انہیں! تم سے بات کرنے کی ہمت تو ان میں ہوگی نہیں!"

فریحہ کمال نے ہنس کر ریحان کی طرف دیکھا اور پھر مسرور کمال کی طرف دیکھ کر کہا "ٹھیک ہے۔ تم باپ بیٹے دو چار منٹ بعد آجانا۔"

کنول، کوثر جہاں اور فریحہ کمال وہاں سے چلی گئیں۔

ریحان نے باپ کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ دیے "میرا دماغ چکرایا ہوا ہے ڈیڈی! پلیز مجھے بتا دیجیے کہ یہ سب!"

مسرور کمال نے ہنس کر ریحان کے ایک دھپ لگایا۔ "جب تمہاری ماں سے میرا رومانس چلا تھا تو کوثر بھی ہمارے ساتھ ہی پڑھتی تھی۔ ہم تینوں اپنے کالج کے مثالی دوست تھے۔ میرے اور فریحہ کے رومانس کی واحد رازدار کوثر ہی تھی۔ اب یہ ایک لمبی داستان ہے کہ میری اور فریحہ کی شادی میں جو رکاوٹیں تھیں، وہ کوثر نے کس طرح دور کی تھیں۔"

"لیکن...."

"صبر کرو۔ میں سب بتا رہا ہوں۔ اس شادی میں کوثر بہت برسوں کے بعد مجھے نظر آئی تھی۔ تقریب کے دوران میں ہم دونوں میں بہت باتیں ہوئی تھیں۔ کوثر کو اپنی بیٹی سے اتنی محبت ہے کہ وہ اس کی تصویر ہر وقت اپنے پرس میں رکھتی ہے۔ اسی طرح میرے پرس میں بھی تمہاری اور تمہاری ممی کی تصویر ہر وقت رہتی ہے۔ وہ میں نے بھی کوثر کو دکھائی تھی للذا جب تم دونوں نے ہماری نگرانی شروع کی تو یہ بات ہم سے چھپی نہ رہ سکی۔ کوثر کو دیکھ کر میری اور مجھے دیکھ کر کوثر کی رگِ شرارت پھڑک اٹھی تھی للذا ہم دونوں تم سے تفریح لیتے رہے۔ فون پر ہم دونوں نے تمہاری ماں سے بھی رابطہ کرلیا تھا اور وہ بھی ہمارے اس کھیل سے محظوظ ہونے کے لیے تیار ہوگئی تھیں۔ بس اب چلو۔" مسرور کمال کھڑے ہوگئے "اب تم اتنے ڈفر بھی نہیں ہو کہ باقی باتیں خود نہ سمجھ سکو۔"

پندرہ دن بعد کنول اور ریحان کو اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکا بھیج دیا گیا۔





تماشائے فطرت
اریج اقبال

پچپن سالہ رشید خاں کوشش تو کر رہا تھا کہ اس کی بیساکھی کی آواز اتنی زیادہ نہ ہو کہ برابر کے کمرے میں لیٹی ہوئی اس کی جوان بیٹی صبیحہ اور نوعمر بیٹے عاصم کی نیند میں خلل پڑے اور وہ بے دار ہو جائیں لیکن اسی کمرے میں لیٹی ہوئی اس کی بیوی ساجدہ کو اندیشہ تھا کہ رات کے سناٹے میں ''کھٹ کھٹ'' کی وہ کم آواز بھی سوتے ہوئے دماغوں پر ہتھوڑے کی طرح برس سکتی ہے۔

شریک حیات اگر سمجھ دار ہو تو شوہر کا مزاج سمجھنے میں اسے بہت کم وقت لگتا ہے لیکن ساجدہ تو رشید خاں کے ساتھ ایک چوتھائی صدی سے کچھ زیادہ ہی گزار چکی تھی۔ اسے خوب اندازہ تھا کہ اس وقت اس کے شوہر کے دل پر کیا گزر رہی تھی اور دماغ میں کیسا کہرام برپا تھا۔

بستر پر لیٹے لیٹے رشید خاں کے جسم میں بے چینی کے اتنے کانٹے چبھے تھے کہ اس نے بیساکھی کے سہارے کمرے میں ٹہلنا شروع کر دیا تھا۔ جب سے ایک حادثے میں اس کی دائیں ٹانگ ضایع ہوئی تھی، وہ بیساکھی اس کے جسم کا لازمی حصہ بن گئی تھی اور دس مہینے میں شاید وہ بھول بھی گیا تھا کہ وہ بیساکھی اس کے جسم کا اضافی حصہ تھی۔

جب رشید خاں کو ٹہلتے ہوئے زیادہ دیر ہو گئی تو ساجدہ سے چپ نہ رہا گیا اور وہ بول پڑی۔ ''نیند نہیں آ رہی ہے تو بیٹھ جاؤ، بیٹھے رہو۔ اس طرح آخر کب تک.....'' ساجدہ کی آواز بھرا گئی۔ وہ اپنا جملہ پورا نہیں کر سکی۔

ساجدہ کی آواز سن کر رشید خاں میکانکی انداز میں، جہاں تھا وہیں رک گیا۔ وہ اس وقت ساجدہ کے پلنگ کے قریب ہی تھا۔ چند لمحے وہ ساجدہ کی طرف دیکھتا رہا پھر ایک قدم بڑھا کر اسی کے پلنگ پر بیٹھ گیا اور ساجدہ کو بھی یہ اچھا نہ لگا کہ وہ لیٹی رہتی۔

''ساجدہ!'' رشید خاں سپاٹ اور دھیمی آواز میں بولا۔ ''میں سارا دن یہی سوچتا رہا تھا کہ آج جب ہماری پیاری بیٹی اپنی پہلی تنخواہ لے کر دفتر سے آئے گی تو اس گھر کے در و دیوار سے لپٹی ہوئی غربت کے سائے مدھم پڑنے لگیں گے اور ہمیں کچھ سکون کا سانس ملے گا لیکن.....'' رشید خاں نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور خاموش ہو گیا۔

ساجدہ نے رشید خاں پر ایک نظر ڈالی اور سر جھکا لیا۔

چند لمحے بعد رشید خاں پھر بولا۔ ''ہماری صبیحہ بہت سیدھی ہے ساجدہ! وہ تو کچھ سمجھی ہی نہیں ہے۔ اس نے تو آ کر بڑی خوشی خوشی بتا دیا کہ پہلی تنخواہ ملنے پر اس کے باس نے اسے مبارک باد کے ساتھ گل دستے کا تحفہ دیا ہے لیکن مجھے تو وہ گل دستہ لگا ہی نہیں۔ وہ تو کانٹوں کا ایک ڈھیر تھا جس نے میری روح میں ان گنت زخم ڈال دیے۔''

''جانتی ہوں میں۔'' ساجدہ نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''بچی تو ہوں نہیں کہ اس گل دستے کا مطلب نہ سمجھتی۔ یہ تو ایک طوفان کی آہٹ ہے لیکن میرا دماغ تو یہ سوچ سوچ کر بھی تھکا ہے کہ آنے والے دوسرے طوفان کو کس طرح روکا جا سکتا ہے۔''

''دوسرا طوفان؟'' رشید خاں نے سوالیہ نظروں سے بیوی کی طرف دیکھا۔

''ہاں۔'' ساجدہ نے سر ہلایا۔ ''سبھی کو تو معلوم ہو چکا ہے کہ صبیحہ کو پندرہ ہزار روپے کی ملازمت مل گئی ہے۔ اب تو خاموش قرض خواہوں کے تیز، نوکیلے تقاضے ہمارے گھر کے دروازے میں سوراخ ڈال دیں گے..... جنرل اسٹور والے، دودھ والے یا سبزی والے جیسے لوگوں کو تو شاید کچھ سمجھایا بھی جا سکتا ہے مگر ان عزیزوں کی زبانیں بڑی زہریلی ہو جائیں گی جن کے ہم قرض دار ہیں۔ ہر شخص یہ چاہے گا کہ پہلے اس کا قرض ادا کیا جائے۔''

رشید خاں آہستگی سے اثبات میں سر ہلانے لگا پھر عجیب سے لہجے میں بولا۔ ''لیکن..... یہ ممکن تو اسی صورت میں ہے نا کہ صبیحہ کی ملازمت برقرار رہے۔''

ساجدہ نے چونک کر رشید خاں کی طرف دیکھا۔

''ہاں ساجدہ۔'' رشید خاں نے کہا۔ ''میں بس یہی فیصلہ کر سکا ہوں کہ صبیحہ کل سے ملازمت پر نہ جائے۔ جو بات گل دستے سے چلی ہے، وہ آگے تو بڑھے گی لہٰذا اس سے پہلے کہ اس کی آنچ ہماری عزت کے دامن تک پہنچے، ہمیں اس پر پانی ڈال دینا چاہیے۔'' پھر یکایک رشید خاں کے لہجے میں ایک عجیب سی سختی اور آواز میں غصے کی لہر آ گئی۔ ''یہ دولت مند..... یہ پیسے والے..... شاید اپنا حق سمجھتے ہیں غریبوں کی عزت سے کھیلنا۔''

ساجدہ کی نظریں جھک گئیں۔ وہ کچھ توقف سے بولی۔ ''یہ فیصلہ اتنی جلدی نہ کرو۔''

رشید خاں نے چونک کر ساجدہ کی طرف دیکھا۔ ''کیا مطلب؟ کیا کہنا چاہتی ہو تم؟ کیا میں یہ فیصلہ اس وقت کروں جب ہماری عزت کا دامن جل کر خاک ہو چکا ہو؟''

''دیکھو۔'' ساجدہ نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''اس میں تو شک نہیں کہ ہماری صبیحہ بہت سی لڑکیوں کی طرح تیز و طرار نہیں ہے۔ اسی لیے وہ اس گل دستے کا مطلب فوراً نہیں سمجھ سکی، لیکن وہ بے وقوف بھی نہیں ہے اگر بات آگے

بڑھتی نظر آئی تو اس کی سمجھ میں سب کچھ آجائے گا۔ وہ خود ہی چھوڑ دے گی ملازمت۔''

''یہ تم کیوں چاہتی ہو ساجدہ؟'' رشید خاں نے کچھ حیرت سے کہا۔ ''یہ فیصلہ صبیحہ پر کیوں چھوڑا جائے؟''

''بس یہ سوچ رہی ہوں کہ بات شاید وہ نہ ہو جو ہمارے دماغ میں آئی ہے۔''

''یہ خیال تمہیں کیوں آیا؟''

''دنیا میں سبھی تو برے نہیں ہوتے...... ہوسکتا ہے، صبیحہ کا باس بھی برا آدمی نہ ہو، وہ گل دستہ اس نے خلوص نیت اور صاف دل سے دیا ہو۔''

رشید خاں کے ہونٹوں پر تلخ سی مسکراہٹ آگئی۔ ''تم یہ خطرہ اس لیے مول لینا چاہتی ہو کہ ہم ایک اذیت ناک زندگی گزار رہے ہیں اور میں کچھ کرنے کے قابل نہیں رہا ہوں؟'' رشید خاں نے کہا اور پھر کپکپاتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''نہیں ساجدہ!... میں اس قابل تو ہوں کہ خودکشی کرسکوں۔''

ساجدہ نے رشید خاں کی طرف دیکھا اور بولی۔ ''زندگی سے کچھ ایسا پیار تو مجھے بھی نہیں رہا ہے۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ''خودکشی میں بھی کرسکتی ہوں لیکن...... اس کے بعد کیا ہوگا؟...... آصف کی بیماری طول کھینچ گئی ہے، اسے اچھے علاج کی ضرورت ہے اور پھر ہماری صبیحہ ہے۔ ہماری جوان بیٹی جو ہمارے بعد دنیا کے طوفانوں میں تھپیڑے کھانے کے لیے بے سہارا ہو جائے گی...... کیا پھر ہماری روحوں کو سکون مل سکے گا؟ کیا مر کر بھی ہم چین پاسکیں گے؟''

اس بات پر رشید خاں کی آنکھوں سے بھی آنسو ابل پڑے۔ وہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر سسکیاں لیتے ہوئے بولا۔ ''خدا ہم جیسے بدنصیبوں کو آخر بیٹی دیتا ہی کیوں ہے؟''

ساجدہ کچھ نہیں بولی۔ اس نے دوپٹے سے اپنی آنکھیں خشک کیں، اٹھ کر ایک گلاس میں پانی لائی، رشید خاں کو پلایا پھر کہا...... ''اب جا کے بستر پر لیٹو! سونے کی کوشش کرو۔''

''مجھے نیند نہیں آئے گی ساجدہ۔''

''نیند تو...... کہتے ہیں، کانٹوں پر بھی آجاتی ہے۔''

''مجھے تو بستر پر کانٹے نہیں...... انگارے بچھے ہوئے لگ رہے ہیں۔''

''کوشش تو کرو۔'' ساجدہ کے لہجے میں درد تھا۔ ''ساری رات بیٹھے تو نہیں رہ سکتے...... نڈھال ہو جاؤ گے، طبیعت خراب ہو جائے گی۔''

ساجدہ کے سمجھانے بجھانے پر رشید خاں نے بیساکھی سنبھالی۔ ساجدہ نے اسے سہارا دیا اور وہ اٹھ کر اپنے بستر پر جا لیٹا۔

اپنے بستر پر ساجدہ بھی لیٹ گئی لیکن نیند اس کی آنکھوں سے بھی اڑی ہوئی تھی، بے کلی کے عالم میں تو وہ بھی تھی، دل تو اس کا بھی بھر رہا تھا۔

صرف دس مہینے میں اس گھر کی دنیا بدل گئی تھی۔

رشید خاں زیادہ تعلیم یافتہ تو نہیں لیکن محنتی آدمی تھا۔ اس کی زندگی ملازمتیں کرتے گزری تھی۔ کم آمدنی کے باوجود اس نے اپنے بچوں کی تعلیم کا خاص خیال رکھا تھا۔ صبیحہ بی اے کر چکی تھی اور دس سال کا بیٹا عاصم اسکول کا طالب علم تھا مگر سال بھر سے اسکول نہیں جا سکا تھا۔ اس کی جان کو ایک ایسی بیماری لگ گئی تھی جس کا علاج ٹھیک سے نہیں ہو پا رہا تھا یا ڈاکٹر اس کی بیماری سمجھنے سے قاصر رہا تھا۔ اس کے معدے میں تکلیف رہتی تھی۔ کچھ کھایا نہیں جاتا تھا اگر زبردستی کچھ کھاتا تھا تو معدے میں جلن اور تکلیف کے بعد قے ہو جاتی تھی۔ اسی لیے وہ بہت کمزور، بہت لاغر ہو گیا تھا۔

سال بھر پہلے تک رشید خاں ایک ریکروٹنگ ایجنٹ کا ملازم تھا۔ ملازمت کو پانچ سال گزر چکے تھے کہ ریکروٹنگ ایجنٹ کوئی غیر قانونی کام کرتے ہوئے گرفتار ہو گیا۔ ریکروٹنگ ایجنسی بند ہو گئی۔ رشید خاں کسی اور ملازمت کی تلاش میں دو مہینے تک سرگرداں رہا لیکن ایک حادثے میں اس کی دائیں ٹانگ ضایع ہو گئی۔ بہت دن تک اسے ایک اسپتال میں رہنا پڑا اور پھر جب وہ گھر لوٹا تو بیساکھی کے سہارے۔

ساجدہ کسی نہ کسی سے کچھ قرض لے کر گھر چلاتی رہی تھی۔ اور چند مہینوں میں اچھا خاصا قرض ہو گیا تھا۔ اس کی ادائیگی کی کوئی صورت بھی نظر نہیں آرہی تھی کہ پچھلے مہینے صبیحہ کو پندرہ ہزار روپے کی ملازمت مل گئی۔ ملازمت کے لیے کوششیں وہ خود بھی کرتی رہی تھی۔ اسے ملازمت ملی تو ساجدہ اور رشید خاں کو ایسا لگا جیسے کوئی خزانہ ہاتھ میں آنے والا ہو۔ ساجدہ منصوبے بنانے لگی کہ وہ گھریلو اخراجات، کم سے کم کر کے باقی رقم سے دھیرے دھیرے لوگوں کا قرض اتارے گی لیکن صبیحہ نے ببانگ دہل کہہ دیا تھا کہ پہلے وہ اپنے بھائی عاصم کا علاج کسی بڑے ڈاکٹر سے کرائے گی، چاہے کتنی بھی فیس ادا کرنی پڑے۔ وہ عاصم کو بہت چاہتی تھی۔

لیکن اب۔

ماں اور بیٹی...... دونوں ہی کو اپنے خواب بکھرتے ہوئے سے لگ رہے تھے لیکن اس وقت ساجدہ کو اپنی بیٹی کے جذبات کا علم نہیں تھا۔

☆☆☆

دوسرے کمرے میں صبیحہ تکیے میں منہ دیے خاموشی سے آنسو بہا رہی تھی۔ اس نے اپنے والدین کی ساری باتیں سنی تھیں۔ ان باتوں نے اسے شدید اذیت میں ڈال دیا تھا۔ وہ باربار عاصم کی طرف بھی دیکھتی رہی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ بیساکھی کی ''کھٹ کھٹ'' سے عاصم کی آنکھ کھل جائے۔

صبیحہ روتی رہی اور سوچتی رہی کہ اب کیا ہوگا؟ اگر دوسرے دن اسے ملازمت پر نہ جانے دیا جاتا تو پھر کسی اچھے ڈاکٹر سے اس کے بھائی کا مستقل علاج نہیں ہوسکتا تھا اور قرض خواہوں کے تقاضوں کی شدت بھی بڑھے گی۔ وہ ضرور پوچھیں گے کہ اتنی معقول ملازمت آخر کیوں چھوڑ دی گئی اور انہیں ان کے سوال کا جواب بھی نہیں دیا جاسکے گا۔

صبیحہ روتی رہی، سوچتی رہی اور اس کے دماغ میں اپنے والدین کی باتیں بھی گونجتی رہیں۔ اس نے گل دستہ پا کر واقعی وہ سب کچھ نہیں سوچا تھا جو وہ اپنے ماں باپ کی زبان سے سن چکی تھی، اور وہ اتنی بے وقوف بھی نہیں تھی کہ ان باتوں کو بے بنیاد قرار دے دیتی۔ وہ ساری باتیں تو کسی کوڈیالے سانپ کی طرح اس کے سارے وجود کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے تھیں لیکن ماں نے جو باتیں کہی تھیں، اسے ان باتوں سے کچھ ڈھارس بھی مل رہی تھی کہ دنیا میں سبھی لوگ برے تو نہیں ہوتے۔

رات کسی نہ کسی طرح گزر ہی گئی۔ صبح وہ کوشش کرتی رہی کہ اس کے چہرے کے تاثرات یا حرکات وسکنات سے یہ ظاہر نہ ہوجائے کہ اس نے اپنے ماں باپ کی باتیں سن لی تھیں۔ وہ عاصم سے چھیڑ چھاڑ کرتی رہی۔ اس نے عاصم کو یہ یقین بھی دلایا کہ آج وہ کسی اچھے ڈاکٹر کے بارے میں معلومات بھی حاصل کرے گی تاکہ اس سے عاصم کا علاج جلد ازجلد شروع کرایا جائے۔

رشید خاں اور ساجدہ چپ چپ سے تھے لیکن صبیحہ ایسی بنی رہی جیسے ان دونوں کی خاموشی میں وہ کوئی معنی خیزی محسوس نہ کرسکی ہو پھر جب ناشتا کرنے کے بعد وہ دفتر جانے کے لیے تیار ہونے لگی تو اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اسے دفتر جانے دیا جائے گا یا نہیں۔

لیکن اسے نہیں روکا گیا۔

مگر جب وہ اپنے دفتر جانے والے روٹ کی بس میں سوار ہوئی تو بھی اسے مکمل اطمینان نہیں تھا۔ وہ یقین اور بے یقینی کے دو پاٹوں میں پھنسی ہوئی تھی۔ اس کے لیے اندازہ لگانا بھی مشکل تھا کہ مستقبل میں کیا حالات پیش آئیں گے اور اسے کیا فیصلہ کرنا پڑے گا۔

☆☆☆

پینتالیس سالہ ارسلان شاہ جب اپنے خوب صورت بیڈ روم میں داخل ہوا تو اس کی چالیس سالہ بیوی احمر سلطانہ بھی اس سے گھریلو قسم کی باتیں کرتے ہوئے اس کے ساتھ ساتھ تھی۔ بیڈروم میں جب ارسلان شاہ اپنا کوٹ اتارنے لگا تو احمر سلطانہ نے اس کی مدد کی۔ ارسلان شاہ کا کوٹ لے کر وہ وارڈروب کی طرف بڑھی۔ وارڈروب سے اس نے ہینگر نکالا۔ اس وقت ارسلان شاہ اپنی ٹائی ڈھیلی کرکے بستر پر بیٹھا اپنے جوتے کے فیتے کھول رہا تھا۔

''آج خانساماں سے میں نے ایک چیز بنوائی ہے۔'' احمر سلطانہ نے وارڈروب بند کرتے ہوئے کہا اور پھر کمرے سے جانے کے لیے دروازے کی طرف قدم بڑھائے۔ ''ابھی آتی ہوں، ذرا کچن کا ایک چکر لگالوں۔''

''کھانے میں تو ابھی دیر ہوگی۔'' ارسلان شاہ نے خیال ظاہر کیا۔

احمر سلطانہ نے اپنی کلائی کی گھڑی میں وقت دیکھتے ہوئے کہا۔ ''جی ہاں، ابھی ایک گھنٹا تو لگے گا۔''

''اچھا تو مجھے ایک ڈرنک بنا کے دیتی جاؤ ذرا تھکن اتر جائے گی، چاق وچوبند ہوجاؤں گا۔''

احمر سلطانہ ہنس کر پلٹتی ہوئی بولی۔ ''آپ کو تو بس بہانہ چاہیے۔''

ارسلان شاہ جوتے اتار کر موزے بھی اتار چکا تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے احمر سلطانہ کی طرف دیکھا اور پھر سائیڈ ٹیبل سے پائپ اٹھا کر اس میں تمباکو بھرنے لگا۔

احمر سلطانہ نے اس کے لیے ایک گلاس بنا دیا اور پھر دروازے کی طرف بڑھی۔

ارسلان شاہ نے دروازے کی طرف بڑھتی ہوئی احمر سلطانہ کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا، خوب صورت تو اب بھی ہے میری بیوی..... لیکن.....

جانے کیا خیال آیا تھا اس کے ذہن میں کہ وہ دھیرے سے ہنس دیا اور پھر گلاس ہونٹوں سے لگا کر ایک چھوٹا سا گھونٹ لیا۔ گلاس سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر وہ اپنے گلے میں جھولتی ہوئی ٹائی اتارتے ہوئے بستر سے اٹھا۔ جب احمر سلطانہ واپس آئی، وہ کپڑے تبدیل کرکے بستر پر نیم دراز ہوچکا تھا اور شراب کا گلاس اس کے ہاتھ میں تھا۔

''ایک ڈرنک تم اپنے لیے بھی بنالو۔'' ارسلان شاہ نے احمر سلطانہ سے کہا۔

''نہیں۔'' احمر سلطانہ نے کہا۔ ''مجھے کچھ بات کرنا ہے آپ سے۔''

''ارے تو ایک ڈرنک سے کیا فرق پڑ جائے گا...... بلکہ...... ڈرنک کرتے ہوئے باتیں کرنے میں مزہ بھی آتا ہے۔''

''معاملہ بہت سنجیدہ ہے ارسلان!'' احمر سلطانہ نے کہا اور ایک کرسی بستر کے قریب گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔ ''کل سے سوچ رہی تھی کہ اس معاملے میں آپ سے بات کروں بھی یا نہیں!''

''کوئی بہت گمبھیر مسئلہ ہے کیا؟''

''ہاں، گمبھیر تو ہے۔''

ارسلان شاہ نے ایک گھونٹ لے کر احمر سلطانہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم تو بہت ہی سنجیدہ نظر آرہی ہو۔''

''بات ہی کچھ ایسی ہے۔'' احمر سلطانہ واقعی بہت سنجیدہ تھی۔ ''شاید آپ کو یاد بھی نہ ہو میری ایک دوست ہے، فیروزہ...... چند سال پہلے وہ اپنے شوہر کے ساتھ امریکا جا کے وہیں سیٹل ہوگئی ہے۔''

''مجھے واقعی یاد نہیں۔'' ارسلان شاہ نے کہا۔ ''تمہاری دوستوں کی کمی تو ہے نہیں۔ مجھ جیسا شخص کیسے یاد رکھ سکتا ہے ان سب کو۔''

احمر سلطانہ کسی طرف دیکھتی ہوئی کچھ سوچنے لگی۔ ارسلان شاہ نے گھونٹ لیتے ہوئے بھی احمر سلطانہ کے چہرے پر نظر رکھی۔

''اچھا پہلے آپ ایک بات بتائیں۔'' احمر سلطانہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''اپنے دوستوں میں انسانی فطرت کے بارے میں بہت کچھ کہتے رہتے ہیں۔ آج آپ مجھے اس بارے میں کچھ بتائیں...... کیا یہ ممکن ہے کہ شادی شدہ عورت جو، جوانی کی حد سے بھی گزر چکی ہو، اپنے شوہر کے علاوہ کسی سے محبت کرنے لگے۔''

''اوہ!'' ارسلان شاہ کے منہ سے نکلا اور پھر اس نے دو بڑے گھونٹ لے کر گلاس خالی کر دیا۔ ''بات شاید میری سمجھ میں آ گئی ہے۔ مسئلہ واقعی گمبھیر ہے۔ مجھے ایک ڈرنک اور بنا دو۔''

اس مرتبہ احمر سلطانہ اٹھی تو اس نے ارسلان شاہ کے لیے ڈرنک بنانے کے ساتھ اپنے لیے بھی ایک گلاس بنا لیا۔

''گڈ!'' ارسلان شاہ نے سر ہلایا۔ ''ایسے گمبھیر مسئلے پر بات کرتے ہوئے ڈرنک لینا ضروری ہو جاتا ہے۔''

''میرے ذہن پر واقعی بہت بوجھ ہے۔'' احمر سلطانہ نے کرسی پر بیٹھ کر ایک گھونٹ لیا۔

ارسلان شاہ بولا۔ ''یہ کوئی ایسا معاملہ بہر حال نہیں ہے جس کا تجزیہ کرنے کے لیے بہت زیادہ غور و فکر کی ضرورت ہو۔ محبت تو کیا، کوئی بھی جذبہ انسان کے دل میں کسی وقت بھی پیدا ہو سکتا ہے۔ اس میں عمر کی کوئی قید نہیں ہوتی۔''

''میں شادی شدہ عورت کی بات کر رہی ہوں اور میرا سوال خاص طور سے محبت کے جذبات کی طرف ہے۔''

ارسلان شاہ نے ایک گھونٹ لے کر کہا۔ ''میں اسی طرف آرہا ہوں۔ کیا ہمارے سامنے ایسی مثالیں نہیں ہیں کہ شادی شدہ مرد کسی دوسری عورت یا لڑکی کی محبت میں گرفتار ہو کر اس سے شادی کر لیتے ہیں۔''

''میں عورت کی بات کر رہی ہوں ارسلان۔''

''وہی میں بھی کہنے جا رہا ہوں کہ عورت بھی انسان ہی ہوتی ہے اگر کسی شادی شدہ مرد کے دل میں کسی دوسری عورت کی محبت پیدا ہو سکتی ہے تو کسی شادی شدہ عورت کے دل میں بھی کسی دوسرے مرد کی محبت پیدا ہو سکتی ہے۔ اس میں فساد بس یہ ہے کہ ہمارے یہاں کی عورت معاشرتی قید و بند کی وجہ سے اپنی دوسری محبت کو اپنے اندر ہی اندر کچلتی رہتی ہے اور اس کا ذکر بھی اپنی زبان پر کبھی نہیں لاتی۔''

''اب میں آپ سے بہت صاف صاف سوال کروں گی۔'' احمر سلطانہ نے کہا۔ ''کسی شادی شدہ عورت کا یہ فعل کیا مجرمانہ ہے؟''

''کم از کم میں تو اسے مجرمانہ نہیں مانتا۔'' ارسلان شاہ نے کہا۔ ''یہ سب کچھ تو ایک فطری معاملہ ہے۔ انسان اپنے جذبات کچل تو سکتا ہے لیکن یہ اس کے اختیار میں نہیں ہے کہ وہ ان جذبات کو پیدا ہونے دے، یا اُبھرنے نہ دے۔''

''اور اگر وہ عورت، اپنے محبوب سے زیادہ قریب ہو جائے تو؟''

ارسلان شاہ نے فوراً گلاس منہ سے لگا کے ایک بڑا گھونٹ لیا، پھر سر ہلاتے اور کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''اگر بڑے کینوس میں دیکھا جائے تو تمہارا یہ سوال خاصا پیچیدہ ہے۔''

''آپ اسے بڑے کینوس میں کیوں دیکھ رہے ہیں۔ اس سوال کو بھی اسی کینوس میں دیکھیے جس میں آپ محبت کے معاملے میں عورت اور مرد کو یکساں سمجھ رہے ہیں۔''

''دراصل یہاں سے بات آجاتی ہے اخلاقی حدود کی اور مختلف معاشرے یا بعض افراد ان حدود کا تعین اپنی سوچ اور اپنے نظریات کے مطابق کرتے ہیں۔''

''آپ اپنی اخلاقی حدود کا کیا تعین کریں گے؟ میں تو اس معاملے میں آپ کا نظریہ جاننا چاہتی ہوں۔''

ارسلان شاہ دھیرے سے ہنس پڑا اور محبت بھری نظروں سے احمر سلطانہ کی طرف دیکھنے لگا۔

''جواب دیجیے ارسلان!...... آپ اس طرح میری

طرف کیا دیکھنے لگے؟''
''مجھے کالج کا زمانہ یاد آ گیا۔ تم کالج کی سب سے کامیاب ڈیبیٹر تھیں۔ تمہاری اسی صلاحیت نے مجھے تمہارا گرویدہ بنایا تھا۔''
''اب وہ زمانہ آپ کہاں یاد کرنے لگے۔'' احمر سلطانہ کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ نظر آئی۔
''اس لیے کہ تم آج بھی ویسی ہی سنجیدگی سے کسی گمبھیر مسئلے پر بات کرسکتی ہو۔''
''ان باتوں میں آپ میرا سوال کیوں ٹال رہے ہیں؟''
''ٹال نہیں رہا ہوں۔ بس خوشی ہو رہی ہے مجھے کہ تم آج بھی، عام قسم کی بیویوں کی طرح روایتی قسم کی باتوں کے بجائے اتنے سنجیدہ مسائل پر سوچ سکتی ہو۔''
''سوچنے کی ضرورت تو مجھے اپنی دوست کی وجہ سے پڑی ہے۔''
''وہ تو خیر میں تمہاری باتوں سے سمجھ گیا ہوں کہ وہ اپنے شوہر کے ہوتے ہوئے بھی کسی اور سے محبت کرنے لگی ہے۔''
''اور بہت پریشان ہے اس سلسلے میں ایک ہفتے سے تقریباً روزانہ ہی مجھے فون کر رہی ہے۔ بہت دیر تک باتیں کرتی رہتی ہے۔ میری تو سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ اسے کیا جواب دوں۔ اسی لیے میں آپ سے مشورہ کر رہی ہوں لیکن آپ میرے اس سوال کا جواب دینے سے گریز کر رہے ہیں کہ عورت اگر اپنے محبوب سے بہت زیادہ قریب ہو جائے تو اسے کیا سمجھا جائے گا۔ آپ میرا مطلب تو سمجھ گئے ہوں گے۔ قربت سے میری مراد یہ ہے کہ......''
''میں سمجھ رہا ہوں تمہاری بات۔'' ارسلان شاہ بول پڑا اور پھر ایک گھونٹ لے کر احمر سلطانہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''کیا تمہاری دوست اپنے محبوب سے اتنا قریب جا چکی ہے؟''
''ابھی تو نہیں گئی لیکن اس کے جذبات کی شدت کو محسوس کرتے ہوئے میں سمجھ رہی ہوں کہ ایسا کسی وقت ہو تو سکتا ہے۔''
''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ اس کا امکان تو ہے۔ محبت کے معاملات میں یہ حیوانی جذبہ بھی کسی وقت سر اٹھا لیتا ہے اور اگر وقت اور ماحول اس میں حارج نہ ہوں تو انسان اس دھارے میں بے بس تنکے کی طرح بہہ جاتا ہے۔''
''میری دوست بھی اسی خیال سے پریشان ہے کہ کسی وقت ایسا نہ ہو جائے۔''
''وہ اپنے شوہر سے طلاق کیوں نہیں لے لیتی؟ پھر وہ اپنے محبوب سے شادی کرسکتی ہے۔''
''مشکل تو یہی ہے کہ وہ اپنے شوہر سے بھی محبت کرتی ہے اور اسے چھوڑنا نہیں چاہتی۔''
''ہوں۔'' ارسلان شاہ نے متفکر انداز میں سر ہلایا۔ ''بعض اوقات یہ بھی ممکن ہے کہ محبت دو طرف تقسیم ہو جائے۔''
''اسی لیے تو میں آپ کا مشورہ چاہتی ہوں کہ ان حالات میں میری دوست کو کیا کرنا چاہیے؟''
ارسلان شاہ نے ایک بڑا گھونٹ لے کر اپنا گلاس خالی کر دیا لیکن احمر سلطانہ کا گلاس ابھی خالی نہیں ہوا تھا اور وہ سوالیہ نظروں سے ارسلان شاہ کی طرف دیکھ رہی تھی۔
وہ کچھ رک کر سوچتے ہوئے بولا۔ ''وہ لوگ...... میرا خیال ہے کہ قابل رحم ہوتے ہیں جو اس قسم کی صورت حال سے دوچار ہو جائیں۔ انہیں کوئی بھی مشورہ دیا جائے، وہ ان کے لیے قابل عمل نہیں ہوتا کم از کم میں یہی سمجھتا ہوں۔ اس قسم کے لوگ بس حالات کے دھارے پر بہتے رہیں۔ وہ دھارا انہیں کہیں بھی لے جاسکتا ہے۔''
''میرے سوال کا جواب تو آپ نے اب بھی نہیں دیا۔''
''اس کا ایک ہی جواب ہے ڈارلنگ...... شادی شدہ عورت اپنے محبوب سے اگر اتنی قریب ہو جائے تو یہ بات اپنے شوہر سے پوشیدہ رکھے۔ دراصل یہ شوہر کے مزاج پر بھی منحصر ہے کہ وہ یہ بات برداشت کرسکتا ہے یا نہیں۔''
''لیکن اس طرح عورت کے ضمیر پر ایک بوجھ تو ہو جائے گا۔''
''اس کا انحصار عورت کے مزاج پر ہے کہ وہ اسے جرم سمجھتی ہے یا نہیں۔''
''آپ اسے جرم نہیں سمجھتے؟''
''نہیں۔'' ارسلان شاہ دھیرے سے ہنس دیا۔ ''میرے دوست احباب تو میرے اس قسم کے خیالات پر بہت چراغ پا ہوتے ہیں لیکن میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ انسان اگر اپنے اس وحشی جذبے کے ہاتھوں بے بس ہو جاتا ہے تو یہ کوئی جرم نہیں ہے۔''
''مرد یا عورت؟''
''دونوں۔''
''تو میں اپنی دوست کو کیا مشورہ دوں؟''
''مشورہ تو...... میں نے کہا نا کہ ان حالات میں کسی کے لیے قابل عمل ہو ہی نہیں سکتا اگر اس سے کہا جائے کہ وہ اپنے

محبوب کو نظر انداز کرنے کی، اسے بھولنے کی کوشش کرے تو یہ اس کے لیے ممکن نہیں ہوگا۔ اپنے شوہر سے وہ طلاق بھی نہیں لینا چاہتی۔ ایسی صورت میں تو بس یہی ہوسکتا ہے کہ انسان خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دے۔''

''تو یہ ہے آپ کا مشورہ؟''

''اسے مشورہ تو نہیں کہا جاسکتا ڈارلنگ..... ہاں اگر تم اسے مشورہ سمجھتی ہو تو اور بات ہے۔ تم اپنی دوست سے وہی سب کچھ کہہ دو جو میں ابھی تم سے کہہ چکا ہوں۔''

احمر سلطانہ نظریں جھکا کر کچھ سوچنے لگی پھر اس نے اپنا گلاس خالی کیا اور کھڑی ہوتی ہوئی بولی۔ ''میں جا کے کھانا لگواتی ہوں۔''

اس کے جانے کے بعد ارسلان شاہ سوچنے لگا کہ مسئلہ واقعی احمر سلطانہ کی کسی دوست کا ہے یا احمر سلطانہ کو اس پر شبہ ہوگیا ہے کہ وہ اپنے دفتر میں ملازم لڑکی صبیحہ کو پسند کرنے لگا ہے؟

نہیں، ارسلان شاہ نے اپنا سر جھٹکا، ابھی تو اس کا علم صبیحہ کو بھی نہیں کہ وہ اسے پسند کرنے لگا ہے۔ ایسی صورت میں احمر سلطانہ کو اس کا شبہ کیسے ہوسکتا ہے؟

☆☆☆

صبیحہ نے پہلے ہی دن اپنی تنخواہ ماں کے ہاتھ پر رکھ دی تھی۔ دوسرے دن جب وہ آفس سے گھر پہنچی تو اسے یہ جان کر اچھا خاصا ذہنی دھچکا لگا کہ دس ہزار تو لوگوں کا قرض دینے دلانے میں خرچ ہوگئے تھے اور اب بس پانچ ہزار باقی تھے جن سے کسی نہ کسی طرح مہینے بھر کا خرچ چلانا تھا۔

''یہ آپ نے کیا کر دیا اماں!'' صبیحہ نے بے اختیار کہا۔

''ایسا تو کئی مہینے تک ہوتا رہے گا بیٹی۔'' ساجدہ بولی۔ ''تمہیں تو پتا ہے، قرضہ بہت ہے لوگوں کا۔''

''وہ تو بہت دن سے ہے اماں..... اگر مجھے ملازمت نہ ملتی تو وہ اب بھی رہتا، بلکہ بڑھتا رہتا۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن اب کوئی بہانہ بھی تو نہیں ہے کسی کو قرض نہ لوٹانے کا..... سبھی کو پتا چل گیا ہے کہ تمہیں اچھی خاصی ملازمت مل گئی ہے۔''

''کسی طرح کچھ دن تو اور ٹالا جاسکتا تھا لوگوں کو۔'' صبیحہ نے کہا۔ ''عاصم کی حالت نہیں دیکھ رہی ہو..... میں چاہتی تھی کہ اسے کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھاؤں۔ آج کسی نے مجھے آغا خاں کے ایک ڈاکٹر کا نام بھی بتایا ہے۔''

''کس نے بتایا ہے؟'' ایک طرف خاموش بیٹھے ہوئے رشید خاں نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

''دفتر میں ہی کسی نے بتایا ہے۔'' صبیحہ نے جواب دیا۔

گل دستے کے معاملے میں رشید خاں اتنا چراغ پا ہو چکا تھا کہ صبیحہ نے اپنے باس ارسلان شاہ کا نام لینا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

''گھر کے معاملات تم نے دفتر کے لوگوں کو بتانا شروع کر دیے۔''

''سبھی بتاتے ہیں ابا۔'' صبیحہ نے دبی زبان سے جواب دیا۔ ''زیادہ دن ساتھ رہے تو دفتر کے لوگ ایک خاندان کی طرح کے ہوجاتے ہیں۔''

''سبھی اپنے اپنے گھروں کے مسئلوں پر ایک دوسرے سے مشورہ کرتے ہیں۔''

اس سے پہلے کہ رشید خاں کچھ کہتا، ساجدہ بول پڑی۔ ''ہاں خیر ایسا تو ہوتا ہوگا لیکن بیٹی، آغا خاں تو بہت بڑا اسپتال ہے۔ وہاں کے ڈاکٹروں کی فیس تو بہت زیادہ ہوگی۔''

''فیس تو ادا کی جاسکتی تھی اگر تم دس ہزار روپے لوگوں کو نہ دے دیتیں۔''

''اور اس کے بعد کیا ہوتا؟'' رشید خاں بول پڑا۔ ''علاج کہاں سے ہوتا عاصم کا؟..... یہ بڑے ڈاکٹر تو دوائیں بھی بہت مہنگی بتاتے ہیں۔''

''وہ تو بعد میں سوچ لیا جاتا اماں۔'' صبیحہ نے باپ کو جواب دینے کے بجائے ساجدہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کم از کم یہ تو صحیح طرح سے پتا لگ جاتا کہ عاصم کی بیماری آخر ہے کیا۔''

''جب مہنگا علاج نہ کروایا جاسکے تو بیماری جان لینے سے بھی کیا حاصل۔'' رشید خاں نے تلخی سے کہا۔

''بس تو ٹھیک ہے۔ مر جانے دیں عاصم کو تڑپ تڑپ کر۔'' صبیحہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور وہ وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ رشید خاں اور ساجدہ اسے جاتے دیکھتے رہ گئے۔

رشید خاں نے افسردہ سے لہجے میں کہا۔ ''یہ لڑکی آخر کیا سمجھتی ہے ساجدہ؟ عاصم کی بیماری کی فکر کیا ہمیں نہیں ہے؟ کیا عاصم میرا بیٹا نہیں ہے؟ کیا اسے تم نے اپنی کوکھ سے نہیں جنا؟''

''جذباتی ہوگئی وہ۔'' ساجدہ نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''بہت محبت کرتی ہے وہ عاصم سے۔''

''اور ہمیں تو نفرت ہے عاصم سے۔'' رشید خاں کے لہجے میں اب تلخی تھی۔

☆☆☆

صبیحہ کے کمرے میں ایک بستر پر عاصم لیٹا کہانی کی کوئی

کتاب پڑھ رہا تھا۔ سال بھر پہلے جب اس کی بیماری نے شدت اختیار کی تھی تو اسکول جانا اس کے لیے ممکن نہیں رہا تھا۔ تبھی سے صبیحہ اس کی وقت گزاری کے لیے کسی لائبریری سے کہانیوں کی کتابیں لا دیا کرتی تھی۔

عاصم کی طرف سے منہ پھیرے وہ اپنے بستر پر جا لیٹی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ عاصم اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے ہوئے دیکھے۔

''کیا ہوا باجی؟'' عاصم بول پڑا۔

''کچھ نہیں، یوں ہی سر میں ہلکا سا درد ہو گیا ہے۔'' صبیحہ کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

''سر دبا دوں؟'' عاصم نے بڑی محبت سے پوچھا۔

اس بات پر صبیحہ کا دل اور بھر آیا لیکن کسی نہ کسی طرح وہ عاصم سے اپنے آنسو چھپانے میں کامیاب رہی۔

پھر اسی دن رات کو لگ بھگ دو بجے ایسا ہوا کہ عاصم کی چیخ نما کراہ سے صبیحہ کی آنکھ کھل گئی۔ وہ بوکھلا کر اٹھ بیٹھی۔ عاصم اپنے بستر پر بیٹھا دونوں ہاتھوں سے پیٹ پکڑے اس طرح کراہ رہا تھا کہ کبھی کبھی اس کی آواز اتنی بلند ہو جاتی تھی جیسے وہ کراہا نہ ہو، چیخ پڑا ہو۔

''عاصم، میرے بھیا۔'' صبیحہ اپنے بستر سے اٹھ کر لپکی۔ ''میں ابھی تجھے دوا دیتی ہوں بھیا۔'' اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ اس نے ایک چھوٹی سی الماری کھول کر دو شیشیاں نکالیں۔ ایک شیشی کی بناوٹ سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ ڈراپس کی تھی اور دوسری شیشی میں چھوٹے چھوٹے ٹیبلٹس تھے۔

شیشیاں لے کر صبیحہ جھپٹنے کے سے انداز میں عاصم کے بستر پر گئی۔ اسی وقت بیساکھیوں کی ''کھٹ کھٹ'' کی آواز کے ساتھ رشید خاں اور اس کے ساتھ ساجدہ بھی بوکھلائی ہوئی سی کمرے میں داخل ہوئی۔ اس وقت صبیحہ نے تقریباً زبردستی عاصم کو اپنی گود میں لٹا لیا تھا اور اس کے منہ میں ڈراپس ٹپکانے کی کوشش کر رہی تھی۔ خود اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں......

ساجدہ بستر کے پائینتی بیٹھ گئی۔

''میرا بچہ...... میرا بچہ......'' اس کے منہ سے نکل رہا تھا اور وہ دونوں ہاتھوں سے عاصم کے پیر دبا رہی تھی حالانکہ اسے معلوم تھا کہ پیر دبانے سے عاصم کی تکلیف میں کوئی کمی نہیں آئے گی۔

رشید خاں بیساکھیوں کے سہارے بستر کے قریب کھڑا بے بسی سے عاصم کی طرف دیکھ رہا تھا اور چہرے کی کیفیت ایسی تھی جیسے بیٹے کی اذیت اس کے لیے بھی ناقابل برداشت ہو۔

''میرا بھیا تو مرد ہے اماں۔'' صبیحہ کی آواز کانپ رہی تھی۔ ''برداشت کر لیتا ہے یہ۔ تم جلدی سے پانی تو لے آؤ۔''

ساجدہ جلدی سے اٹھ کر کمرے سے چلی گئی۔

عاصم کے منہ میں ڈراپس ٹپکانے کے بعد صبیحہ نے وہ شیشی ایک طرف رکھ دی اور عاصم کو اپنی آغوش میں لیے بیٹھی رہی۔ رشید خاں پر اس نے بس ایک اچٹتی سی نظر ڈالی تھی۔

عاصم کی تڑپ میں ابھی بالکل کمی نہیں آئی تھی۔ کچھ کھاتے ہوئے تو اس کے معدے میں تکلیف ہوتی ہی تھی لیکن کبھی کبھی شدید اذیت کا دورہ بھی پڑ جاتا تھا۔ ایسے موقع کے لیے ڈاکٹر نے ڈراپس اور کچھ ٹیبلٹ دیے تھے۔ وہ ٹیبلٹ، ڈراپس کے تین منٹ بعد کھلائے جاتے تھے جن سے تکلیف میں بہ تدریج کمی ہوتی چلی جاتی تھی۔

ساجدہ پانی کا گلاس لے آئی۔ اس وقت اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

''بس ایک منٹ اور میرے بھیا۔'' صبیحہ نے کہتے ہوئے گھڑی پر نظر ڈالی۔

ڈراپس عاصم کے حلق میں ڈالے ابھی دو منٹ ہوئے تھے۔

صبیحہ نے دوسری شیشی سے چار ٹیبلٹ نکال لیے تھے اور تڑپتے ہوئے عاصم کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''اگلے مہینے تو میں کسی کا قرضہ نہیں لوٹاؤں گی۔'' ساجدہ روہانسی آواز میں بولی۔ ''کوئی بڑا ڈاکٹر ہی میرے بچے کو ٹھیک کر سکتا ہے۔'' پھر اس نے رشید خاں کی طرف دیکھتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔ ''سن لیا تم نے؟''

رشید خاں چپ چاپ کھڑا رہا لیکن اس کے ہونٹوں پر خفیف سی کپکپاہٹ صاف ظاہر کر رہی تھی کہ شدید جذباتی وہ بھی ہو رہا تھا۔ عاصم کی کراہیں اس کا جگر بھی کاٹ رہی تھیں۔

عاصم کے بری طرح تڑپنے کے باعث صبیحہ اسے ٹیبلٹس بڑی مشکل سے کھلا سکی۔

''بس اب آرام آ جائے گا۔'' صبیحہ نے عاصم کا سر سہلایا۔

نمی اب صبیحہ کی آنکھوں میں بھی نظر آ رہی تھی۔ وہ اپنے آنسو روکنے کی بے حد کوشش کر رہی تھی لیکن اس کا دل بے تحاشا رو رہا تھا۔

کچھ دیر بعد عاصم کی کراہوں سے ''چیخ'' کی کیفیت ختم ہو گئی۔ سال بھر میں اس پر یہ دورہ چوتھی مرتبہ پڑا تھا۔ تیسرا دورہ پڑے ہوئے ڈھائی ماہ سے زیادہ گزر چکے تھے۔

عاصم کی تکلیف پوری طرح ختم ہونے میں پندرہ منٹ لگے۔ اب وہ بس لمبی لمبی سانسیں لے رہا تھا۔ اتنی دیر تک شدید تکلیف کے باعث اس کے چہرے پر زردی پھیل گئی تھی۔

ساجدہ نے دوپٹے سے اپنی آنکھیں خشک کیں اور عاصم کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔ ''اب تو بالکل تکلیف نہیں ہے نا بیٹا۔''

''نہیں اماں، اب تو نہیں ہے۔'' عاصم نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔

''تم اب جاؤ اماں۔'' صبیحہ نے کہا۔ ''سو جاؤ، نہیں تو صبح وقت پر نہیں اٹھا جاسکے گا تم سے۔''

''تم بھی جاؤ ابا۔'' عاصم نے رشید خاں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''باجی تو ہے نا میرے پاس۔''

رشید خاں نے آہستہ سے سر ہلایا اور دروازے کی طرف مڑ گیا۔ ساجدہ نے عاصم کو لپٹا کے پیار کیا اور صبیحہ سے بولی۔ ''تم بھی لیٹو اب۔''

''میں لیٹ جاؤں گی اماں...... فکر تو مجھے بھی ہے۔ صبح دفتر تو وقت پر جانا ہوگا۔''

ساجدہ گم صم سی اٹھی اور رشید خاں کے پیچھے کمرے سے چلی گئی۔

''اب بالکل ٹھیک ہے نا میرا بھیا؟'' صبیحہ نے پوچھا۔

''ہاں باجی، بس اب ڈر لگنے لگا ہے مجھے۔''

''ڈر؟...... ڈر کیسا؟''

''کہیں کسی دن میں......''

صبیحہ کا دل بڑی زور سے اُچھلا۔ اسے خیال آگیا تھا کہ عاصم کیا کہنا چاہتا تھا۔ اس نے جلدی سے عاصم کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

''ایسی باتیں زبان پر نہیں لاتے بھیا۔'' وہ جلدی سے بولی۔

اس وقت صبیحہ کی طرف دیکھتے ہوئے عاصم کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

''یہ کیا۔'' صبیحہ نے جلدی سے اپنا دوپٹا عاصم کی آنکھوں پر رکھ دیا۔ ''مرد کبھی نہیں روتے بھیا۔''

عاصم کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ نظر آئی۔

''ابھی اماں نے کہا ہے نا۔'' صبیحہ پھر بولی۔ ''اگلے مہینے تمہیں کسی بڑے ڈاکٹر کو دکھائیں گے۔''

''کیسے دکھاؤ گی باجی۔'' عاصم نے افسردگی سے کہا۔

''میری تنخواہ ملے گی نا۔''

''تنخواہ تو کل بھی ملی تھی۔''

''اماں سے غلطی ہوگئی۔ لوگوں کو دے دلا دیے۔''

''وہ تو دینا ہی پڑیں گے نا باجی، قرضہ ہی اتنا چڑھ گیا ہے۔'' بارہ سال کی عمر میں بھی عاصم بہت ذہین تھا، بہت دور تک سوچتا تھا۔

''آج جمن خالو سے تو اماں کا خاصا جھگڑا ہوگیا تھا۔'' وہ پھر بولا۔ ''اماں ان سے کہہ رہی تھیں کہ وہ اپنے ایک ہزار ابھی لے لیں اور باقی پندرہ سو اگلے مہینے لے لیں مگر وہ مانے ہی نہیں۔ اماں کو ڈھائی ہزار ہی دینے پڑے۔''

صبیحہ کو عاصم سے معلوم ہوا کہ اس دن کتنے قرض خواہوں نے گھر پر گویا دھاوا بولا تھا اور ساجدہ کو کس کس سے کیا کیا کہنا اور کیا کیا دینا پڑا تھا۔

عزیزوں کے اس رویے کی کہانی سن کر صبیحہ کے رگ و پے میں کڑواہٹ پھیل گئی۔ وہ جب دفتر سے لوٹی تھی اور اسے معلوم ہوا تھا کہ دس ہزار روپے لوگوں کو دے دلا دیے گئے تھے تو اسے بہت غصہ آیا تھا لیکن اب اسے اپنی ماں کی بے بسی کا احساس ہوا۔

ساجدہ نے عاصم کی تکلیف اور اس کی تڑپ دیکھ کر کہہ تو دیا تھا کہ وہ اگلے مہینے کسی کا قرض ادا نہیں کرے گی لیکن صبیحہ نے عاصم سے سب کچھ سننے کے بعد محسوس کیا کہ یہ اسی صورت میں ممکن تھا کہ قرض خواہوں سے ڈٹ کر لڑا جاتا جو مناسب بھی نہیں تھا اور ساجدہ کے بس کی بات بھی نہیں تھی۔

☆☆☆

احمر سلطانہ نے ارسلان شاہ سے جو باتیں کی تھیں، ان میں ''فیروزہ'' کا حوالہ بالکل جھوٹ تھا۔ اصل بات یہ تھی کہ احمر سلطانہ خود ہی زریاب کی محبت میں گرفتار ہو چکی تھی۔

زریاب، ارسلان شاہ کا بچپن کا دوست تھا۔ مصوری اس کی گھٹی میں پڑی تھی لیکن یہ کام وہ پیسے کے لیے نہیں کرتا تھا۔ مرحوم باپ سے ورثے میں اسے ایک ایسی کثیر رقم مل گئی تھی کہ اسے کوئی ذریعہ معاش تلاش کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ باپ کے بعد چھوٹی بہن کے سوا اس کا دنیا میں کوئی نہیں تھا۔ لاابالی زریاب کے کھانے پینے اور دیگر ضروریات کا خیال وہی رکھتی تھی۔ زریاب کی شادی کے بعد یہ فرض اس کی بیوی نے سنبھالا تھا۔ وہ ایک اچھی لڑکی تھی۔ زریاب کی بہن نے بی اے کرلیا تو وہ اس کی شادی کی تیاریوں میں دل و جان سے لگ گئی لیکن شادی سے چند دن پہلے زریاب کی بہن ایک حادثے کا شکار ہو کر دنیا سے چل بسی۔ زریاب کے لیے وہ تو ایک بڑا صدمہ تھا ہی لیکن اس کے ساتھ ہی اسے یہ جھٹکا بھی لگا کہ اس کی بیوی کو کینسر ہوگیا۔ زریاب نے اپنے لاابالی

طرز زندگی کے باوجود اس کے علاج معالجے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی لیکن چند سال بعد وہ بھی دنیا سے چل بسی۔

زریاب لاابالی تو تھا ہی، ان صدموں کے بعد وہ اپنی طرف سے بہت ہی بے پروا ہو گیا۔ مصوری میں وہ پہلے سے زیادہ غرق رہنے لگا۔ اپنے کھانے پینے کا خیال اسے پہلے بھی نہیں رہتا تھا، اس لیے بہن اور بیوی کے بعد اس کی یہ عادت اس کی صحت پر اثر انداز ہونے لگی۔ ایک مرتبہ وہ بیمار پڑا تو اسے زبردستی ایک اسپتال میں داخل کرانے والا ارسلان شاہ ہی تھا۔

اسپتال میں اس کی دیکھ بھال ہوئی تو وہ تندرست ہو گیا۔ اسے کوئی خاص بیماری تو تھی نہیں، بس بڑھتی ہوئی کمزوری کے باعث ہی وہ ڈھیر ہو گیا تھا۔ اسپتال سے اپنے گھر جانے کے بعد وہ پھر اپنا یہی حال کرتا جس کا ارسلان شاہ کو پوری طرح اندازہ تھا۔ اسی لیے وہ زریاب کو زبردستی اپنے گھر لے آیا۔ اس نے ملازمین کے علاوہ اپنی بیوی کو بھی تاکید کی کہ وہ زریاب کا خیال رکھا کرے۔

شوہر کی تاکید سے قطع نظر احمر سلطانہ نے خود ہی زریاب کا ہر طرح خیال رکھا۔ اس کی مصوری وہ ہمیشہ ہی سے پسند کرتی تھی۔

زریاب کی خواہش تھی کہ وہ تصویر کشی کا سارا ساز و سامان بھی اپنی خواب گاہ میں ہی رکھنا چاہتا ہے لہٰذا اس کے لیے بنگلے کا ایک ایسا کمرا وقف کیا گیا جو خاصا کشادہ تھا۔ لاابالی زریاب نے خود کو اسی کمرے تک محدود کر لیا۔ اپنا کھانا وغیرہ بھی وہ وہیں منگوا لیتا تھا۔ ارسلان شاہ کے اصرار پر وہ کبھی کبھی ان میاں بیوی کے ساتھ تھوڑی دیر کے لیے لان میں آ بیٹھتا تھا یا ڈائننگ روم میں آ کر ان کے ساتھ کھانا کھا لیتا تھا۔

احمر سلطانہ کو جب فرصت ہوتی تھی تو وہ زریاب کے کمرے میں جا کے ایک کرسی گھسیٹ کر اس طرح بیٹھ جاتی تھی کہ زریاب کو کینوس پر رنگوں سے کھیلتے ہوئے دیکھ سکے۔ اس طرح کبھی کبھی دو ڈھائی گھنٹے بھی گزر جاتے تھے۔ زریاب اس سے بے خبر اپنی دھن میں رہتا تھا لیکن پھر شاید دھیرے دھیرے یا اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ اس طرح ایک غیر اخلاقی حرکت کا مرتکب ہوتا ہے۔ اس احساس کے بعد وہ بھی کبھی تھکن کا بہانہ کر کے احمر سلطانہ کے ساتھ بیٹھ جاتا۔ ابتدا میں ان کی گفتگو صرف فن مصوری پر ہوتی تھی لیکن یہ فن انسانی جذبات سے گہرا تعلق رکھتا ہے اس لیے ان کی گفتگو کا دائرہ وسیع ہوتا چلا گیا۔ احمر سلطانہ کیونکہ پڑھی لکھی اور نہایت ذہین تھی اس لیے ان کی گفتگو میں بعض اوقات بڑے نازک مسائل بھی چھڑ جاتے تھے جس کے نتیجے میں وہ ایک دوسرے سے کچھ بے تکلف ہوتے چلے گئے اور پھر شاید ان دونوں ہی کو پتا نہیں چل سکا کہ وہ کب ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو گئے تھے۔

اس کے بعد زریاب پر کیا گزری، احمر سلطانہ کو اس کا علم نہیں ہو سکا لیکن خود اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی تھی کہ یہ کیا ہو گیا۔ وہ ارسلان شاہ سے محبت بھی کرتی تھی اور اس سے بے وفائی کا تصور بھی اس کے لیے محال تھا لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی محسوس کرنے لگی تھی کہ اب زریاب سے دور ہو جانا بھی اس کے لیے ممکن نہیں رہا تھا۔ نتیجہ یہ کہ وہ ہمہ وقت اس مسئلے پر سوچنے لگی۔ جب اس سوچ بچار کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا تو اس نے یہ مسئلہ اپنی ایک دوست کی آڑ لے کر ارسلان شاہ کے سامنے رکھ دیا۔

مسئلہ اتنا پیچیدہ تھا کہ ارسلان شاہ بھی اس کی رہنمائی نہیں کر سکا۔ لے دے کر ارسلان شاہ کی ایک ہی بات اس کے ذہن میں گونجتی رہ گئی کہ خود کو حالات کے دھارے پر بہتا ہوا چھوڑ دے اور قدرت کے فیصلے کا انتظار کرے لیکن اسے یہ احساس بہرحال رہا کہ قدرت کا فیصلہ جو بھی ہو، وہ اس کے لیے کسی بھی پہلو سے خوشگوار نہیں ہوگا۔

دوسرے دن جب ارسلان شاہ دفتر چلا گیا تو احمر سلطانہ نے بوتل نکال کر ایک پیگ بنایا اور وقفے وقفے سے گھونٹ لیتی ہوئی کمرے میں ٹہلنے لگی۔ ارسلان شاہ کے سامنے خود کو نارمل رکھنے کے لیے اسے شدید جدوجہد کرنا پڑتی تھی اور وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب بھی رہتی تھی لیکن تنہائی ملتے ہی اس کی بے چینی عود کر آتی تھی۔ اس کا تعلق نہایت ماڈرن گھرانے سے تھا جہاں شراب نوشی بری نہیں سمجھی جاتی تھی اور ارسلان شاہ بھی اسی طبقے سے تعلق رکھتا تھا اس لیے احمر سلطانہ پارٹیوں میں شرکت کے علاوہ گھر میں بھی کسی وقت ایک آدھ ڈرنک لے لیا کرتی تھی لیکن کچھ عرصے سے اس نے کچھ زیادہ پینا شروع کر دیا تھا۔ ارسلان شاہ کے سامنے خود کو نارمل رکھنے کی کوشش میں وہ اعصابی طور پر اتنا تھک جاتی تھی کہ اس کے بعد شراب کا سہارا لینا اس کے لیے ضروری ہو جاتا تھا۔ وہ محسوس کرتی تھی کہ اگر اس نے یہ سہارا نہ لیا تو اس کے اعصاب تڑخ جائیں گے یا وہ کسی دماغی خلل کا شکار ہو جائے گی۔

پیگ اس نے پندرہ منٹ میں ختم کر لیا۔ خواہش تو دوسرے پیگ کی بھی تھی لیکن اس نے خود کو قابو میں رکھنے کی کوشش کی۔ وہ اتنی ذہین تھی کہ شراب کے معاملات کو اچھی طرح سمجھتی تھی۔ اسے خوب اندازہ تھا کہ ان حالات میں دوسرے پیگ کے بعد تیسرے پیگ کی خواہش بھی ہو گی اور

کوشش کے باوجود صبیحہ سے گریزاں نہیں رہ سکا۔ جب صبیحہ کو دفتر سے پہلی تنخواہ ملی تو ارسلان شاہ نے اسے ایک خوب صورت گل دستہ دیا۔ اپنے تئیں وہ اس کی محبت کا تحفہ تھا لیکن صبیحہ سے اس نے بس اتنا کہا تھا کہ یہ تحفہ وہ اسے اس کی پہلی تنخواہ کی خوشی میں دے رہا ہے۔

انہی حالات میں جب اس کی بیوی نے اسے اپنی ایک شادی شدہ دوست کی محبت کے بارے میں بتایا تو اس جذبے کے بارے میں ارسلان شاہ کے خیالات کو دوسری سند مل گئی۔ اسے یہ شبہ بالکل نہیں ہوا تھا کہ ''فیروزہ'' کا نام لے کر اس آڑ میں احمر سلطانہ نے اسے اپنی محبت کی کہانی سنائی تھی۔

یہ ایک طرفہ تماشا تھا کہ دونوں میاں بیوی کسی نے کسی کی محبت میں گرفتار ہو چکے تھے لیکن ایک دوسرے کو بھی بہت چاہتے تھے، ایک دوسرے سے الگ ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔

ان دونوں کی محبتوں میں ایک فرق یہ تھا کہ احمر سلطانہ اور زریاب ایک دوسرے کے جذبات سے واقف ہو چکے تھے جبکہ ارسلان شاہ کو اب تک ہمت نہیں ہو سکی تھی کہ صبیحہ کو اپنی محبت سے آگاہ کر دیتا۔ اب تک وہ سوچتا ہی رہا تھا کہ صبیحہ کو اپنے جذبات سے کس طرح آگاہ کرے لیکن آج تو وہ ڈر گیا تھا کہ اگر اس نے ایسا کیا تو صبیحہ بری طرح بھڑک جائے گی۔ شاید وہ دفتر آنا بھی چھوڑ دیتی جو ارسلان شاہ کے لیے اذیت ناک ہو جاتا۔

ارسلان شاہ کو یہ خوف اس لیے ہوا تھا کہ جب وہ بے اختیاری صبیحہ کو اس کے ادھورے نام سے مخاطب کر بیٹھا تھا تو صبیحہ نہ صرف چونکی تھی بلکہ چند لمحے تک اس کے چہرے کا رنگ بھی بدلتا رہا تھا۔

اس کے بعد ارسلان شاہ نے خود کو تسلی دینے کی کوشش کی تھی کہ وہ سب کچھ اس کا وہم تھا۔ اپنے اس خیال کی تصدیق یا تردید کے لیے اس نے صبیحہ کو ایک بار پھر اس کے ادھورے نام سے مخاطب کیا تھا اور اس کے اس خیال کی تردید ہو گئی تھی کہ اسے وہم ہوا تھا۔ دوسری بار بھی صبیحہ کے چہرے کے تاثرات میں تبدیلی آئی تھی۔

ارسلان شاہ کا دل بجھ گیا تھا لیکن پھر اس نے یہ سوچ کر خود کو تسلی دی تھی کہ محبت کرنے کا مطلب سوداگری تو نہیں ہوتا کہ اس ہاتھ دے اور اس ہاتھ لے۔ صبیحہ اگر اس کے جذبات کی پذیرائی نہیں کرے گی تو وہ اپنے دل سے اس کی محبت نکال تو نہیں دے گا، بلکہ جب دل میں کسی کی محبت پنپ جائے تو اسے دل سے نکال دینا ممکن ہی نہیں ہوتا۔

کچھ دیر تک اپنے انہی خیالات میں منہمک رہنے کے بعد وہ ایک لمبی سانس لے کر آگے جھکا اور ٹیلے فون کا ریسیور اٹھا کر آغا خان اسپتال کا نمبر ملانے لگا۔

پھر پانچ منٹ بعد اس نے انٹرکام پر صبیحہ سے کہا کہ وہ اس کے کمرے میں آئے۔

صبیحہ کاپی پینسل سنبھالے اس کے کمرے میں آئی۔ اس کی دانست میں اس کی طلبی کا مقصد یہی ہو سکتا تھا کہ ارسلان شاہ کو پھر کوئی ڈکٹیشن دینا ہوگا۔

''نہیں۔'' ارسلان شاہ نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''تم غلط سمجھی ہو صبیحہ!'' اس نے خیال رکھا تھا کہ وہ صبیحہ کا ادھورا نام نہ لے۔ ''میں نے تمہیں ڈکٹیشن دینے کے لیے نہیں بلایا ہے۔''

''صبیحہ سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔

''دراصل۔'' ارسلان شاہ پھر بولا۔ ''میں نے ابھی آغا خان فون کیا تھا۔ تھوڑے بہت تعلقات ہیں میرے اس ڈاکٹر سے جس کا نام میں نے تمہیں بتایا تھا۔ اس سے میں نے تمہارے بھائی کے لیے کل کا ٹائم لے لیا ہے۔ کل تم دفتر لنچ کے بعد آجانا۔ صبح نو بجے اپنے بھائی کو دکھانے اسپتال لے جانا۔ تم سے فیس نہیں لی جائے گی۔ اس کا بل دفتر کے نام پر بنایا جائے گا اور یہاں بھیج دیا جائے گا۔''

صبیحہ نے کچھ کہنا چاہا مگر کہہ نہیں سکی۔ اب پھر انکار کرنے میں اسے بے بسی کا احساس ہوا تھا۔

''بس اب جاؤ۔'' ارسلان شاہ نے کہا۔ ''یہی بتانا تھا تمہیں۔''

صبیحہ مڑ کر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی کمرے سے جانے لگی۔ ارسلان شاہ اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اسے بے حد مسرت حاصل ہوئی اگر اس کی وجہ سے صبیحہ کے بھائی کی طبیعت ٹھیک ہو جاتی اور اس لڑکی کے ذہن سے ایک بہت بڑا بوجھ ہٹ جاتا جس سے وہ محبت کرنے لگا تھا۔

☆☆☆

زریاب کے کمرے کے دروازے سے لوٹتے وقت احمر سلطانہ کو اپنے آپ سے ایسی جنگ لڑنا پڑی تھی کہ وہ نڈھال ہو گئی تھی۔ جب وہ اپنے کمرے میں پہنچی تو اس نے محسوس کیا کہ پیے ہوئے پیگ کے اثرات اس کے دماغ سے زائل ہو چکے تھے۔ اس نے بڑی وحشت میں ایک پیگ اور بنایا اور آدھا گلاس ایک ہی سانس میں خالی کر گئی پھر وہ چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتی ہوئی کمرے میں ٹہلتی اور سوچتی رہی کہ حالات کا یہ دھارا اسے بہا کر کہاں تک لے جا سکتا ہے؟

کہاں تک لے جا کر رہے گا یہ اسے؟

پندرہ منٹ میں اس نے باقی آدھا گلاس بھی ختم کر لیا اور سوچنے لگی کہ حالات کے دھارے پر بہنا جب اس کا مقدر بن چکا ہے تو وہ خود کو اذیت کیوں دے رہی ہے؟

وہ کمرے سے نکلی اور پھر زریاب کے کمرے کی طرف چل پڑی۔

جب وہ کمرے میں داخل ہوئی تو کینوس کے سامنے مصروف زریاب نے سر موڑ کر اس کی طرف دیکھا اور ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

''آیئے احمر!...... آج آپ نے تھوڑی سی دیر نہیں کر دی؟''

''ہاں وہ...... بس یوں ہی ...... ایک کام میں الجھ گئی تھی۔''

''ہوں۔'' زریاب رنگوں کی پلیٹ کی طرف اس طرح دیکھنے لگا جیسے سوچ رہا ہو کہ اب کس رنگ کا انتخاب کرے۔

احمر سلطانہ اس کے عقب میں اس کے قریب جا کھڑی ہوئی اور کینوس کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔ ''اس پر آپ دو دن سے کام کر رہے ہیں۔''

''جی ہاں، اور ابھی دو دن اور لگ سکتے ہیں۔ بعض پینٹنگز کبھی کبھی بہت الجھا دیتی ہیں۔ آپ بیٹھیے نا!''

احمر سلطانہ قریب کی ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

زریاب کچھ توقف سے بولا۔ ''پینٹنگز میں زندگی کے رنگ اُجاگر کرنے کے لیے رنگوں کا انتخاب مجھے ہمیشہ اُلجھاتا ہے۔ غالباً میں اب تک ایک اچھا پینٹر نہیں بن سکا ہوں۔''

''ایسا نہیں ہے زریاب!'' احمر سلطانہ نے جواب دیا۔ ''کبھی کبھی زندگی کے رنگ اتنے ہی مبہم نظر آتے ہیں کہ سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے اور سوچنا پڑتا ہے کہ سب کچھ وہی ہے جو ہم دیکھ رہے ہیں یا کچھ اور ہے!''

زریاب نے سر گھما کر اس کی طرف دیکھا اور وہ مسکرا دی۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ دوسرا پیگ پینے سے پہلے اس کا یہ خیال غلط تھا کہ پہلے پیگ کا اثر زائل ہو چکا ہے۔ وہ اس وقت خود کو اس قابل پا رہی تھی کہ زریاب سے کچھ زیادہ بے باک انداز میں گفتگو کر سکے۔

زریاب پھر پینٹنگ کی طرف متوجہ ہو گیا تھا لیکن اس کا وہ ہاتھ حرکت میں نہیں آیا جس میں برش تھا۔ احمر سلطانہ نے محسوس کر لیا کہ زریاب کی نگاہیں تو پینٹنگ پر تھیں لیکن ذہن کہیں اور تھا۔

چند لمحوں کے توقف سے احمر سلطانہ بولی۔ ''آپ کچھ سوچنے لگے زریاب!''

''ہوں۔'' زریاب نے ایک طویل سانس لی پھر برش اور رنگوں کی پلیٹ ایک طرف رکھ کر آہستگی سے چلتا ہوا احمر سلطانہ کے قریب آیا اور دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔ ''ایک بات کہوں آپ سے؟''

''ضرور کہیے!'' احمر سلطانہ نے سنجیدگی سے کہا۔ ''میں چاہتی ہوں کہ اس وقت ہم ایک دوسرے سے بہت کچھ کہہ ڈالیں۔''

زریاب نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ ''کیا آج آپ نے ایک پیگ سے زیادہ پی لی ہے؟''

وہ احمر سلطانہ کے ایک پیگ کی عادت سے تو واقف تھا۔

''ہاں!'' احمر سلطانہ نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''بس غلطی ہو گئی...... لیکن شاید اچھا ہی ہوا۔ اس وقت مجھ میں اتنی ہمت آ گئی ہے کہ سارس کی طرح ریت میں سر نہ چھپاؤں۔''

''شاید آپ تھک گئی ہیں۔''

''کیا مطلب؟''

''کچھ دن سے آپ مجھ سے گریزاں رہنے کی کوشش کر رہی ہیں جس میں آپ کو ناکامی ہوئی ہے اور ایسی صورت میں اعصاب پر اتنا دباؤ پڑتا ہے کہ انسان خود کو تھکا ہوا محسوس کرنے لگتا ہے۔''

''یہ آپ اس لیے کہہ رہے ہیں کہ ایک دن میں گھنٹا بھر تک نہیں آئی تھی تو آپ نے ایک ملازم کے ذریعے مجھے بلوایا تھا۔''

''اور میں نے آپ کو بتایا تھا کہ میں آنے ہی والی تھی۔''

''ہاں۔'' زریاب نے کہا ''اور کچھ دیر پہلے آپ نے یہ کوشش پھر کی تھی۔''

احمر سلطانہ نے کچھ حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

زریاب کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔ ''آپ دروازے تک آ کر لوٹ گئی تھیں۔ میں نے آپ کے قدموں کی آہٹ سن لی تھی۔''

''میں تو بہت دبے قدموں آئی تھی۔''

''جب کان شدت سے کوئی آواز سننے کے مشتاق ہوں تو انہیں وہ آواز سنائی دے ہی جاتی ہے، خواہ وہ کتنی ہی مدھم ہو۔''

''اوہ!'' احمر سلطانہ کے منہ سے نکلا اور پھر اس نے بھرائی ہوئی سی آواز میں کہا۔ ''یہ شدت ہی تو میرا خوف بڑھاتی چلی جا رہی ہے زریاب۔''

''کچھ کم خوف زدہ میں بھی نہیں ہوں۔'' زریاب نے سنجیدگی سے کہا پھر بولا۔ ''غالباً میں ایک بہت گھٹیا انسان ہوں۔''

''یہ خیال کیوں آیا آپ کو؟''

''اگر کوئی اپنے دوست ہی کی پیٹھ میں خنجر گھونپ دینا چاہے تو اسے کیا کہیں گے؟''

''خنجر گھونپنے کی خواہش اور خنجر گھونپنے کا عمل دو مختلف باتیں ہیں اور مجھے یقین ہے کہ عمل آپ سے نہیں ہوگا۔''

''مگر اذیت تو مجھے پیسے ڈال رہی ہے احمر!'' زریاب نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''کئی بار تو میں نے سوچا کہ یہاں سے کہیں دور بھاگ جاؤں لیکن ایسا کر نہیں سکا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر میں نے ایسا کیا تو میری سانسیں میرا ساتھ چھوڑ دیں گی۔''

''کچھ ایسا ہی میں بھی محسوس کرتی ہوں زریاب۔'' اور یہ جو آپ نے گھٹیا انسان والی بات کہی ہے، یہ میرے ذہن میں اپنے لیے بھی تھی لیکن کل مجھے اطمینان سا مل گیا ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''کل میں نے ارسلان سے اس بارے میں بات کی تھی۔''

''کیا!'' زریاب اچھل پڑا۔

''پریشان نہ ہوں۔'' احمر سلطانہ نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''بات میں نے دوسرے انداز میں کی تھی۔''

زریاب کے چہرے پر اب بھی پریشانی کے تاثرات قائم رہے اور وہ سوالیہ نظروں سے احمر سلطانہ کی طرف دیکھتا رہا پھر اس کے چہرے سے پریشانی اسی وقت ختم ہوئی جب احمر سلطانہ نے ارسلان سے اپنی گفتگو دہرانا شروع کی اور احمر سلطانہ کی فرضی دوست فیروزہ کا حوالہ آگیا۔

''شکر ہے۔'' زریاب نے سب کچھ سننے کے بعد ایک طویل سانس لی۔ ''آپ نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔''

''ڈرانے والا خیال آپ کے ذہن میں آیا ہی کیوں زریاب؟ کیا مجھے اتنی ہمت ہو سکتی ہے کہ آپ کے اور اپنے بارے میں ارسلان سے کھل کر بات کر سکوں؟''

''بس خیال ہی تو ہے۔'' زریاب نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''کبھی کبھی اچانک ذہن میں آنے والے خیال کا کوئی جواز نہیں ہوتا۔''

احمر سلطانہ کچھ سوچنے لگی۔ زریاب کی بات پر اس کے ذہن میں ایک خیال آیا تھا۔ وہ زریاب کی طرف دیکھے بغیر دھیمی آواز میں بولی۔ ''کبھی کبھی زندگی میں اچانک آنے والی تبدیلی کا بھی کوئی جواز نہیں ہوتا۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں احمر!'' زریاب نے کہا۔ ''اور جواز نہ ہونے ہی کی وجہ سے اذیت کا احساس ہوتا ہے۔ انسان خود کو غلطی پر سمجھتا ہے۔''

''لیکن ارسلان نے جو کچھ کہا، اس کی روشنی میں ہم غلطی پر نہیں ہیں۔ جذباتی سطح پر ہماری زندگی میں جو تبدیلی آئی ہے، وہ ایک فطری امر ہے۔''

''لیکن وہ فطری امر جو کسی خوشگوار انجام سے دور محسوس ہو، اذیت ناک تو ہوتا ہے۔''

''انجام ناخوشگوار سہی لیکن وہ کیا ہوگا۔ کبھی آپ نے سوچا تو ہوگا۔''

''اکثر سوچا ہے اور سوچتے سوچتے شدید گھبراہٹ ہوئی ہے۔''

''میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا ہے۔ جب کوئی بات سمجھ میں نہ آئے تو گھبراہٹ ہونے ہی لگتی ہے۔ شاید اب اس بارے میں سوچا ہی نہ جائے تو اچھا ہے۔''

''یعنی بہ قول ارسلان، ہم خود کو حالات کے دھارے پر بہنے دیں۔''

''ہاں۔''

''لیکن اس بارے میں سوچا ہی نہ جائے، یہ بس کہنا آسان ہے۔ اس پر عمل نہیں کیا جا سکتا۔''

احمر سلطانہ نے آہستگی سے اثبات میں سر ہلایا۔ اچانک وہ بہت اُداس نظر آنے لگی تھی۔

☆☆☆

اسی دن رات کو رشید خاں نے متفکر انداز میں ساجدہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم نے مہینے بھر کے خرچ کے لیے جو روپے بچائے ہیں، کیا وہ تم صبیحہ کو دے رہی ہو؟''

''نہیں۔''

''پھر وہ کل عاصم کو اسپتال کیسے لے جائے گی؟......اور پھر وہ بھی آغا خان......وہ ڈاکٹر کی فیس کیسے دے گی۔''

''فیس صبیحہ کا دفتر ادا کرے گا۔'' ساجدہ نے شوہر سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ ''وہ صبیحہ کے لیے دفتر کی طرف سے ایڈوانس ہوگا جو بعد میں اس کی تنخواہ سے کٹتا رہے گا۔''

رشید خاں کے چہرے پر حیرت کے تاثرات ابھرے۔

''ابھی صبیحہ کو ملازمت ملے صرف ایک مہینا گزرا ہے اتنی جلدی اسے ایڈوانس؟'' رشید خاں نے حیرت کے عالم میں اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

ساجدہ خاموش رہی۔

رشید خاں کچھ توقف سے بولا۔ ''ایڈوانس کی یہ منظوری...... ظاہر ہے کہ اسے اپنے باس سے ہی ملی ہوگی۔''

ساجدہ سر ہلا کر رہ گئی۔ وہ اب بھی رشید خاں سے نظریں نہیں ملا رہی تھی۔ غالباً وہ سمجھ گئی ہوگی کہ رشید خاں اس وقت بھی اسی انداز میں سوچ رہا ہوگا جس انداز میں اس نے صبیحہ کو گل دستہ ملنے پر سوچا تھا۔

رشید خاں مضطربانہ انداز میں بستر سے اٹھا اور اپنی بیساکھیاں سنبھال کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ کمرے میں بیساکھی کی ''کھٹ کھٹ'' صبیحہ کو اپنے اعصاب پر دھماکوں کی طرح محسوس ہونے لگی۔ وہ دروازے سے کان لگائے اپنے ماں باپ کی گفتگو سن رہی تھی۔ عاصم کو آغا خان لے جانے کے بارے میں اس نے صرف اپنی ماں کو بتایا تھا لیکن یہ بات یقینی تھی کہ رات کو ساجدہ یہ بات اپنے شوہر کو بتائی۔ اسی لیے صبیحہ نے اس وقت دروازے سے کان لگا رکھے تھے۔ وہ اپنے باپ کا ردعمل جاننا چاہتی تھی۔

''ساجدہ!'' رشید خاں بکھری ہوئی سی آواز میں بولا۔ ''کیا میں اب بھی وہ بات نہ سوچوں جو میں نے صبیحہ کو گل دستہ ملنے پر سوچی تھی؟''

''کون سی بات؟''

''صبیحہ سے یہ ملازمت چھڑا دی جائے۔''

''پھر عاصم کا کیا ہوگا؟'' ساجدہ روہانسی آواز میں بولی۔ ''کل رات وہ کیسا تڑپا تھا، دیکھا نہیں تھا تم نے۔''

''تڑپ تڑپ کے مرجائے گا وہ...... اس سے زیادہ اور کیا ہوگا۔ ہمارے گھر سے جنازہ اٹھ جائے گا اس کا، ہماری عزت کا جنازہ تو نہیں اٹھے گا۔''

''خدا کے لیے ایسی باتیں نہ کرو۔'' ساجدہ رونے لگی۔

''پھر کیسی باتیں کروں ساجدہ؟'' رشید خاں کی آواز میں کرب تھا۔ ''کیا عاصم صرف تمہارا بیٹا ہے؟ میرا دل نہیں تڑپتا اس کے لیے؟''

''تو پھر صبیحہ کی ملازمت چھڑانے کے بارے میں نہ سوچو۔ پانی ابھی سر سے اونچا تو نہیں ہوا ہے۔''

''سر سے اونچا ہو جانے کے بعد سوچنے سے کیا فائدہ ہوگا۔''

''پانی سر سے اونچا ہونے والا ہو تو اس کے آثار کچھ پہلے سے دکھائی دے جاتے ہیں۔ جس طرح تم سوچ رہے ہو، اسی انداز میں صبیحہ سے بات کر چکی ہوں میں۔ وہ خود کہہ رہی تھی کہ اگر اسے ایسی کسی بات کا شبہ ہوا تو وہ خود ہی یہ ملازمت چھوڑ دے گی۔''

بیساکھی کی ''کھٹ کھٹ'' بند ہوگئی۔ رشید خاں بستر پر بیٹھ گیا تھا۔

''اسے کیسے شبہ ہو جائے گا ساجدہ؟'' رشید خاں کا لہجہ سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ ''دنیا نہیں دیکھی ہے ابھی اس نے...... یہ پیسے والے لوگ بڑے عیار ہوتے ہیں۔ یہ کب کیا کر گزریں، پتا بھی نہیں چلتا، اور اس وقت پتا چلتا ہے جب پتا چلنے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔''

''تم کچھ بھی کہو، مجھے تو بھروسا ہے صبیحہ پر۔''

رشید خاں نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''یہ تم نہیں، تمہاری ممتا بول رہی ہے۔ عاصم کی حالت تم سے دیکھی نہیں جاتی۔ اس کی خاطر تم یہ خطرہ مول لینے کے لیے بھی تیار ہوگئی ہو کہ......''

رشید خاں نے نہ جانے کیا سوچ کر پھر ایک ٹھنڈی سانس کے ساتھ بات ادھوری چھوڑ دی۔

ساجدہ خاموش رہی۔ شاید اسے اپنے شوہر سے اتفاق تھا کہ وہ ایک خطرہ مول لے رہی ہے۔

''ہم جیسے لوگوں کی اولاد تو ہونا ہی نہیں چاہیے۔'' رشید خاں شکستہ سے لہجے میں بولا۔ ''خاص طور سے لڑکی اگر پیدا بھی ہو تو پیدا ہوتے ہی مرجائے۔''

صبیحہ کا دل بھر آیا اور آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ دروازے سے ہٹ کر اپنے بستر کی طرف بڑھ گئی۔

عاصم اس رات جلدی ہی سوگیا تھا اور سونے سے پہلے وہ اس بات سے بے حد خوش ہوا تھا کہ دوسرے دن صبیحہ اسے شہر کے ایک بہت بڑے اسپتال لے جائے گی۔

صبیحہ بستر پر پڑی روتی رہی اور کچھ خیالات بھی اس کے ذہن میں چکراتے رہے۔ اپنے باپ کا یہ شبہ بھی ایک سوال بن کر اس کے دماغ میں ڈنک مارتا رہا کہ ارسلان شاہ کی اس مہربانی کے پس منظر میں کوئی گھناؤنا مقصد تو نہیں ہے؟

صبیحہ کے ذہن میں یہ بات بھی کھٹک رہی تھی کہ ارسلان شاہ نے اس دن اسے دو مرتبہ صرف ''صبیح'' کہہ کر مخاطب کیا تھا اور یہ انداز تخاطب بے تکلفی کی طرف بڑھنے کے لیے پہلا قدم ہوسکتا تھا۔ صبیحہ کو یہ بات اسی وقت کھٹک گئی تھی اور اس کی سوچ کے مطابق ارسلان شاہ نے اس کے چہرے کے تاثرات سے اس کا اندازہ بھی لگا لیا تھا۔ اسی لیے جب اس نے دوسری مرتبہ صبیحہ کو اپنے کمرے میں بلایا تھا تو اس کا پورا نام لیا تھا۔

لیکن بعد میں صبیحہ نے یہ بھی سوچا تھا کہ یہ سب کچھ اس کی غلط فہمی بھی ہوسکتی تھی۔ یہ اتفاق بھی ہوسکتا تھا کہ ارسلان شاہ نے اسے اس کے ادھورے نام سے مخاطب کیا تھا۔ صبیحہ کو

یہ بات معلوم ہو چکی تھی کہ دفتر کے اور لوگ بھی ایڈوانس لیتے رہتے تھے اور ان سب کا خیال تھا کہ ارسلان شاہ بہت اچھا انسان ہے جو اپنے دفتر کے لوگوں کا بے حد خیال رکھتا ہے۔
ان خیالات میں اُلجھے اُلجھے کسی وقت صبیحہ کو نیند آ گئی۔

☆☆☆

دوسرے دن صبیحہ اپنے بھائی کو لے کر ٹھیک نو بجے اسپتال پہنچ گئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ وہاں ایک آدھ گھنٹا لگے گا اور پھر وہ عاصم کو گھر پہنچا کے اپنے دفتر چلی جائے گی لیکن وہاں تین گھنٹے لگ گئے۔ عاصم کے نہ جانے کیا کیا ٹیسٹ ہوتے رہے تھے۔

آخر تین گھنٹے بعد صبیحہ کو ڈاکٹر سے بہ تفصیل بات کرنے کا موقع ملا۔

''معاملہ خاصا پیچیدہ ہے۔'' ڈاکٹر نے اس سے کہا۔ ''آپ کے بھائی کو ہم نے اسپتال میں داخل کر لیا ہے۔''

''داخل!'' صبیحہ چونکی۔

''جی ہاں، یہ بے حد ضروری ہے اگر اس حالت میں وہ اپنے گھر پر رہا تو کسی وقت بھی اس کی زندگی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔''

''تو......تو......'' صبیحہ نے پہلو بدلا۔ ''اسے کتنے دن تک اسپتال میں رہنا پڑے گا؟''

''اس بارے میں یقین سے ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن ایک مہینا تو ضرور لگے گا۔''

''اور اس پر کتنے پیسے خرچ ہو جائیں گے؟''

ڈاکٹر نے غور سے اس کی طرف دیکھا پھر بولا۔ ''آپ کو اس سلسلے میں فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ بل تو آپ کے دفتر جائے گا۔''

''پھر بھی...... مجھے معلوم تو ہو۔''

''ارسلان صاحب نے کہا ہے کہ آپ کو اس بارے میں کچھ نہ بتایا جائے۔''

''باس نے کہا ہے؟'' صبیحہ پھر چونکی۔

''جی ہاں، اس دوران میں دو مرتبہ ان کا فون آ چکا ہے۔ وہ عاصم کے بارے میں پوچھتے رہے تھے۔ وہ اس کے لیے خاصے فکر مند ہیں پھر ابھی چند منٹ پہلے میں نے بھی انہیں فون کیا تھا اور انہیں بتایا تھا کہ عاصم کو اسپتال میں داخل کرنا بے حد ضروری ہے۔ ان کی اجازت ملنے کے بعد ہی ہم نے عاصم کو اسپتال میں داخل کیا ہے۔''

صبیحہ خاصی پریشان ہو گئی۔ اس نے کبھی اتنے بڑے اسپتال میں علاج نہیں کروایا تھا لیکن اس نے لوگوں سے جو کچھ سنا تھا، اس کے مطابق وہاں کا ایک ماہ کا بل صبیحہ کے لیے ایک بہت کثیر رقم ہوتی۔ اس کا اندازہ تھا کہ اگر وہ اپنی تنخواہ میں سے ہر ماہ پانچ ہزار روپے بھی ایڈجسٹ کروائے گی تو اس میں کئی سال لگ جائیں گے۔

''آپ جا کے اپنے بھائی سے مل لیجیے۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''ارسلان صاحب کی ہدایت کے مطابق اسے جو کمرا دیا گیا ہے وہاں آپ یا آپ کا کوئی ایک عزیز بھی ہر وقت رہ سکتا ہے۔''

ڈاکٹر نے کمرا نمبر بھی بتایا۔

صبیحہ کے لیے اس وقت کوئی فیصلہ کرنا دشوار ہو گیا۔ اسے یہ اختیار تو بہر حال تھا کہ وہ عاصم کو اسی وقت وہاں سے لے جاتی۔ کیونکہ عاصم کو داخل کیا جا چکا تھا اس لیے اسپتال کا صرف ایک دن کا بل اس کے دفتر جاتا جو وہ کسی طرح ایڈجسٹ کروا ہی دیتی لیکن ڈاکٹر کی اس بات نے اسے بری طرح ڈرا دیا تھا کہ عاصم اگر اس حالت میں گھر پر رہا تو کسی وقت بھی اس کی زندگی خطرے میں پڑ سکتی تھی۔

ڈاکٹر کے کمرے سے نکل کر وہ انہی خیالات میں ڈوبی، عاصم کے کمرے کی طرف جانے لگی۔

جیسے ہی وہ کمرے میں داخل ہوئی، اسے دیکھ کر بستر پر لیٹا ہوا عاصم جلدی سے اٹھ بیٹھا۔ وہ بہت خوش نظر آ رہا تھا۔

''یہ تو بڑا ٹھنڈا کمرا ہے باجی۔'' وہ بولا۔

یہ ضرور اسپتال کے خاص کمروں میں سے ہے۔ صبیحہ نے سوچا اور ساتھ ہی اسے بے تحاشا اخراجات کا خیال بھی آیا۔

''یہاں ٹیلی فون بھی ہے باجی۔'' عاصم کسی چھ سات سالہ بچے کی طرح خوش نظر آ رہا تھا۔

صبیحہ نے بستر پر بیٹھ کر محبت سے اس کا گال تھپتھپایا۔

''میں یہاں ضرور ٹھیک ہو جاؤں گا باجی۔'' عاصم بولتا رہا۔ ''ڈاکٹر صاحب کہہ رہے تھے کہ اب وہ میرے پیٹ میں اتنے زور کا درد نہیں ہونے دیں گے اور کھانے کے لیے بھی مجھے نہ جانے کیا دیں گے کہ مجھے متلی نہیں ہو گی۔ میں بس ایک مہینے میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔''

عاصم کی خوشی دیکھ کر صبیحہ یہ فیصلہ نہیں کر سکی کہ اسے اسی وقت اسپتال سے لے جائے۔ اس کی خوشی دیکھ کر اس کا دل بھی بھر رہا تھا۔ اس وقت وہ یہ بھی سوچنے لگی کہ عاصم کے صحت مند ہو جانے کی خاطر کیا وہ کوئی بھی قربانی دے سکے گی؟

☆☆☆

''سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' دوسرے دن دفتر میں ارسلان شاہ، صبیحہ سے کہہ رہا تھا۔ ''تمہیں پریشان ہونے کی

ضرورت نہیں۔ بس پانچ سو روپے ماہانہ اپنی تنخواہ سے ایڈجسٹ کرواتی رہنا۔"

"اس ایڈجسٹمنٹ میں تو بہت عرصہ لگ جائے گا سر۔" صبیحہ نے پریشانی کے عالم میں کہا۔ "مجھے اندازہ تو ہے کہ اسپتال کا بل کتنا ہو جائے گا۔"

"کسی بھی فکر کی ضرورت نہیں ہے صبیحہ..... میں نے کہا نا، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم بس یہ خیال رکھو کہ اسپتال میں تمہارا بھائی گھبرائے نہیں۔"

"وہ گھبرائے گا نہیں۔ جب تک بھی وہ اسپتال میں ہے، اماں رہیں گی اس کے پاس۔ میں نے کل ہی انہیں اسپتال پہنچا دیا تھا۔ ابا بھی اسے دیکھنے جاتے رہیں گے اور شام کو میں بھی وہاں کا چکر ضرور لگایا کروں گی۔"

"ٹھیک ہے، بس اب جاؤ۔ اپنا کام دیکھو۔"

صبیحہ گم صم سی اٹھی اور کمرے سے نکل آئی۔

دفتر سے چھٹی کے بعد وہ سیدھی اسپتال پہنچی۔ اس وقت ساجدہ بڑی محبت سے عاصم کے سر کی مالش کر رہی تھی اور رشید خاں بھی ایک طرف بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے صبیحہ پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی اور پھر دوسری طرف دیکھتے ہوئے کچھ سوچنے لگا۔

صبیحہ کو دیکھ کر عاصم بہت خوش ہو گیا تھا اور چہکنے لگا تھا۔

"آپ کب آئے ابا؟" صبیحہ نے رشید خاں سے پوچھا۔

"ابھی..... تھوڑی دیر پہلے..... شاید آدھا گھنٹا ہو گیا۔" رشید خاں نے جواب تو دیا لیکن صبیحہ کی طرف دیکھا نہیں۔

صبیحہ نے ساجدہ کی طرف دیکھا تو اس نے نظریں چرا لیں۔

تھوڑی دیر بعد صبیحہ نے وہاں سے روانگی کا ارادہ کیا تو عاصم مچل گیا۔

"اتنی جلدی کیوں جا رہی ہیں باجی؟"

"اب مجھے گھر بھی تو دیکھنا ہوگا بھیا۔" صبیحہ نے کہا۔ "اماں تو یہاں ہیں۔ کھانا کون پکائے گا، گھر کی صفائی کون کرے گا۔ میں اب کل صبح دفتر جانے سے پہلے چکر لگا لوں گی یہاں کا۔"

"خالی گھر بھی تو زیادہ دیر تک نہیں چھوڑا جا سکتا۔" رشید خاں نے کہا اور پھر اپنی بیساکھیاں سنبھالتا ہوا صبیحہ کی طرف دیکھ کر بولا۔ "میں بھی تمہارے ساتھ ہی چلا چلتا ہوں۔"

صبیحہ اس وقت خاصی پریشان تھی۔ اسے ڈر لگا ہوا تھا کہ ابا اس سے نہ جانے کیا کہے لیکن وہ راستے میں بھی چپ رہا اور گھر جانے کے بعد بھی فوراً کچھ نہیں بولا۔ صبیحہ کھانا پکانے میں مصروف ہو گئی۔ گھر کے کام کاج میں وہ خاصی پھرتیلی تھی۔ وہ نو بجے سے پہلے پہلے سب کاموں سے فارغ ہو گئی۔ کھانا اس نے اتنا تیار کر لیا تھا کہ رشید خاں دوسرے دن دوپہر کو بھی کھا لیتا اور صبح دفتر جانے سے پہلے صبیحہ اسپتال جا کر اپنی ماں کو بھی اتنا کھانا دے دیتی جو دونوں وقت ہو جاتا۔ اس نے گزشتہ روز بھی ایسا ہی کیا تھا۔

باپ کے ساتھ اس نے خود بھی کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد رشید خاں کو لیموں کی چائے پینے کی عادت تھی۔ اسے چائے دے کر صبیحہ اپنے کمرے میں جانے لگی تو بڑی دیر سے سوچ میں ڈوبا ہوا رشید خاں بول پڑا۔ "سنو!"

صبیحہ رک گئی۔ اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئی تھیں۔

"پانی سر سے اونچا ہونے کے آثار..... ابھی نہیں دکھائی دیے تمہیں؟"

"میں سمجھی نہیں ابا!"

"اسپتال کا بل کتنا ہوگا؟..... کچھ اندازہ ہے؟"

"جی ابا!" صبیحہ نظریں جھکائے ہوئے بولی۔ "اندازہ تو ہے۔"

"تمہاری صرف ایک ماہ کی ملازمت کے بعد تمہارا دفتر اتنا بڑا بل ادا کرے گا۔"

"جی۔" صبیحہ کی آواز دھیمی ہی رہی۔ "مجھے دفتر کے کچھ لوگوں سے بھی معلوم ہوا ہے کہ ہمارے باس اپنے دفتر کے لوگوں کا بہت زیادہ خیال رکھتے ہیں۔"

"اتنا زیادہ خیال؟..... اسپتال کا بل ہزاروں میں تو نہیں ہوگا۔"

"مجھے اندازہ ہے ابا لیکن اماں سے میں ایک بات کہہ چکی ہوں۔ اماں نے بتایا تو ہوگا تمہیں۔"

"ہاں، بتایا تھا ساجدہ نے لیکن..... تمہاری آنکھیں کیا اتنی دور تک دیکھ سکتی ہیں جتنی دور تک میں دیکھ سکتا ہوں؟"

"ابا!" صبیحہ کی آواز گھٹی ہوئی تھی۔ "اماں سے تو میں کہہ چکی لیکن اگر تم کچھ کہو گے تو میں عاصم کی بیماری بھلا کر ملازمت چھوڑ دوں گی۔"

رشید خاں کچھ نہیں بولا۔ اب تک وہ صبیحہ کی طرف دیکھتے ہوئے باتیں کرتا رہا تھا لیکن اب دوسری طرف دیکھنے لگا۔ اس وقت اس کے چہرے پر غربت کا شدید احساس اور لاچاری کا کرب صاف نظر آ رہا تھا۔

وہ پھر کئی منٹ تک کچھ نہیں بولا تو صبیحہ اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ وہ بستر پر لیٹی تو بہت اُداس تھی۔

دوسری صبح وہ کچھ جلدی اٹھی۔ باپ کو ناشتا کرانے کے

بعد دفتر جانے کے لیے تیار ہوئی پھر ایک ٹفن میں ماں کے لیے کھانا لے کر اسپتال روانہ ہوئی۔

پھر اسی معمول میں دس دن گزر گئے۔ اتنے کم دنوں ہی میں عاصم کی صحت کچھ بہتر ہونے لگی تھی اور وہ بہت زیادہ خوش نظر آنے لگا تھا۔

دسویں دن ڈاکٹر نے صبیحہ کو بتایا کہ عاصم کی حالت اطمینان بخش تھی اس لیے اسے مہینے بھر سے زیادہ عرصے اسپتال میں رکھنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔

☆☆☆

زریاب ایک پینٹنگ بناتے ہوئے احمر سلطانہ سے باتیں بھی کرتا جا رہا تھا جو کرسی پر بیٹھی تھی اور باتیں کرتے ہوئے پینٹنگ کی طرف بھی دیکھ رہی تھی۔

''کافی دن ہو گئے۔'' زریاب کہہ رہا تھا۔ ''ارسلان سے ملاقات ہی نہیں ہوئی۔ کبھی وہ مجھے لان میں یا کھانے کی میز پر بلا لیتا تھا لیکن شاید دس دن سے زیادہ ہو گئے، ایسا نہیں ہوا۔ وہ خود بھی یہاں نہیں آیا حالانکہ کبھی کبھار تو آ جاتا تھا۔''

''ارسلان کی وجہ سے میں بھی الجھن میں پڑ گئی ہوں زریاب!'' احمر سلطانہ نے کہا۔ ''آج کل وہ کچھ پریشان ہیں۔ بعض اوقات تو اتنے گم صم ہوتے ہیں کہ میری آواز سن کر بری طرح چونک جاتے ہیں۔''

زریاب نے مڑ کر تشویش سے احمر سلطانہ کی طرف دیکھا۔ ''اسے ہم دونوں کے بارے میں شبہ تو نہیں ہو گیا؟''

''میرے خیال میں تو ایسی کوئی بات نہیں ہے۔''

''پھر کیا بات ہے؟''

''میں نے انہیں ٹٹولنے کی کوشش تو کی تھی۔ ان کا کہنا ہے کہ بزنس کی کسی ڈیل میں انہیں کسی بڑے خسارے کا اندیشہ ہے۔ مطلب یہ کہ اگر ڈیل نہ ہو سکی تو انہیں خسارے کا امکان نظر آ رہا ہے لہٰذا جب تک ڈیل ہو نہیں جاتی، انہیں پریشانی تو رہے گی۔''

''آپ کو یقین ہے کہ یہی بات ہو گی؟''

''میں نے ابھی کہا تھا نا کہ الجھن میں تو میں بھی پڑ گئی ہوں۔ بزنس کے کسی معاملے کی وجہ سے وہ کبھی کبھی پریشان تو نظر آتے ہیں لیکن ایسا دو ایک دن سے زیادہ کبھی نہیں ہوا۔''

''تو پھر؟''

''شاید کوئی اور ہی بات ہے۔''

''اسی لیے تو میں پوچھ رہا تھا کہ اسے ہم دونوں کے بارے میں تو شبہ نہیں ہو گیا؟''

''ایسی کوئی بات نہیں۔ یہ تو میں یقین سے کہہ سکتی ہوں۔ دو ایک بار آپ کا ذکر بھی چھیڑا ہے ارسلان نے لیکن اسی طرح جیسے ہمیشہ بات ہوئی ہے اگر انہیں کوئی شبہ ہوا ہوتا تو ان کے لہجے میں کوئی تبدیلی ضرور محسوس ہوتی۔ ایسے معاملات میں انسان خود کو مکمل طور پر قابو میں نہیں رکھ سکتا، وہ کتنی بھی کوشش کرے، اس کے لہجے میں کچھ تبدیلی ضرور آ جاتی ہے۔''

''یہ بھی آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔'' زریاب نے کھوئے ہوئے سے انداز میں کہا اور پھر پینٹنگ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''میں کوشش کروں گی کہ ان کی پریشانی کی اصل وجہ معلوم ہو جائے۔'' احمر سلطانہ نے کہا۔ ''اور ہو سکتا ہے کہ ان کی وہی بات درست ہو جو وہ مجھ سے کہہ چکے ہیں۔ بہر حال، یہ خیال تو آپ اپنے ذہن سے نکال دیں کہ انہیں ہم پر شبہ ہو گیا ہے۔ آپ پورے سکون سے اپنی یہ پینٹنگ مکمل کریں۔ مجھے یہ آپ کی دوسری پینٹنگز سے کچھ زیادہ ہی پسند آ رہی ہے۔'' احمر سلطانہ اٹھ کر زریاب کے برابر میں جا کھڑی ہوئی۔

''اچھا!'' زریاب دھیرے سے ہنسا۔ ''زیادہ پسندیدگی کی وجہ؟''

''بعض چیزوں کی پسندیدگی کی وجہ بتانا شاید بہت مشکل ہوتا ہے۔'' احمر سلطانہ نے زریاب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کا لہجہ خاصا معنی خیز تھا۔

زریاب نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اس کی طرف دیکھا تو وہ زریاب سے نظریں نہیں ملا سکی اور پینٹنگ کی طرف دیکھنے لگی، پھر انگلی سے پینٹنگ کے ایک حصے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ''بس اس حصے میں مجھے کچھ ایسا لگ رہا ہے جیسے رنگ کچھ پھیکا ہے۔ اسے اور گہرا ہونا چاہیے۔''

زریاب نے پینٹنگ کے اس حصے کو غور سے دیکھا جس کی طرف احمر سلطانہ نے اشارہ کیا تھا پھر اس نے چاروں طرف سر گھما کر کمرے کی لائٹس کا جائزہ لیا اور پھر دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ''اس حصے پر غالباً لائٹ شیڈ پڑ رہا ہو گا۔ آپ اسے بالکل قریب سے...... یہاں سے دیکھیے۔''

احمر سلطانہ زریاب کے دائیں ہاتھ پر کھڑی تھی۔ زریاب نے اس کے دائیں شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے اپنے قریب کیا تاکہ وہ پینٹنگ سامنے سے دیکھ سکے۔

یہ پہلا موقع تھا جب زریاب نے اسے چھوا تھا۔ اس کا جسم بھی زریاب کے جسم سے تھوڑا سا ٹکرایا تھا۔ اس ٹکراؤ اور شانے پر زریاب کے ہاتھ کا لمس ایسا تھا کہ اس کا سارا جسم

سنسنا گیا۔ اسے ایسا لگا جیسے اس نے ہلکی برقی رو کے کسی تار کو چھولیا ہو لیکن وہ برقی رو نشاط انگیز بھی تھی۔

''یہاں سے ٹھیک لگ رہا ہے نا۔'' زریاب نے پینٹنگ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ شاید اسے اس کا احساس ہی نہیں تھا کہ وہ کیا حرکت کر بیٹھا تھا لیکن اس کے چہرے پر ہلکی سی سرخی آگئی تھی۔

جسم میں دوڑتی ہوئی نشاط انگیز لہروں نے احمر سلطانہ کو اکسایا۔ اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ زریاب اس کے شانے پر اپنی گرفت سخت کر دے، اسے اپنے بازوؤں کے حصار میں جکڑ لے۔

اسی کیفیت میں احمر سلطانہ کے دماغ میں ارسلان کی بات گونجی۔ ''محبت کے معاملات میں یہ حیوانی جذبہ کسی وقت بھی سر اٹھالیتا ہے اور اگر وقت اور ماحول اس میں حارج نہ ہوں تو انسان اس دھارے میں بے بس تنکے کی طرح بہہ جاتا ہے۔''

''نہیں۔'' احمر سلطانہ کے دماغ میں خود اس کی آواز گونجی۔ ''اسے بے بس تنکے کی طرح نہیں بہنا چاہیے۔''

اس نے ایک جھٹکے کے ساتھ خود کو زریاب سے دور کر لیا۔ زریاب نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس وقت احمر سلطانہ کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔

''یہ...... یہ آپ نے...... یہ آپ نے کیا کیا زریاب؟'' احمر سلطانہ کی سانس پھول رہی تھی۔

زریاب نے سکتے کی سی حالت میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آئی ایم سوری احمر!''

احمر سلطانہ کے ہونٹوں میں ایسی لرزش تھی جیسے وہ کچھ کہنا چاہتی ہو لیکن اس کے منہ سے پھر ایک لفظ بھی نہیں نکلا۔ وہ یکا یک مڑ کر تقریباً دوڑتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔ اسی طرح وہ اپنے کمرے تک پہنچی۔ غنیمت یہ ہوا کہ گھر کے کسی ملازم نے اسے اس طرح زریاب کے کمرے سے نکلتے نہیں دیکھا ورنہ وہ جو کچھ سمجھتا، اس میں اس کا کوئی قصور نہیں ہوتا۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر احمر سلطانہ بستر پر اس طرح ڈھیر ہوئی جیسے اس وقت اپنے جسم کا وزن سنبھالنا اس کے لیے ممکن نہ ہو۔ اس کی سانس بری طرح پھولی ہوئی تھی۔ سینہ دھونکنی کی طرح پھول پچک رہا تھا اور چہرے پر اب بھی ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ دماغ جیسے آندھیوں کی زد پر تھا۔

کوئی آدھے گھنٹے تک وہ بستر پر پڑی خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتی رہی پھر آہستہ سے اٹھی۔ اس نے الماری کھول کر شراب کی بوتل نکالی اور ایک پیگ بنا کر کرسی پر بیٹھ گئی۔

آدھا گلاس تو اس نے ایک ہی سانس میں خالی کر دیا۔ پھر چھوٹے چھوٹے گھونٹ لینے لگی۔ اس طرح اس کے جسم کی، اچانک کھو جانے والی توانائی آہستہ آہستہ واپس لوٹنے لگی۔ اسے خیال آرہا تھا کہ زریاب کے ساتھ گزرے ہوئے وہ چند لمحے شاید زندگی بھر نہ بھول سکے اور یہ بڑی خیر ہوئی تھی کہ وہ اس طوفان کی زد سے نکل آئی تھی جو شاید ایک معجزہ تھا۔ ارسلان نے تو کہا تھا کہ ایسے موقع پر انسان بے بس تنکے کی طرح بہہ جاتا ہے لیکن اس نے خود کو بروقت سنبھال لیا تھا۔

زریاب سے اپنی محبت کو تو وہ کوشش کے باوجود نہیں چھپا سکی تھی لیکن زریاب سے اتنا قریب ہو جانا اس کی دانست میں اس کا ایک بہت بڑا جرم ہوتا۔

ارسلان اس قسم کے معاملات میں بڑے سفاک خیالات رکھتا تھا اور اسے ایک فطری معاملہ قرار دیتا تھا۔ دو تین روز پہلے بھی احمر سلطانہ نے اپنی دوست کی آڑ میں یہ بحث چھیڑی تھی اور ارسلان نے کہا تھا کہ اگر ایسا ہو جائے تو عورت کی جسمانی کیمسٹری میں کوئی فرق نہیں آتا اور وہ یہ بات بس اپنے شوہر سے پوشیدہ رکھے۔ اس نے یہ تک کہا تھا کہ بعض اوقات شادی سے پہلے بھی بعض لڑکیوں کے کسی سے تعلقات ہو جاتے ہیں لیکن شادی کے بعد وہ یہ بات اپنے شوہر سے پوشیدہ رکھتی ہیں اور ان کی ساری زندگی ہنسی خوشی گزر جاتی ہے لیکن احمر سلطانہ ایک نہایت ماڈرن گھرانے سے تعلق رکھتے ہوئے بھی اسے ایک بہت بڑا جرم سمجھتی تھی۔ اسی لیے اسے یہ احساس پرسکون کرتا چلا گیا کہ وہ ایک جرم سے بچ گئی تھی۔

پیگ ختم کر کے وہ بستر پر لیٹ گئی۔ اس نے دوسرا پیگ پینا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ ایک ہی پیگ پی کر وہ اپنی حالت پر بڑی حد تک قابو پا چکی تھی۔ وہ بستر پر لیٹ کر زریاب کے بارے میں سوچنے لگی۔ اس کے خیال کے مطابق زریاب کی وہ حرکت شعوری نہیں تھی۔ وہ بے اختیار ہی ایسا کر بیٹھا تھا۔ احمر سلطانہ نے اسے اگر کبھی گھٹیا انسان سمجھا ہوتا تو اس کے دل میں زریاب کی محبت کبھی پیدا نہیں ہوتی۔

احمر سلطانہ نے اپنا دل اچھی طرح ٹٹولا۔ زریاب کی اس حرکت کے باعث اس کے دل میں زریاب کی محبت کم نہیں ہوئی تھی لیکن اب احتیاط کا تقاضا یہی تھا کہ وہ اس سے تنہائی میں نہ ملے، اسے لان میں یا ڈرائنگ روم میں بلا لیا کرے تاکہ اس ماحول میں حیوانی جذبات اپنا رنگ دکھا ہی نہ سکیں۔ وہ آج تو کسی طرح خود کو سنبھالنے میں کامیاب ہوگئی تھی لیکن ضروری نہیں تھا کہ ہمیشہ ہی ایسا ہو۔ تنہائی میں کسی

وقت بھی یہ ممکن تھا کہ وہ اور زریاب، دونوں ہی جذبات کے دھارے میں بے بس تنکے کی طرح بہہ جاتے اور پھر احساس جرم کم از کم احمر سلطانہ کی زندگی کو دیمک کی طرح چاٹ ڈالتا۔

پھر دوسرے دن احمر سلطانہ نے ایسا ہی کیا۔ اس نے ایک ملازم کے ذریعے زریاب کو لان میں بلا لیا۔ اس نے کہلوایا تھا کہ وہ آ کر چائے پی لے۔

یہ دیکھ کر وہ چونک گئی کہ زریاب کے دائیں ہاتھ پر ڈریسنگ تھی۔

''یہ کیا ہوا؟'' اس نے بے تابی سے پوچھا۔

''میں نے بستر کا سائڈ لیمپ بجھا کر اس کا شیشہ پکڑ لیا تھا اور شیشہ اتنی جلدی تو ٹھنڈا نہیں ہوتا۔'' زریاب نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

احمر سلطانہ اسے حیرت سے دیکھنے لگی۔

''اس ہاتھ کو اتنی سزا تو ملنا ہی چاہیے تھی۔'' زریاب نے اس مرتبہ بڑے گمبھیر لہجے میں کہا۔

احمر سلطانہ بے چین ہو گئی۔ ''ابھی ڈاکٹر کے پاس چلیے۔''

''اس کی ضرورت نہیں ہے احمر! میں نے خود ہی دوا لگا کر ڈریسنگ کر لی ہے۔ ایک آدھ ہفتے میں ٹھیک ہو جائے گا ہاتھ۔''

''ارسلان دیکھیں گے تو نہ جانے کیا سوچیں۔'' احمر سلطانہ نے وحشت میں کہا۔

''میں اسے کچھ بھی سوچنے کا موقع نہیں دوں گا۔ خود ہی بتا دوں گا کہ لیمپ کا شیشہ ٹھیک کرنے لگا تھا اور بھول ہی گیا تھا کہ وہ میں نے چند لمحے پہلے ہی بند کیا ہے لہٰذا اس کا شیشہ گرم تو ہو گا۔'' پھر زریاب عجیب سے انداز میں ہنسا۔ ''ہم آرٹسٹوں سے اس قسم کی حماقتوں کی توقع تو ہر ایک کو ہوتی ہے۔''

اس وقت زریاب کے ہاتھ کی طرف دیکھتے ہوئے احمر سلطانہ کی پلکیں بھیگنے لگیں...... پھر اس نے فوراً ہی خود کو سنبھالا کیونکہ ملازم چائے کی ٹرے لیے ان کی طرف آ رہا تھا۔

☆☆☆

مہینے بھر بعد صبیحہ دفتر میں ارسلان بیگ کے سامنے بیٹھی بڑے پرمسرت لہجے میں کہہ رہی تھی۔ ''کل صبح میرے بھائی کو اسپتال سے ڈسچارج کر دیا جائے گا سر...... ڈاکٹر صاحب کہہ رہے تھے کہ اب اس کے پیٹ میں درد کبھی نہیں ہو گا۔ بس ایک دوا کی گولی عاصم کو دو مہینے تک روزانہ کھانا ہو گی۔ میرے پوچھنے پر ڈاکٹر صاحب نے بڑے اعتماد سے کہا تھا کہ اب عاصم کو اسکول میں داخل کرایا جا سکتا ہے۔''

''مبارک ہو صبیحہ!'' ارسلان شاہ نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''میں آپ کی بے حد شکر گزار ہوں سر۔'' صبیحہ کی پلکیں بھیگ گئیں۔

''شکر گزار ہونے کی اس میں کوئی بات نہیں۔ اس کا علاج تم نے اپنے پیسوں سے کروایا ہے۔''

''میں اس خوش فہمی کا شکار نہیں ہوں سر!'' صبیحہ نے سنجیدگی سے کہا۔ ''مجھے اب علم ہو چکا ہے کہ اس کا بل کیا آئے گا۔''

''جو بھی آئے گا، وہ تم ایڈجسٹ تو کرواؤ گی نا!''

''پانچ سو روپے مہینا۔'' صبیحہ نے سنجیدگی سے کہا۔ ''اس بل کے آگے اس معمولی رقم کی کوئی اہمیت ہی نہیں ہے۔ آپ تو میرے لیے اور میرے گھر والوں کے لیے ایک فرشتہ ثابت ہوئے ہیں سر۔ کسی لالچ کے بغیر آج کے زمانے میں کون کسی کے لیے اتنا کرتا ہے۔''

''تم سے ایک بات کہوں صبیح؟'' ارسلان بیگ نے جان بوجھ کر اس کا ادھورا نام لیا۔ وہ گزشتہ دنوں میں بھی دو تین بار دانستہ ایسا کر چکا تھا اور ہر مرتبہ اس نے محسوس کیا تھا کہ صبیحہ کے چہرے کی رنگت بدل گئی تھی۔ اس نے اس وقت بھی محسوس کیا کہ صبیحہ کی سنجیدگی کچھ زیادہ گہری ہو گئی تھی۔

''جی!'' صبیحہ نے کچھ چونکتے ہوئے انداز میں اس کی طرف دیکھا بھی تھا۔ ''جی...... جی سر!''

''کہنا تو کیا۔'' ارسلان شاہ بولا۔ ''بس کچھ پوچھنا چاہتا ہوں تم سے۔''

صبیحہ نے سوالیہ انداز میں ارسلان شاہ کی طرف دیکھا اور پھر نظریں جھکا لیں۔

''اپنی آیندہ زندگی کے بارے میں تم نے کچھ سوچا تو ہو گا!'' ارسلان شاہ بولا۔

صبیحہ کچھ نہیں بولی۔ اس کا انداز ایسا تھا، جیسے وہ سوچ میں پڑ گئی ہو کہ یہ پوچھنے کا مقصد کیا ہو سکتا ہے۔

''جواب نہیں دیا تم نے!'' ارسلان شاہ نے کچھ توقف سے کہا۔

صبیحہ نے بھی کچھ رک کر جواب دیا۔ ''عاصم کے علاج کے بعد میں اب اس کے علاوہ کچھ سوچ ہی نہیں سکتی کہ مجھے اب اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ آپ کی ملازمت میں گزارنا ہے اور ساری رقم ایڈجسٹ کروانا ہے۔ میں اب اس صورت

حال میں اپنی زندگی کے بارے میں کچھ اور سوچ ہی کہاں سکتی ہوں۔''

صبیحہ کے لہجے میں جو کرب تھا، اس نے ارسلان شاہ کے دل پر چرکا سا لگایا۔ وہ نظریں جھکا کر کچھ سوچنے لگا۔

صبیحہ ان باتوں سے کچھ مضطرب ہو گئی تھی۔ وہ بولی۔

''کیا میں جاؤں سر؟''

''ایک منٹ صبیحہ!'' ارسلان شاہ نے سنجیدگی سے کہا۔ ''ایک بہت نجی سا سوال کر رہا ہوں میں تم سے۔ تم نے کسی شخص کے بارے میں کبھی کچھ سوچا ہے؟''

''میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔''

''ہاں میرا سوال شاید مبہم تھا۔ مطلب یہ کہ ہر لڑکی کو زندگی گزارنے کے لیے ایک ساتھی کی ضرورت تو پڑتی ہے۔ تم نے اس حوالے سے کبھی کسی کو دیکھا ہے؟''

''جی نہیں۔'' صبیحہ نے نظریں جھکا کر کہا ''زندگی کے اندھیروں میں کبھی کسی طرف دیکھنا ممکن ہی نہیں تھا۔''

''تمہارے والدین نے تو سوچا ہوگا کچھ اس بارے میں؟''

''جی۔'' صبیحہ نظریں جھکائے ہوئے بولی۔ ''سوچا تو ہوگا۔ سبھی والدین اس بارے میں سوچتے ہی ہیں لیکن میرے والد...... یہ تو میں آپ کو بتا چکی ہوں کہ وہ ایک حادثے میں معذور ہو چکے ہیں۔ اس کے بعد سے اب تک گھر کے جو حالات رہے ہیں، ان میں بس سوچا ہی جا سکتا ہے، کچھ کیا تو نہیں جا سکتا لیکن۔'' صبیحہ نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے یہ سب کچھ کیوں جاننا چاہا؟''

''بس اس لیے کہ اگر تم نے کسی کو پسند کیا ہو تو میں اس معاملے میں تمہارے والد سے مل کر ان کی کچھ مدد کروں۔''

''آپ مجھ پر اتنے احسانات کیوں کرنا چاہتے ہیں سر؟ اور پھر اب یہ ممکن بھی کہاں رہا ہے؟'' صبیحہ مغموم ہو گئی۔ ''ایڈوانس ایڈجسٹ کراتے کراتے میری زندگی کا ایک بڑا عرصہ تو اب آپ کی ملازمت میں ہی گزرنا ہے۔''

''میں نے تم سے کہا تھا کہ اس ایڈوانس کے سلسلے میں تمہیں اتنا فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔''

''فکر مند میں شروع میں ہوئی تھی سر۔ اب تو نہیں ہوں۔ اب تو سوچ لیا ہے، سمجھ لیا ہے کہ اس ایڈوانس کو ایڈجسٹ کرانے کے لیے مجھے خاصے لمبے عرصے تک آپ کی ملازمت کرنا ہے۔''

''لیکن۔'' ارسلان شاہ کچھ سوچتے ہوئے رکا، پھر بولا۔ ''اگر اس ایڈوانس کو قرض کہہ لیا جائے اور کوئی تمہارا یہ قرض ادا کر دے تو؟''

''میں نہیں سمجھتی کہ کوئی ایسا کرے گا۔'' صبیحہ نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اور اگر کوئی ایسا کرے گا تو اسے مجھ سے ضرور کوئی لالچ ہوگا۔ اس سے اگر میری عزت نفس کو ٹھیس پہنچتی ہے تو میں شدید اذیت میں مبتلا ہو جاؤں گی اور اگر کسی وجہ سے میں نے خود کو مجبور پایا تو خودکشی کے سوا کوئی راستہ نہیں رہے گا میرے لیے۔''

ارسلان شاہ نے اضطراب میں پہلو بدلا اور صبیحہ کی طرف دیکھتا رہا جو بہت گمبھیرتا سے نظریں جھکائے بیٹھی ہوئی تھی۔

''زندگی کو اتنا بے وقعت سمجھتی ہو تم؟'' وہ بولا۔

''زندگی کی وقعت تو اسی وقت تک ہے سر جب تک عزتِ نفس محفوظ ہو۔''

''ہوں۔'' ارسلان شاہ نے طویل سانس لی۔ ''تمہارے سوچنے کا یہ انداز بہت سنگین ہے۔''

''حالات انسان کو اس طرح سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں سر!''

''اچھا خیر!'' ارسلان شاہ سوچتا ہوا بولا ''ان باتوں کا اپنے ذہن پر کوئی بوجھ مت لینا۔ یہ مت سوچنا کہ میں نے تم سے یہ باتیں کیوں کیں۔ بھول جاؤ یہ سب، اور جاؤ کام کرو۔ کسی دن اپنے بھائی کو دفتر ضرور لانا۔ دیکھنا چاہتا ہوں میں اسے۔ مجھے خوشی ہوگی اسے دیکھ کر۔''

''بہتر۔''

صبیحہ سنجیدہ تاثرات کے ساتھ اٹھی اور کمرے سے چلی گئی۔

اس رات ارسلان شاہ کی آنکھوں سے نیند بہت دور رہی۔ اس نے آنکھیں صرف اس لیے بند کر رکھی تھیں کہ احمر سلطانہ کو اس کے جاگنے کا علم نہ ہو جائے پھر جب ایک بج گیا اور ارسلان شاہ کا یہ احساس خاصا پختہ ہو گیا کہ احمر سلطانہ اب گہری نیند میں تھی تو وہ بہ آہستگی بستر سے اٹھا۔ اس نے بڑی احتیاط سے وہ الماری کھولی جس میں شراب رکھی رہتی تھی۔

اس نے بوتل اور گلاس تپائی پر رکھ کر غور سے احمر سلطانہ کی طرف دیکھا جو گہری گہری سانسیں لے رہی تھی اور اسی سے ارسلان شاہ نے اندازہ لگایا تھا کہ اب وہ گہری نیند میں تھی۔

کھانے سے پہلے ارسلان شاہ نے دو پیگ لیے تھے لیکن اس رات اس کا جی چاہ رہا تھا کہ خود کو شراب میں غرق کر لے۔ اس کے بعد ہی یہ ممکن تھا کہ وہ احمر سلطانہ سے کچھ

باتیں کرسکتا لیکن یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ احمر سلطانہ اسے دو پیگ سے زیادہ پینے دیتی۔ اسی لیے اس نے احمر سلطانہ کے سو جانے کا انتظار کیا تھا۔

کرسی پر بیٹھے بیٹھے اس نے دوسرا پیگ پیتے ہوئے اس مرتبہ بڑے غور سے احمر سلطانہ کے خوب صورت چہرے کا جائزہ لیا۔ اسے وہ اتنی ہی خوب صورت لگی جتنی وہ جوانی میں تھی۔ جسمانی طور پر بھی وہ بالکل نہیں ڈھلکی تھی۔ اس کا بڑا سبب یہ تھا کہ وہ ماں نہیں بنی تھی اور ''یوگا'' کی مشقیں اس کی زندگی کا لازمی حصہ اس وقت سے بنی ہوئی تھیں جب اس کی شادی بھی نہیں ہوئی تھی۔

ارسلان شاہ پیتا رہا اور بہت کچھ سوچتا رہا۔ جب اس نے چوتھا پیگ بنا کر ہونٹوں سے لگایا تو یہ دیکھ کر چونکا کہ احمر سلطانہ کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور وہ بڑی سنجیدگی کے ساتھ غور سے ارسلان شاہ کی طرف دیکھ رہی تھی۔

نظریں ملتے ہی وہ بولی۔ ''آپ باز نہیں آئے پینے سے!''

ارسلان شاہ کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ بولا۔ ''اگر تم نہ جاگتیں تو یہ پیگ ختم کرنے کے بعد میں خود تمہیں جگاتا۔''

''کیوں؟''

''کچھ باتیں کرنا ہیں تم سے!''

احمر سلطانہ اپنے چہرے پر الجھن کے تاثرات کے ساتھ اٹھ بیٹھی۔ نیند کے خمار نے اس کی آنکھوں میں سرخ سرخ ڈورے ڈال دیے تھے اور اس کی آنکھیں زیادہ حسین نظر آنے لگی تھیں۔ شب خوابی کے ڈھیلے ڈھالے لباس میں اس کا مرمریں پیکر نہایت زہد شکن نظر آرہا تھا لیکن اس وقت ارسلان کا ذہن خیالات کی ایسی بھول بھلیوں میں بھٹک رہا تھا کہ اس کی جمالیاتی حس کسی گھور تاریکی میں جا چھپی تھی۔

احمر سلطانہ بستر سے اٹھی تو ارسلان شاہ گلاس ہاتھ میں لیے جلدی سے اٹھا اور بولا۔ ''میں وہیں آرہا ہوں۔''

احمر سلطانہ پھر بستر پر بیٹھ گئی اور الجھی ہوئی نظروں سے ارسلان شاہ کی طرف دیکھتی رہی۔

ارسلان شاہ اس کے قریب جا کر اس کے پہلو میں اس طرف بیٹھا جس طرف سائڈ ٹیبل تھی۔ اس نے ایک بڑا گھونٹ لے کر گلاس سائڈ ٹیبل پر رکھا اور احمر سلطانہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''جو باتیں میں تم سے کرنا چاہتا ہوں، اس کے لیے مجھے ہمت کی ضرورت تھی جو مجھ میں شراب سے ہی پیدا ہو سکتی تھی۔''

''کافی دن سے مجھے اس کا اندازہ ہے کہ آپ کسی معاملے میں خاصے پریشان ہیں۔'' احمر سلطانہ بولی۔ ''لیکن یہ اندازہ مجھے نہیں تھا کہ اس پریشانی کی نوعیت ایسی ہے، جس کا اظہار کرنے کے لیے آپ کو شراب کی ضرورت ہے۔''

''ہاں۔'' ارسلان شاہ نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''بات کچھ ایسی ہی ہے۔''

''کہیے!'' احمر سلطانہ اس کی طرف دیکھتی رہی۔

''سمجھ میں نہیں آرہا ہے، بات کہاں سے شروع کروں۔'' ارسلان شاہ نے گلاس اٹھا کر ایک گھونٹ لیا۔

''کتنی پی چکے ہیں اب تک؟'' احمر سلطانہ نے پوچھا۔

''یہ چوتھا ہے۔''

''اوہ!'' احمر سلطانہ کے لہجے میں تشویش تھی۔ ''آپ کے اعصاب پر یقیناً شدید دباؤ ہے۔ چوتھے پیگ نے بھی آپ پر اتنا اثر نہیں کیا جو عام حالات میں یقیناً ہوتا ہے۔''

ارسلان شاہ نے گلاس سائڈ ٹیبل پر رکھا اور اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اس کے چہرے سے شدید الجھن کا اظہار ہو رہا تھا۔ احمر سلطانہ اس کی طرف دیکھتی رہی۔ اب وہ کچھ پریشان نظر آنے لگی تھی۔ غالباً اس کی سمجھ میں نہیں آرہا ہو گا کہ بزنس کی کسی پریشانی کے بارے میں بتانے کے لیے ارسلان شاہ کو اتنی الجھن کیوں ہے کہ بات شروع کرنا بھی اس کے لیے مشکل ہو گیا ہے۔

کچھ توقف سے ارسلان شاہ نے ایک کرسی کے قریب رک کر احمر سلطانہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم برا نہ مانو تو ایک بات کہوں تم سے!''

''کہیے!'' احمر سلطانہ کے چہرے پر الجھن کا تاثر بڑھ گیا۔

''تم۔'' ارسلان شاہ کچھ کہتے کہتے رکا پھر ایک طویل سانس لے کر بولا۔ ''تم زریاب کے کمرے میں جانا چھوڑ دو۔''

☆☆☆

احمر سلطانہ کا دل بڑی زور سے اچھلا اور سارے جسم میں سنسناہٹ پھیلتی چلی گئی۔ اسے تو یقین تھا کہ اس کے اور زریاب کے معاملے میں ارسلان شاہ کو ذرا بھی شبہ نہیں ہوا ہو گا۔

ارسلان شاہ جلدی سے احمر سلطانہ کے قریب پہنچا اور اس کے پہلو میں بیٹھ کر اس کے گھٹنے پر ہاتھ رکھتے ہوئے محبت بھرے لہجے میں بولا۔ ''تم خوب جانتی ہو کہ میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں اور بس ... اسی لیے میں کوئی خطرہ مول نہیں

لینا چاہتا۔"

احمر سلطانہ کے دل کی دھڑکنیں بہت بڑھ چکی تھیں۔

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔" اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

"دیکھو احمر!" ارسلان شاہ نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ "بعض باتیں ہم پڑھتے بھی ہیں، لوگوں سے سنتے بھی ہیں لیکن وہ کسوٹی پر کھری اسی وقت محسوس ہوتی ہیں جب آدمی خود اس صورتِ حال میں پھنستا ہے۔"

احمر سلطانہ کو ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کی جان نکلی جا رہی ہو۔

یکا یک ارسلان شاہ اٹھا اور پھر ٹہلنے لگا۔ "سنا تو تم نے بھی ہوگا کہ ہمارے اجداد نے جو معاشرہ تشکیل دیا تھا اس میں عورت اور مرد کے درمیان ممکنہ حد تک دوری پر خاصا زور دیا تھا اور اس میں جو حکمت تھی، وہ آج پوری طرح میری سمجھ میں آ چکی ہے۔ سگے بہن بھائی بھی اگر جوان ہوں تو ان کا ایک کمرے میں رہنا اسی لیے مناسب نہیں سمجھا گیا کہ بعض اوقات کوئی معمولی سی تحریک بھی انسان کے اندر چھپے ہوئے وحشی جذبے کو سامنے لے آتی ہے۔ اس وحشی جذبے کے ہاتھوں انسان کتنا بے بس ہو جاتا ہے، یہ ہمارے اجداد جانتے تھے اور اسی لیے انہوں نے ایک ایسے معاشرے پر اصرار کیا جس میں عورت اور مرد کو ایک دوسرے سے دور رکھنے پر زور دیا گیا۔"

احمر سلطانہ گم صم سی بیٹھی ارسلان شاہ کی طرف دیکھتی رہی جو اس وقت کسی مفکر کے انداز میں بول رہا تھا۔ اس نے قریب آ کر سائڈ ٹیبل سے اپنا گلاس اٹھا کر ایک گھونٹ لیا اور گلاس ہاتھ میں لیے لیے پھر ٹہلنے لگا۔

"لیکن اب زمانہ بدل چکا ہے۔ قدریں بدل چکی ہیں۔ عورت اور مرد ایک دوسرے سے قریب رہنے لگے ہیں اور ہمارے اجداد کے خدشات رنگ لانے لگے ہیں۔" ارسلان شاہ نے پھر بولنا شروع کیا۔ "اخبارات میں کبھی کبھی ایسی خبریں آتی رہتی ہیں جنہیں پڑھ کر انسان کانپ جاتا ہے لیکن میں سوچتا ہوں کہ ایسے بہت سے واقعات اخبارات تک پہنچتے بھی نہیں ہوں گے۔ میں یہ تو اب بھی نہیں کہوں گا کہ لوگوں کے کردار منفی ہو گئے ہیں لیکن میں وہ باتیں ضرور دہراؤں گا جو تمہاری دوست فیروزہ کے سلسلے میں تم سے کہہ چکا ہوں۔"

ارسلان شاہ نے خاموش ہو کر ٹہلتے ٹہلتے ایک چھوٹا سا گھونٹ لیا۔

احمر سلطانہ کی پریشانی میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ اس کے خیال کے مطابق ارسلان شاہ اس پر اپنے شبہے کا اظہار کرنے کے بجائے اپنی بات دوسرے انداز میں کر رہا تھا۔

"مجھے یقین ہے احمر! تم کسی ایسی لڑکی سے دوستی نہیں کر سکتیں جو اچھے کردار کی مالک نہ ہو، اس لیے فیروزہ بھی اچھے کردار کی مالک ہوگی لیکن تم جان چکی ہو کہ اس کے ساتھ کیا ہو چکا ہے۔ یہ اسی لیے ہوا نا کہ اسے مردوں سے قریب ہونے کا موقع ملا اور وہ دونوں ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو گئے۔ میں یہ تو کہہ چکا ہوں نا کہ یہ کوئی اختیاری جذبہ نہیں ہے۔ یہ تو بس ہو جاتا ہے اور انسان اس کا کھلونا بن کر رہ جاتا ہے اگر دونوں فریق غیر شادی شدہ ہوں تو اس قسم کا جذبہ پیدا ہونے کے بعد وہ آپس میں شادی کر لیتے ہیں لیکن یہ جذبہ شادی شدہ افراد کے دل میں بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ جذبہ عمر یا رشتوں کی قید و بند سے آزاد ہے۔ شادی شدہ افراد کی عمر زیادہ بھی ہو چکی ہو تو عورت اور مرد کی قربت میں یہ جذبہ کسی وقت بھی سر اٹھا سکتا ہے۔"

"کیا ہر ایک کے ساتھ ایسا ہوتا ہوگا؟" احمر سلطانہ نے ڈرتے ڈرتے دھیمی آواز میں پوچھا۔

"نہیں۔" ارسلان شاہ نے کہا۔ "اگر ایسا ہو تو سارا معاشرہ تہ و بالا ہو جائے۔ میں بس یہ کہہ رہا ہوں کہ کبھی بھی، کسی کے ساتھ بھی ایسا ہو ضرور سکتا ہے۔ اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ تم اگر کسی ایسی پارٹی میں جاؤ جہاں مرد بھی شریک ہوں تو تمہیں اکیلا نہیں ہونا چاہیے۔ اسی لیے میں تمہیں زریاب کے کمرے میں جانے سے بھی منع کر رہا ہوں۔ ایسا ہرگز نہیں ہے احمر کہ مجھے تم پر بھروسا نہیں ہے لیکن اب میں جان چکا ہوں کہ یہ سرکش جذبہ، بھروسے کی بھی دھجیاں اڑا سکتا ہے۔ یہ بہت طاقت ور اور خوف ناک ہوتا ہے۔ میں تم سے التجا کروں گا ڈارلنگ کہ میری ان باتوں کا برا نہ ماننا اگر اس وقت تمہیں غصہ آ رہا ہو تو پھر کسی وقت ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ میری باتوں کا تجزیہ کرنا اور اس وقت اپنی دوست فیروزہ کے معاملے کو بھی اپنے ذہن میں رکھنا۔"

احمر سلطانہ نظریں جھکائے بیٹھی تھی۔ وہ بہ دستور دھیمی آواز میں بولی۔ "اگر مرد ساتھ ہو تو عورت کے دل میں کسی کے لیے اس قسم کا جذبہ پیدا نہیں ہو سکتا؟"

ارسلان شاہ کچھ سوچنے لگا۔ پھر سر ہلا کے بولا۔ "اچھا سوال کیا ہے تم نے! میرا خیال ہے کہ اس صورت میں بھی ایسا ہو سکتا ہے لیکن اس کا امکان بہت کم رہ جاتا ہے۔ اب ہماری مجبوری یہ ہے کہ ہم وقت کے ساتھ بہت آگے نکل آئے ہیں۔ یہاں سے واپسی ناممکن ہو چکی ہے۔ عورت اور مرد اب ایک دوسرے کے ساتھ چل رہے ہیں۔ اب اگر ہم زمانے کے

ساتھ نہیں چلیں گے تو یہ وقت ہمیں بہت پیچھے چھوڑ جائے گا اسی لیے اب بس یہ احتیاط ہی کی جاسکتی ہے کہ عورت اور مرد کو تنہائی میسر نہ ہو۔ تنہائی میں ہی اس حیوانی جذبے کو اُبھرنے کا زیادہ موقع ملتا ہے۔''

احمر سلطانہ مخمصے کا شکار تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ ارسلان شاہ کے دل میں اگر کوئی شبہ ہے تو صاف طور پر سامنے آجائے۔ وہ خود کو اس کے لیے بھی تیار کر رہی تھی کہ ایسی صورت میں وہ اعتراف بھی کرلے۔

''زریاب تو ہمارے گھر میں کافی دن سے ہیں۔'' وہ بولی۔ ''اور میں برابران کے کمرے میں جاتی رہتی ہوں۔''

''تو کیا تمہیں زریاب سے محبت ہوچکی ہے؟'' ارسلان شاہ مسکرایا۔

احمر سلطانہ خود کو اعتراف کرنے کے لیے تیار کررہی تھی لیکن جب یہ سوال ارسلان شاہ کی زبان پر آیا تو اسے ایسا لگا جیسے اس کا دل اتنی زور سے اچھلا کہ اس کی ضرب اس کی پسلیوں نے بھی محسوس کی۔

ارسلان شاہ نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ''نہ جانے کیوں مجھے یقین ہے کہ ایسا نہیں ہوا ہوگا اور میں چاہتا ہوں کہ آیندہ بھی ایسا نہ ہو۔''

احمر سلطانہ نے محسوس کیا کہ چوتھے پیگ کے بعد ارسلان شاہ پر شراب کی اثر پذیری واضح ہونے لگی تھی۔

ارسلان شاہ خالی گلاس لیے ہوئے کرسی پر جا بیٹھا اور بوتل اٹھا کر اس کا ڈھکنا کھولنے لگا۔

''ابھی اور پئیں گے؟'' احمر سلطانہ کے انداز میں ذرا ذرا سا احتجاج تھا۔

''ہاں ڈارلنگ!'' ارسلان شاہ نے گلاس میں شراب انڈیلتے ہوئے کہا۔ ''ابھی مجھے تم سے کچھ اور باتیں بھی کرنا ہیں جن کے لیے میں ایک اور پیگ کی خواہش یا ضرورت محسوس کررہا ہوں۔''

اور کوئی بات؟...... احمر سلطانہ کی پریشانی میں اضافہ ہوا۔

گلاس بنا کے ارسلان شاہ نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے ایک گھونٹ لیا اور احمر سلطانہ کی طرف دیکھتے ہوئے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ''ابھی چند دن پہلے میں نے تم سے کہا تھا کہ شادی شدہ عورت اگر کسی دوسرے مرد کے زیادہ قریب ہوجائے تو اس کی جسمانی کیمسٹری میں کوئی فرق نہیں پڑتا لہٰذا اس کے شوہر کو اس کی پروا نہیں ہونا چاہیے لیکن اب مجھے محسوس ہورہا ہے کہ اس قسم کی باتیں کرنا انٹلیکچوئل بننے کی ایک بے ہودہ سی لاشعوری کوشش ہے۔ مرد کو اگر اپنی بیوی کے بارے میں یہ بات معلوم ہوجائے تو وہ اسے برداشت نہیں کرسکتا۔''

''کیا صرف محبت برداشت کرسکتا ہے؟'' احمر سلطانہ بے اختیار پوچھ بیٹھی اور اپنی اس جرأت پر اس نے دم بھی سادھ لیا۔

''یہ بھی اچھا سوال اٹھایا تم نے۔'' ارسلان شاہ مسکرایا۔ ''خیر ویسے تو عورت اور مرد کی قربت بھی ایک فطری حیوانی جذبے کی وجہ سے عورت اور مرد کی بے بسی ہے اور محبت بھی ایک ایسا ہی بے اختیاری جذبہ ہے لیکن محبت شاید برداشت کی جاسکتی ہے یا نظرانداز کی جاسکتی ہے لیکن ابھی مجھے خیال آیا ہے کہ شاید یہ بھی ایسا کچھ آسان نہیں ہوگا۔''

ارسلان شاہ نے خاموش ہوکر پے در پے کئی بڑے گھونٹ لیے اور گلاس آدھے سے زیادہ خالی ہوگیا۔

''یہ کیا کررہے ہیں آپ؟'' احمر سلطانہ بے چین ہوکر بولی۔ ''اس طرح کیوں پی رہے ہیں؟...... چار پیگ تو پی چکے ہیں آپ۔''

ارسلان شاہ نے ایک طویل سانس لی۔ ''مجھے ابھی ایک بات اور کرنا ہے ڈارلنگ!...... اور اس کے لیے مجھے شاید ابھی ایک اور پیگ کی ضرورت بھی محسوس ہوگی۔''

''میں آپ کو اب ہرگز اور نہیں پینے دوں گی۔'' احمر سلطانہ بستر سے اٹھی، جھپٹ کر قریب آئی اور بوتل اٹھا کے الماری کی طرف جانے لگی۔

ارسلان شاہ نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا پھر گلاس ہاتھ میں لیے لیے اٹھا اور بستر کی طرف بڑھا۔

بوتل رکھ کر احمر سلطانہ بستر کی طرف لوٹی۔ ارسلان شاہ بستر پر بیٹھ چکا تھا۔ احمر سلطانہ اس کے برابر میں بیٹھ گئی۔ ارسلان شاہ نے ایک گھونٹ لے کر گلاس سائڈ ٹیبل پر رکھا اور احمر سلطانہ کا ایک ہاتھ بڑی محبت سے اپنے ہاتھوں میں لے کر بولا۔ ''زریاب کے معاملے میں جو قدغن میں تم پر لگا رہا ہوں ڈارلنگ، ایسی ہی قدغن تمہیں مجھ پر بھی لگانا چاہیے تھی۔''

''کیوں؟...... کیا مطلب؟''

''حالات کا تجزیہ انسان کو بڑی صفائی سے کرنا چاہیے ڈارلنگ!...... عورت اگر کسی جذبے کے ہاتھوں بے بس ہو سکتی ہے تو کیا مرد نہیں ہوسکتا؟ بلکہ...... مرد تو زیادہ ہوسکتا ہے...... اگرچہ عورت آج پہلے سے زیادہ آزاد ہوچکی ہے لیکن مرد تو اس سے بہت زیادہ آزاد ہے۔ اسے تو رسیاں تڑا

کر بھاگنے کا موقع ہی نہیں ملنا چاہیے۔''

''آپ بہت زیادہ پی گئے ہیں۔ ابھی میں دیکھ چکی ہوں، آپ کی چال میں لڑکھڑاہٹ بھی آگئی ہے۔''

''لیکن دماغ ابھی نہیں لڑکھڑایا۔'' ارسلان شاہ اچانک کچھ اداس نظر آنے لگا۔ ''مجھے تم سے بہت محبت ہے ڈارلنگ!'' ارسلان شاہ کی پلکیں نم ہوگئیں۔ ''میں تم سے جدا ہوجانے کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔''

''آپ کو یقیناً اب بہت نشہ ہوگیا ہے۔''

ارسلان شاہ نے فوراً گلاس اٹھایا پھر احمر سلطانہ اسے روکنے کی کوشش کرتی رہ گئی لیکن وہ باقی شراب بھی اپنے حلق میں انڈیل گیا۔

''لعنت ہے...... لعنت ہے مجھ پر!'' ارسلان شاہ نے کہا اور گلاس اتنی زور سے دیوار پر مارا کہ وہ ٹکڑے ٹکڑے ہوکر بکھر گیا۔

احمر سلطانہ کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا جب وہ ارسلان شاہ کو اس طرح بہکتے دیکھ رہی تھی۔

''لیٹ جائیے اب آپ...... سونے کی کوشش کیجیے۔'' احمر سلطانہ نے بستر سے اٹھ کر ارسلان شاہ کے شانوں پر دباؤ ڈالا اور اسے لٹانے کی کوشش کی۔

ارسلان شاہ نے اس کی کلائیاں پکڑ کر اسے ایک جھٹکے سے پھر اپنے پہلو میں بٹھا لیا اور بولا۔ ''تم ٹھیک سمجھ رہی ہو ڈارلنگ!...... مجھے واقعی نشہ ہوگیا ہے لیکن یہی تو میں چاہتا تھا۔ میرے بولنے میں اب لکنت بھی آگئی ہے۔ یہ جو میں نے گلاس توڑا ہے تو اس طرح دراصل میں نے اپنا غصہ اتارا ہے اس پر میں بہت برا ہوں ڈارلنگ!...... پلیز، مجھے معاف کر دینا۔'' ارسلان شاہ نے اس کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑے۔

''یہ کیا کررہے ہیں آپ؟'' احمر سلطانہ روہانسی ہوگئی اور اس نے ارسلان شاہ کے جڑے ہوئے ہاتھ ایک دوسرے سے الگ کیے۔

ارسلان شاہ اس سے لپٹ گیا اور اس کے شانے پر سر رکھ کر باقاعدہ آنسوؤں سے رونے لگا۔ ''میں تم سے بہت پیار کرتا ہوں ڈارلنگ!''

احمر سلطانہ نے اس کی پیٹھ تھپکی۔ ''میں جانتی ہوں۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے آپ کو...... بس اب لیٹ جائیے، سونے کی کوشش کیجیے۔''

''نیند اب مجھے کہاں آتی ہے ڈارلنگ؟ وہ اب میرے حواس پر...... میرے اعصاب پر بری طرح چھا گئی ہے۔''

''کوئی خواب میں نظر آتی ہے کیا؟'' احمر سلطانہ دھیرے سے ہنسی۔ اب وہ ارسلان کی باتوں کو صرف گہرے نشے کے اثرات سمجھ رہی تھی۔

''نہیں ڈارلنگ!'' ارسلان شاہ نے روتے ہوئے سسکی سی لی۔ ''مجھے اتنا نشے میں مت سمجھو۔ میں سچ کہہ رہا ہوں تم سے۔ وہ میری اسٹینو گرافر ہے۔ اس کا نام صبیحہ ہے۔''

اب احمر سلطانہ کچھ چونکی۔ اس نے ارسلان شاہ کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر اسے ذرا سا دھکیلا اور اس کا چہرہ اپنے سامنے لانے کی کوشش کی لیکن وہ اس سے بری طرح لپٹ گیا۔

''نہیں...... نہیں۔'' وہ ہذیانی انداز میں بولا۔ ''صبیحہ نے مجھے اس قابل نہیں چھوڑا ہے کہ میں تم سے نظر ملا سکوں۔ پاگل کر دیا ہے اس نے مجھے۔ میرا سکون چھین لیا ہے مجھ سے۔''

''پلیز!...... آپ میری طرف دیکھیں تو سہی۔'' احمر سلطانہ کی آواز کچھ بھرا گئی۔ اسے احساس ہوگیا تھا کہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔ صرف اسی قسم کی باتوں کا اظہار کرنے کے لیے ارسلان شاہ نے زیادہ پی لی تھی۔

''پلیز!'' احمر سلطانہ نے ایک بار پھر زبردستی اس کا چہرہ اپنے سامنے کرنا چاہا لیکن ارسلان شاہ مڑ کر بستر پر اوندھے منہ گر گیا۔ اب اس کے آنسو تکیے میں جذب ہورہے تھے اور وہ بڑبڑائے جارہا تھا۔ ''صرف دو مہینے میں وہ میرے اعصاب پر چھا گئی ہے۔ اسے یوں میری زندگی میں نہیں آنا چاہیے تھا اس نے تو مجھے ایک بے وفا شوہر بنا دیا...... مجھے اس قابل نہیں رہنے دیا کہ میں اپنی احمر سے نظریں ملا سکوں۔''

اب احمر سلطانہ کا ہاتھ ارسلان شاہ کے سر پر تھا اور وہ اس طرح بیٹھی ہوئی تھی جیسے اسے سکتہ ہوگیا ہو۔ وہ جانتی تھی کہ دو مہینے پہلے ارسلان شاہ نے صبیحہ نام کی ایک لڑکی اسٹینو گرافر کی حیثیت سے ملازم رکھی ہے۔ خود ارسلان شاہ نے ہی اسے اس بارے میں بتایا تھا اور وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ کسی لڑکی سے ارسلان شاہ کی وابستگی اتنی شدید بھی ہو سکتی ہے۔

لیکن اب تو سب کچھ روز روشن کی طرح عیاں تھا۔

ارسلان شاہ تکیے میں سر دیے روتا اور بڑبڑاتا رہا پھر شاید اسے بھی پتا نہیں چلا ہوگا کہ اس کے آنسو کب رکے تھے اور کب وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوگیا تھا لیکن احمر سلطانہ سکتے کی سی حالت میں بیٹھی ہی رہ گئی۔ نیند تو اس کی آنکھوں سے کافور ہو چکی تھی۔

☆☆☆☆

دوسری صبح ارسلان شاہ کی آنکھ کھلی تو اس نے محسوس کیا کہ اس کا جسم ٹوٹ رہا تھا اور بخار کی سی کیفیت تھی۔ یہ احساس اسے بس چند لمحوں کے لیے ہوا، اس کے بعد اس کی آنکھیں پھر بند ہو گئیں، وہ سو گیا۔ یہ بات اسے بعد میں معلوم ہوئی کہ ڈاکٹر نے اسے کوئی مسکن دوا بھی دی تھی جس کے باعث اس پر نیند کا غلبہ رہا تھا اور وہ پھر سو گیا تھا۔

ارسلان شاہ کے بخار کی شدت سے پریشان ہو کر احمر سلطانہ نے صبح ساڑھے سات بجے ہی ڈاکٹر کو بلا لیا تھا۔ اس وقت ارسلان شاہ پر غشی سی طاری تھی۔ وہ ڈاکٹر کے کسی سوال کا جواب بھی ٹھیک سے نہیں دے سکا تھا۔ احمر سلطانہ ہی ڈاکٹر کو بتاتی رہی تھی۔

گیارہ بجنے والے تھے جب ارسلان شاہ کی آنکھ دوبارہ کھلی۔ اس نے احمر سلطانہ کو بستر پر اپنے قریب ہی دیکھا۔ اس نے صبح ڈاکٹر کی آمد سے پہلے ہی شب خوابی کا لباس اتار کر ساڑی باندھ لی تھی۔

''خدا کا شکر ہے کہ اب آپ کا بخار بہت کم ہو گیا ہے۔'' احمر سلطانہ نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر مسکراتے ہوئے محبت آمیز لہجے میں کہا۔

ارسلان شاہ کو ایک دھندلے سے خواب کی طرح یاد تھا کہ ڈاکٹر اسے دیکھنے آیا تھا لیکن رات کی باتیں اسے خاصی حد تک یاد تھیں۔ اس نے احمر سلطانہ کو صبیحہ کے بارے میں بتا دیا تھا لیکن یہ اسے یاد نہیں رہا کہ اس نے اس بارے میں کتنی تفصیل بیان کی تھی۔ صبیحہ کا ذکر کرتے وقت شراب اس پر پوری شدت سے اثر انداز ہو چکی تھی۔ وہ احمر سلطانہ سے نظریں چرانے لگا۔

''میں نے آپ کے دفتر فون کر دیا ہے۔'' احمر سلطانہ نے خوشگوار لہجے میں کہا۔ ''بتا دیا ہے کہ آپ کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے اس لیے آپ دفتر نہیں آسکیں گے۔''

''ہوں۔'' ارسلان شاہ کی نظریں جھکی رہیں۔

''میری طرف تو دیکھیے!'' احمر سلطانہ نے اس کی ٹھوڑی پکڑ کر اس کا چہرہ اپنی طرف کیا۔

''مجھے معاف کر دینا احمر!'' ارسلان شاہ کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ ''میں قصوروار ہوں تمہارا۔''

''ارے!'' احمر سلطانہ ہنس پڑی۔ ''یہ آج آپ کیسی باتیں کرنے لگے۔'' اس کا لہجہ خوشگوار ہی رہا۔ ''آپ تو ہمیشہ یہی کہتے رہے ہیں کہ یہ ایک بے اختیار جذبہ ہے جو کسی وقت بھی، کسی کے دل میں بھی پیدا ہو سکتا ہے اور انسان اس کے سامنے بے بس ہوتا ہے پھر آپ قصوروار کیسے ہو گئے؟''

ارسلان شاہ نے مضطربانہ انداز میں احمر سلطانہ کی طرف دیکھا اور اسے کچھ تعجب ہوا کہ احمر سلطانہ شوخ سے انداز میں مسکرا رہی تھی۔

''وہ خوب صورت تو بہت ہو گی جس نے آپ کا دل چرا لیا۔'' وہ بولی۔

''یقین کرو، وہ تم سے زیادہ خوب صورت نہیں ہے۔'' ارسلان شاہ نے سنجیدگی سے کہا۔ ''اور یہ میں تمہیں خوش کرنے کے لیے نہیں کہہ رہا ہوں۔''

''میں نہیں مانوں گی۔ اتنا دیوانہ تو کر دیا ہے اس نے آپ کو۔''

''نہیں احمر!'' ارسلان شاہ سنجیدہ رہا۔ ''محبت کا جذبہ کسی خوب صورتی سے مشروط نہیں ہوتا۔ کوئی اور بات بھی یہ تحریک پیدا کر سکتی ہے لیکن۔'' ارسلان شاہ نے غور سے احمر سلطانہ کی طرف دیکھا۔ ''مجھے تعجب ہو رہا ہے کہ تمہاری پیشانی پر ناگواری کی کوئی لکیر نہیں ہے۔''

''وہ کیوں ہو گی جناب!'' احمر سلطانہ دھیرے سے ہنسی۔ ''مجھے آپ کے اس خیال سے سو فیصد اتفاق ہے کہ یہ جذبہ کسی شادی شدہ انسان کے دل میں بھی اور کسی بھی عمر میں پیدا ہو سکتا ہے۔ اپنی دوست فیروزہ کی مثال میرے سامنے ہے۔ وہ بھی اپنے شوہر کو بہت چاہتی ہے۔ جس طرح ابھی آپ نے خود کو قصوروار کہا ہے، اسی طرح وہ بھی اسی قسم کے احساسات میں مبتلا تھی لیکن آپ سے گفتگو کے بعد میں نے اسے سمجھا دیا تھا کہ وہ خود کو اس معاملے میں اپنے شوہر کا مجرم نہ سمجھے۔''

''ہاں احمر!'' ارسلان شاہ نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''میں نے اس قسم کی باتیں کہی تو تھیں اور واقعی اس قسم کے معاملے میں میرا نظریہ یہی ہے لیکن مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم نے میرے اس نظریے سے سو فیصد اتفاق کر لیا ہے۔ مجھے ڈر تھا کہ صبیحہ کے بارے میں جاننے کے بعد تمہیں دکھ ہو گا اور تم مجھے اس کے لیے بھی معاف نہیں کرو گی۔''

''جب مجھے آپ کے نظریے سے اتفاق ہے تو میں آپ کو قصوروار کیوں سمجھوں؟'' احمر سلطانہ نے کہا۔ ''آپ مجھے اس کے بارے میں تفصیل سے بتائیے۔''

''رات کو میں نے تمہیں کیا کیا بتایا تھا؟''

''اتنی زیادہ تو پی گئے تھے آپ...... بتاتے کیا خاک! آپ بس یہ بڑبڑاتے ہوئے مدہوش ہو کر سو گئے تھے کہ آپ اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔''

ارسلان شاہ سوچ میں پڑ گیا۔ محبت کے بارے میں اپنے خیالات اور ان سے احمر سلطانہ کے متفق ہونے کے باوجود اس کے دل میں ایک چور تھا۔ اس کے خیال کے مطابق ایسا تو تھا کہ اس نے احمر سلطانہ کے حقوق میں سے کوئی چوری کی تھی۔ وہ چوری اس کی کوئی شعوری کوشش نہ سہی لیکن چوری تو تھی۔

احمر سلطانہ کے اصرار پر ارسلان کو صبیحہ کے بارے میں سب کچھ بتانا پڑا۔

''اوہ!'' سب کچھ سن کر احمر سلطانہ کے منہ سے نکلا۔ ''تو وہ ابھی تک آپ کی محبت سے بے خبر ہے؟''

''ہاں۔'' ارسلان شاہ نے آہستہ سے کہا۔ ''لیکن بعض باتوں کی وجہ سے اس کے ذہن میں ایک گرہ سی ضرور پڑ گئی ہے۔ شاید وہ یہ سمجھنے لگی ہے کہ پیسے والے بعض لوگوں کی طرح میں بھی ایک عیاش طبع انسان ہوں۔''

''تو آپ اس کی غلط فہمی دور کر دیں اپنے جذبات کا اظہار کر دیں اس پر۔''

ارسلان شاہ نے بڑی محبت سے احمر سلطانہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور بولا۔ ''تمہارے اس انداز کی وجہ سے مجھ میں یہ ہمت بڑھتی جا رہی ہے کہ میں تم سے صبیحہ کے بارے میں باتیں کرتا رہوں لیکن یہ مجھے بڑا عجیب سا لگ رہا ہے کہ ایک شوہر اپنی بیوی سے اپنی کسی محبت کے بارے میں گفتگو کر رہا ہے۔''

''عجیب تو لگے گا۔'' احمر سلطانہ مسکرائی۔ ارسلان شاہ جیسے شوہر دنیا میں شاید اِکا دُکا ہی ہوں گے۔ مرد تو اپنی بیوی سے چھپ کر دنیا بھر میں گل چھرے اُڑاتے پھرتے ہیں اور بیوی کو اگر پتا چل جائے تو بھی وہ پروا نہیں کرتے اور مرد ہونے کے ناتے اسے اپنا حق سمجھتے ہیں۔

''تو پھر دنیا میں احمر سلطانہ جیسی بیویاں بھی اِکا دُکا ہوں گی جو.....''

''ہم صبیحہ کی باتیں کر رہے تھے۔'' احمر سلطانہ نے اس کی بات کاٹی۔

''ہاں۔'' ارسلان شاہ نے ایک طویل سانس لی۔ ''جب وہ پہلی مرتبہ میرے سامنے آئی تھی، تبھی وہ مجھے بہت اچھی لگی تھی لیکن اس وقت میں نے اس بارے میں کچھ سوچا نہیں تھا۔ ایسا تو بیس پچیس دن بعد ہوا جب اچانک مجھ میں یہ احساس پیدا ہوا کہ میں اس سے محبت کرنے لگا ہوں۔ گو کہ اس جذبے کے بارے میں ہمیشہ میرا ایک نظریہ رہا ہے اور فیروزہ کی وجہ سے میں تم سے اظہار خیال بھی کرتا رہا ہوں لیکن اب میں اس مرحلے سے گزرا ہوں تو میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ ایسا کیوں ہو جاتا ہے، کیسے ہو جاتا ہے۔''

''یہ سب اس وقت نہ سوچیے۔'' احمر سلطانہ بولی۔ ''بس صبیحہ کے بارے میں بتاتے رہیے مجھے۔''

''وہ لڑکی۔'' ارسلان شاہ نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''میں نے ابتدائی چند دن میں ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ ان لڑکیوں میں سے نہیں ہے جو ملازمت کے بہانے گھر سے نکلتی ہی اس لیے ہیں کہ اپنی زندگی کا ساتھی بنانے کے لیے کوئی مناسب شخص تلاش کریں یا کوئی موٹی اسامی پھانسیں۔ اس نے یہ ملازمت حد درجہ مجبوری کے عالم میں کی تھی۔ میں نے چاہا کہ اپنے جذبات کا اظہار کرنے کی ابتدا اسے کوئی تحفہ دینے سے کروں۔ مجھے اندازہ یہ بھی تھا کہ اگر میں نے اسے کوئی مہنگا تحفہ دیا تو وہ اسے قبول نہیں کرے گی اور ابتدا ہی میں میرے بارے میں کوئی غلط رائے قائم کر لے گی۔ اسی لیے......''

''آپ نے اس کی تنخواہ کے موقع پر گل دستے کا تحفہ دیا۔''

''ہاں!..... یہ میں ابھی تمہیں بتا چکا ہوں اور جب اس نے دوسرے دن مجھ سے اپنے بھائی کی حالت کے بارے میں بتایا اور ڈاکٹر کے بارے میں مشورہ کیا تو.....''

''یہ سب تو ابھی آپ مجھے بتا چکے ہیں۔'' احمر سلطانہ نے پھر اس کی بات کاٹی۔

''ہاں۔'' ارسلان شاہ نے سر ہلایا۔ ''دہرایا میں نے اس لیے کہ اس کے بعد کے حالات میری حوصلہ شکنی کرتے رہے۔ میں نے محسوس کیا کہ اب اگر میں نے اس سے کچھ کہا تو اسپتال کے بل کی وجہ سے وہ یہ سمجھے گی کہ میں اس کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں۔ وہ بات چیت کے دوران میں یہ بھی کہہ چکی ہے کہ اگر کبھی اس کی عزت نفس پر تازیانہ لگا تو وہ اسے برداشت نہیں کر سکے گی اور شاید خودکشی ہی کر لے۔''

''مجھے یقین ہے..... آپ کی ایسی کوئی خواہش نہیں ہو گی جس سے اس کی عزت نفس پر تازیانہ لگے اگر کسی لڑکی کو یہ معلوم ہو کہ کوئی اس سے شادی کرنا چاہتا ہے تو اس کی عزت نفس پر تازیانہ کیوں لگے گا؟''

شادی کی بات پر ہی ارسلان شاہ نے چونک کر احمر سلطانہ کی طرف دیکھا تھا۔

''چونک کیوں گئے؟'' احمر سلطانہ بولی۔ ''کیا میرا یہ یقین غلط ہے کہ آپ کے دل میں شادی کے علاوہ کوئی خواہش تھی؟''

ارسلان شاہ نے مضطربانہ انداز میں پہلو بدلا۔ اسی وقت احمر سلطانہ نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر اس کے بخار کا اندازہ لگانے کی کوشش کی۔

''آپ کا بخار بالکل اتر چکا ہے۔'' وہ خوش ہو کر بولی ''میرا اندازہ بالکل ٹھیک تھا کہ زیادہ شراب نوشی اور ڈپریشن کی وجہ سے آپ کی طبیعت خراب ہوئی تھی۔ شراب کا اثر تو خیر زائل ہونا ہی تھا لیکن مجھ سے صبیحہ کے بارے میں تفصیل سے بات کر کے آپ کا ڈپریشن بھی ختم ہو گیا ہے۔''

''ڈپریشن تو تمہارے رویے کی وجہ سے ختم ہوا ہے۔'' ارسلان شاہ نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''میں شدید پریشان تو اس لیے تھا کہ جب تمہیں اس کا پتا چلے گا تو کیا ہو گا۔''

''چلیں ٹھیک ہے۔'' احمر سلطانہ نے ہنس کر کہا۔ ''اب تو آپ کو پتا چل گیا کہ اس سے مجھ پر کوئی ایسا ردعمل نہیں ہوا جو آپ کے لیے پریشانی کا سبب بنے۔''

''تم بہت گریٹ ہو ڈارلنگ۔'' ارسلان شاہ نے اس طرح احمر سلطانہ کی طرف دیکھا جیسے خود کو اس کا احسان مند محسوس کر رہا ہو۔

''یہ فضول باتیں چھوڑیے۔ ذکر تھا صبیحہ سے آپ کی شادی کا۔''

ارسلان شاہ کچھ سوچنے لگا پھر بولا۔ ''سچی بات تو یہ ہے کہ اس حد تک سوچنے کا مجھے موقع ہی نہیں ملا۔ میں تو بس اس خیال سے پریشان ہوتا رہا ہوں کہ صبیحہ سے اپنے جذبات کا اظہار کرنا میرے لیے ناممکن ہو چکا ہے۔''

''وہ تو کسی طرح آپ کو کرنا ہی پڑے گا۔ کل رات آپ خود کہہ چکے ہیں کہ آپ اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔''

''یہ تو بس کہنے کی بات ہے۔'' ارسلان شاہ نے کہا۔ ''انسان کو زندہ تو رہنا ہی پڑتا ہے۔''

''مگر ایسا انسان بے سکون تو ہو جاتا ہے۔''

ارسلان شاہ نے کچھ سوچتے ہوئے آہستگی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''بس تو پھر۔'' احمر سلطانہ نے کہا۔ ''صبیحہ سے آپ کی شادی تو ہونا ہی چاہیے۔''

''تمہاری زبان سے یہ بات سن کر مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا ہے۔'' ارسلان شاہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''اس طرح تمہارے دل میں کیا ایک خلش نہیں رہ جائے گی۔''

احمر سلطانہ نے نظریں جھکا لیں۔ وہ کچھ سوچ رہی تھی اور یکایک بہت سنجیدہ نظر آنے لگی تھی۔ وہ کچھ توقف سے بولی۔ ''میرا خیال ہے...... مجھے اعتراف کر لینا چاہیے کہ ایک خلش تو میرے دل میں اسی وقت پیدا ہو چکی ہے لیکن میرا خیال ہے کہ دھیرے دھیرے میں اس صورتِ حال کو خوش دلی سے قبول کر لوں گی۔ ویسے بھی ہمارے یہاں مرد کی دوسری شادی کوئی معیوب بات نہیں اور اگر اسے خرابی کہا بھی جائے تو جب انسان کے سامنے دو خرابیاں آ جائیں تو ان میں سے کوئی ایک برائی قبول کرنا ہی پڑتی ہے۔ اس وقت انسان سوچتا ہے کہ کم برائی کس میں ہے اور زیادہ برائی کے مقابلے میں کم برائی کو تسلیم کر لیتا ہے یا قبول کر لیتا ہے۔ میں بھی اپنے دل کی خلش تو برداشت کر سکتی ہوں لیکن۔'' احمر سلطانہ کی پلکیں بھیگ گئیں۔ ''یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ آپ ایک بے سکون زندگی گزاریں۔''

ارسلان شاہ اس وقت اتنا جذباتی ہو گیا کہ نقاہت محسوس کرنے کے باوجود اٹھ کر اس نے احمر سلطانہ کو اپنے سینے سے لگا لیا، اور احمر سلطانہ کی آنکھوں سے ٹپکنے والے دو آنسو اس کے شانے پر گرے۔

''نہیں احمر!'' وہ شدید جذباتی لہجے میں بولا۔ ''میں تمہیں یہ دکھ نہیں دوں گا۔''

''مجھے کوئی دکھ نہیں ہو گا اس سے۔'' احمر سلطانہ نے اس سے الگ ہوتے ہوئے کہا اور اپنی آنکھیں خشک کرتی ہوئی مسکرائی۔

''ابھی سے تمہاری آنکھوں میں آنسو آ گئے ہیں۔'' ارسلان شاہ بولا۔

''آپ کی بے سکونی کا اندیشہ ہے میرے ان آنسوؤں کا سبب۔''

''ابھی تم اپنے دل کی خلش کا اعتراف بھی کر چکی ہو۔''

''اور میں نے یہ بھی کہا تھا کہ یہ خلش دھیرے دھیرے دور ہو جائے گی اور پھر آپ تو دکھ کی بات کر رہے ہیں۔ دکھ اور خلش میں فرق ہے۔''

''بس الفاظ کا فرق ہے۔ ایسے معاملات کی خلش اور دکھ میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔''

''اس پر بحث نہ کیجیے ارسلان!'' احمر سلطانہ نے سنجیدگی سے قطعیت کے ساتھ کہا۔ ''صبیحہ سے آپ کی شادی تو ہو کر رہے گی۔ آپ بات کیجیے صبیحہ سے۔''

''میں نہیں کر سکتا احمر!'' ارسلان شاہ نے بے بسی سے کہا۔

''کیوں نہیں کر سکتے؟''

''میری چند باتوں کی وجہ سے وہ میری طرف سے کچھ کھٹک تو گئی ہے اس لیے اگر میں نے اس سے شادی کے بارے میں بات کی تو وہ یہی سمجھے گی کہ میں اسے دھوکا دے کر اپنے جال میں پھنسانا چاہتا ہوں اور پھر وہ کچھ ایسی آزاد خیال لڑکی بھی نہیں ہے کہ اپنی شادی کا فیصلہ خود کر سکے۔ یہ فیصلہ وہ اپنے والدین پر چھوڑے گی اور وہ آخر کیوں چاہیں گے کہ اپنی بائیس سالہ بیٹی کی شادی ایک پینتالیس سالہ شخص سے کر دیں۔''

''آپ پہلے صبیحہ سے تو بات کرلیں۔ اسے تو اپنے جذبات سے آگاہ کر دیں۔''

''میں ایسا نہیں کر سکوں گا احمر!'' ارسلان شاہ پریشان سا نظر آیا۔ ''اگر میں ناکام رہا...... میرا مطلب ہے، صبیحہ نے کچھ اور سمجھ لیا تو کیا ہوگا۔ ابھی تو صرف بے سکونی ہی مجھے اپنا مقدر نظر آ رہی ہے، پھر میں ساری زندگی اس اذیت کا بھی شکار رہوں گا کہ صبیحہ نے مجھے غلط سمجھا۔''

اس مرتبہ احمر سلطانہ کچھ نہیں بولی۔ وہ کچھ متفکر نظر آنے لگی تھی۔

☆☆☆

عاصم اب بہت خوش تھا۔ اسے اب ہر چیز کھانے کی اجازت تھی اور اس نے کھائی بھی تھی۔ متلی کا ذرا بھی احساس نہیں ہوا تھا۔ اسے اتنا صحت مند پا کر اس کے والدین بھی خوش تھے اور صبیحہ بھی۔

اسپتال سے عاصم کو گھر پہنچانے کے بعد جب وہ گیارہ بجے کے قریب دفتر پہنچی تو اسے معلوم ہوا کہ ارسلان شاہ اس دن دفتر نہیں آیا تھا۔ اطلاع آئی تھی کہ اس کی طبیعت کچھ خراب ہے۔ اسے یہ بھی پتا چلا کہ دفتر کے چند خاص لوگ ارسلان شاہ کی مزاج پرسی کے لیے، لنچ کے وقفے میں اس کے گھر جانے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔ ان کے ساتھ صبیحہ بھی جا سکتی تھی اور شاید اسے جانا بھی چاہیے تھا کیونکہ وہ ارسلان شاہ کی احسان مند تھی لیکن اس نے وہاں جانے میں ہچکچاہٹ محسوس کی۔ اس کے دل میں کچھ شکوک تھے۔ ارسلان شاہ نے کبھی بھی اس سے کھل کر کچھ نہیں کہا تھا لیکن اس کی بعض باتیں ایسی تھیں جو صبیحہ کو ہمیشہ کھٹکتی رہی تھیں۔ اسے ایسا محسوس ہوتا رہا تھا جیسے ارسلان شاہ اس سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔

کیا چاہتا تھا؟

اس سوال کے جواب میں صبیحہ کے دل و دماغ میں وہ شبہات کلبلانے لگتے تھے جن کا اظہار اس کے باپ نے کیا تھا۔ دو ایک بار تو اس کے جی میں آئی بھی تھی کہ وہ یہ ملازمت چھوڑ دے لیکن اس خیال کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں میں بے بسی کی نمی بھی آگئی تھی۔ ایک طرف اس کا بھائی اسپتال میں ارسلان شاہ کی ہی وجہ سے زیرِ علاج تھا اور دوسری طرف وہ اپنے گھر کی دگرگوں حالت سے بھی بے خبر نہیں تھی۔ انہی باتوں کی وجہ سے، جب اسے ملازمت چھوڑنے کا خیال آیا تھا تو اس نے خود کو تسلی دی تھی کہ اس کے خدشات بے بنیاد بھی تو ہو سکتے ہیں لیکن اس کے ساتھ اس نے یہ بھی سوچا تھا کہ اس خیال کا سبب اپنی مجبوری کا احساس ہے جو اس کے لاشعور میں بھی موجود ہے۔ غرضیکہ وہ اس ایک مہینے میں شدید مخمصے کا شکار رہی تھی۔

لنچ کے وقفے سے ذرا دیر پہلے اسے معلوم ہوا کہ جو لوگ ارسلان شاہ کے گھر جانا چاہتے تھے، ان سے فون پر کہا گیا تھا کہ اب ارسلان شاہ کی طبیعت سنبھل گئی ہے اور کیونکہ ڈاکٹروں نے انہیں مکمل بیڈ ریسٹ کی تاکید کی ہے اس لیے کوئی ان کی مزاج پرسی کے لیے نہ آئے۔

دفتر سے چھٹی کے بعد جب وہ گھر پہنچی تو بھی اس کا ذہن الجھا ہوا تھا۔ ارسلان شاہ نے ایک دن پہلے اس سے کہا تھا کہ وہ کسی وقت اپنے بھائی کو دفتر لائے کیونکہ وہ اسے دیکھنا چاہتا ہے لیکن صبیحہ یہ بات اپنے والدین سے کہنے کی ہمت ہی نہیں کر سکی تھی۔ وہ دونوں اور خصوصاً اس کا والد اس بات کو نہ جانے کیا کیا معنی پہناتا۔ دراصل خود صبیحہ کے ذہن میں یہ خیال آ چکا تھا کہ ارسلان شاہ اس سے بے تکلف ہونے کے لیے شاید اب اس طرح پیش قدمی کرنا چاہتا ہو۔

اس دن صبیحہ گھر پہنچنے کے بعد بھی کچھ الجھی الجھی سی رہی تو اس کی ماں نے اسے ٹوکا۔ ''کس سوچ میں پڑی ہوئی ہو آج؟''

''کوئی خاص بات نہیں ہے اماں!'' صبیحہ نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔

''کوئی بات تو ضرور ہے۔'' ساجدہ نے کہا۔ ''اپنے باس سے تو آج تمہاری کوئی خاص بات نہیں ہوئی؟''

''آج تو کوئی بات نہیں ہوئی۔ ان کی طبیعت کچھ خراب تھی، آج وہ دفتر ہی نہیں آئے۔''

''یہ کیا جواب دیا تم نے کہ آج تو کوئی بات نہیں ہوئی...... کیا آج سے پہلے کوئی بات ہوئی تھی؟''

صبیحہ نے کن انکھیوں سے رشید خاں کی طرف دیکھا جو ان ماں بیٹی کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔

عاصم بھی وہیں موجود تھا اور ان سب کی طرف سے غافل کوئی کہانی پڑھنے میں منہمک تھا۔

''جواب دو، چپ کیوں ہو گئیں؟'' ساجدہ نے صبیحہ کو غور سے دیکھا۔
صبیحہ کے لیے فیصلہ کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ وہ ان لوگوں کو ارسلان شاہ کی خواہش سے آگاہ کرے یا نہ کرے۔
''جواب دو نا اپنی ماں کو۔'' رشید خاں سرد لہجے میں بولا۔
''وہ... دراصل.....'' صبیحہ نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ''کل میں نے باس کو بتایا تھا کہ آج عاصم کو اسپتال سے ڈسچارج کر دیا جائے گا۔ اس پر انہوں نے بڑی خوشی کا اظہار کیا تھا۔''
اپنا نام سنتے ہی عاصم نے چونک کر سر اٹھایا اور ان لوگوں کی طرف دیکھنے لگا۔
صبیحہ نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''وہ چاہتے ہیں کہ میں کسی دن عاصم کو اپنے ساتھ دفتر لے جاؤں۔ وہ اسے دیکھنا چاہتے ہیں۔''
عاصم خوش ہو کر ایک دم بولا۔ ''تو مجھے لے چلو نا باجی۔''
''ہاں اس میں کوئی حرج تو نہیں ہے۔'' ساجدہ نے سوچتے ہوئے کہا۔
''حرج تو ہے۔'' رشید خاں تڑختی ہوئی سی آواز میں بولا۔ ''اُنگلی پکڑ کر پونچا پکڑنے کی مثال نہیں سنی تم نے؟''
''تمہارے دماغ میں تو سوئی بس ایک ہی جگہ اٹک گئی ہے۔'' ساجدہ نے کچھ ناگوار لہجے میں کہا۔
''اور میں خود کو غلطی پر نہیں سمجھتا۔'' رشید خاں بولا اور پھر اس نے صبیحہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم عاصم کو وہاں نہیں لے جاؤ گی۔''
عاصم اپنے باپ کا منہ تکتا رہ گیا اور صبیحہ نے بھی نظریں جھکا لیں۔ ساجدہ ایک نظر اپنے شوہر پر ڈال کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔
اس رات جب صبیحہ اپنے بستر پر لیٹی تو بھی اس کا ذہن اُلجھا ہوا تھا۔ اس نے پہلی مرتبہ سوچا کہ ان حالات میں تو وہ ہمیشہ اُلجھنوں ہی کا شکار رہے گی جس سے اس کے اعصاب پر دباؤ بڑھتا رہے گا اور اعصاب کوئی دباؤ کسی خاص حد تک ہی برداشت کرتے ہیں اور پھر ٹوٹنے بکھرنے لگتے ہیں۔
پھر یوں ہی صبیحہ کو ناصر کا خیال آ گیا۔ وہ اس کے عزیزوں ہی میں سے تھا لیکن اس کے والد نے تجارت میں اتنی ترقی کر لی تھی کہ اب ان کا گھر پیسوں میں کھیل رہا تھا۔ غرور کی کوئی انتہا نہیں رہی تھی اور اسی لیے رشید خاں نے ان لوگوں سے برائے نام سا تعلق رکھا تھا۔ صبیحہ، ناصر کو پسند تھی۔
اسے کوئی سال بھر پہلے معلوم ہوا تھا کہ ناصر اس سے شادی کا خواہش مند تھا مگر اس کے والدین اس شادی پر اس لیے آمادہ نہیں تھے کہ رشید خاں ایک غریب شخص تھا۔ ناصر کی ماں کسی بڑے گھر کی بہو لانے کی خواہش مند تھی۔ ناصر نے اپنے ماں باپ کا رویہ سمجھتے ہوئے خاموشی اختیار کر لی تھی۔ صبیحہ اسے پسند تو تھی لیکن وہ اس کی محبت میں گرفتار نہیں ہوا تھا اور صبیحہ تو بہت پہلے اپنی شادی کے بارے میں سوچنا ہی چھوڑ چکی تھی۔
لیکن اس وقت اسے خیال آیا کہ اگر ناصر سے اس کی شادی ہو جائے تو اس کے ذریعے ارسلان شاہ کا وہ سارا روپیا ادا کیا جا سکتا ہے جو اس نے عاصم کے علاج پر صرف کیا تھا۔
صبیحہ کو یہ سب خیال تو آئے لیکن اس کی سمجھ میں یہ نہیں آ سکا کہ ایسا کیونکر ممکن ہے؟ ناصر کے گھر والے تو کیا، خود رشید خاں کو ان لوگوں سے زیادہ میل جول پسند نہیں تھا۔ ایسے کسی اتفاق کے امکانات مفقود تھے کہ دونوں گھر ایک دوسرے سے قریب ہو جاتے اور صبیحہ کی شادی ناصر سے ہو جاتی.....

☆☆☆

ارسلان شاہ نے دوسرے دن سے دفتر جانا شروع کر دیا اور پھر کئی دن گزر گئے۔ احمر سلطانہ ان دنوں خاصی دل گرفتہ سی رہی۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ ارسلان شاہ اب گم صم سا رہنے لگا تھا۔ احمر سلطانہ سے چھپ کر اس نے کچھ زیادہ شراب نوشی بھی شروع کر دی تھی، لیکن احمر سلطانہ سے یہ بات چھپی رہ نہیں سکی تھی۔ اس نے ارسلان شاہ سے کئی بار کہا تھا کہ وہ کسی طرح بھی صبیحہ کو اپنے جذبات سے آگاہ کر دے لیکن وہ ایسا نہیں کر سکا تھا۔
ارسلان شاہ پر کیا گزر رہی تھی اور آگے چل کر اس کا کیا حال ہو سکتا تھا، احمر سلطانہ اس کا اندازہ اچھی طرح اس لیے لگا سکتی تھی کہ وہ خود بھی محبت کے اس عذاب میں گرفتار تھی۔
زریاب اس کے حواس پر اتنا چھا چکا تھا کہ اب وہ اس کے خوابوں میں بھی آنے لگا تھا۔ جس سے اس کی پریشانی اور بڑھ گئی تھی۔ ارسلان شاہ کے بارے میں تو اسے اندازہ تھا کہ وہ مرد ہے اس لیے اس کی محبت کا کوئی مثبت نتیجہ نکل سکتا ہے، بس کوشش میں کچھ دیر سویر ہو سکتی تھی لیکن خود اس کی محبت کیا رنگ لائے گی؟ اس کا کوئی اندازہ بھی نہیں لگایا جا سکتا تھا۔ یہ بات تو ناممکن ہی تھی کہ وہ ارسلان شاہ سے طلاق لے کر زریاب سے شادی کر لیتی۔ اس نے اپنے دل کو اچھی طرح ٹٹول لیا تھا۔ جتنی محبت اسے زریاب سے تھی، اس سے کم ارسلان شاہ سے بھی نہیں تھی۔ اسے خود بھی یہ بڑا عجیب سا لگتا

تھا کہ وہ دو مردوں سے یکساں محبت کا شکار تھی۔ زریاب کے لیے ارسلان شاہ کو چھوڑنا یا ارسلان شاہ کی خاطر زریاب کو بھلا دینا اس کے لیے یکساں ناممکن تھا اور یہ بات ممکن نہیں تھی کہ وہ دونوں کو اپنا لیتی۔ ارسلان شاہ تو مرد تھا۔ وہ ایک سے زیادہ شادیاں کر سکتا تھا لیکن وہ عورت تھی۔ یہ اس کے لیے ممکن نہیں تھا کہ دو مردوں کو اپنا لیتی۔

ارسلان شاہ کے اس نظریے سے وہ بالکل متفق نہیں تھی کہ شوہر ہوتے ہوئے کسی مرد سے تعلقات عورت کی جسمانی کیمسٹری میں کوئی فرق نہیں لاتے لہٰذا وہ یہ بات اپنے شوہر سے چھپا بھی سکتی ہے۔ احمر سلطانہ کی دانست میں تو یہ اس کی ارسلان شاہ سے ایک سنگین بے وفائی ہوتی۔ وہ ایسی کسی حرکت کو اپنا ایک سنگین جرم سمجھتی۔

احمر سلطانہ کی اس بڑھتی ہوئی اذیت سے زریاب بھی بے خبر نہیں تھا۔

''شاید مجھے یہاں سے کہیں دور چلا جانا چاہیے!'' اس نے احمر سلطانہ سے کہا جب وہ دونوں ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے۔

احمر سلطانہ نے یاس انگیز نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ''کیا آپ مجھے بھول سکیں گے زریاب؟''

''کوشش کروں گا۔''

''لیکن میں تو کوشش کر کے بھی آپ کو نہیں بھلا سکتی۔ وہ تو میرے لیے اور زیادہ اذیت ناک ہو جائے گا کہ میں آپ کا چہرہ دیکھنے کو بھی ترس جاؤں۔ نہیں زریاب! آپ کو میری قسم ہے۔ آپ کہیں نہیں جائیں گے۔''

زریاب نے بڑے کرب سے احمر سلطانہ کی طرف دیکھا۔ ''سمجھنے کی کوشش کرو احمر!'' وہ پہلی مرتبہ اتنی بے تکلفی سے بولا تھا۔

بے اختیار احمر سلطانہ کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی۔ اسی وقت زریاب کو بھی اپنی بے تکلفی کا احساس ہو گیا۔ وہ جلدی سے بولا۔ ''آئی ایم سوری! مجھے اس طرح مخاطب نہیں ہونا چاہیے تھا۔''

''کیوں نہیں ہونا چاہیے تھا؟'' احمر سلطانہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ قائم رہی۔ ''اس وقت آپ کا اس طرح مخاطب کرنا مجھے بہت اچھا لگا ہے۔ آخر محبت کرتے ہیں آپ مجھ سے!''

''محبت تو تم بھی کرتی ہو مجھ سے!...... پھر تم کیوں مجھے اس طرح مخاطب کر رہی ہو۔''

''اب نہیں کروں گی۔''

''لیکن اس بے تکلفی سے بھی کیا حاصل احمر!'' زریاب نے بڑے کرب سے کہا۔ ''میں تمہاری اذیت بڑی شدت سے محسوس کر رہا ہوں اور اب یہ مجھ سے برداشت نہیں ہو رہی ہے۔''

''برداشت کی ہر حد سے گزر کر ہی شاید ہماری محبت کسی انجام تک پہنچ سکے گی۔''

''کس انجام تک؟''

''یہ سوچ سوچ کر تو میرا دماغ چکرانے لگتا ہے۔''

''تم تو دوہری اذیت میں گرفتار ہو احمر!...... ارسلان کے لیے بھی تو بہت پریشان رہتی ہو تم۔''

''ہاں زریاب!'' احمر سلطانہ نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''میں دیکھ رہی ہوں کہ وہ بڑے ضبط سے کام لے رہے ہیں۔ لیکن یہ ضبط انہیں کہاں لے جائے گا، اس کا اندازہ میں ہی نہیں، تم بھی لگا سکتے ہو۔ ہم تینوں ایک ہی قسم کی کشتی میں سوار ہیں۔''

''اسی لیے تو تم مجھ سے زیادہ اذیت کا شکار ہو گئی ہو۔''

احمر سلطانہ نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور کچھ سوچتی ہوئی کسی طرف دیکھنے لگی......

☆☆☆

ان دنوں میں صبیحہ نے محسوس کیا تھا جیسے ارسلان شاہ کچھ بدل گیا ہو۔ اس سے ذرا بھی بے تکلفانہ گفتگو کرنے سے وہ مکمل طور پر گریز کرنے لگا تھا۔ پہلے تو صبیحہ محسوس کرتی تھی کہ وہ اسے اپنے کمرے میں بلانے کے لیے غیر ضروری ڈکٹیشن کرانے لگتا تھا مگر ان دنوں میں اس نے ایسی کوئی بات نہیں محسوس کی تھی۔ مسکرانا تو شاید وہ بھول ہی گیا تھا۔ عاصم کو دفتر بلانے کے سلسلے میں بھی اس نے دوبارہ کوئی بات نہیں کی تھی۔

ارسلان شاہ کو اگر کوئی کاروباری پریشانی ہوتی تو صبیحہ کے علم میں آ جاتی۔ آخر وہ اسی کے دفتر میں کام کرتی تھی۔ بہت کچھ اس کے علم میں رہتا تھا۔

تو اب آخر اسے کیا ہو گیا ہے؟ اس سوال میں وہ اکثر اُلجھی رہتی۔

ایک دن دفتر سے واپسی پر اس نے اپنے گھر کے تقریباً سامنے ہی ایک قیمتی کار کھڑی دیکھی۔ اسے ذرا بھی گمان نہیں ہوا کہ اس کار میں کوئی اس کے گھر آیا ہوگا۔ وہ اپنی سوچ میں ڈوبی گھر کے دروازے پر پہنچی اور اسی وقت دروازہ کھلا۔ وہ چونک گئی۔ ساڑی میں ملبوس پختہ عمر کی ایک خوب صورت عورت کے ساتھ صبیحہ کو اپنی ماں ساجدہ بھی نظر آئی تھی۔ ایسا لگا

تھا جیسے ساجدہ اسے دروازے تک چھوڑنے آئی ہو۔
ارسلان شاہ کی بیوی کبھی دفتر نہیں آئی تھی اس لیے صبیحہ اسے پہچان نہیں سکی۔
احمر سلطانہ اسے دیکھ کر مسکرائی اور پھر ساجدہ سے بولی۔ ''یہ یقیناً آپ کی بیٹی صبیحہ ہوگی۔''
''جی ہاں۔'' ساجدہ بہت سنجیدہ نظر آرہی تھی۔
احمر سلطانہ نے بڑی محبت سے صبیحہ کے شانے پر ہاتھ رکھا اور مسکراتی ہوئی بولی۔ ''مجھے امید ہے کہ تم سے بہت جلد ملاقات ہوگی۔'' پھر اس نے ساجدہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اچھا بہن، اب اجازت دیں۔ صبیحہ کے والد صاحب سے آپ آج ہی بات کر لیجیے گا۔''
''جی۔'' ساجدہ کی آواز بہت دھیمی تھی۔
''خدا حافظ۔'' احمر سلطانہ نے کہا، پھر صبیحہ کا شانہ تھپک کر کار کی طرف بڑھ گئی۔
شوفر کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تھا۔ اس نے جلدی سے اتر کر کار کی پچھلی نشست کا دروازہ کھولا اور احمر سلطانہ کار میں بیٹھنے لگی۔ صبیحہ کی نظر اسی کی طرف لگی ہوئی تھی۔ وہ اس وقت چونکی جب اس نے اپنی ماں کی آواز سنی۔ ''چلو اندر آؤ۔''
صبیحہ چونک کر جلدی سے گھر میں داخل ہوگئی اور ساجدہ نے دروازہ بند کر دیا۔
''یہ کون تھیں اماں؟'' صبیحہ نے حیرت سے پوچھا۔
''بیٹھ کر اطمینان سے بات کریں گے۔''
''ابا نہیں ہیں کیا؟'' صبیحہ نے گھر میں سناٹا محسوس کیا تھا۔
''نماز پڑھنے گئے ہیں۔'' ساجدہ نے جواب دیا۔
عاصم کے بارے میں پتا چلا کہ ساجدہ نے اس سے ابھی ذرا دیر پہلے بازار سے کچھ بسکٹ وغیرہ منگوائے تھے اور وہ دے کر جلدی سے چلا گیا تھا۔ ان دنوں وہ محلے کے کچھ بچوں کے ساتھ میدان میں کرکٹ کھیلنے جانے لگا تھا۔
اطمینان سے بیٹھنے کے بعد ساجدہ نے کہا۔ ''اس نے بھی یہی کہا تھا کہ تم اسے نہیں جانتیں اور اس نے بھی تمہیں کہیں نہیں دیکھا۔''
''یہ تھیں کون؟'' صبیحہ نے بے چینی سے پوچھا۔
''تمہارے دفتر کے مالک ارسلان شاہ صاحب کی بیوی۔''
''کیا!'' صبیحہ بڑی شدت سے چونکی تھی۔
''ہاں۔'' ساجدہ نے کہا۔ ''احمر سلطانہ نام بتایا ہے اس نے اپنا۔''
صبیحہ حیرت سے ماں کی طرف دیکھتی رہی۔ یہ جان کر اس کا سارا جسم سنسنانے لگا تھا۔ یہ اس کے لیے ایک بہت ہی غیر معمولی بات تھی کہ ارسلان شاہ کی بیوی اس کے گھر آئے۔
''عجیب ہی عورت ہے۔'' ساجدہ نے کہا۔ ''کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ دنیا میں ایسی عورتیں بھی ہوں گی۔''
''آخر بات کیا ہے اماں؟'' صبیحہ کی حیرت اپنی جگہ برقرار تھی۔
''کیا کوئی عورت ایسی ہو سکتی ہے جو اپنے شوہر کی دوسری شادی کرانا چاہے؟'' ساجدہ بولی۔
''کیا مطلب؟''
''وہ اپنے شوہر کا رشتہ لے کر آئی تھی۔''
صبیحہ اب بھی حیرت سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔
''سمجھ میں نہیں آیا تمہاری!'' ساجدہ بولی۔ ''اس گھر میں وہ آخر کس کے لیے رشتہ لے کر آ سکتی ہے؟''
صبیحہ چونکی اور اس کا جسم ایک بار پھر سنسنا گیا۔
''ارسلان صاحب تمہیں پسند کرنے لگے ہیں۔ تم سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔'' ساجدہ بولی۔ ''تمہارے ابا کا شبہ کسی حد تک ٹھیک ہی نکلا۔''
صبیحہ کی نظریں جھک گئیں۔ اس کے اعصاب بری طرح ہل گئے تھے۔ اس کے سان گمان میں بھی نہیں آ سکتا تھا کہ اچانک ایسی کوئی صورتِ حال سامنے آ جائے گی۔
''احمر سلطانہ کہہ رہی تھی کہ وہ شادی کے سترہ سال بعد بھی ماں نہیں بن سکی اس لیے وہ خود بھی چاہتی ہے کہ ارسلان صاحب کی دوسری شادی ہو جائے اور خدا انہیں صاحبِ اولاد کر دے۔'' ساجدہ نے بتایا۔ ''اور تم نے آج تک چھپائے رکھا کہ ارسلان صاحب تم سے کیا چاہتے ہیں۔''
''میں قسم کھاتی ہوں اماں!'' صبیحہ کی آواز لرز رہی تھی۔ ''مجھ سے کبھی ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔''
''تمہارے جواب پر میں اس لیے یقین کیے لیتی ہوں کہ احمر سلطانہ بھی یہی کہہ رہی تھی۔ عاصم کی بیماری کے سلسلے میں ایک بڑی رقم ایڈوانس دینے کے بعد وہ ڈر گئے تھے کہ انہوں نے تم سے اس قسم کی بات کی تو تم یہ سمجھو گی کہ پہلے اتنی بڑی رقم دے کر انہوں نے تم پر اسی لیے دباؤ ڈال دیا تھا کہ تم انکار نہ کر سکو۔''
صبیحہ نظریں جھکائے بیٹھی رہی۔ اپنی شادی کے معاملے میں گفتگو کرنا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ ہاں اس پر وہ متعجب ضرور تھی کہ اس بات پر اسے غصہ نہیں آیا تھا کہ ارسلان شاہ

اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔
ساجدہ اپنی اور احمر سلطانہ کی باتیں بتاتی رہی۔ صبیحہ نے چپ سادھے رکھی۔
''ہاں ایک بات ضرور ہے۔'' ساجدہ بولی۔ ''تمہارے ابا جو سمجھ رہے تھے، وہ تو غلط نکلا۔ ارسلان صاحب اس قسم کے آدمی نہیں ہیں جو نوجوان لڑکیوں کو پھانس کر انہیں اپنا کھلونا بنائے رکھتے ہیں۔ کسی سے شادی کا خواہش مند ہونا تو کوئی بری بات نہیں ہے۔ احمر سلطانہ کہہ رہی تھی کہ میں تمہارے ابا سے بات کر کے اچھی طرح سوچ سمجھ لوں اور یہ دباؤ ہم ہرگز محسوس نہ کریں کہ تمہیں ایک بڑی رقم ایڈوانس دی جا چکی ہے۔ ہمیں اس شادی سے انکار کا پورا پورا حق ہے اور اگر تم کسی دوسری جگہ ملازمت کرنا چاہو تو ارسلان شاہ صاحب کی طرف سے یہ دباؤ ہرگز نہیں ہوگا کہ پہلے تم ایڈوانس کی رقم ایڈجسٹ کرواؤ۔''
صبیحہ بہ دستور نظریں جھکائے بیٹھی رہی۔
☆☆☆
''یہ تم کیا کر بیٹھی ہو احمر!'' ارسلان شاہ نے بے چینی سے اس کی طرف دیکھا۔
''وہی کیا ہے میں نے جو مجھے کرنا چاہیے تھا۔'' احمر سلطانہ نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''جب آپ صبیحہ سے خود بات نہیں کر سکے تو اب اس کے علاوہ اور کیا راستہ رہ گیا تھا کہ میں ہی کوئی قدم اٹھاؤں۔''
''یہ ٹھیک نہیں ہوا۔'' ارسلان شاہ بے چینی سے ٹہلنے لگا۔
''یہی ٹھیک ہوا ہے۔'' احمر سلطانہ نے زور دے کر کہا۔
''آپ کی جو حالت ہوتی جا رہی ہے، وہ میرے لیے ناقابل برداشت ہے۔ آپ جواب اتنی شراب پینے لگے ہیں، اس کا کیا نتیجہ نکلے گا؟ زیادہ تو نہیں لیکن آپ کی صحت کچھ گری ضرور ہے اس ایک مہینے میں اگر ایسا ہی چلتا رہا تو آگے چل کر کیا ہو گا۔''
''لیکن مجھے نظر نہیں آتا کہ وہ لوگ اس شادی کے لیے تیار ہوں گے۔'' ارسلان شاہ نے کہا۔ ''مجھے تو یہ ڈر ہے کہ صبیحہ ملازمت نہ چھوڑ دے پھر تو میں اسے کبھی دیکھ بھی نہیں سکوں گا۔''
''ہو سکتا ہے وہ لوگ فوری طور پر اس کے لیے تیار نہ ہوں لیکن مجھے امید ہے کہ میں انہیں کسی نہ کسی طرح آمادہ کر ہی لوں گی۔''
ٹہلتے ٹہلتے ارسلان شاہ احمر سلطانہ کے سامنے رکا اور اس کے دونوں شانوں پر ہاتھ رکھ کر جذباتی لہجے میں بولا۔
''تم بہت گریٹ ہو میری جان!''
''میں تو بہت معمولی عورت ہوں ارسلان!'' احمر سلطانہ نے بھرائی ہوئی آواز اور کھوئے کھوئے سے انداز میں کہا۔ ''اپنے جذبات کے ہاتھوں میں کھلونا بن گئی ہوں۔''
''کیا مطلب!'' ارسلان شاہ نے اسے تعجب سے دیکھا۔
احمر سلطانہ چونک پڑی۔ اس وقت اس کے دماغ میں ایسے خیالات تھے جو وہ ارسلان شاہ پر ظاہر نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے جلدی سے کہا۔ ''یہ میری جذباتیت ہی تو ہے جو میں آپ کی یہ حالت نہیں دیکھ سکتی اگر میں جذباتی نہ ہوتی تو ایک خودغرض عورت ہوتی جو آپ کی دوسری شادی کرانے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہوتی۔''
''یہی تو تمہارا بڑاپن ہے ڈارلنگ! خودغرض لوگوں کو کبھی بڑا نہیں سمجھا جا سکتا۔''
''مجھے نہیں معلوم کہ بات آپ کی ٹھیک ہے یا میری۔'' احمر سلطانہ پھیکے سے انداز میں مسکرائی۔
ارسلان شاہ اس کے لیے بے حد جذباتی ہو گیا تھا۔ وہ بہت کچھ کہتا رہا لیکن اس کی باتیں سننے کے ساتھ احمر سلطانہ کے دماغ میں کچھ اور خیالات بھی چکراتے رہے۔ اس نے بہت سوچ سمجھ کر دو فیصلے کیے تھے۔ ان میں سے پہلا فیصلہ یہ تھا کہ ارسلان شاہ اور صبیحہ کی شادی کرانے کے لیے اپنی کوششوں میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھے گی اور وہ کامیابی حاصل کرنے کے بعد اسے اپنے بارے میں بھی ایک فیصلہ کرنا تھا۔
☆☆☆
رشید خاں کی آواز کچھ اونچی ہوئی تو صبیحہ جلدی سے اٹھ کر درمیانی دروازے کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ عاصم نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا تو صبیحہ نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔
''یہ نہیں ہو سکتا ساجدہ!'' رشید خاں سخت لہجے میں کہہ رہا تھا۔ ''ہرگز نہیں۔''
''اس میں حرج کیا ہے، شادی تو کوئی بری بات نہیں۔''
''شادی تو بری بات نہیں مگر ان دونوں کی عمروں میں کتنا فرق ہے۔ دنیا تو یہی سمجھے گی کہ ہم نے دولت کے لالچ میں......''
''دنیا تو کسی حالت میں بھی چین نہیں لینے دیتی۔'' ساجدہ کے لہجے میں تلخی تھی۔ ''رہی عمر کی بات تو ایسی مثالیں دنیا میں موجود ہیں۔''
صبیحہ دروازے سے کان لگائے سنتی رہی۔ ساجدہ پوری

پوری کوشش کر رہی تھی کہ رشید خاں کو اس شادی پر آمادہ کر لے۔ ان کی بحث خاصی لمبی ہوگئی۔ کھڑے کھڑے صبیحہ کی ٹانگیں دکھنے لگیں لیکن وہ جاننا چاہتی تھی کہ یہ بحث کس نتیجے تک پہنچتی ہے۔

''اچھا!'' آخر رشید خاں نے شکست خوردہ اور مضمحل لہجے میں کہا۔ ''لیکن میری دو شرطیں ہوں گی۔''

''وہ کیا؟''

''ایک تو صبیحہ سے پوچھ لو۔ کیا وہ اتنی عمر کے آدمی سے شادی کرنے کے لیے اور خاص طور سے کسی کی دوسری بیوی بننے کے لیے تیار ہوگی؟''

''کل کرلوں گی میں یہ بات اور دوسری شرط کیا ہے؟''

''ہم اپنی زندگی کے سلسلے میں یہ گوارا نہیں کریں گے کہ شادی کے بعد صبیحہ ہمارے گھریلو اخراجات اٹھائے۔ ارسلان شاہ کیونکہ مالک ہے اس لیے وہ اپنے دفتر میں مجھ جیسے اپاہج کو بھی نوکری دے سکتا ہے۔'' رشید خاں کچھ جذباتی ہوگیا تھا اور اس کی آواز بھرا گئی تھی۔ ''میری صرف ٹانگیں بے کار ہیں، ہاتھ تو کام کرسکتے ہیں میرے۔''

رشید خاں کی اس جذباتیت پر صبیحہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور پھر وہ دروازے پر کھڑی نہیں رہ سکی۔

''کیا بات ہے باجی!'' عاصم نے اس وقت پوچھا جب وہ بستر پر لوٹ آئی تھی۔

''کچھ نہیں بھیا! سو جاؤ تم۔'' صبیحہ نے دوپٹے سے اپنی آنکھیں خشک کرتے ہوئے کہا۔

''واہ!'' عاصم بولا۔ ''جب کوئی بات نہیں ہے تو آپ کی آنکھوں میں آنسو کیوں آگئے؟''

عاصم کو سمجھانے بجھانے میں صبیحہ کو دقت تو ہوئی لیکن کسی نہ کسی طرح وہ اسے ٹالنے میں کامیاب رہی۔

ان حالات میں یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ صبیحہ کو جلدی نیند آجاتی۔ وہ جاگتی اور سوچتی رہی لیکن یہ فیصلہ کرنا اسے بہت دشوار معلوم ہوا کہ وہ اس سلسلے میں اپنی ماں کو کیا جواب دے گی۔

دوسری صبح وہ ناشتے کے بعد معمول کے مطابق دفتر جانے کے لیے تیار ہونے لگی تو اس کا ذہن خاصا الجھا ہوا تھا۔ وہ پریشان تھی کہ اب وہ ارسلان شاہ کا سامنا کس طرح کرے گی۔

''آج تم دفتر نہ جاؤ۔'' ساجدہ نے اس سے کہا۔

صبیحہ چونکی۔ ''کیوں اماں؟''

''کچھ ضروری بات کرنا ہے تم سے!''

صبیحہ چپ ہوگئی۔ وہ جانتی ہی تھی کہ ساجدہ کو اس سے کیا بات کرنا ہے۔ اس وقت اس نے یہ سکون ضرور محسوس کیا کہ وہ ارسلان شاہ کا سامنا کرنے سے بچ گئی تھی۔

تھوڑی دیر بعد عاصم محلے کے لڑکوں سے ملنے گھر سے چلا گیا تو ساجدہ صبیحہ کے پاس آبیٹھی۔ صبیحہ نظریں جھکائے بیٹھی رہی۔ ساجدہ نے احمر سلطانہ کا ذکر کرنے کے بعد اپنی اور رشید خاں کی باتیں کچھ اختصار کے ساتھ بیان کرنا شروع کیں۔ صبیحہ اس طرح سنتی رہی جیسے ان باتوں سے بے خبر ہو۔

آخر میں ساجدہ نے کہا۔ ''میں تو اس شادی کے لیے خوشی سے تیار ہوں صبیحہ! یہ سوچ سوچ کر میرا دماغ بہت پریشان ہوگیا ہے کہ ملازمت کرتے کرتے تم تو بوڑھی ہوجاؤ گی اور یہی بات میں نے تمہارے باپ کو بھی سمجھائی ہے اور وہ بھی تیار ہوگئے ہیں مگر ان کی دو شرطیں ہیں۔''

ساجدہ نے شرطیں بھی بتائیں اور بولی۔ ''لیکن پہلے تم یہ بتادو کہ تمہیں تو اس شادی پر کوئی اعتراض نہیں ہے؟''

☆☆☆

صبیحہ گیارہ بجے تک دفتر نہیں پہنچی تو ارسلان شاہ نے پریشان ہوکر فون پر اپنی بیوی سے رابطہ کیا۔

''میں نے تم سے کہا تھا نا احمر کہ تم نے صحیح قدم نہیں اٹھایا ہے۔ اب تو میں صبیحہ کی صورت دیکھنے کو بھی ترس جاؤں گا۔''

''ایسی کیا بات ہوگئی؟'' احمر سلطانہ نے پریشان ہوکر پوچھا۔

''صبیحہ آج ابھی تک دفتر نہیں آئی اور اب تو گیارہ بج چکے ہیں، اب کیا آئے گی۔''

''اس کی وجہ کچھ اور بھی ہوسکتی ہے ارسلان! ممکن ہے وہ لوگ اس شادی کے لیے تیار ہوگئے ہوں اس لیے انہوں نے صبیحہ کو دفتر بھیجنا مناسب نہ سمجھا ہو، یا صبیحہ کی طبیعت کچھ خراب ہوگئی ہو، یا......''

''ان باتوں سے میری ڈھارس نہیں بندھ سکتی۔'' ارسلان شاہ نے نڈھال سے لہجے میں کہا۔

''اچھا تو میں ابھی صبیحہ کے گھر جا کے معلوم کرتی ہوں کہ قصہ کیا ہے۔ میں کہہ کر تو آئی تھی کہ رات کو آؤں گی لیکن آپ اتنے پریشان ہیں تو میں ابھی چلی جاتی ہوں۔''

''کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔'' ارسلان شاہ نے اداس اور تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔

دوسری طرف سے احمر سلطانہ نے سلسلہ منقطع کردیا۔ ارسلان شاہ نے ریسیور رکھنا چاہا تو وہ اس کے ہاتھ سے

چھوٹ کر میز پر گر پڑا۔ اس نے دوبارہ ریسیور اٹھا کے کریڈل پر رکھا اور کرسی کی پشت گاہ سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے چہرے پر گہری اداسی تھی۔

انٹرکام کی گھنٹی بجی تو وہ چونکا۔ اس نے بڑے اکتائے ہوئے انداز میں انٹرکام کا ریسیور اٹھایا۔ ''ہیلو!''

''آئی ایم سوری سر!...... مجھے دفتر آنے میں آج کچھ دیر ہو گئی۔''

صبیحہ کی آواز سن کر ارسلان شاہ اچھل پڑا۔

''کوئی بات نہیں صبیحہ!'' وہ جلدی سے بولا۔ ''کبھی ہو جاتا ہے ایسا۔''

''کیا میں آپ کے کمرے میں آ سکتی ہوں؟''

''ہاں ہاں، کیوں نہیں۔''

دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا گیا تو ارسلان شاہ نے بھی ریسیور رکھا۔ صبیحہ کی آواز سن کر وہ خوش تو ہوا تھا لیکن کچھ پریشانی بھی لاحق ہوئی تھی۔ صبیحہ کو ظاہر ہے کہ سب کچھ معلوم تو ہو گیا ہوگا، اب اس کا نہ جانے کیا ردعمل سامنے آئے۔ انٹرکام پر ارسلان شاہ نے اس کی جو آواز سنی تھی، اس سے کچھ اندازہ لگانا مشکل تھا۔ بہت سپاٹ سے لہجے میں بات کی تھی صبیحہ نے!

جب وہ کمرے میں آئی تو ارسلان شاہ نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرانا چاہتا تھا لیکن صبیحہ کو بے حد سنجیدہ دیکھ کر مسکرا نہ سکا۔

صبیحہ میز کے قریب آ کھڑی ہوئی اور ارسلان شاہ اس کا منہ تکتا رہا۔

''کیا میں بیٹھ جاؤں سر؟'' صبیحہ آہستہ سے بولی۔

''اوہ، ہاں!'' ارسلان شاہ چونک پڑا۔ ''بیٹھو!''

''شکریہ۔'' صبیحہ بیٹھ گئی۔ ''مجھے دیر اس لیے ہو گئی کہ اماں نے مجھے کچھ باتیں کرنے کے لیے روک لیا تھا۔''

ارسلان شاہ نے کرسی پر بے چینی سے پہلو بدلا اور صبیحہ کی طرف دیکھتا رہا۔

وہ پھر بولی۔ ''آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ اماں نے مجھے کیا باتیں کرنے کے لیے روکا ہوگا۔''

ارسلان شاہ کچھ نہیں بول سکا۔

صبیحہ کچھ توقف سے بولی۔ ''اماں میری مرضی جاننا چاہتی تھیں۔''

''ہوں۔'' ارسلان شاہ نے پھر پہلو بدلا۔

''سر!'' صبیحہ سنجیدگی سے بولتی رہی۔ ''بہت دن پہلے ہی جب مجھے اپنے گھر کے حالات کا اندازہ ہو چکا تھا۔

میں نے سوچنا ہی چھوڑ دیا تھا کہ لڑکیاں شادی بھی کرتی ہیں اور اس طرح ان کی نئی زندگی کا آغاز ہوتا ہے اس لیے جب آج میری اماں نے میری مرضی جاننا چاہی تو میں نے فیصلے کا اختیار ان پر اور ابا پر چھوڑ دیا۔''

''اوہ!'' ارسلان شاہ کچھ پُرسکون ہوا۔ ''تمہاری مرضی جاننے کا مطلب تو یہ ہوا کہ تمہارے والدین کو اس شادی پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔''

''جی!'' صبیحہ کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ ''لیکن ابا کی ایک شرط ہے۔''

''کیا؟'' ارسلان شاہ نے جلدی سے کہا۔ ''مجھے ان کی ہر شرط منظور ہوگی۔''

''لیکن مجھے وہ منظور نہیں ہے۔''

ارسلان شاہ کا چہرہ اتر گیا۔ ''کیوں؟''

صبیحہ نے اسے پہلے تو شرط سے آگاہ کیا، پھر بولی۔ ''میں یہ گوارا نہیں کر سکتی کہ میرے والد آپ کے دفتر میں کوئی معمولی ملازمت کریں۔''

''معمولی ملازمت کیوں کریں گے وہ!'' ارسلان شاہ نے پرجوش انداز میں کہا۔ ''میں انہیں جنرل منیجر بنا دوں گا۔''

''یہ منصب سنبھالنے کی صلاحیت تو ان میں نہیں ہے۔''

''کیوں نہیں ہے؟'' ارسلان شاہ کا انداز پرجوش ہی رہا۔ ''پڑھے لکھے آدمی ہیں وہ!......تم مجھے بتا چکی ہو کہ وہ پہلے کہاں کام کرتے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ تھوڑی سی تربیت کے بعد اس منصب کے اہل ہو جائیں گے۔''

''ابھی تو آپ مجھ سے شادی کے لیے اس سے زیادہ بھی بہت کچھ کر سکتے ہیں لیکن بعد میں......''

''تم کوئی اندیشہ اپنے ذہن میں نہ آنے دو صبیحہ! میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو اپنی بات سے پھر جاتے ہیں۔ میں نے ہمیشہ جو کچھ کہا ہے، وہ کیا بھی ہے۔ ایسا ناممکن ہے کہ میں بعد میں بدل جاؤں۔'' ارسلان شاہ کرسی سے اٹھ کر ٹہلنے لگا اور شدید جذباتی انداز میں بولا۔ ''میری رفاقت میں اگر میری وجہ سے تمہیں ایک کانٹا بھی چبھا تو میں خود کو بھی معاف نہیں کر سکوں گا۔ تم اندازہ بھی نہیں لگا سکتیں کہ تمہارے لیے میرے جذبات کیا ہیں اور ان دنوں میں مجھ پر کیا گزرتی رہی ہے اگر تم یقین کرو تو میں تمہیں بتاتا ہوں کہ......''

ارسلان شاہ بولتا ہی چلا گیا۔ صبیحہ کے بارے میں اپنے جذبات، اس کے بارے میں اپنی سوچ، اپنے خدشات، سبھی کچھ بیان کر ڈالا اس نے اور اس رات کی تفصیل تو اس نے بڑی وضاحت سے بیان کی جب اس نے اپنی بیوی احمر

سلطانہ کو صبیحہ سے اپنی محبت کے بارے میں بتایا تھا۔
صبیحہ ہکا بکا سی بیٹھی وہ سب کچھ سنتی رہی۔ یہ اندازہ لگانا اس کے لیے واقعی ناممکن تھا کہ گزشتہ کچھ عرصے میں ارسلان پر جو یہ سب کچھ گزر گیا تھا۔ صبیحہ اس کی حرکات وسکنات اور اس کے لب و لہجے میں سچائی کی چمک بھی دیکھ رہی تھی اور جذبات کی طغیانی بھی......
سب کچھ بیان کر دینے کے بعد ارسلان شاہ اس طرح اپنی کرسی پر بیٹھا جیسے تھک کر گر گیا ہو۔ اس کی سانس بھی کچھ پھولی ہوئی تھی۔ وہ صبیحہ کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔ ''مجھے تو ہمت ہی نہیں رہ گئی تھی کہ تم سے کچھ کہہ سکوں اور احمر مجھے کچھ بتائے بغیر تمہارے گھر پہنچ گئی تھی۔''
''بہت محبت کرتی ہیں وہ آپ سے۔'' صبیحہ ان باتوں سے شدید متاثر ہوئی تھی۔
''وہ میرے لیے مر بھی سکتی ہے۔'' ارسلان شاہ نے پرجوش لہجے میں کہا۔ ''لیکن میں بھی اس کے لیے اپنی جان دینے سے گریز نہیں کر سکتا۔ میں بہت صاف گوئی سے تمہیں بتا دوں کہ جتنی محبت مجھے تم سے ہے، اتنی ہی محبت مجھے احمر سے بھی ہے اگر تم مجھ سے شادی کرنے سے انکار کرتی ہو تو جو کچھ میں نے ابھی بیان کیا، اس سے تم اندازہ لگا سکتی ہو کہ باقی زندگی مجھ پر کیا گزرے گی لیکن اگر تم مجھ سے شادی کر لیتی ہو تو یہ خواہش بھی نہ کرنا کہ میں تمہیں احمر سے زیادہ اہمیت دوں۔ میرے لیے تم دونوں ہمیشہ یکساں رہو گی۔''
صبیحہ کو ایسا محسوس ہونے لگا جیسے وہ بہت دب گئی ہو۔ اتنا بوجھ تو اس پر اس رقم کا بھی نہیں تھا جو اس نے ارسلان شاہ کے دفتر سے ایڈوانس لی تھی۔
ارسلان شاہ جیسا محبت کرنے والا شوہر اپنی زندگی میں اسے شاید مل ہی نہیں سکتا تھا......

☆☆☆

احمر سلطانہ جب صبیحہ کے گھر پہنچی تھی تو یہ جان کر اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں رہا تھا کہ صبیحہ کے والدین اس شادی کے لیے تیار ہو گئے تھے اور صبیحہ کو بھی اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا لیکن رشید خاں کی ایک شرط تھی جس کی وجہ سے صبیحہ خود ارسلان شاہ سے بات کرنے دفتر گئی تھی۔
احمر سلطانہ مطمئن ہو کے گھر لوٹ آئی۔ صبیحہ کے دیر سے دفتر جانے کا سبب اس کی سمجھ میں آ گیا تھا لیکن اس کی وہ تاخیر ارسلان شاہ کی پریشانی کا سبب بن گئی تھی لیکن اب، احمر سلطانہ کے خیال کے مطابق ارسلان شاہ کو اپنے دفتر میں مطمئن ہونا چاہیے تھا۔ گھر پہنچ کے اس نے ارسلان شاہ کو فون کیا اور اسے معلوم ہوا کہ صبیحہ چند ہی لمحے پہلے اس کے کمرے سے گئی ہے۔ ارسلان شاہ نے احمر سلطانہ کو اپنی اور صبیحہ کی گفتگو کے بارے میں بھی بتایا۔
شام کو جب وہ گھر لوٹا تو بے حد خوش تھا۔ اس نے احمر سلطانہ کو اپنی گود میں اٹھا لیا۔ اس کا انداز کچھ ایسا تھا جیسے احمر سلطانہ کو گود میں اٹھائے اٹھائے ناچنا شروع کر دے گا۔
''کیا بچوں کی سی حرکت کر رہے ہیں۔'' احمر سلطانہ ہنستی ہوئی بولی۔
ارسلان شاہ نے اسے بستر پر بٹھا دیا اور اس کے دونوں شانوں پر ہاتھ رکھ کر اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔ ''شاید دنیا کا کوئی شخص اپنی بیوی پر اتنا ناز نہیں کر سکتا جتنا میں کر سکتا ہوں۔''
''یہ باتیں چھوڑیے۔'' احمر سلطانہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے پہلو میں بٹھا لیا۔ ''اب اپنی شادی کے بارے میں سوچیے۔''
''ہو سکے تو آج ہی میرا نکاح کروا دو۔'' ارسلان شاہ اس طرح گڑگڑایا جیسے احمر سلطانہ اس کی بیوی نہیں بلکہ اس کی سرپرست ہو۔
احمر سلطانہ ہنسنے لگی۔ ''نہیں جناب! کچھ دن تو آپ بھی اور تڑپیے!''
''بھی؟'' ارسلان شاہ بولا۔ ''کیا مطلب؟''
احمر سلطانہ کا دل دھک سے ہو گیا۔ ''بھی'' وہ اس خیال سے کہہ بیٹھی تھی کہ کسی کی محبت میں تڑپ تو وہ بھی رہی تھی۔
ایک بار احمر سلطانہ پہلے بھی ارسلان شاہ سے ایسی کوئی بات کہہ چکی تھی اور اس نے کسی بہانے وہ معاملہ ٹال دیا تھا۔ اسی طرح اسے اس وقت بھی بات بنانا پڑی اور اس نے اپنی دانست میں ارسلان شاہ کو سوچنے کا موقع نہیں دیا اور بولی۔ ''شادی کی تیاری کے سلسلے میں آپ نے کیا سوچا ہے؟''
''اس میں سوچنا کیا ہے احمر!'' ارسلان شاہ نے سنجیدگی سے کہا۔ ''میری عمر پینتالیس سال ہو چکی ہے اور میں دوسری شادی کر رہا ہوں۔ کوئی دھوم دھام کرنا تو مضحکہ خیز بات ہو گی۔ میں بس تمہیں اور دو تین دوستوں کو لے کر صبیحہ کے گھر جاؤں گا اور نکاح کے بعد اسے لے آؤں گا۔ ہاں اگر وہ لوگ کوئی دھوم دھام کرنا چاہیں تو غالباً مجھے کوئی اعتراض نہیں کرنا چاہیے۔''
''میں رات کو دوبارہ جاؤں گی صبیحہ کے گھر! انہی سے پوچھوں گی کہ ان کا کیا پروگرام رہے گا۔''
''یہ ٹھیک ہے۔''

''زریاب آپ سے کچھ ناراض ہیں۔ انہیں تو منائیے! کیا نکاح میں انہیں نہیں لے جائیں گے؟''

احمر سلطانہ کی بات پر ارسلان شاہ کچھ حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا تھا۔ ''کیوں؟ وہ کیوں ناراض ہے مجھ سے؟''

''وہ اسی گھر میں ہیں لیکن کتنے دن ہو گئے، آپ ان سے نہیں ملے۔''

''تم جانتی ہی ہو ڈارلنگ! میں صبیحہ کے معاملے میں ذہنی طور پر کتنا اُلجھا رہا تھا۔ چلو ابھی چلتے ہیں اس کے کمرے میں۔''

''چلیے!'' احمر سلطانہ کھڑی ہوتی ہوئی بولی۔ ''پچھلے دنوں ان کا ہاتھ بھی جل گیا تھا۔ اب تو خیر ٹھیک ہو گیا ہے۔''

''کیسے جل گیا تھا؟'' ارسلان شاہ نے چونک کر پوچھا۔

احمر سلطانہ نے جواب میں وہی کہہ دیا جو بہانہ زریاب نے سوچا تھا۔

وہ دونوں زریاب کے کمرے میں پہنچے۔ ارسلان شاہ وہاں کافی دیر تک بیٹھا اور تینوں میں باتیں ہوتی رہیں۔ زریاب سارے حالات سے واقف تھا لیکن اس نے اس پر حیرت کا اظہار کیا کہ ارسلان شاہ دوسری شادی کر رہا تھا اور احمر سلطانہ اس پر معترض بھی نہیں تھی۔

☆☆☆

''کوئی دھوم دھام تو ہمیں بھی نہیں کرنا ہے بہن!'' رشید خان نے کہا۔

رات کا وقت تھا اور احمر سلطانہ ذرا ہی دیر پہلے ان کے گھر پہنچی تھی۔ اس گفتگو کے دوران میں صبیحہ اور عاصم کو اس کمرے سے ہٹا دیا گیا تھا لیکن دوسرے کمرے میں عاصم دروازے سے کان لگائے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ اسے اس سے بڑی خوشی ہو رہی تھی کہ اس کی باجی کی شادی کے بارے میں باتیں ہو رہی تھیں۔

صبیحہ نے وہ باتیں سننے کی ذرا بھی کوشش نہیں کی۔ اس نے دو ایک مرتبہ عاصم پر اچٹتی سی نظر تو ڈالی تھی مگر اس سے کچھ کہا نہیں تھا۔

تھوڑی دیر بعد احمر سلطانہ چلی گئی تو رشید خاں کے چہرے پر سوچ بچار کے آثار زیادہ گہرے ہو گئے......

''اب تو تمہیں خوش ہونا چاہیے۔'' ساجدہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''رشید خاں نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ ''کیا تم خوش ہو؟''

''کیوں؟... میں خوش کیوں نہیں ہوں گی۔ ماں باپ پر بیٹی کا بوجھ کم تو نہیں ہوتا۔''

''ہاں یہ تو ضرور ہے کہ بیٹی کی ایک ذمے داری ہوتی ہے والدین پر، لیکن جو کچھ تمہارے دل میں ہے، وہ تم زبان پر نہیں لا رہی ہو۔ میری طرح تمہیں بھی یہ احساس ضرور ہوگا کہ یہ شادی ہماری غربت کا نتیجہ ہے۔ ہم جیسے لوگوں کی لڑکیاں جب ملازمت کے لیے گھر سے قدم نکالتی ہیں تو ان کی شادیاں کچھ اسی قسم کی ہوتی ہیں۔''

''لیکن ہمیں یہ خوشی تو ہونا چاہیے کہ ہماری بیٹی ایک خوش حال زندگی گزارے گی۔''

''وہ تو گزارے گی لیکن ہم پر کیا بیتے گی۔ ہمیں اپنے اردگرد کیسی کیسی آوازیں سنائی دیں گی۔ یہ تو بہ ظاہر بڑا اچھا لگ رہا ہے کہ میں جنرل منیجر بن جاؤں گا لیکن رہوں گا تو اپنے داماد کا ملازم!''

ساجدہ تھوڑی سی اداس نظر آئی۔ ''اب بیٹی کی خاطر کچھ کڑوی گولیاں تو ہمیں نگلنا ہی پڑیں گی۔ ہم جیسے ماں باپ اس کے لیے مجبور ہوتے ہیں۔''

رشید خاں نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''کاش میں اسی دن صبیحہ کی ملازمت ختم کرا دیتا جب وہ گل دستہ لے کر آئی تھی۔''

''تو اس سے کیا ہوتا۔ احمر سلطانہ تو اس کے بعد بھی ہمارے گھر آتیں۔ ارسلان شاہ اس سے پہلے ہی ہماری بیٹی کو پسند کرنے لگے تھے۔''

''شاید اس وقت تک ارسلان شاہ کے جذبات میں اتنی شدت نہیں آئی ہوگی۔''

''چلو مان لیتی ہوں میں تمہاری بات، لیکن صبیحہ کی ملازمت چھڑانے کے بعد اس گھر کا کیا ہوتا!''

''یہی تو میں نے ابھی کہا تھا۔ یہ شادی، اس کا سبب ہماری لاچاری ہے۔ یہ تو سوچنا ہی پڑے گا کہ میں ارسلان شاہ کی ملازمت سے کس طرح بچ سکتا ہوں۔''

''اگر تم چاہو تو یہ شادی اب بھی رکوائی جا سکتی ہے۔'' ساجدہ نے کچھ تلخی سے کہا۔ ''نکاح نہیں ہوا ہے ابھی...... بیٹی ابھی گھر ہی میں ہے۔''

رشید خاں کچھ نہیں بولا۔ اس کے متفکر چہرے پر بے بسی کی لکیریں کچھ اور گہری ہو گئی تھیں۔

☆☆☆

نکاح کے لیے ایک ہفتے بعد کی تاریخ طے ہوئی تھی لیکن احمر سلطانہ نے فوراً ہی اس کی تیاریاں اس طرح شروع کی تھیں کہ بنگلے کا ایک کشادہ کمرا جو باقاعدہ کسی قسم کے استعمال

''اب یہی ہونا چاہیے احمر!'' زریاب نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اب تک تو میں سوچتا رہا تھا کہ جیسی کشتی میں ہم دونوں سوار ہیں، ویسی ہی کشتی ارسلان کا بھی مقدر بن گئی ہے۔ ہماری طرح اب وہ بھی زندگی بھر تڑپے گا لیکن اب کہانی بدل گئی ہے۔ وہ سکون کی آغوش میں چلا گیا ہے تو اب ہم آخر کیوں ڈوبے رہیں کرب کے اندھیرے میں۔''

''نہیں.... نہیں....'' احمر سلطانہ کی آواز دھیمی بھی تھی اور لرزتی ہوئی بھی۔ اس کا جسم عجیب سے انداز میں سنسنانے لگا تھا۔ اتنی شدت سے وہ زریاب کے قریب کبھی نہیں ہوئی تھی۔ اس قرب کی آگ میں اس کی قوت ارادی جلنے لگی۔ وہ خود کو پگھلتا ہوا محسوس کرنے لگی تھی۔ اس آگ میں اس کی قوت مدافعت خاکستر ہوسکتی تھی اور شاید ایک کمزور لمحہ اس کی زندگی میں آنے والا تھا۔

''اب مجھ سے گریز نہ کرو احمر!'' زریاب کی آغوش کچھ اور تنگ ہوگئی۔ ''ارسلان تو کہہ بھی چکا ہے کہ اس سے عورت کی جسمانی کیمسٹری میں کوئی فرق نہیں آتا لہٰذا وہ اس سے بے خبر ہی رہے گا۔''

اسی وقت احمر سلطانہ کے دماغ کے اندرونی حصے میں ایک شدید ضرب لگی۔ وہ ضرب اس کے ضمیر کے تازیانے کی تھی جس نے اس کے وجود کو بری طرح ہلا دیا۔ زریاب کے قرب سے اس کا پگھلتا ہوا وجود یک لخت اپنی اصل حالت میں آگیا اور اس کے اندر ایک خوف ناک سی وحشت بھر گئی۔ ایسی شدید وحشت کہ جب اس نے زریاب کو دھکا دیا تو اس طرح جیسے اس کے جسم میں کوئی حیوانی قوت در آئی ہو۔ وہ زریاب کی آغوش سے نکل گئی اور زریاب کینوس سے جا ٹکرایا۔

کینوس یا زریاب کو احمر سلطانہ گرتے ہوئے اس لیے نہیں دیکھ سکی کہ وہ پاگلوں کی طرح دروازے کی طرف دوڑ پڑی تھی۔ دروازے سے نکل کر بھی وہ دوڑتی ہی رہی۔ یہ دوسرا موقع تھا جب وہ زریاب کے کمرے سے اس طرح نکلی تھی۔ پہلے موقع پر اسے ارسلان کی بات کی صداقت کا یقین ہوگیا تھا کہ ماحول اور وقت حارج نہ ہو تو عورت اور مرد کسی بھی وقت کسی کمزور لمحے سے دوچار ہوسکتے ہیں۔ اس پر یقین کرلینے ہی کے باعث احمر سلطانہ نے زریاب کے کمرے میں جانا چھوڑا تھا لیکن آج اس سے یہ حماقت اس لیے سرزد ہوگئی تھی کہ موت کی آغوش میں جانے سے پہلے وہ ایک مرتبہ اپنے محبوب کو دیکھ لینا چاہتی تھی لیکن اب اسے شدت سے احساس ہوا کہ اس سے حماقت سرزد ہوئی تھی۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر وہ بستر پر ڈھیر ہوگئی۔ اس کی سانسیں بری طرح پھولی ہوئی تھیں اور زریاب کے خلاف اشتعال کا لاوا اس کی رگ رگ میں دوڑنے لگا تھا۔ اس نے تو زریاب کو نہایت باکردار اور مضبوط قوت ارادی کا انسان سمجھا تھا اور اس کی محبت میں گرفتار ہوئی تھی لیکن اب اس کے ذہن میں صرف یہ خیال تھا کہ زریاب ایک گھٹیا انسان ہے۔

یکایک ٹیلے فون کی گھنٹی بجی اور احمر سلطانہ چونک پڑی۔ گھر میں کئی ٹیلے فون تھے جن میں سے ایک زریاب کے کمرے میں بھی تھا اور وہ کال زریاب ہی کی تھی۔

''آئی ایم سوری احمر!'' زریاب کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

احمر سلطانہ نے غصے سے ریسیور، کریڈل پر پٹخ دیا۔ وہ زریاب سے اب کوئی بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔

اتفاقاً اس کی نظر دیوار گیر کلاک پر پڑی اور اسے معلوم ہوا کہ زریاب کے کمرے سے آئے اسے ایک گھنٹا گزر چکا تھا۔ اپنے اشتعال انگیز خیالات میں اسے وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں رہا تھا۔

احمر سلطانہ کے دماغ سے خودکشی کرنے کا خیال غائب ہوگیا۔ اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ دراصل وہ خودکشی اس لیے نہیں کرنا چاہتی تھی کہ صبیحہ اور ارسلان شاہ کی شادی سے پیدا ہونے والی خلش کبھی ختم نہیں ہوتی بلکہ خودکشی کے فیصلے کا سبب یہ خوف تھا کہ زریاب سے اس کی محبت کبھی ارسلان شاہ کے سامنے نہ آجائے...... وہ صورت حال احمر سلطانہ کے لیے اپنی موت سے زیادہ اذیت ناک ہوتی لیکن اب اس کے دل سے زریاب کی محبت ختم ہوچکی تھی اور اب اسے صرف یہ سوچنا تھا کہ زریاب کو اس گھر سے کس طرح رخصت کیا جائے کہ ارسلان شاہ اس سلسلے میں کوئی خاص بات نہ سوچ سکے۔

☆☆☆

صبح ناشتے کی میز پر صبیحہ کچھ شرمائی شرمائی سی بیٹھی تھی۔ ارسلان شاہ بے حد خوش نظر آرہا تھا۔ احمر سلطانہ متفکر ہونے کے باوجود اپنے ہونٹوں پر جبری مسکراہٹ سجائے ہوئے تھی۔

''آج تو زریاب کو بھی ہمارے ساتھ ہی ناشتا کرنا چاہیے۔'' ارسلان شاہ نے احمر سلطانہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''تو پہلے کہتے۔'' احمر سلطانہ بولی۔ ''جب ہم ناشتا کرنے بیٹھتے ہیں اس سے پہلے ہی ایک ملازم ناشتا دینے کے لیے زریاب کے کمرے......

احمر سلطانہ کو ایک دم چپ ہو جانا پڑا۔ ایک ملازم تقریباً گرتا پڑتا ڈائننگ روم میں داخل ہوا تھا اور پاگلوں کی طرح چیخا تھا۔

''لاش...... لاش...... صاحب! زریاب صاحب کی لاش!''

اس بات پر وہ تینوں ہی اپنی اپنی کرسیوں سے حواس باختگی کے عالم میں اٹھے تھے۔ احمر سلطانہ بے تحاشا دروازے کی طرف دوڑی تھی۔ اس کے پیچھے ارسلان شاہ بھی تھا اور صبیحہ بھی اس وقت بھول گئی تھی کہ اس گھر میں دلہن کی حیثیت سے ابھی اس کی ایک ہی رات گزری تھی۔

زریاب کے کمرے کا دروازہ چوپٹ کھلا ہوا تھا۔ بوکھلایا ہوا ملازم ہی اسے اس حال میں چھوڑ کر گیا ہوگا۔ ناشتے کی ٹرے اور اس کا سارا سامان دروازے کے قریب ہی بکھرا ہوا تھا جس سے ملازم کی بوکھلاہٹ کی شدت کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔

زریاب کی لاش اس کے بستر پر تھی۔ اس کی بائیں کلائی کی شہ رگ ایک تیز دھار چاقو مار کر کاٹی گئی تھی اور وہ چاقو بستر پر ایک جانب پھیلے ہوئے زریاب کے ہاتھ میں تھا۔ یہ سچویشن ظاہر کر رہی تھی کہ زریاب خودکشی کا مرتکب ہوا تھا۔ بے تحاشا خون بستر کو رنگین کرتا ہوا فرش پر گر کر جمنے لگا تھا۔ زریاب کے چہرے کی رنگت اتنی سفید تھی جیسے اس کے جسم سے خون کا آخری قطرہ تک نچڑ چکا ہو۔ اس سے یہ بات ظاہر ہوتی تھی کہ خودکشی کا یہ عمل کئی گھنٹے پہلے کیا گیا تھا۔

لیکن یہ ساری باتیں بعد کی تھیں۔ زریاب کی لاش دیکھتے ہی صبیحہ کو تو چکر آ گیا تھا اور وہ گرتے گرتے فرش پر بیٹھ گئی۔

احمر سلطانہ کا عالم یہ تھا کہ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے زریاب کی لاش کو تک رہی تھی۔ اسے اردگرد کا کچھ ہوش ہی نہیں تھا لیکن ارسلان شاہ نے خود کو بڑی حد تک قابو میں رکھا تھا۔ اس نے ٹیلے فون پر نمبر ملائے تھے اور پھر ریسیور کے ماؤتھ پیس میں بڑے ہذیانی سے انداز میں بولا تھا۔

''ہیلو!...... پولیس اسٹیشن!''

☆☆☆

پولیس کے لیے یہ انتہائی چکرا دینے والا کیس ثابت ہوا۔ ایسے شواہد نہیں ملے تھے کہ اسے قتل کا کیس سمجھا جا سکتا لیکن یہ بات بھی کسی طرح سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ زریاب نے خودکشی کیوں کی تھی۔ اس کا اندازہ صرف احمر سلطانہ کو تھا لیکن وہ اس سلسلے میں اپنی زبان بند رکھنے پر مجبور تھی۔ پولیس نے ارسلان شاہ، صبیحہ اور احمر سلطانہ کے علاوہ گھر کے ملازمین سے بھی پوچھ گچھ کی تھی اور پوچھ گچھ کا یہ سلسلہ کئی دن تک چلتا رہا تھا لیکن آخرکار پولیس اس کے سوا کسی نتیجے تک نہیں پہنچ سکی کہ زریاب اپنی بیوی کے انتقال کے بعد ذہنی طور سے بہت بکھر گیا تھا اس نے خود کو ایک اعتبار سے تنہائی کے پنجرے میں قید کر لیا تھا اور گزرتے وقت کے ساتھ زندگی اس پر بھاری ہوتی چلی گئی تھی۔ یہاں تک کہ وہ زمین پر سے اپنا بوجھ ختم کر دینے کا فیصلہ کر بیٹھا تھا۔

پولیس کی پوچھ گچھ کا سلسلہ ختم ہونے کے بعد احمر سلطانہ کو چپ سی لگ کر رہ گئی۔ زریاب کی خودکشی نے اسے شدید صدمہ پہنچایا تھا۔

یہ انسانی فطرت کی بوالعجبی ہے کہ اس کی سوچ کسی بھی وقت، کسی بھی وجہ سے اچانک تبدیل ہو جاتی ہے اور ایسا ہی احمر سلطانہ کے ساتھ بھی ہوا تھا۔ زریاب سے چند گھنٹے نفرت کرنے کے بعد وہ پھر اس سے محبت کرنے لگی تھی۔ زریاب کی خودکشی نے اس کی روح تک کو جھنجھوڑ ڈالا تھا۔ اس کے خیال کے مطابق زریاب سے ایک سنگین غلطی ہوئی تھی جس کا احساس بھی اسے بڑی سنگینی سے ہوا تھا۔ ٹیلے فون پر احمر سلطانہ سے ''سوری'' کرنے کے بعد ہی خودکشی کی تھی۔ اس میں اتنی سکت نہیں رہی تھی کہ اس واقعے کے بعد احمر سلطانہ سے نظریں ملا سکتا۔

لیکن غلطی تو انسان ہی سے ہوتی ہے، احمر سلطانہ نے سوچا تھا، وہ تو خود ایک غلطی کی مرتکب ہوئی تھی۔ اسے تو ایک واقعہ ہو جانے کے بعد رات کو تو کیا، دن میں بھی زریاب کے کمرے میں نہیں جانا چاہیے تھا اور ایسا وہ کر بھی چکی تھی۔ اس نے زریاب سے تنہائی میں ملنا چھوڑ دیا تھا مگر اس رات کیونکہ اس نے اپنی زندگی ختم کرنے کا فیصلہ کیا تھا اس لیے جذبات میں بہہ کر زریاب کے کمرے میں پہنچ گئی تھی اور یہ اس کی بہت بڑی غلطی تھی۔ اس رات جب اسے اپنے جذبات پر قابو نہیں رہا تھا تو زریاب کو اپنے جذبات پر قابو کیسے رہ سکتا تھا۔ وہ رات تو ان دونوں ہی کے لیے ایک خوف ناک رات تھی۔ ایسی رات جو ان دونوں جیسے کسی بھی انسان کے دل میں طوفان لا سکتی تھی، ان کے جذبات سے لاوا اگلوا سکتی تھی۔

ارسلان شاہ کے نظریات ہی کی وجہ سے احمر سلطانہ خود کو بھی مجرم سمجھنے لگی تھی۔ اسے ہر حال میں اس کا خیال رکھنا چاہیے تھا کہ محبت کے معاملے میں انسان کے اندر چھپے ہوئے حیوانی جذبات کسی وقت بھی سر اٹھا لیتے ہیں جو ایک فطری امر ہے اس لیے اسے جرم نہیں سمجھا جا سکتا۔

جرم کی بات سے احمر سلطانہ کو اختلاف تھا لیکن یہ بات

اس کی سمجھ میں آئی تھی کہ فطری جذبات کو دبانا انسان کے لیے بہت مشکل ہوتا ہے لہٰذا اگر زریاب کو خود پر قابو نہیں رہا تھا تو اسے اس کی سزا نہیں ملنا چاہیے تھی لیکن وہ خود ہی اپنے آپ کو سزا دے بیٹھا تھا۔ اس کے اندر کے انسان نے اسے مجرم قرار دے دیا تھا اور جب اس نے اپنے ہاتھوں سے سزا پالی تھی تو اس کے لیے احمر سلطانہ کے جذبات پھر بدل گئے تھے۔

احمر سلطانہ کی سوچ کا یہ انداز!

یہی تھی انسانی فطرت کی بوالعجبی!

اور اسی احساس نے احمر سلطانہ کو بیمار ڈال دیا کہ اگر وہ فون پر زریاب کی معذرت قبول کر لیتی تو وہ خودکشی نہ کرتا۔ وہ خود کو زریاب کا، اپنے محبوب کا قاتل سمجھنے لگی تھی۔

ارسلان شاہ نے بڑے سے بڑا ڈاکٹر کھڑا کر دیا لیکن جب انسان اپنی روح کو خود ہی گھاؤ لگا بیٹھے تو کوئی بھی اس کا مسیحا نہیں بن سکتا۔

صبیحہ کے لیے یہ صورت حال دوہری پریشانی کا سبب تھی۔ ایک طرف احمر سلطانہ کی صحت دن بہ دن گرتی چلی جارہی تھی اور دوسری طرف ارسلان شاہ کی اداسی میں اضافہ ہوتا چلا جارہا تھا۔

صبیحہ نے احمر سلطانہ کی تیمارداری میں بھی کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ وہ اس سے اکثر پوچھتی بھی تھی کہ آخر اسے کیا ہو گیا ہے لیکن وہ ہمیشہ ایک ہی جواب دیتی تھی۔ ''یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم صبیحہ! لیکن ایک اطمینان مجھے ضرور ہے کہ میرے بعد ارسلان کا خیال رکھنے کے لیے تم تو ہو۔''

اس وقت صبیحہ کی آنکھوں میں آنسو آجاتے تھے۔

ایک دن وہ ارسلان شاہ سے کہہ بیٹھی۔ ''آخر آپ باجی سے کیوں نہیں پوچھتے کہ انہیں اندر ہی اندر کیا غم کھائے جارہا ہے؟''

''کیسے پوچھوں صبیحہ!'' ارسلان شاہ نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''میں تو اپنے ہی اندر گھٹتا چلا جارہا ہوں لیکن آج تم نے یہ سوال کیا ہے تو سوچ رہا ہوں کہ اپنی اس گھٹن میں تمہیں بھی شریک کر لوں۔ میں نے کم ہی عرصے میں محسوس کر لیا ہے کہ تم مجھے اب پوری طرح قبول کر چکی ہو اور میرا ہر راز اپنے سینے میں دفن رکھ سکتی ہو۔''

صبیحہ کچھ حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''میں اس کی بیماری کی وجہ جانتا ہوں۔'' ارسلان شاہ نے اداس لہجے میں کہا۔ ''وہ اور زریاب ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے تھے۔''

''جی!'' صبیحہ ہکا بکا رہ گئی۔

ارسلان شاہ نے آزردگی سے اثبات میں سر ہلایا اور پھر وہ ساری باتیں دہرانے لگا جو احمر سلطانہ نے اس سے اپنی فرضی دوست فیروزہ کے حوالے سے کی تھیں۔ اس نے اپنے ان خیالات کا اظہار بھی کیا جو اس نے احمر سلطانہ سے کیا تھا۔ صبیحہ دم بخود سی بیٹھی سب کچھ سنتی رہی۔

''اور میرے یہ نظریات بہت پختہ ہیں صبیحہ!'' ارسلان شاہ نے کہا۔ ''مرد ہو یا عورت، یہ جذبہ جب سر اٹھاتا ہے تو انسان بے بس ہو جاتا ہے۔ احمر بھی بے بس تھی۔ میں نے اسے یا اس کی محبت کو کبھی برا نہیں سمجھا لیکن وہ خود کو مجرم سمجھتی رہی اور زریاب نے غالباً اس خوف سے خودکشی کر لی کہ کسی دن مجھ پر ان دونوں کی محبت کا راز آشکارا نہ ہو جائے۔ اسے شاید یہ اندازہ نہیں ہوگا کہ اس کی موت احمر کے لیے کتنا بڑا صدمہ ہوگی۔'' ارسلان شاہ نے سوچتے ہوئے کچھ توقف سے کہا۔ ''اور اب تم کہہ رہی ہو کہ میں اس سے وجہ پوچھوں، وجہ تو مجھے معلوم ہے صبیحہ لیکن اگر میں نے اس پر یہ ظاہر کر دیا کہ مجھے اس کی اور زریاب کی محبت کا علم ہے تو وہ شدید ترین اذیت میں مبتلا ہو جائے گی۔'' ارسلان شاہ پھر کچھ رکا۔ ''میں اس کو مرتے ہوئے تو شاید دیکھ لوں۔'' ارسلان شاہ کی آواز کانپ گئی۔ ''لیکن اس کی وہ اذیت تو میری ہی جان لے لے گی۔''

صبیحہ کو اس وقت ایسا لگ رہا تھا کہ اس کے سامنے بیٹھا ہوا انسان، غیر معمولی خیالات رکھنے والا انسان کسی اور ہی دنیا کی مخلوق ہے۔ اپنی بیوی کی محبت کے بارے میں اس طرح کی باتیں کرنے والا، صبیحہ کی دانست میں اس دنیا کا انسان ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

ارسلان شاہ نے یہ سب کچھ بتاتے ہوئے صبیحہ پر جس اعتماد اور یقین کا سہارا لیا تھا، اسے صبیحہ نے کبھی ٹھیس نہیں پہنچائی اور کچھ عرصے بعد احمر سلطانہ اس غلط فہمی کا شکار رہتے ہوئے دنیا سے سدھار گئی کہ اس کا شوہر اس کی اور زریاب کی محبت سے ناواقف تھا۔



سفید خون

ایچ اقبال

ان داغوں کا احوال جو صاف شفاف دامن کو یوں بدنما کرتے ہیں کہ خلاصی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ خاندان کی روایات اور عزت کی یہ پامالی خاندان کے بزرگوں کے لیے ناقابلِ قبول اور ناقابلِ برداشت ہوتی ہے۔ لیکن مجرم اگر اپنا ہی لختِ جگر ہو تو انصاف کرنا، نظر انداز کرنے سے زیادہ مشکل بلکہ تکلیف دہ ہوتا ہے۔ اور یہ تکلیف اٹھانا ناگزیر ہو تو کتنی ٹوٹ پھوٹ ہوتی ہے، یہ کچھ وہی جانتے ہیں جو شکستگی کے اس عمل سے گزر رہے ہوتے ہیں ایک ایسے ہی عظیم الشان قصر کی شکستگی کے دیدنی مناظر!

عجیب محبتوں کے عجب تر سلسلے کی داستان

راجا مظفر حسین خان کی کوٹھی کے معمر منتظم کو سبھی ''کاکا خلیل'' کہا کرتے تھے جن میں خود راجا مظفر حسین خان بھی شامل تھے۔ گھر کے باقی لوگ ''کاکا جی'' اور گھر کے ملازمین ''کاکا صاحب'' کہا کرتے تھے۔

راجا مظفر حسین کا تعلق راجا کانس کے خاندان سے تھا جس نے پندرہویں صدی میں مغربی بنگال پر حکومت کی تھی۔ بعد میں وہ خاندان مسلمان ہوگیا تھا۔ کاکا خلیل کے بارے میں یہ بات کہی جاتی تھی کہ وہ راجا کانس کے وزیر کی اولادوں میں سے تھا، اور وہ وزارت نسل در نسل منتقل ہوتی رہی تھی۔ اس کے اجداد راجا مظفر حسین خان کے اجداد کی خدمت کرتے چلے آئے تھے مگر انہیں کبھی معمولی ملازم نہیں سمجھا گیا تھا۔ ان کی حیثیت وزیر ہی کی سی رہی تھی۔ گھر کے منتظم اعلیٰ کی حیثیت سے ان سب کی عزت بھی کی جاتی رہی تھی۔ اسی لیے راجا مظفر حسین خان کے گھر میں بھی کاکا خلیل کا احترام کیا جاتا تھا۔

یہ خاندان ہمیشہ سے مشرقی روایات پر گامزن رہا تھا، لیکن اب راجا مظفر حسین خان کی اولادوں کے رہن سہن میں کچھ تبدیلیاں آگئی تھیں۔ وہ سوٹ پہننے لگے تھے۔ کھانے میں کانٹے چھری کا استعمال ہونے لگا تھا جس پر راجا صاحب معترض نہیں ہوئے تھے حالانکہ گھر پر ان کا دبدبہ بدستور قائم تھا۔ ان کے بڑے بیٹے کنور احمد الیاس کی عمر اب پچاس سال سے زیادہ ہوچکی تھی لیکن اس میں بھی ان کے سامنے اونچی آواز سے بات کرنے کی ہمت نہیں تھی۔

خود راجا صاحب کی وضع قطع میں اب بھی کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ وہ گھر میں چوڑی دار پاجامہ اور کرتا پہنتے تھے۔ گھر سے نکلتے تھے تو اس میں شیروانی کا اضافہ ہوجاتا تھا۔ عمر اب پچھتر سال سے متجاوز ہوچکی تھی لیکن نہایت صحت مند تھے۔ تیسری شادی انہوں نے پینسٹھ سال کی عمر میں کی تھی۔ ان کی پہلی بیوی کا انتقال کنور احمد الیاس کی پیدائش کے دو سال بعد ہی ہوگیا تھا۔ کنور الیاس کی پرورش ان کی دوسری بیوی نے کی تھی جو ان کے دوسرے بیٹے کنور احمد ریاض کی ماں تھی۔

راجا صاحب نوعمری سے اب تک مشرقی روایات کے پاس دار رہے تھے لیکن جوانی میں نہایت یار باش اور مجلسی بھی تھے۔ شعر و شاعری اور موسیقی کی محفلیں گھر میں اکثر جما کرتی تھیں لیکن تیسری شادی کے بعد ان میں بتدریج تبدیلی آتی چلی گئی تھی۔ اب تو یہ عالم ہوگیا تھا کہ وہ گھر کے لوگوں کو بھی چوبیس گھنٹوں میں چار پانچ بار سے زیادہ نظر نہیں آتے تھے۔ تین وقت تو وہ تھے جب سارا گھر ساتھ بیٹھ کر ناشتا کرتا تھا، پھر دوپہر اور رات کو کھانا کھاتا تھا۔ ایک مرتبہ وہ صبح کے وقت لان میں چہل قدمی کرتے نظر آتے تھے۔ پانچویں بار ان کا نظر آنا کسی اتفاق پر مبنی ہوتا تھا ورنہ وہ اپنا بیشتر وقت اپنی خواب گاہ میں گزارتے تھے جہاں کتابوں کی الماریاں بھی تھیں۔ لائبریری انہوں نے الگ سے نہیں بنائی تھی۔ ان کا وقت مطالعہ کرنے میں یا کچھ لکھنے لکھانے میں گزرتا تھا۔ اگر ان کا کوئی تیسرا مشغلہ تھا تو اس سے گھر کے لوگ قطعی بے خبر

تھے۔شاذونادر ہی ایسا ہوتا تھا کہ وہ کوئی بات کرنے کے لیے کسی کو اپنے کمرے میں بلائیں۔

ناشتا کرتے ہوئے یا کھانا کھاتے وقت وہ عموماً کسی سوچ میں ڈوبے رہا کرتے تھے اس لیے باقی لوگوں کو آپس میں بھی بات کرنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ڈائننگ روم میں سناٹا سا چھایا رہتا تھا۔

لیکن ایک شام، رات کے کھانے سے پہلے ہی گھر میں سناٹا چھا گیا۔کاکا خلیل نے سب کو فرداً فرداً راجا صاحب کا یہ پیغام پہنچایا تھا کہ رات کے کھانے کے آدھے گھنٹے بعد سب لوگ ''گھریلو ڈرائنگ روم'' میں جمع ہو جائیں۔

کوٹھی میں دو وسیع وعریض ڈرائنگ روم تھے۔ایک ڈرائنگ روم کو ''گھریلو'' اس لیے کہا جاتا تھا کہ خاندان یا گھر کے کسی بھی معاملے میں گھر کے لوگوں کا اجتماع وہیں ہوتا تھا۔

کبھی کبھی ایسا ہوتا تھا کہ گھر والوں کو وہاں جمع ہونے کی ہدایت ملتی تھی لیکن انہیں معلوم ہوتا تھا کہ اس اجتماع کا مقصد کیا ہے اور کیا بات ہوگی۔سب لوگ اطمینان سے وہاں جمع ہو جاتے تھے لیکن اس روز کسی کو معلوم نہیں تھا کہ انہیں کیوں جمع کیا جارہا ہے اس لیے سبھی کو اتنی پریشانی ہوئی کہ ذرا دیر کے لیے سب سناٹے میں آ گئے۔پھر جب اس کیفیت سے نکلے تو سبھی ایک دوسرے سے پوچھنے لگے کہ کیا معاملہ ہوسکتا ہے!

راجا صاحب کی بیویاں ''بڑی رانی'' اور ''چھوٹی رانی'' کہلاتی تھیں چھوٹی رانی کی عمر اب بتیس سال کے لگ بھگ تھی۔راجا صاحب سے شادی کے وقت ان کی عمر بائیس سال تھی۔وہ آٹھ سال کی ایک بچی کی ماں تھیں۔

باہر کے لوگ اس بات کو ''عجیب'' قرار دیتے تھے کہ ہر بیوی سے راجا صاحب کی ایک ہی اولاد ہوئی تھی۔مرحوم بیوی نے کنور احمد الیاس کو جنم دیا تھا۔دوسری بیوی سے کنور احمد ریاض تھا جس کی عمر اب پینتالیس سال تھی۔تیسری بیوی سے صرف ایک بیٹی پیدا ہوئی تھی جس کا نام عدیلہ تھا۔

مقررہ وقت پر سب کھانے کی میز پر پہنچ گئے۔راجا صاحب نے عادت کے مطابق سب پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی اور پھر کھانے میں مشغول ہونے کے بعد کسی سوچ میں ڈوبے رہے۔

کنور الیاس کے جوان العمر بیٹے شاہ زیب نے کھانے کے دوران میں کئی مرتبہ کنور ریاض کی خوبصورت اور اکلوتی بیٹی نرگس پر اچٹتی سی نظر ڈالی اور نرگس نے بھی اسے چور نگاہوں سے دیکھا۔یہ بات کسی اور کی نظر میں آئی ہو، یا نہ آئی ہو، شاہ زیب کی بہن الماس اس سے بے خبر نہیں رہی۔کچھ دنوں سے وہ ان دونوں پر نظر رکھنے لگی تھی۔دراصل اسے شبہ ہو گیا تھا کہ ان دونوں میں کوئی خفیہ رابطہ تھا۔وہ خفیہ رابطہ ''محبت'' بھی ہوسکتی تھی۔

الماس سوچا کرتی تھی کہ وہ ''محبت'' ہی ہے تو شاید صرف نرگس کو ہو۔اسے اپنے بھائی شاہ زیب کی نیت پر شبہ تھا۔وہ جانتی تھی کہ شاہ زیب دل پھینک واقع ہوا تھا، کالج کی کئی لڑکیوں سے فلرٹ کر چکا تھا۔الماس کی دانست میں اس کے امکانات کم تھے کہ وہ نرگس کے معاملے میں سنجیدہ ہو۔

جب سے الماس کو یہ بات معلوم ہوئی تھی کہ راجا صاحب نے رات کے کھانے کے بعد سب کو گھریلو ڈرائنگ روم میں طلب کیا تھا، وہ مسلسل سوچتی رہی تھی کہ شاید دادا جی کو ان دونوں کے بارے میں کچھ علم ہو گیا ہے اور وہ انہی کے بارے میں کوئی فیصلہ صادر کرنے والے ہیں۔

گھر کے سبھی لوگوں کا خیال تھا کہ راجا صاحب گوشہ گیر ہو جانے کے باوجود گھر کے کسی معاملے سے بھی بے خبر نہیں رہتے۔گھر میں کوئی پتا بھی کھڑکتا تھا تو اس کی آواز ان کے کانوں تک پہنچ جاتی تھی اور پیغام رسانی کا وہ فرض کاکا خلیل کی طرف سے ادا کیا جاتا تھا۔

کاکا خلیل کی حیثیت گھر کے ایک فرد کی سی تھی۔کھانے کی میز پر بھی وہ سب کے ساتھ ہوا کرتا تھا۔راجا صاحب کے برابر کی ایک کرسی اس کے لیے مخصوص تھی۔

الماس سوچتی رہی تھی کہ شاید دادا جی، شاہ زیب اور نرگس کے معاملے سے واقف ہو گئے ہوں، اور اس سے پہلے کہ اس معاملے میں کوئی گل کھل جاتا، وہ ان دونوں کی شادی کا فیصلہ سنا دینا چاہتے ہوں۔

وہ فیصلہ صرف کنور الیاس اور کنور ریاض کو بھی سنایا جاسکتا تھا لیکن راجا صاحب اس بات کے قائل تھے کہ گھر کے معمولات میں کسی بھی قسم کی تبدیلی گھر کے سبھی لوگوں کے علم میں آنا چاہیے۔

کھانے کے بعد سب لوگ مخصوص ڈرائنگ روم میں جمع ہو گئے۔جمع کیا ہو گئے، کھانے کے بعد سب نے رخ ہی ادھر کا کیا تھا۔ان سب کے فوراً بعد راجا صاحب بھی پہنچ گئے۔

اس اجتماع کے موقع پر کاکا خلیل وہاں موجود نہیں تھا۔

راجا صاحب نے ذرا بھی توقف کیے بغیر بولنا شروع کردیا۔''اگر کوئی عام سی بات ہوتی تو وہ میں تم لوگوں کو کھانے کی میز پر ہی بتا دیتا لیکن جو کچھ مجھے کہنا ہے، اس سے

تم لوگوں کے دماغ الجھ جائیں گے۔ یہ ایک مجبوری ہے کہ میں فی الحال تم سب کی وہ الجھن رفع بھی نہیں کرسکتا۔ اس الجھن کی وجہ سے تم لوگ کھانا بھی ٹھیک سے نہیں کھا پاتے۔''

مگر اب بھی کسی نے کھانا ٹھیک سے نہیں کھایا تھا۔ سب کے دماغ تو اسی وقت سے الجھے ہوئے رہے تھے جب سے انہیں اس اجتماع کی ہدایت ملی تھی۔

راجا صاحب کی اس تمہید سے الماس سمجھ گئی کہ بات نرگس اور شاہ زیب کے بارے میں نہیں ہوگی۔

''دادا جی کوئی بہت ہی چونکا دینے والی بات کرنے والے ہیں۔'' الماس سوچنے لگی تھی۔

راجا صاحب کی تمہید ختم ہوتے ہی ان کا خاص ملازم بخشو، حقہ لے کر آگیا۔ راجا صاحب کی تمبا کو نوشی صرف حقے تک محدود تھی۔ جب وہ گھر سے باہر ہوتے تھے تو کچھ نہیں پیتے تھے۔ سگریٹ، سگار، پائپ، کچھ بھی انہیں پسند نہیں تھا۔

بخشو کے جانے کے بعد راجا صاحب نے حقے کے دو گہرے کش لیے، پھر سب پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے بولے۔ ''کل ایک لڑکی یہاں آئے گی۔''

ان کی بات مکمل ہونے سے پہلے صرف اسی ایک جملے نے سبھی کے دماغوں پر سوالات کی یلغار کر دی ہوگی لیکن کوئی سوال، بے اختیارانہ بھی کسی کی زبان پر نہیں آسکا۔ راجا صاحب کی بات پوری ہونے سے پہلے کبھی کوئی بولنے کی ہمت نہیں کرسکتا تھا۔

راجا صاحب نے حقے کا ایک کش لے کر کہا۔ ''کل کاکا خلیل جائیں گے اور اسے لے آئیں گے۔ اس کا نام فریحہ ہے۔ عمر اس کی'' انہوں نے شاہ زیب، نرگس اور الماس کی طرف دیکھا۔ ''تمہی تینوں کی سی ہے۔ تم تینوں کی عمروں میں بہت کم فرق ہے، اسی لیے تم تینوں ایک دوسرے کو نام لے کر مخاطب کرتے ہو۔ اسے بھی تم لوگ اس کا نام لے کر مخاطب کیا کرنا۔ میں ایک بات خاص طور سے کہنا چاہتا ہوں۔ اس گھر میں اس کی حیثیت اس گھر کے ایک فرد کی سی ہوگی۔ اسے کسی بھی اعتبار سے کم تر نہ سمجھا جائے۔'' رک کر اس مرتبہ انہوں نے سبھی پر طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''میں نے بات بہت سادگی سے کی ہے۔ یقیناً تم لوگوں نے سمجھ لیا ہوگا؟''

راجا صاحب کا جملہ تو نہیں مگر لہجہ سوالیہ تھا۔

جواب میں سب نے ''جی ہاں'' یا صرف ''جی'' کہا۔

''بس۔'' راجا صاحب بولے۔ ''فریحہ کے بارے میں مجھے فی الحال اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنا۔'' حقے کا کش

موسیقی کا سبق

مقدمے کی سماعت کے سارے عرصے میں جج صاحب اپنے ذہن پر زور دیتے رہے کہ انہوں نے ملزم کو پہلے کہاں دیکھا ہے۔ جب سماعت مکمل ہوگئی اور صرف فیصلہ سنانا باقی رہ گیا تو وہ رہ نہ سکے اور ملزم سے پوچھ ہی لیا۔ ملزم نے کہا۔ ''جناب میں آپ کی بیگم صاحبہ کو موسیقی کا سبق دیا کرتا تھا۔''

''چودہ سال قید بامشقت'' جج نے فوراً فیصلہ سنا دیا۔

لے کر انہوں نے اپنے بڑے بیٹے کنور الیاس اور اس کی بیوی کی طرف دیکھا۔ ''تم دونوں نے جشن منانے کی تیاری کی؟''

کنور الیاس کے چہرے پر الجھن کا تاثر ابھرا، لیکن بیگم الیاس نے الجھن میں مبتلا رہنے کے بجائے سوال کر ڈالا۔ ''کس سلسلے میں راج با!''

راجا صاحب کے دونوں بیٹے ''راج با'' کہتے تھے اس لیے ان کی بیویاں بھی یہی کہنے لگی تھیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ بڑی رانی نے دو سال کے کنور الیاس کے منہ سے ''راجا ابا'' کہلوانے کی کوشش کی تھی تو وہ بہ مشکل صرف ''راج با'' کہہ سکا تھا۔ راجا صاحب کو اپنے ننھے بیٹے کے منہ سے یہ کہنا اچھا لگا تھا لہٰذا بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ کنور الیاس کی یہ عادت پختہ ہوتی چلی گئی اور جب کنور ریاض پیدا ہوا تو اس سے بھی ''راج با'' کہلوایا گیا۔ پھر جب ان کی شادیاں ہوئیں تو ان کی بیویوں نے بھی یہ انوکھا سا اندازِ مخاطب اپنا لیا۔

راجا صاحب نے بیگم الیاس کی طرف دیکھا۔ ''حد ہے۔'' وہ سپاٹ لہجے میں بولے۔ ''اگلے ہفتے تمہارا بیٹا اپنی تعلیم مکمل کر کے لندن سے آرہا ہے۔ کیا وہ خوشی کا موقع نہیں ہے؟ کیا اس موقع پر گھر میں جشن نہیں ہونا چاہیے؟''

''میں نے تو کہا تھا الیاس سے۔'' بڑی رانی بول پڑیں۔

راجا صاحب کی پیشانی پر ایک شکن پڑ گئی۔ انہوں نے کنور الیاس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم نے یہ بات ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اڑا دی!''

''جی ... وہ... دراصل...'' کنور الیاس بوکھلاہٹ

میں صحیح طور پر کچھ نہیں کہہ سکا۔
راجا صاحب یکا یک اس طرح اٹھے جیسے جھنجلا گئے ہوں لیکن اپنی جھنجلاہٹ کا اظہار نہ کرنا چاہتے ہوں۔ وہ تیزی سے چلتے ہوئے ڈرائنگ روم سے نکل گئے۔
دراصل راجا صاحب اپنے پوتے شاہ زیب کی بہ نسبت اس کے بڑے بھائی اورنگ زیب کو زیادہ چاہتے تھے جس کا ایک اہم سبب یہ تھا کہ اورنگ زیب کو زیادہ سے زیادہ تعلیم حاصل کرنے کی خواہش تھی۔ اسے لندن بھی اسی لیے بھیجا گیا تھا۔ اس کے برخلاف شاہ زیب کو پڑھنے سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ وہ بی اے کے آخری سال تک بھی مشکل سے پہنچ سکا تھا۔
راجا صاحب کے جانے کے بعد آٹھ سالہ عدیلہ کے علاوہ سبھی کے دماغوں میں یہ سوال چکرا رہا تھا کہ ان کے گھر میں آکر رہنے والی لڑکی فریحہ کون ہے، لیکن اس موضوع پر انہوں نے اس وقت ایک دوسرے سے کوئی بات نہیں کی۔ سبھی کو یہ ڈر تھا کہ منہ سے نہ جانے کیا بات نکل جائے اور وہ راجا صاحب کے کانوں تک پہنچے تو انہیں بری لگے۔
تھوڑی دیر بعد الماس کوٹھی کے سامنے کے حصے میں بنے ہوئے لان میں احاطے کی چار دیواری پر منڈھی چنبیلی کی بیل کے قریب گھاس پر لیٹی ہوئی تھی۔ کوٹھی کے عقب میں بھی لان تھا لیکن وہاں چنبیلی کی بیل نہیں تھی جس کی خوشبو الماس کو بہت پسند تھی۔
چنبیلی کی خوشبو سے مہکتی ہوا میں سانس لیتے ہوئے الماس وہاں رات کے کھانے کے بعد کچھ وقت ضرور گزار کر اپنی خواب گاہ کا رخ کرتی تھی۔
گھاس پر لیٹے لیٹے بھی وہ اسی سوال میں الجھی رہی کہ اس گھر کی فرد بن کر آنے والی فریحہ کون ہوسکتی ہے؟
اس سوال کے ساتھ وہ خیالات بھی اس کے دماغ میں بسے رہے جن کا تعلق اس کے بھائی شاہ زیب اور اس کے چچا کنور ریاض کی بیٹی نرگس سے تھا۔ الماس کو تشویش تھی کہ اس کا بھائی گھر میں ہی کوئی گل نہ کھلا دے، کالج میں تو وہ فلرٹ کرتا ہی رہا تھا۔
الماس کو اندازہ نہیں تھا کہ نرگس اس معاملے میں کس حد تک سنجیدہ تھی! اس کے لیے یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ وہ اس بارے میں نرگس سے پوچھتی۔ گھر میں وہ تین نوجوان ہستیاں ایک دوسرے سے بے تکلف تو تھیں لیکن راجا مظفر حسین کی ہدایات کے مطابق اس بے تکلفی کی بھی ایک حد مقرر تھی۔ راجا صاحب کا حکم تھا کہ کسی کو کسی کے نجی معاملات میں دخل اندازی نہیں کرنا چاہیے، تاوقتیکہ یہ ثابت نہ ہوجائے کہ وہ معاملہ اخلاق کی قیود کو توڑ رہا ہے۔
الماس ابھی نہیں جانتی تھی کہ شاہ زیب اور نرگس کا معاملہ اخلاق کی حدود میں ہے یا اس سے تجاوز کرگیا ہے، یا امکان ہے کہ متجاوز ہوجائے!
اگر واقعی وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے ہوں اور نرگس کے معاملے میں شاہ زیب کی سوچ مثبت ہو تو پھر اس میں اخلاق پر کوئی زد نہیں پڑتی تھی۔ محبت کے جذبۂ بے اختیار کو غیر اخلاقی نہیں کہا جاسکتا تھا۔ خود الماس ایک نوجوان نبیل کو پسند کرتی تھی۔
نبیل کا تعلق ایک متوسط گھرانے سے تھا۔ اس سے الماس کی ملاقات دو سال پہلے ایک تقریری مقابلے میں ہوئی تھی جو شہر کے تمام کالجوں کے درمیان ہوا تھا۔ الماس نے اس میں اپنے کالج کی نمائندگی کی تھی اور اس مقابلے میں سیکنڈ آئی تھی۔ فرسٹ آنے والے نبیل کا تعلق دوسرے کالج سے تھا۔ تقریریں معاشرے کے حوالے سے کی گئی تھیں۔ نبیل کی تقریر بھی بہت زہریلی تھی۔ معاشرتی ''تقسیم'' پر اس نے بڑے سفاکانہ انداز میں نشتر چلائے تھے۔ اس کی تقریر سے الماس کے علاوہ دوسرے لوگوں نے بھی اندازہ لگایا ہوگا کہ متوسط طبقے کا یہ نوجوان شدید فرسٹریشن کا شکار تھا، معاشرے کی طرف سے نہایت مایوس اور دل شکستہ!
مقابلے کی اس تقریب میں الماس اور نبیل کا تعارف ہوگیا تھا۔ الماس بعد میں بھی اس سے ملتی رہی۔ وہ حوصلہ مندانہ الفاظ سے نبیل کا فرسٹریشن ختم کرنا چاہتی تھی۔ وہ ایسا کیوں کرنا چاہتی تھی؟ اسے یہ اندازہ کچھ عرصے بعد ہوسکا۔ کیونکہ وہ نبیل کو پسند کرنے لگی تھی۔ اس نے اشاروں کنایوں میں اپنے جذبات کا اظہار بھی کردیا۔ جواب میں نبیل نے بھی علامتی الفاظ استعمال کیے اور الماس کو مشورہ دیا کہ وہ اپنا دھیان بٹانے کی کوشش کرے تو یہ اس کے حق میں بہتر ہوگا۔ اس نے مبہم پیرائے میں یہ بھی بتایا کہ وہ بھی کسی لڑکی کو پسند کرتا ہے اور اسے اپنانے کی خواہش کو اس لیے کچلتا رہتا ہے کہ اس کے مقدر کا گہن اس لڑکی کے مقدر پر نہ پڑے۔
یہ جاننے کے باوجود کہ نبیل کسی اور لڑکی کو پسند کرتا ہے، الماس نے اس سے تعلقات قائم رکھے تھے۔ آئے دن تو نہیں مگر کبھی کبھی ان کی ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔ الماس نے

اسے ''صرف ایک اچھا دوست'' کے طور پر قبول کر لیا تھا۔ اس کی کوشش یہی رہی کہ نبیل کا فرسٹریشن دور کر سکے۔

ہفتہ بھر پہلے نبیل سے اس کی ملاقات کچھ زیادہ وقفے سے ہوئی تھی۔ اس ملاقات میں الماس حیران بھی ہوئی اور خوش بھی! نبیل اوسط درجے کے لباس کے بجائے قیمتی سوٹ میں ملبوس تھا اور اس کے پاس چمکتی ہوئی نئی کار بھی تھی۔

''قسمت اچانک مہربان ہو گئی ہے۔'' الماس کے استفسار پر نبیل نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

''ایسا ہوتا ہے نبیل! بزرگ کہتے ہیں نا! ایک خاص عرصہ گزر جانے کے بعد گھورے کے دن بھی پھر جاتے ہیں۔''

نبیل نے یہ بتانے سے گریز کیا کہ قسمت اس پر کس طرح مہربان ہوئی تھی اور الماس نے بھی یہ جاننے کے لیے اصرار نہیں کیا تھا لیکن اس کے بعد وہ سوچتی ضرور رہی تھی۔ اس خیال نے اسے پریشان بھی کیا تھا کہ نبیل کسی غلط راہ پر تو نہیں نکل گیا ہو؟

☆☆☆

''سچ بتاؤ نبیل! تم نے کوئی غیر قانونی پیشہ تو اختیار نہیں کیا ہے؟'' فریحہ نے پوچھا۔

وہ نبیل کا چھوٹا سا لیکن آراستہ فلیٹ تھا جس میں اس رات نبیل اور فریحہ ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔

''میں تم سے کہہ چکا ہوں فریحہ کہ تم مجھ سے یہ سوال نہ کیا کرو۔'' نبیل نے سنجیدگی سے کہا۔ ''اگر میں نفی میں جواب دوں گا تو تم یقین نہیں کرو گی اور اثباتی جواب سے تمہیں نہ صرف افسوس ہوگا بلکہ تم پند و نصائح کی تقریر بھی شروع کر دو گی۔'' وہ مسکرایا۔ ''میری ایک دوست کی تقریریں پہلے ہی میرے دماغ کو بہت گرما چکی ہیں۔ کوئی اور بات کرو۔''

''اب اور باتیں کیا کروں!'' فریحہ نے کہا۔ ''یہ بات تو میں تم سے چلتے چلتے پوچھ بیٹھی۔ جو کچھ میں کہنے آئی تھی، وہ سب کچھ پہلے ہی کہہ دیا تھا۔''

''اور وہ سب کچھ سن کر میں بہت خوش ہوا ہوں فریحہ!'' نبیل نے کہا۔ ''اب تم زندگی کے ایک نئے دور میں قدم رکھوگی۔ میرے لیے وہ سب کچھ بہت خوش کن تھا جو تم نے مجھے بتایا۔''

''لیکن میں ذرا الجھی ہوئی ہوں۔ ذرا بھی اندازہ نہیں ہے کہ اب میں تم سے اتنا مل سکوں گی یا نہیں جتنا اب تک ملتی رہی ہوں۔''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے فریحہ!'' نبیل نے سنجیدگی سے کہا۔ ''مجھ سے تمہیں جو قلبی تعلق ہے، کیا وہ ختم ہو جائے گا؟ کم ہو جائے گا؟''

''نہ کم ہوگا، نہ ختم ہوگا لیکن میں بے چین تو رہنے لگوں گی اور'' فریحہ نے نبیل کو گھورا۔ ''تم اب بھی نہیں مانو گے لیکن مجھے یقین ہے کہ بے چین تو تم بھی رہو گے۔ میں جانتی ہوں کہ جتنی محبت مجھے تم سے ہے، اتنی ہی محبت تمہیں بھی مجھ سے ہے جس کا تم اظہار نہیں کرتے۔ پہلے تو تمہارا خیال یہ تھا کہ تمہارے مقدر کا گہن میرے مقدر پر بھی پڑ جائے گا لیکن اب تو تمہارے حالات بدل چکے ہیں۔ تم اس فلیٹ کے مالک ہو۔ تمہارے پاس کار بھی ہے۔ یقیناً کچھ بینک بیلنس بھی ہوگا۔ اب تو تمہیں معاشرے سے بھی کوئی گلہ نہیں ہونا چاہیے۔''

''گلہ تو مجھے اب بھی ہے فریحہ!'' نبیل کا لہجہ بہت گمبھیر تھا۔

''کیوں؟ اب کیوں؟'' فریحہ نے کہتے ہوئے اپنی گھڑی پر نظر ڈالی۔

''تمہیں دیر ہو رہی ہے فریحہ!'' نبیل نے اس کی بات ٹالتے ہوئے کہا۔ ''دس بج چکے ہیں۔ اب تمہیں جانا چاہیے۔''

فریحہ نے ٹھنڈی سانس لی اور کھڑی ہوگئی۔ چلتے چلتے اس نے کہا۔ ''موبائل پر تم سے رابطہ بہر حال رہا کرے گا۔''

نبیل بھی اس کے ساتھ اٹھا اور اسے چھوڑنے کے لیے اپنا فلیٹ بند کر کے عمارت کے نیچے تک آیا جہاں فریحہ کی ایک چھوٹی سی کار کھڑی تھی۔

فریحہ نے اس کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر انجن اسٹارٹ کرنے کے بعد نبیل کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی تھی۔

نبیل ہنس کر بولا۔ ''اس طرح پلکیں خراب ہو جاتی ہیں۔ بہت گھنیری پلکیں ہیں تمہاری! ان کا خیال رکھو۔''

''خدا حافظ۔'' فریحہ نے کچھ بھرّائی سی آواز میں کہا اور جھٹکے سے کار آگے بڑھا دی۔

نبیل کا چہرہ فوراً بے حد سنجیدہ ہو گیا۔ اس کی نظریں دور جاتی ہوئی فریحہ کی کار پر جمی رہیں۔ جب کار نظروں سے اوجھل ہوئی تو وہ آہ بھرنے کے سے انداز میں ٹھنڈی سانس لے کر اپنے فلیٹ میں واپس جانے کے لیے مڑا۔

بلڈنگ میں لفٹ بھی تھی لیکن نبیل عموماً زینے ہی استعمال کیا کرتا تھا۔ اس وقت زینے طے کرتے ہوئے اس نے خود محسوس کیا کہ اس کے قدم بڑے بوجھل انداز میں اٹھ رہے تھے۔

''معاشرے سے گلہ۔''

یہ عنوان نبیل کو اب بھی دل برداشتہ رکھتا تھا۔ اپنی فرسٹریشن ہی کی وجہ سے اس نے دنیاوی آسائشات حاصل کرنے کے لیے اپنی زندگی کی راہ بدلی تھی اور ایک پیشہ ور قاتل بن گیا تھا۔

☆☆☆

''راجا انڈسٹریز'' کے مالک راجا مظفر حسین خان ہی تھے لیکن سارا کاروبار سنبھالنے کی ذمے داری انہوں نے اپنے دونوں بیٹوں کنور الیاس اور کنور ریاض کو سونپ دی تھی۔ انہوں نے بس ایک مرتبہ بہت بڑا سرمایہ لگایا تھا جس کے بعد انڈسٹریز کی ترقی دونوں بھائیوں کی محنت کا نتیجہ تھی جس کا فائدہ بھی وہی اٹھاتے تھے۔ راجا صاحب کو اس فائدے میں سے بھی ایک پائی بھی مطلوب نہیں رہی تھی۔ انہوں نے ان دونوں سے کبھی پوچھا بھی نہیں تھا کہ ان کے لگائے ہوئے سرمائے سے وہ کتنا فائدہ حاصل کر چکے تھے اور اب کتنا فائدہ حاصل کر رہے تھے۔

راجا صاحب کی وہ ''بے خبری'' درحقیقت بے خبری نہیں تھی، جس کا اندازہ سب کو تھا۔ راجا صاحب سب کچھ جانتے تھے، بس ان کی زبان پر کبھی کچھ نہیں آیا تھا۔ ان کے علم میں یہ بات بھی تھی کہ سال بھر سے دونوں بھائیوں کے تعلقات میں قدرے کشیدگی آ گئی تھی جس کا سبب مالی معاملات تھے مگر ان دونوں میں سے کسی میں بھی اتنی ہمت نہیں تھی کہ اپنے موقف کو راجا صاحب کے سامنے پیش کر سکتا۔ یہ اور بات ہے کہ راجا صاحب اس سے بھی بے خبر

نہیں تھے۔ انہوں نے بس دخل اندازی ضروری نہیں سمجھی تھی۔ شاید انہیں خیال ہو کہ دونوں بھائی خود ہی اپنے معاملات کو سلجھالیں گے۔

گھر میں دونوں بھائیوں کی کوشش ہوتی تھی کہ ان کی کشیدگی کوئی اور محسوس نہ کر سکے لیکن دونوں کی بیگمات بہرحال اس سے واقف تھیں۔ اس کی جھلک کسی طرح الماس کے کانوں میں پڑ گئی تھی جس نے اسے کچھ پژمردہ کیا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ گھر کا ماحول ظاہری طور پر نہیں بلکہ درحقیقت خوش گوار رہے۔ اس نے یہ بات اپنے بھائی شاہ زیب کو بھی اس لیے نہیں بتائی تھی کہ بات جتنی پھیلتی، گھر کے ماحول پر اس کا اتنا ہی زیادہ اثر پڑتا۔ اس کے خیال کے مطابق بڑی رانی، چھوٹی رانی اور نرگس کو دونوں بھائیوں کے اختلافات کا علم نہیں ہوسکا تھا۔ رہا کا کا خلیل تو الماس کا خیال تھا کہ وہ ضرور باخبر ہوگا۔ گھر میں راجا صاحب سے بہت زیادہ قریب کا کا خلیل ہی تھا۔

دوسرے دن کا کا خلیل ہی فریحہ کو لے کر آیا۔

ہلکی ہلکی سردی پڑنے لگی تھی۔ الماس لان میں ٹہلتے ہوئے دھوپ سے خود کو سینک رہی تھی جب اس نے ایک نئی اور قیمتی کار پھاٹک سے اندر آتے دیکھی۔ کار کی نمبر پلیٹ نہیں تھی۔ پلیٹ کی جگہ لگے ہوئے کارڈ پر تحریر تھا کہ رجسٹریشن کے لیے درخواست دی جاچکی ہے۔

گویا اس کوٹھی میں رہنے والوں کی دس کاروں میں گیارہویں کار کا اضافہ ہوگیا تھا۔ وہ کاریں کھڑی کرنے کے لیے چار گیراج تھے۔ ایک گیراج میں تین کاریں کھڑی کی جاسکتی تھیں۔ ان کی دیکھ بھال اور انہیں چلانے کے لیے شوفر بھی ملازم تھے۔

کوٹھی میں داخل ہونے والی نئی کار وہ شوفر چلا رہا تھا جو راجا صاحب نے اپنے لیے مخصوص کرلیا تھا۔ فریحہ کار کی پچھلی نشست پر بیٹھی تھی۔ کا کا خلیل شوفر کے برابر کی نشست پر بیٹھا تھا۔

الماس دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی ہوئی برآمدے کی طرف بڑھی۔ کار کا رخ بھی برآمدے کی طرف تھا۔ جب وہ برآمدے کے سامنے آکر رکی تو الماس بھی وہاں پہنچ چکی تھی۔

فریحہ خود ہی دروازہ کھول کر کار سے اتری۔ الماس کے خیال کے مطابق کا کا خلیل کے ساتھ اس وقت آنے والی لڑکی فریحہ ہی ہوسکتی تھی۔ اس کے خیال کی تصدیق فوراً ہی ہوگئی۔ فریحہ نے مسکراتے ہوئے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''فریحہ نام ہے میرا۔ نانا نے۔'' وہ ایک دم رکی، پھر جلدی سے بولی۔ ''کا کا صاحب نے آپ کو بتا ہی دیا ہوگا۔ ابھی گاڑی ہی میں انہوں نے آپ کی طرف اشارہ کرکے مجھے بتایا تھا کہ آپ الماس ہیں۔''

فریحہ کی بات بعد میں مکمل ہوئی۔ الماس کے دماغ کو شروع ہی میں ہلکا سا دھچکا لگ گیا تھا۔ فریحہ ابتدا میں بے اختیار ''نانا'' کہہ گئی تھی، کا کا صاحب بعد میں کہا تھا۔

''آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔'' الماس نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ اس وقت اس کے دماغ میں ہلچل مچ چکی تھی۔ فریحہ نے کا کا خلیل کو پہلے ''نانا'' کہا تھا۔ گویا وہ کا کا خلیل کی نواسی تھی۔

کا کا خلیل کے اشارے پر دو ملازم قریب آگئے تھے۔ وہ ڈکی کھولنے لگے۔ فریحہ اس طرف متوجہ ہوگئی تھی۔

دماغ میں ہلچل کے ساتھ ساتھ الماس کو یہ خیال بھی آرہا تھا کہ وہ فریحہ کو پہلے بھی کہیں دیکھ چکی تھی۔

ڈکی سے ملازمین نے دو سوٹ کیس نکال لیے تھے۔ کا کا خلیل نے ان سے کہا۔ ''یہ اسی کمرے میں پہنچا دو جو تم لوگوں نے آج ٹھیک کیا ہے۔''

یہ الماس کے علم میں نہیں تھا کہ فریحہ کے لیے کوٹھی میں کون سا کمرا ٹھیک کروایا گیا تھا۔ فریحہ پھر الماس کی طرف متوجہ ہوئی اور بولی۔ ''آپ سے میری بہت اچھی بنے گی۔ کا کا صاحب مجھے گھر کے سب افراد کے بارے میں بہت تفصیل سے بتا چکے ہیں۔''

''فریحہ بی بی!'' کا کا خلیل بول پڑا۔ ''باتیں تو کرتی رہنا۔ پہلے سلام کرنے کے لیے راجا صاحب کے پاس چلو۔''

''جی کا کا!'' فریحہ نے کہا، پھر الماس سے بولی۔ ''آپ سے جلد ہی ملاقات ہوگی۔''

جواب میں الماس نے صرف مسکرانا اور سر کی خفیف سی جنبش کافی سمجھی۔ کا کا خلیل اور فریحہ چلے گئے۔ الماس وہیں کھڑی سوچ میں ڈوبی رہی۔ کیونکہ فریحہ راجا صاحب کو سلام کرنے گئی تھی اس لیے الماس کے تصور میں راجا صاحب کا خاکہ ابھر آیا تھا۔ وہ خاکہ جو ذہن میں ابھرا تو الماس چونک سی گئی۔ راجا صاحب کی بڑی بڑی آنکھوں اور ستواں ناک کی شباہت الماس نے فریحہ کے چہرے پر محسوس کی تھی۔ فوراً اس کے تصور میں راجا صاحب کی جوانی کی تصویر ابھری جو ڈرائنگ روم میں لگی ہوئی تھی۔ اس تصویر کی وجہ سے الماس کو محسوس ہوا کہ فریحہ راجا صاحب سے کافی حد تک مشابہ تھی۔ اس احساس سے الماس کا جسم سنسنا اٹھا۔ اس کے دماغ میں

آنے والا پہلا خیال یہ تھا کہ راجا صاحب نے سب سے چھپ کر شاید ایک شادی اور بھی کی ہوگی اور فریحہ غالباً اسی شادی کا ثمر ہے۔ الماس کو یہ خیال بھی آیا کہ وہ لڑکی غالباً کاکا خلیل کی بیٹی ہوگی، اسی لیے فریحہ کے منہ سے کاکا خلیل کے لیے نانا کا لفظ نکل گیا تھا۔

ان خیالات نے الماس کے جسم میں ہیجان پیدا کردیا۔

''ہیلو!'' کوٹھی سے نرگس نکلی تھی اور الماس کی طرف بڑھی تھی۔ ''کس سوچ میں ڈوبی کھڑی ہو؟'' پھر اس نے کار پر نظر ڈالتے ہوئے پوچھا۔ ''یہ نئی کار کس کے لیے خریدی گئی ہے؟''

''فریحہ کے لیے۔'' الماس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''ابھی وہ اسی کار میں آئی ہے اس لیے میرا خیال ہے کہ یہ اسی کے لیے خریدی گئی ہوگی۔''

نرگس چونک پڑی تھی۔ ''فریحہ آگئی؟''

''ہاں۔'' الماس نے جواب دیا۔ ''ابھی کاکا جی کے ساتھ آئی ہے۔ راج دا کو سلام کرنے گئی ہے۔''

راجا صاحب کے پوتے پوتیوں کو راج دادا کے بجائے راج دا کہنے کی عادت پڑ گئی تھی۔ وہ پوتے پوتیاں اس دن کالج بھی اسی لیے نہیں گئے کہ انہیں فریحہ کو دیکھنے کا اشتیاق تھا۔ کنور الیاس اور کنور ریاض اپنے دفتر جاچکے تھے۔ فریحہ کے معاملے میں تجسس انہیں بھی ہوگا لیکن دفتر جانا ان کے لیے ضروری تھا۔

''میں جاکے شاہ زیب کو بتادوں!'' نرگس نے بے چینی سے کہا اور الماس سے کچھ سنے بغیر تیزی سے کوٹھی میں واپس جانے لگی۔ الماس اسے جاتے دیکھتی رہی۔ اسے شاہ زیب اور نرگس کا معاملہ ہمہ وقت تشویش میں مبتلا رکھتا تھا۔

☆☆☆

راجا صاحب کے کمرے میں فریحہ نے خاصا وقت گزارا تھا۔

شاہ زیب، نرگس اور الماس ڈرائنگ روم میں بیٹھے فریحہ کا انتظار کررہے تھے۔ انہیں کسی ملازم سے معلوم ہوگیا تھا کہ بڑی رانی اور چھوٹی رانی بھی اس وقت راجا صاحب کے کمرے میں تھیں۔ انہیں خاص طور سے بلوایا گیا تھا۔ عام طور پر وہ راجا صاحب کے کمرے میں نہیں جاتی تھیں۔ خود راجا صاحب ان کے کمروں میں چلے جایا کرتے تھے۔

''کیسی ہے وہ؟'' شاہ زیب نے الماس کی طرف دیکھتے ہوئے بے تابی سے پوچھا۔

''اچھی ہے، خوبصورت ہے۔'' الماس نے بس اتنا ہی جواب دیا، فریحہ کے بارے میں اپنے اس خیال کا اظہار نہیں کیا جس پر وہ مسلسل سوچ رہی تھی۔ اس کا خیال درست ثابت ہونے کی صورت میں کنور ریاض اور کنور الیاس فریحہ کے سوتیلے بھائی ہوتے۔

کاکا خلیل ڈرائنگ روم کے سامنے سے گزرتا نظر آیا تو شاہ زیب اسے پکارتا ہوا دروازے کی طرف لپکا۔ کاکا خلیل رک گیا۔

''کیا بات ہے شاہ زیب میاں؟'' اس نے مسکرا کر شفقت آمیز لہجے میں پوچھا۔

''فریحہ ابھی تک راج داہی کے پاس ہے؟''

''جی ہاں۔'' کاکا خلیل نے جواب دیا۔ ''بڑی رانی اور چھوٹی رانی بھی وہیں ہیں۔''

''وہ تو ہمیں معلوم ہوگیا تھا۔'' شاہ زیب نے کہا۔

''اور کیا معلوم کرنا چاہتے ہو؟''

''ہم تینوں تو اس سے ملنے کے لیے بیٹھے ہوئے ہیں۔''

''تھوڑی دیر میں کھانے کا وقت ہوجائے گا۔'' کاکا خلیل نے کہا۔ ''تم لوگ فریحہ سے غالباً کھانے کی میز پر ہی مل سکو گے۔''

کاکا خلیل کا یہ جواب بالکل درست ثابت ہوا۔ کھانے کی میز پر راجا صاحب اور فریحہ ساتھ ساتھ ہی آئے۔

بہت عرصے بعد گھر والوں نے راجا صاحب کو کھانے کی میز پر بولتے دیکھا۔ وہ گھر والوں اور فریحہ کو ایک دوسرے سے متعارف کرا رہے تھے۔ الماس کو یقین تھا کہ راجا صاحب سے فریحہ کی مشابہت نے سبھی کو چونکایا ہوگا لیکن کسی میں ہمت نہیں تھی کہ راجا صاحب کے سامنے اس خیال کا اظہار کرسکتے۔ عدیلہ اسکول سے آچکی تھی اس لیے کھانے کی میز پر وہ بھی موجود تھی اور کھانا کھاتے کھاتے رک کر فریحہ کو غور سے دیکھنے لگتی تھی۔ الماس نے یہ محسوس کیا تو سوچنے لگی، کیا اس معصوم بچی نے بھی راجا صاحب سے فریحہ کی مشابہت محسوس کرلی تھی؟

تعارف کے بعد کھانا خاموشی سے کھایا جارہا تھا کہ موبائل کی گھنٹی کی آواز نے سب کو چونکادیا۔ نظریں فریحہ کی طرف اٹھ گئیں جو اپنا موبائل نکال رہی تھی۔

راجا صاحب نے تیکھی نظروں سے کاکا خلیل کی طرف دیکھا۔

فریحہ نے جلدی سے موبائل ''آف'' کردیا تھا۔ کاکا

خلیل نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ''میں نے تم سے کہہ دیا تھا کہ کھانے کی میز پر موبائل اپنے ساتھ نہ رکھو یا اسے بند کر دیا کرو۔''

''مجھے خیال نہیں رہا تھا کا کا جی!'' فریحہ نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا اور پھر راجا صاحب کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔ ''مجھے معاف کر دیجیے گا۔ آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔''

راجا صاحب سر جھکا کر کھانے میں مصروف ہو گئے۔

گھر کے باقی لوگ موبائل اپنے ساتھ کھانے کی میز پر لاتے ہی نہیں تھے۔ راجا صاحب کو کھانے کے دوران میں ہر قسم کی آواز گراں گزرتی تھی۔

کھانے کے بعد کمرے سے نکلتے ہوئے شاہ زیب بولا۔ ''ہمارے ساتھ آؤ فریحہ! ذرا گپ شپ کریں گے۔''

''ضرور۔'' فریحہ مسکرائی اور پھر اس نے بڑی بے تکلفی سے نرگس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''تم اور الماس مجھے بہت پیاری لگی ہو۔''

شاہ زیب نے منہ بنایا۔ ''اور میں شاید کسی گنتی میں نہیں ہوں۔''

فریحہ ہنسنے لگی۔ ''ایسی کوئی بات نہیں شاہ زیب! دراصل لڑکیوں کا لڑکوں سے یہ جملہ کہنا مناسب نہیں ہوتا۔''

''شاہ زیب کو لڑکیوں سے یہ جملہ سننا بہت پسند ہے۔'' الماس کا لہجہ کچھ چبھتا ہوا سا تھا۔

شاہ زیب نے اسے گھور کر دیکھا۔ ''میری بہن ہو کر بھی تم میرا امیج خراب کر رہی ہو۔ نرگس کے منہ سے ایسی کوئی بات کبھی نہیں نکلی۔''

''ارے اب لڑو تو نہیں۔'' فریحہ نے گویا بیچ بچاؤ کیا اور پھر شاہ زیب کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔ ''میری نظر میں تمہارا امیج ذرا بھی خراب نہیں ہوا ہے۔ یہ بس تہذیب کا تقاضا تھا کہ میں نے تم سے وہ بات نہیں کہی جو میں الماس اور نرگس سے کہہ سکتی ہوں۔''

''ورنہ میں بھی پیارا لگتا ہوں۔'' شاہ زیب نے شوخی سے کہا۔

فریحہ ہنس پڑی لیکن نرگس شاہ زیب کو گھورنے لگی۔

الماس سنجیدہ رہی۔ شاہ زیب کی یہ شوخی اس کے لیے غیر متوقع نہیں تھی تاہم اس نے یہ ضرور سوچا کہ راجا صاحب سے فریحہ کی مشابہت تو شاہ زیب نے بھی محسوس کی ہوگی۔ ایسی صورت میں اسے فریحہ سے اتنا بے تکلف ہونا نہیں چاہیے تھا۔

وہ تینوں گھریلو ڈرائنگ روم میں جا بیٹھے۔

''میں ذرا ایک میسج بھیج دوں۔'' فریحہ اپنا موبائل نکالتے ہوئے بولی۔

شاہ زیب پوچھ بیٹھا۔ ''جن کی کال آئی تھی؟''

''جی۔'' فریحہ کی انگلیاں موبائل پر متحرک تھیں۔

''تمہاری زبان مسلسل چل رہی ہے شاہ زیب!'' الماس نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

''بولنے دو انہیں الماس!'' فریحہ نے ہنس کر اس پر ایک نظر ڈالی اور میسج دوبارہ ٹائپ کرنے لگی۔

الماس نے محسوس کر لیا تھا کہ فریحہ سے شاہ زیب کا یہ شوخ انداز نرگس کو گراں گزر رہا تھا۔

فریحہ نے کسی کو مختصر سا میسج بھیج دیا۔

''الماس!'' وہ بولی۔ ''جب میں آئی تھی تو ہم کوٹھی کے باہر ہی مل گئے تھے۔ وہاں میں نے تمہیں آپ کہا تھا اور ابھی تم کہا ہے۔ دراصل مجھ کو ہدایت کی گئی تھی کہ تم تینوں ایک دوسرے سے گھلے ملے ہوئے ہو لہٰذا میں بھی تم تینوں سے بے تکلفانہ بات چیت کیا کروں۔''

''کس نے ہدایت کی تھی؟'' شاہ زیب پوچھ بیٹھا۔

''راجا صاحب نے۔'' فریحہ نے جواب دیا۔

الماس کو ذہنی جھٹکا لگا۔ فریحہ نے اس طرح جواب دیا تھا جیسے راجا صاحب سے اس کا کوئی رشتہ نہ ہو، یا پھر یہ بات چھپانے ہی کے لیے اسے یہ ہدایت کی گئی تھی کہ سب کے سامنے وہ انہیں راجا صاحب ہی کہا کرے۔

''تم نے ایک بات نوٹ کی نرگس؟'' شاہ زیب بولا۔

''کیا بات؟''

''فریحہ میں راج دا کی شباہت کافی ہے۔''

''ایسے اتفاقات ہوتے ہیں۔'' الماس بول پڑی۔

فریحہ مسکراتی رہی۔ اس کے چہرے پر کوئی ایسا تاثر نہیں ابھرا تھا جس سے کوئی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا۔ ان چاروں میں گپ شپ ہوتی رہی۔ فریحہ کے بارے میں اسی کی زبان سے یہ بات سامنے آئی کہ وہ میڈیکل کالج میں پڑھ رہی تھی اور یہ اس کا آخری سال تھا۔ اپنے بارے میں اس نے کوئی اور بات نہیں بتائی۔

گپ شپ جاری تھی کہ نرگس کسی کام کے بہانے سے اٹھ کر چلی گئی۔ الماس سمجھ گئی کہ اسے شاہ زیب کا فریحہ سے بے تکلفانہ اندازِ گفتگو گراں گزر رہا تھا۔ الماس کو خود بھی اپنے بھائی کے یہ تیور اچھے نہیں لگ رہے تھے اس لیے اس نے فریحہ کو وہاں سے اٹھا لے جانا ہی مناسب سمجھا۔

''چلو میں تمہیں کوٹھی دکھاؤں۔'' وہ فریحہ کا ہاتھ پکڑ کر

کھڑی ہوگئی۔
''اچھا تو میں یہیں بیٹھ کر ذرا اخبار پڑھ لوں۔'' شاہ شازیب بولا۔
وہ اگر ڈھٹائی لا دلیتا تو خود بھی ان کے ساتھ چل پڑتا مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ وہ دونوں چلی گئیں تو اس کے چہرے سے سارا کھلنڈراپن ایک پل میں رخصت ہوگیا اور سوچ بچار کے تاثرات ابھر آئے۔ فریحہ میں راجا صاحب کی شباہت دیکھ کر اسے یقین ہوگیا تھا کہ فریحہ راجا صاحب کی کسی خفیہ شادی کا ثمر ہے۔ وہ جانتا تھا کہ راجا صاحب جوانی میں خاصے حسن پرست واقع ہوئے تھے۔ موجودہ دونوں بیویوں میں سے تیسری تو اب بھی دلآویز اور پُرکشش شخصیت کی مالک تھی۔ خود شاہ زیب کی مرحوم دادی بھی حسین تھی۔ شاہ زیب نے اس کی تصویریں دیکھی تھیں۔ بڑی رانی جو شاہ زیب کے چچا کنور ریاض کی ماں تھی، پینسٹھ سال کی عمر میں بھی نہایت دبدبے اور وجاہت کی مالک تھی۔ چھوٹی رانی سے شادی کے وقت راجا صاحب پینسٹھ سال کے تھے جبکہ چھوٹی رانی کی عمر بائیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ اس سے راجا صاحب کی خواہشات اور مزاج کا اندازہ لگایا جاسکتا تھا اور یہ بات ممکن نظر آتی تھی کہ انہوں نے کوئی شادی کسی وجہ سے خفیہ طور پر بھی کی ہو۔

شاہ زیب کا خیال تھا کہ اس بیوی کے مرجانے کی وجہ سے وہ اس کے بطن سے پیدا ہونے والی بیٹی فریحہ کو اپنے پاس لے آئے تھے لیکن اس معاملے کو خفیہ رکھا گیا تھا۔
مگر کب تک؟

شاہ زیب اپنے دماغ میں ابھرنے والے اس سوال کا جواب سمجھنے سے قاصر تھا۔ جب اسے یہ سب کچھ سوچتے سوچتے گھبراہٹ محسوس ہونے لگی تو وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا اور بستر پر لیٹ کر آنکھیں بند کرلیں۔ اب وہ کوشش کررہا تھا کہ اپنے دماغ سے ان خیالات کو نکال دے جن پر سوچتے سوچتے اس کے سر میں درد ہونے لگا تھا۔
شام کو جب کنور ریاض اور کنور الیاس دفتر سے آئے تو کاکا خلیل نے ان سے فریحہ کا تعارف کرایا۔ اس وقت شاہ زیب اور الماس بھی وہاں موجود تھے اس نے اپنے والد اور چچا کے چہرے پر بھی الجھن کے تاثرات دیکھے۔
کنور الیاس کی عمر کنور ریاض سے زیادہ تھی لیکن شاہ زیب...... اور الماس اسے چچا ہی کہتے تھے۔ ان دونوں بھائیوں کے تاثرات سے شاہ زیب نے سمجھ لیا کہ فریحہ میں راجا صاحب کی شباہت نے انہیں بھی چونکا دیا تھا۔

الماس نے ایک بات اور بھی محسوس کی۔ یہ اندازہ تو اسے پہلے ہی تھا کہ اس کے والد اور چچا میں کسی قسم کی کشیدگی پیدا ہو چکی تھی اور کاکا خلیل کے رویّے سے یہ بھی گمان ہوتا تھا کہ وہ اس معاملے میں کنور الیاس کے ساتھ تھا۔ کنور ریاض سے اس کی گفتگو میں خفیف سا تناؤ ہوتا تھا۔ الماس نے اس وقت یہ بھی محسوس کیا کہ فریحہ بھی جتنی خوش دلی کے ساتھ کنور الیاس سے ملی تھی، اس کا وہ انداز کنور ریاض سے بات کرتے ہوئے نہ تھا۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا تھا کہ وہ بھی کاکا خلیل کی طرح کنور ریاض سے خوش نہیں تھی۔ اسے اپنے نانا سے دونوں بھائیوں کی کشیدگی کا علم ہوا ہوگا۔
الماس کو بڑی حد تک یقین ہو چکا تھا کہ فریحہ کاکا خلیل کی نواسی تھی۔ یعنی اس کی ماں کاکا خلیل کی بیٹی تھی اور راجا مظفر حسین نے یہ راز رکھنا اسی لیے ضروری سمجھا ہوگا کہ انہوں نے اپنے ملازم کی بیٹی سے شادی کی تھی۔
جب مزید چند دن اور گزرے تو فریحہ گھر میں سبھی سے گھل مل گئی لیکن کنور ریاض کے سامنے وہ خود کو لیے دیے رہتی تھی۔

غالباً نرگس کو بھی اس کا احساس ہوگیا تھا اس لیے وہ فریحہ سے کسی حد تک کھنچی کھنچی سی رہنے لگی تھی۔ کنور ریاض بہرحال اس کا باپ تھا، لیکن اس کے اس انداز کے باوجود فریحہ اس سے بھی محبت آمیز انداز میں گفتگو کرتی تھی۔ بیگم ریاض سے بھی اس کی بات چیت میں ناپسندیدگی کا عنصر شامل نہیں تھا۔ گویا جو بات بھی تھی، وہ صرف کنور ریاض کی ذات تک محدود تھی۔

جلد ہی وہ دن بھی آگیا جب ایک شام اورنگ زیب کو لندن سے آنا تھا۔ گھر میں اس دن جشن کی تیاری پورے زور پر تھی۔ اسی دوپہر الماس اور فریحہ ذرا دیر کے لیے تنہا ہوئیں۔
فریحہ نے کہا۔ ''تم تینوں انہیں بھیا کہتے ہو نا؟ مجھے کاکا خلیل نے بتایا تھا۔''
''ہاں۔'' الماس نے کہا۔ ''دراصل ہم تینوں کی عمروں میں تو کوئی خاص فرق نہیں ہے لیکن وہ ہم سب سے کئی سال بڑے ہیں۔''
''تم اور شاہ زیب ان کے سگے بہن بھائی ہو؟''
''کیا مطلب؟''
''مطلب یہ کہ اس گھر میں ایک لڑکی نرگس بھی ہے جو تم تینوں کی سگی بہن نہیں ہے، چچازاد بہن ہے۔''
''ہم اس پہلو پر دھیان نہیں دیتے۔'' الماس نے سنجیدگی سے کہا۔ ''نرگس بھی ہمارے لیے سگی بہن کی طرح

ہے۔"

"سگی بہن... اور سگی بہن کی طرح... یہ دو مختلف باتیں ہیں جن کا کم از کم شاہ زیب کو پوری طرح احساس ہے۔" فریحہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ تم بھی اس سے بے خبر نہیں ہو۔ شاہ زیب اور نرگس میں اس قسم کی محبت ہے جو سگے بہن بھائی میں نہیں ہوتی۔ صرف رشتے کے بھائی بہن ہی ایک دوسرے کے لیے ایسے جذبات رکھتے ہیں۔"

الماس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر کچھ بول نہیں سکی کیونکہ فریحہ نے اپنی بات جاری رکھی تھی۔ "شاہ زیب جو مجھ سے بے تکلفانہ انداز اختیار کرتا ہے، وہ صرف نرگس کو چھیڑنے کے لیے ہوتا ہے اور نرگس بہت معصوم ہے۔ وہ مجھ سے گریزاں رہنے لگی ہے۔ مجھے اس پر بہت پیار آتا ہے۔ میں کسی وقت اسے سمجھاؤں گی کہ وہ غلط فہمی سمجھ رہی ہے، اور پھر میرے دل میں تو شاہ زیب کے لیے اس قسم کے جذبات پیدا ہو ہی نہیں سکتے کیونکہ..." وہ ایک دم خاموش ہوگئی۔

الماس چونکی۔ "کیونکہ؟"

اس کے خیال کے مطابق فریحہ اگر واقعی راجا صاحب کی بیٹی تھی تو کنور الیاس سے اس کا رشتہ بہن کا ہوتا۔ سوتیلی بہن سہی لیکن دونوں کا باپ تو ایک ہی ہوتا۔ اس طرح وہ ان چاروں بہن بھائیوں کی پھوپی تھی۔

فریحہ مسکرائی۔ "کیونکہ میں کسی اور سے محبت کرتی ہوں۔"

الماس کے خیال کے مطابق فریحہ نے بات بتا دی تھی۔

"اچھا!" الماس مسکرائی۔ "کون ہے وہ خوش نصیب؟"

"ملواؤں گی تمہیں اس سے۔" فریحہ نے خوش مزاجی سے کہا۔ "تم تینوں نے بھی آج کے جشن میں اپنے خاص خاص دوستوں کو مدعو کیا ہے اور میں نے بھی اسے بلایا ہے۔ سرکارِ عالی سے اس کی اجازت مل گئی تھی۔"

"سرکارِ عالی؟"

"راجا صاحب اس گھر کے سرکارِ عالی ہی تو ہیں۔"

"خوب!" الماس ہنس دی۔ "اچھا لقب دیا تم نے انہیں!"

"ابھی بس بے اختیار منہ سے نکل گیا۔" فریحہ نے جواب دیا، پھر بولی۔ "بہرحال آج میں کم از کم تم کو تو بتا ہی دوں گی کہ میں کس سے محبت کرتی ہوں۔ میں نے اس سے کہا ہے کہ وہ آٹھ بجے تک آجائے۔"

☆☆☆

فریحہ کا خیال غلط ثابت ہوا۔ اس نے نبیل کو بلایا تھا جو نہیں آیا اور نو بجے مہمانوں کے لیے کھانوں کی ڈشیں کھول دی گئیں۔

نبیل اس وقت اپنے فلیٹ میں تھا اور بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ فریحہ نے اسے موبائل پر اس تقریب میں شرکت کی دعوت دی تھی۔ نبیل نے گریز کرنا چاہا تھا لیکن وہ مصر ہوگئی تھی۔

"مجھے یقین ہے کہ تم میری بات نہیں ٹالو گے۔" فریحہ نے یہ کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا تھا۔

نبیل واقعی اس کی بات نہیں ٹالتا اگر اسے راجا غضنفر حسین خان کی کوٹھی کے علاوہ کہیں اور بلایا گیا ہوتا۔ وہ راجا صاحب کی کوٹھی میں کیسے جا سکتا تھا؟ وہاں الماس یقیناً ہوتی جو اس سے محبت کرتی تھی۔ نبیل کے دل میں اس کے لیے صرف ہمدردی کا جذبہ تھا۔ الماس کی محبت کی پذیرائی اس کے لیے ممکن نہیں تھی کیونکہ وہ فریحہ سے محبت کرتا تھا۔

موبائل پر فریحہ نے یہ کہہ کر اسے اور پریشان کر دیا تھا کہ وہ الماس کو اپنی محبت کے بارے میں بتا چکی تھی اور اس نے الماس سے وعدہ بھی کر لیا تھا کہ وہ اسے اس تقریب میں اپنے محبوب سے ملائے گی۔

گوکہ نبیل نے الماس کو بتا دیا تھا کہ وہ کسی اور لڑکی سے محبت کرتا ہے، اس کے باوجود وہ فریحہ کے ساتھ الماس کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کے خیال کے مطابق اس طرح الماس اور فریحہ کے درمیان تناؤ کی فضا بن جاتی۔

نو بج کر پانچ منٹ پر نبیل کے موبائل پر فریحہ کی کال آئی جو اس کے لیے غیر متوقع نہیں تھی۔ اس نے کچھ تذبذب کے ساتھ کال ریسیو کی۔

"میری غلط فہمی خوب دور کی تم نے!" فریحہ نے چھوٹتے ہی کہا تھا۔

"تلخی سے مت بولو۔" نبیل نے کہا۔ "سن تو لو کہ میں کیوں نہیں آسکا۔ مجھے بخار ہوگیا ہے فریحہ!" یہ جھوٹ مجبوری تھی جو خود نبیل کو بھی اچھی نہیں لگی۔

"ارے!" فریحہ کی آواز سے پریشانی کا اظہار ہوا۔ "میں تمہیں دیکھنے کیسے آؤں نبیل!" وہ بے تاب ہوگئی۔ "سب مہمان موجود ہیں۔ کھانا کھا رہے ہیں۔ میں ان سب سے کترا کر تنہائی میں آگئی ہوں۔"

وہ کچھ اور بھی کہتی لیکن نبیل بول پڑا۔ "اتنا پریشان نہ ہو۔ معمولی بخار ہے۔ میں نے دوا لے لی ہے۔ ڈاکٹر ابھی

مجھے دیکھ کر گیا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ صبح تک بخار اتر جائے گا۔ تم مہمانوں میں جاؤ۔ یہ بری بات ہے کہ تم ان کے ساتھ نہیں ہو۔ راجا صاحب نے تمہاری عدم موجودگی محسوس کرلی تو یہ ٹھیک نہیں ہوگا۔"

"کتنا ٹمپریچر ہے؟" فریحہ نے بے چینی سے پوچھا۔

"کہانا، معمولی ہے۔ ایک سو ایک سے کچھ زیادہ ہے۔"

"میں کیسے آؤں تمہیں دیکھنے؟" فریحہ کچھ روہانسی ہوگئی۔

"جذباتی نہ ہو فریحہ! میں کوئی بچہ تو نہیں ہوں کہ میری دیکھ بھال ضروری ہو۔"

"مجھے موقع ملا اور تقریب جلدی ختم ہوگئی تو میں کسی بہانے آؤں گی۔"

"لیکن..."

نبیل کی بات پوری نہ ہوسکی۔ دوسری طرف سے فریحہ بول پڑی تھی۔ "کوئی اِدھر آرہا ہے۔ میں بند کررہی ہوں۔"

فوراً ہی دوسری طرف سے رابطہ منقطع ہوگیا۔

نبیل نے ایک طویل سانس لی۔ چند لمحے کھوئے کھوئے سے انداز میں اپنے موبائل کو تکتا رہا۔ اسے اندیشہ تھا کہ فریحہ کسی طرح آ ہی نہ جائے ورنہ اس کا جھوٹ کھل جاتا۔ فریحہ بہت ناراض ہوتی۔

"منالوں گا کسی طرح" نبیل نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ سوچا اور موبائل رکھ کر بستر پر لیٹ گیا۔

آئندہ کیا ہوگا، وہ سوچنے لگا۔ اس نے فرسٹریشن میں ایک ایسی ڈگر اپنائی تھی کہ اس کا مستقبل غیر یقینی ہوگیا تھا۔ اس نے جو قتل کیے تھے، ان کی تفتیش ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ فائلیں کھلی ہوئی تھیں۔ اگرچہ نبیل نے وہ قتل بڑی منصوبہ بندی سے کیے تھے، پھر بھی اسے ڈر رہتا تھا کہ اس سے شاید کہیں کوئی چوک نہ ہوگئی ہو جو تفتیش کرنے والوں کو کبھی اس تک پہنچادے۔ ایسے حالات میں وہ اگر شادی کرلیتا تو فریحہ کا مستقبل بھی غیر یقینی ہوجاتا۔

ان خیالات میں الجھنے کے ساتھ ساتھ وہ اس اندیشے کا شکار بھی رہا کہ فریحہ نہ آجائے۔

آدھا گھنٹا گزرا تھا کہ فلیٹ کی کال بیل بجی۔ نبیل چونک کر بستر سے اٹھا اور پریشان ہوگیا۔ اس کے خیال کے مطابق اس وقت فریحہ ہی آسکتی تھی۔ نبیل نے ایسا حلقہ احباب نہیں بنایا تھا جن میں سے کوئی اِس کے گھر بھی آتا ہو۔ اس فلیٹ میں فریحہ اور الماس کے علاوہ کبھی کوئی نہیں آیا تھا۔

دروازہ کھولنے کے لیے تو نبیل کو جانا ہی پڑا۔ اس وقت اس کے دماغ میں صرف یہ بات چکرا رہی تھی کہ فریحہ کو منانے کے لیے اسے کیا کچھ کہنا چاہیے!

دروازے کے قریب پہنچ کر وہ چونک پڑا۔ دروازے کے بالکل قریب ایک بڑا سا سفید لفافہ پڑا ہوا تھا جو یقینی طور پر دروازے اور فرش کی درمیانی درز سے اندر کھسکا دیا گیا تھا۔

نبیل نے لفافہ اٹھا کر جلدی سے دروازہ کھولا۔ باہر اسے کوئی نظر نہیں آیا۔ اس کی پیشانی پر شکن پڑگئی۔ وہ باہر نکلا، لفٹ اور زینے تک نظر دوڑائی لیکن کوئی دکھائی نہیں دیا۔ نبیل نے الجھے ہوئے ذہن کے ساتھ لفافہ کھولا۔ اس میں جو کچھ تھا، اس نے نبیل کو اور چونکا دیا۔ وہ فریحہ کا فوٹوگراف تھا!

نبیل کا دماغ چکرا گیا۔ یہ ناقابلِ فہم سی بات تھی کہ فریحہ آئی، اپنا فوٹوگراف اس نے فلیٹ میں سرکایا اور کال بیل بجا کر تیزی سے واپس چلی گئی۔ آخر کیوں؟ کیا مقصد تھا؟

نبیل فوٹوگراف کو لفافے میں رکھتا ہوا تیزی سے لفٹ کی طرف بڑھا۔ جب وہ اس کے سامنے پہنچا تو اس نے دیکھا کہ لفٹ گراؤنڈ فلور پر رکی ہوئی تھی۔ اب نبیل تیزی سے زینے کی طرف بڑھا اور اترنے کے بجائے انہیں پھلانگنے لگا۔ نیچے سے پہلی منزل کی طرف سے آنے والے ایک شخص سے سامنا ہوا۔

بلڈنگ کے لوگوں سے نبیل بڑی خوش مزاجی سے ملتا تھا۔

"کیا بات ہے نبیل صاحب؟ بڑی جلدی میں ہیں؟" وہ شخص بولا۔

نبیل نے کوئی جواب نہیں دیا، زبردستی کی ہنسی ہنس کر زینے پھلانگتا چلا گیا لیکن اس تیزی، طراری کے باوجود کچھ حاصل نہ کرسکا۔ گراؤنڈ فلور پر صرف چوکیدار نظر آیا تھا۔

"ابھی منٹ بھر پہلے کوئی نیچے آیا ہے؟" اس نے چوکیدار سے پوچھا۔ "لفٹ سے یا زینے سے؟"

"جی ہاں صاحب!" چوکیدار نے جواب دیا۔ "ایک خاتون لفٹ سے اتر کر گئی ہیں۔ کسی کے یہاں مہمان آئی ہوں گی۔ وہ شاید ملا نہیں۔ بس ابھی آئی تھیں اور ابھی چلی گئیں۔"

"گاڑی میں آئی تھیں؟"

"جی ہاں صاحب! میں نے انہیں آتے ہوئے تو نہیں لیکن اتفاق سے جاتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔"

"کیسی گاڑی تھی؟"

"بہت پرانی فوکسی تھی صاحب!"

''فوکسی۔'' نبیل زیرلب بڑبڑایا۔
فریحہ نے اسے بتایا تھا کہ اس کے لیے نئے ماڈل کی کوئی کار خریدی گئی تھی۔ چوکیدار ایسی نظروں سے نبیل کی طرف دیکھنے لگا تھا جیسے استفسار کرنا چاہتا ہو لیکن اسے ہمت نہیں ہوسکی۔
نبیل دماغی الجھن کے ساتھ اپنے فلیٹ میں واپس لوٹا۔ دروازہ وہ کھلا چھوڑ گیا تھا۔ اسے اندر سے بند کرتے ہوئے اس نے اپنے موبائل کی آواز سنی جو وہ اپنی خوابگاہ میں ہی چھوڑ گیا تھا۔ وہ تیزی سے خواب گاہ کی طرف لپکا۔ وہ ابھی تک یقین نہیں کرسکا تھا کہ جس خاتون کی بات چوکیدار نے کی تھی، وہ فریحہ ہوگی۔ اسے پرانی فوکسی میں آنے کی آخر کیا ضرورت تھی؟ لیکن یہ بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اگر فریحہ نہیں تھی تو کون تھی!
موبائل پر کال شاید فریحہ کی ہی ہو!
یہ سوچتے ہوئے نبیل نے موبائل اٹھایا۔ اسے اسکرین پر فریحہ کے نام کے بجائے ایک اجنبی نمبر نظر آیا۔
''کون ہے؟'' نبیل نے سوچتے ہوئے کال ریسیو کی۔ ''ہیلو!''
''میں بول رہا ہوں۔'' دوسری طرف سے ایک بھاری مردانہ آواز سنائی دی، پھر ہلکی سی ہنسی کے بعد کہا گیا۔ ''مسٹر ڈارک! اچھا نام دیا ہے تم نے مجھے!''
نبیل نے بے اختیار ایک طویل سانس لی۔
''تصویر مل گئی ہوگی تمہیں!'' مسٹر ڈارک نے کہا۔
اس مرتبہ نبیل چونک پڑا۔ ''کیسی تصویر؟''
''ایک لڑکی کی تصویر۔'' جواب دیا گیا۔
''مگر...''
دوسری طرف سے بات کاٹی گئی۔ ''تم جانتے ہو؟ آج کی تاریخ میں تمہارا بینک بیلنس کتنا ہے؟''
''میں نے پندرہ بیس دن میں جو چیک کیش کرائے ہیں، ان کا ابھی کوئی حساب نہیں لگایا، مگر...''
دوسری طرف سے پھر اس کی بات کاٹی گئی۔ ''معلوم کروگے تو جان لوگے کہ آج تمہارے اکاؤنٹ میں پانچ لاکھ روپے کا اضافہ ہوگیا ہے۔ یہ رقم میں نے تمہارے اکاؤنٹ میں آج ہی جمع کروائی ہے۔ اس مرتبہ تمہیں اس لڑکی کو قتل کرنا ہے۔''
نبیل کو یوں محسوس ہوا جیسے یکایک اس کے سارے جسم میں ہزارہا چیونٹیاں رینگ گئی ہوں۔
مسٹر ڈارک کی آواز آتی رہی۔ ''اس لڑکی کا نام فریحہ ہے۔ کچھ دن سے یہ راجا مظفر حسین کے گھر میں رہ رہی ہے۔ راجا مظفر حسین کی شخصیت کوئی گمنام شخصیت نہیں ہے۔ تم بھی جانتے ہوگے۔ اگر تمہیں اس کا پتا معلوم نہ ہو تو ٹیلی فون ڈائریکٹری میں دیکھ لینا۔ اس لڑکی کے قتل کے بعد تمہارے اکاؤنٹ میں مزید پانچ لاکھ روپے جمع کرادیے جائیں گے، جیسا پہلے ہوتا رہا ہے۔ اس مرتبہ قتل کا انداز ذرا مختلف ہوگا۔ پہلے تم اس لڑکی کو اغوا کرو۔ اس کے بعد اسے قتل کرکے کہیں گہرائی میں گاڑ دو۔ اس بار تمہارا کام کچھ اضافی بھی ہے اس لیے لڑکی کے دفن کے بعد تمہارے اکاؤنٹ میں تین لاکھ روپے اور جمع کردیے جائیں گے۔ کیونکہ بات صرف قتل کی نہیں اس لیے اس مرتبہ میں تمہیں ایک ہفتے کا وقت دے رہا ہوں۔ بس! میری بات مکمل ہوئی۔ کوئی سوال کرنے کا اختیار میں نے تمہیں پہلے بھی کبھی نہیں دیا۔''
اس سے پہلے کہ نبیل کچھ کہتا، دوسری طرف سے رابطہ منقطع کیا جاچکا تھا۔
نبیل اس طرح کھڑا رہ گیا جیسے پتھرا گیا ہو۔ یہ اس کے سان گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ جس راہ پر چل پڑا ہے، وہ کبھی اسے ایک ایسے موڑ پر پہنچادے گی جہاں سے قدم آگے بڑھانا اس کے لیے ممکن نہیں ہوگا۔ وہ کسی قیمت پر بھی فریحہ کو قتل نہیں کرسکتا تھا۔ فریحہ اس کی محبت تھی۔
اب نبیل کے لیے دوسرا راستہ صرف یہ تھا کہ سر دار چلا جائے یا عمر قید کو اپنا مقسوم سمجھ لے۔ فریحہ کو قتل نہ کرنا مسٹر ڈارک سے اس کی سرکشی کے مترادف ہوتا۔ مسٹر ڈارک اسے برداشت نہیں کرتا۔ نبیل نے اب تک جو قتل کیے تھے، مسٹر ڈارک کے پاس اس کے ایسے ثبوت تھے جو اگر قانون کے رکھوالوں تک پہنچادیے جاتے تو نبیل کسی طرح بھی خود کو نہیں بچاسکتا تھا۔
وہ خود نہیں جانتا تھا کہ جس شخص کا آلۂ کار بن گیا ہے، وہ شخص کون ہے۔ وہ ہمیشہ موبائل پر ہی رابطہ کرتا تھا اور ہر مرتبہ اس کے موبائل کا نمبر اسکرین پر گزشتہ نمبروں سے مختلف ہوتا تھا۔ کئی مرتبہ نبیل نے ان نمبروں پر اس شخص سے بات کرنے کی کوشش کی تھی لیکن ہمیشہ اسے ان نمبروں سے کوئی جواب نہیں ملا تھا۔ اس سے صرف یہی نتیجہ اخذ کیا جاسکتا تھا کہ وہ شخص جس نمبر سے ایک مرتبہ نبیل کو فون کرتا تھا، اس نمبر کو دوبارہ استعمال نہیں کرتا تھا۔ اسی لیے نبیل نے اس کا نام ''مسٹر ڈارک'' رکھ دیا تھا۔
اس شخص یعنی مسٹر ڈارک کو غالباً کسی ایسے شخص کی تلاش ہی تھی جو معاشرے کی زیادتیوں سے فرسٹیڈ ہو۔ اسے کسی

طرح نبیل کی اس ذہنی کیفیت کا علم ہوگیا تھا جس سے فائدہ اٹھانے کے لیے اس نے نبیل کے موبائل پر اس سے رابطہ کیا تھا۔ اس نے نبیل سے ایسی باتیں کیں جیسے وہ بھی معاشرتی زیادتیوں سے بددل ہو۔ اس نے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ وہ استحصالی طبقے کے لوگوں کو قتل کردینا چاہتا ہے لیکن اس میں اس کی ہمت نہیں ہے تاہم اگر کوئی اس کی خواہش کے مطابق یہ کام کرنے کے لیے تیار ہوجائے تو وہ اس کو بے تحاشا نواز سکتا ہے۔

نبیل نے اس سلسلے میں اپنی خدمات پیش کردی تھیں لیکن اب اسے اپنی غلطی کا احساس ہورہا تھا اور یہ بات اس کی سمجھ میں آنے لگی تھی کہ اپنی کم مائیگی یا بے مائیگی کا ازالہ کرنے کے لیے انسان کو جرائم کی راہ پر چل کر اپنی تسکین نہیں کرنا چاہیے۔ یہ راہ اسے کسی وقت بھی کسی ایسی جگہ پہنچا سکتی ہے کہ پھر اسے واپسی کا راستہ نہیں ملتا۔

ان خیالات کے علاوہ نبیل اس وقت یہ بھی سوچ رہا تھا کہ مسٹر ڈارک کو فریحہ کے قتل کا خیال کیوں آیا؟ فریحہ کا تعلق استحصالی طبقے سے ہرگز نہیں تھا۔ وہ تو خود ایک زیادتی کا شکار ہوئی تھی اور راجا مظفر حسین خان نے اس زیادتی کا ازالہ کرنے کے لیے اسے اپنے گھر بلوالیا تھا۔

نبیل کے لیے ایک مشکل یہ تھی کہ وہ اس معاملے میں مسٹر ڈارک سے کوئی بات بھی نہیں کرسکتا تھا۔ اس سے رابطے کی صرف یہی صورت ہوتی تھی کہ وہ خود نبیل کو فون کرتا تھا۔

پریشانی اور مایوسی کی حالت میں اس نے بڑی بے دلی سے موبائل پر وہی نمبر ملائے جس سے مسٹر ڈارک اسے کچھ ہی دیر پہلے فون کرچکا تھا۔ اس سے کچھ حاصل نہیں ہوا، ہمیشہ کی طرح ناکامی ہی ہوئی۔ وہی ریکارڈڈ نسوانی آواز سنائی دی کہ اس نمبر سے جواب موصول نہیں ہورہا ہے۔

نبیل ٹہلتا اور سوچتا رہا کہ اب اسے کیا قدم اٹھانا چاہیے۔ اگر اب اسے کسی طرح یہ معلوم ہوجاتا کہ مسٹر ڈارک کون ہے تو وہ اسی کو قتل کرڈالتا۔

معاً نبیل کے دماغ میں جیسے بجلی کوندگئی۔ اسے خیال آیا کہ مسٹر ڈارک وہی شخص تو نہیں جس نے فریحہ کی ماں کے ساتھ زیادتی کی تھی؟

نبیل کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔ ایک شخص کا سراپا اس کے تصور میں ابھر آیا تھا۔

☆☆☆

راجا مظفر حسین خان کے گھر کی تقریب بہت شاندار رہی۔ راجا صاحب اپنے پوتے کو بڑی بڑی شخصیات سے ملاتے رہے۔ اورنگ زیب بھی اس تقریب سے بہت خوش ہوا لیکن وہ بھی فریحہ کو دیکھ کر، گھر کے دوسرے لوگوں کی طرح الجھن کا شکار رہا۔

بارہ بجے کے قریب تمام مہمان رخصت ہوگئے۔ اس کے بعد بہن بھائیوں کی چوکڑی گھریلو ڈرائنگ روم میں جمی۔ اس میں پانچویں فریحہ بھی شامل تھی لیکن اسے شامل کرنے میں الماس نے اصرار کیا تھا۔ وہ تنہائی کی خواہاں تھی۔ اس نے نیند کا بہانہ بھی کیا تھا لیکن الماس کے سامنے اس کی ایک نہیں چلی تھی۔

شاہ زیب، الماس اور نرگس کیونکہ اورنگ زیب کو ''بھیا'' کہہ کر مخاطب کرتے تھے اس لیے فریحہ بھی تعارف کے بعد اسے ''بھیا'' ہی کہتی رہی تھی۔

''میں تو یہاں کے ماحول کو بہت ترستا رہا ہوں۔'' اورنگ زیب نے کہا۔ ''لندن میں یہاں جیسی آزادی اور بے تکلفی نصیب نہیں ہوتی۔ میں نے یورپ کے کئی ملک دیکھے۔ وہاں بڑی اچھی بیچ بنائی گئی ہیں لیکن ماحول ایسا ہے کہ نظریں اٹھانا ممکن نہیں ہوتا۔ مجھے یہاں کے ہاکس بے اور سینڈز پٹ کی یاد آتی رہی۔''

''تو ہاکس بے کا پروگرام بنالیں بھیا!'' نرگس بولی۔ ''وہاں اپنی دو ہٹ بھی ہیں۔ ہفتے کو چلے چلیں، اتوار کی شام کو واپس آجائیں گے۔ چاندنی رات بھی ہوگی۔ مزہ آئے گا۔''

''ہاں یہ تو مجھے خیال ہی نہیں تھا۔'' اورنگ زیب نے کہا۔ ''آج جمعرات ہے اور قمری مہینے کی بارہ تاریخ! ہفتے کو چودھویں کی رات ہوگی۔''

''داجی سے اجازت تو آپ ہی کو لینا ہوگی!'' شاہ زیب بولا۔

پھر الماس نے بھی لقمہ لگایا۔ ''ہم میں سے کسی میں تو ہمت ہی نہیں ہے۔''

فریحہ نے اس گفتگو میں بالکل حصہ نہیں لیا۔ وہ بے چین سی نظر آرہی تھی۔ اورنگزیب نے کئی بار اسے کن انکھیوں سے دیکھا تھا۔

''تمہیں شاید اس قسم کی تفریحات سے دلچسپی نہیں ہے!'' اورنگزیب نے براہِ راست فریحہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ایسی بات تو نہیں۔'' فریحہ کی مسکراہٹ ایسی تھی جیسے کوشش کرکے مسکرائی ہو۔ اس نے کہا۔ ''سب لوگ پروگرام بنائیں گے تو میں بھی اس میں شامل ہوں گی۔ دراصل اس

وقت مجھے نیند آرہی ہے اور کئی گھنٹے کی تقریب نے مجھے تھکا بھی دیا ہے۔''

''یہاں رہو گی تو عادی ہو جاؤ گی اس کی۔'' الماس نے ہنس کر کہا۔ ''اس گھر میں تقریبات کم ہوتی ہیں لیکن جب ہوتی ہیں تو تین چار گھنٹے چلتی ہیں۔''

''نیند آرہی ہے تو انہیں جانے دو الماس!'' اورنگزیب بولا۔ ''تم ہی لے آئی تھیں انہیں زبردستی! میں نے دیکھا تھا۔''

''واقعی مجھے آرام کی ضرورت ہے الماس!'' فریحہ بولی۔

اس طرح اورنگزیب کی وجہ سے اسے چھٹکارا مل گیا۔ پروگرام طے ہونے کے بعد باقی بہن بھائی بھی اپنی اپنی خوابگاہ میں چلے گئے۔

اورنگزیب بستر پر لیٹا تو اسے فوراً نیند نہیں آئی۔ فریحہ کا چہرہ اس کے تصور میں جھلملاتا رہا۔ وہ اسے بہت اچھی لگی تھی لیکن یہ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اسے کیوں اتنی زیادہ اچھی لگی تھی، اس کے نقش ونگار میں کیا انوکھی بات تھی؟ اس الجھن کو اورنگزیب نے اپنے دماغ سے جھٹک دیا تھا کہ فریحہ کے نقش ونگار میں راجا صاحب کی شباہت تھی۔ وہ اسے ایک اتفاقی امر قرار دے چکا تھا۔ وہ خود دو ایک ایسے افراد دیکھ چکا تھا جن میں کسی کی بہت زیادہ شباہت موجود تھی جبکہ ان کا ایک دوسرے سے دور دور تک کوئی تعلق نہیں تھا۔

ہاں اورنگزیب کو یہ الجھن ضرور رہی کہ راجا صاحب اسے اپنے گھر میں کیوں لائے تھے؟ الماس نے اس سے علیحدگی میں اپنے اس شبہے کا اظہار تو کر دیا تھا کہ وہ شاید کاکا خلیل کی نواسی تھی لیکن اس میں الجھاؤ یہ تھا کہ اگر وہ کاکا خلیل کی نواسی تھی تو بھی اس کی شخصیت کو راز میں رکھنا راجا صاحب نے کیوں ضروری سمجھا تھا؟

اورنگزیب کچھ دیر تک ان خیالات میں الجھا رہا، پھر اسے نیند آگئی۔

دوسرے دن ناشتے کے بعد ہی الماس نے اس سے کہا۔ ''کاکا جی سے جلدی بات کر لیجیے گا بھیا! دوپہر کے کھانے کے بعد تو وہ چلے جائیں گے۔''

''ان کا معمول اب بھی وہی ہے؟ جمعے ہی کو جاتے ہیں؟''

''جی ہاں۔''

کاکا خلیل کے خاندان کے کچھ لوگ اسی شہر میں کسی اور جگہ رہتے تھے۔ کاکا خلیل جمعے کے دن دوپہر کے کھانے کے بعد ان سے ملنے چلا جاتا تھا اور رات وہیں گزار کر دوسری صبح واپس آتا تھا۔

گزشتہ رات اورنگزیب نے بہن بھائیوں سے بات کرتے ہوئے کہا تھا کہ راجا صاحب سے ہاکس بے کے پروگرام کی اجازت لینے کے لیے وہ کاکا خلیل کو واسطہ بنائے گا۔

دس بجے کے قریب اورنگزیب کو کاکا خلیل سے بات کرنے کا موقع ملا۔ اس نے کاکا خلیل کو بتایا کہ بہن بھائیوں نے کیا پروگرام بنایا تھا۔

''آپ ہمیں راج دا سے اجازت دلوا دیں۔'' اس نے کاکا خلیل سے کہا۔

کاکا خلیل نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''میں شام کو بات کروں گا راجا صاحب سے۔ میرا خیال ہے کہ انہیں اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔''

''دوپہر کو تو آپ اپنے گھر والوں سے ملنے چلے جائیں گے!''

''اس ہفتے میں نہیں جاؤں گا۔ آج میرا یہاں رکنا ضروری ہے۔''

''کوئی خاص بات؟''

''ہاں۔'' کاکا صاحب نے متفکر انداز میں سر ہلایا۔ ''تم کو شاید ابھی علم نہیں ہوا ہوگا۔ میں تمہیں بتا دیتا ہوں کچھ عرصے سے تمہارے والد اور تمہارے چچا میں کچھ کشیدگی چل رہی ہے۔ راجا صاحب اس معاملے کو اب تک طرح دیتے چلے آئے ہیں لیکن آج انہیں معلوم ہوا ہے کہ دونوں بھائی افہام وتفہیم سے آپس کی کشیدگی ختم نہیں کر سکے اور اس کے برخلاف کچھ اضافہ ہوا ہے۔ اسی کی وجہ سے راجا صاحب بہت غصے میں ہیں۔ آج جمعہ ہے اس لیے وہ دونوں دفتر سے جلدی آجائیں گے۔ مجھے حکم دیا ہے انہوں نے کہ آج ان دونوں کو فوراً ان کی خدمت میں پیش کروں۔''

''راج دا اب بھی راجاؤں ہی کے طور طریق اپنائے ہوئے ہیں۔'' اورنگزیب نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''انہوں نے آپ کو حکم دیا ہے کہ انہیں آپ ان کی خدمت میں پیش کریں۔ آپ ابھی تک ان کے وزیر ہیں۔''

کاکا خلیل نے اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

اورنگزیب پھر بولا۔ ''میرے کان میں کچھ بھنک تو پڑ گئی ہے اس کشیدگی کے بارے میں لیکن گھر میں کسی کو یہ نہیں معلوم کہ اس کشیدگی کی وجہ کیا ہے۔ آپ تو جانتے ہوں گے کاکا جی!''

''ہاں جانتا ہوں۔'' کاکا خلیل نے کہا۔ ''لیکن راجا صاحب نہیں چاہتے کہ میں گھر میں کسی کو اس بارے میں بتاؤں۔''

''اتنا گمبھیر معاملہ ہے!'' اورنگزیب کو تشویش ہوئی۔

کاکا جی نے اس پر بھی کوئی تبصرہ نہیں کیا اور کہا۔ ''میں چلتا ہوں۔''

اس کے جاتے ہی کسی طرف سے نرگس، الماس اور شاہ زیب آنکلے۔ اورنگزیب نے فریحہ کی کمی محسوس کی۔

''بات ہوگئی کاکا جی سے؟'' شاہ زیب نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

''ہاں، ہوگئی۔ وہ شام کو بات کریں گے راج دا سے۔''

''ابھی اجازت مل جاتی تو کسی ملازم کو ہاکس بے بھیج کر ہٹس کی صفائی کروا لیتے۔'' الماس بولی۔

''کوئی وجہ ہوگی کہ کاکا جی شام سے پہلے راج دا سے اس معاملے میں بات نہیں کرنا چاہتے۔'' اورنگزیب نے وضاحت کرنا ضروری نہیں سمجھا۔

''اجازت تو مل جائے گی بھیا!'' شاہ زیب بولا۔ ''آپ کی کوئی خواہش راج دا کبھی نہیں ٹالتے۔ ہٹس کی صفائی کے لیے ملازم کو بھیج دینے میں کوئی حرج نہیں ہوگا۔''

''فریحہ نظر نہیں آئی تم تینوں کے ساتھ!'' اورنگزیب نے بہ ظاہر بڑے سرسری انداز میں کہا۔

الماس نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ اس کی طرف دیکھا۔

نرگس بولی۔ ''وہ تو ناشتے کے بعد ہی کہیں چلی گئی ہے۔''

''اکیلی؟''

''ہاں بھیا! اس کے لیے نئی کار خریدی گئی ہے۔ آپ کو بتایا تو تھا کل۔''

''میرا مطلب ہے شوفر کو تو لے گئی ہوگی!''

''نہیں، اکیلی، خود ڈرائیو کر کے لے گئی ہے گاڑی۔ میرا خیال ہے کہ وہ رات سے ہی بے چین تھی کہیں جانے کے لیے!''

اورنگزیب نے دانستہ موضوع بدلا۔ ''تم کسی ملازم کو تو بھیج دو ہٹس کی صفائی کے لیے!''

''دو ملازموں کو بھیج دیتا ہوں۔ کوئی اکیلا جائے گا تو بور ہوگا۔''

تھوڑی دیر بعد اورنگزیب اپنے کمرے میں لیٹا پرانے کچھ دوستوں کو فون کر رہا تھا کہ الماس آگئی۔

''کیا میں نے ڈسٹرب کیا بھیا؟'' وہ بولی۔

''نہیں نہیں، کچھ دوستوں کو فون کر رہا تھا۔ بہت عرصے بعد آیا ہوں نا لندن سے! آؤ بیٹھو! کوئی خاص بات؟''

''فریحہ ابھی ابھی کہیں سے لوٹی ہے۔'' الماس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''بس یہی اطلاع دینے آئی ہو؟''

''آپ بے چین جو ہوگئے تھے اسے نہ دیکھ کر!''

''بکو مت!'' اورنگزیب نے اسے گھورا۔

''اب بنیے نہیں۔'' الماس نے شوخی سے کہا۔ ''کل آپ اسے جن نظروں سے دیکھتے رہے ہیں، وہ نظریں کچھ معنی رکھتی ہیں۔''

اورنگزیب ہنس پڑا۔ ''لڑکی ہے تو اچھی! کیا تمہیں پسند نہیں؟''

''بھیا!'' الماس سنجیدہ ہوگئی۔ ''یہ نہ بھولیے کہ وہ راج دا کی بیٹی ہوسکتی ہے۔ اس صورت میں اس سے ہمارا اور آپ کا رشتہ...''

''فضول بات!'' اورنگزیب بول پڑا۔ ''ذرا دیر کو تو مجھے بھی یہ خیال آیا تھا لیکن جب سوچا تو یہ ناممکن سا لگا۔ راج دا جوانی ہی میں یتیم ہو جانے کی وجہ سے گھر میں خود مختار ہوگئے تھے۔ ان کا دبدبہ شروع ہی سے رہا ہے۔ وہ چھپ کر کوئی شادی کیوں کریں گے؟''

''تو پھر یہ شباہت؟''

''ایسا ہوتا ہے۔ ایسے اتفاقات میں پہلے بھی دیکھ چکا ہوں۔''

''تو پھر آخر یہ کون ہوسکتی ہے؟''

''یہ راز کسی وقت پر کھلے گا!''

''مجھے تو یہ بات بچگانہ سی لگتی ہے۔ فلموں میں جیسے آخری دھماکا کیا جاتا ہے۔''

اورنگزیب مسکرایا۔ ''تم نہیں جانتیں الماس! راج دا کو نوجوانی میں جاسوسی ناول لکھنے کا شوق تھا۔ ایک بار انہوں نے مجھ سے اپنے کمرے کے شیلف کی صفائی کروائی تھی۔ تم یہ تو جانتی ہی ہو کہ وہ اپنے کمرے میں کسی ملازم کو بھی نہیں بلاتے۔ خود ہی دیکھ بھال کر لیتے ہیں۔ ایک بار مجھ سے کہہ بیٹھے۔ شیلف میں مجھے ایک جاسوسی ناول کا مسودہ ملا۔ وہ نامکمل تھا۔ راج دا نے وہ میرے ہاتھ میں دیکھا تو جلدی سے لے لیا اور مجھے کمرے سے بھگا دیا۔ اس وقت میں ساتویں

جماعت میں پڑھا کرتا تھا۔‘‘
الماس حیرت سے بولی۔ ’’کبھی کوئی ناول چھپا ہے ان کا؟‘‘
’’شاید چھپا ہو، مگر اپنا یہ شوق انہوں نے دوسروں سے پوشیدہ رکھا ہے تو ناول بھی فرضی نام سے چھپوایا ہوگا۔‘‘
’’تو گھر میں بھی وہ جاسوسی ناول جاسوسی ناول کھیلنا چاہتے ہیں۔‘‘
اورنگزیب ہنس کر رہ گیا۔
☆☆☆
کنور الیاس اور کنور ریاض دو بجے کے بعد آگے پیچھے گھر پہنچے۔ جمعے کو لنچ وہ دفتر میں ہی کر لیتے تھے۔ کاکا خلیل نے ان دونوں کو پیغام پہنچایا کہ وہ ٹھیک ڈھائی بجے راجا صاحب کے کمرے میں پہنچیں۔
چونکہ وقت طے تھا لہٰذا دونوں بھائی ساتھ ہی ساتھ راجا صاحب کے کمرے کے دروازے پر پہنچے۔ کنور الیاس نے انگلی سے دروازہ کھٹکھٹا کر کنور ریاض کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ’’غالباً راج با کا پیمانہ لبریز ہوگیا ہے۔ میں تو چاہتا تھا کہ بات اس حد تک آگے نہ بڑھ جائے لیکن تم نہیں مانے!‘‘
کنور ریاض نے بے پروائی کے انداز میں شانے جھٹکے۔ اسی وقت اندر سے دروازہ کھولا گیا۔ دروازہ کھولنے والا کاکا خلیل تھا۔ دونوں بھائیوں کے لیے یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی۔ وہ جانتے تھے کہ کاکا خلیل راجا صاحب کے شاید سبھی نجی معاملات کا رازدار تھا۔
کمرے میں راجا صاحب بستر پر نیم دراز حقہ گڑگڑا رہے تھے۔ بستر کے قریب دو کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ راجا صاحب نے دونوں بھائیوں کے سلام کا جواب دینے کے بعد انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ان کے چہرے کے تاثرات بڑے گمبھیر تھے۔
کاکا خلیل ان کے بستر کے سرہانے سے لگ کر کھڑا ہوگیا۔
’’تم دونوں ایک دوسرے سے ناخوش ہو!‘‘ راجا صاحب کا لہجہ نہایت سپاٹ تھا۔ ان کے چہرے کی گمبھیرتا ان کے لہجے سے ہم آہنگ نہیں تھی۔
’’کم از کم میں تو نہیں ہوں۔‘‘ کنور ریاض بولا۔
’’میں ہوں۔‘‘ کنور الیاس نے سنجیدگی سے کہا۔ ’’آپ نے طلب کیا تو میں سمجھ گیا کہ یہی بات ہوگی، اور اگر آپ طلب نہ کرتے تو میں خود ایک آدھ دن میں آپ سے بات کرنے والا تھا۔ میں نے کوشش تو بہت کی تھی کہ بات آپ تک نہ پہنچے، یا یہ کہہ لیں کہ فیصلہ آپ کو نہ کرنا پڑے لیکن چھوٹے کنور میری باتوں کو نظر انداز کرتے رہے۔‘‘
’’تم مجھ سے مل کر کیا کہتے؟‘‘ راجا صاحب نے پوچھا۔
’’ہمارے کاروبار الگ الگ کر دیجیے!‘‘
’’کیوں؟‘‘
’’ہر سال آڈٹ تو آپ خود کرواتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہو جاتا کہ کیا ہو رہا ہے لیکن ابھی آڈٹ میں تین ماہ باقی ہیں اور کل سے چھوٹے کنور کا ہاتھ زیادہ کھل گیا ہے۔ تین ماہ میں تو بہت کچھ ہو جائے گا۔‘‘
’’کھل کر بات کرو۔‘‘
کنور الیاس نے جواب دینے کے بجائے کنور ریاض کی طرف دیکھا جو سر جھکائے کھڑا تھا۔
’’ان سے پوچھیے!‘‘ کنور الیاس نے باپ کی طرف دیکھتے ہوئے بھائی کی طرف اشارہ کیا۔
’’اس سے بھی پوچھ لوں گا۔‘‘ راجا صاحب سرد لہجے میں بولے۔ ’’ابھی میں تم سے بات کر رہا ہوں۔ تم جواب دو۔‘‘
کنور نے کچھ تذبذب کے بعد کہا۔ ’’چھوٹے کنور کو سیاست سے بہت زیادہ دلچسپی ہوگئی ہے۔ اس کی وجہ سے اس سال کا منافع شاید بیس فیصد رہ جائے۔ یہ ایک سیاسی پارٹی کو انتخابات کے لیے بے تحاشا فنڈز دے رہے ہیں۔‘‘ کنور الیاس نے ایک پارٹی کا نام بھی بتایا۔
’’وہ ساری رقم دگنی ہو کر واپس آجائے گی۔‘‘ کنور ریاض بول پڑا۔
’’وہ کیسے؟‘‘ راجا صاحب کی پیشانی شکن آلود ہوگئی۔
کنور ریاض نے جواب دیا۔ ’’انتخابات میں اس پارٹی کی کامیابی سے ہمارے کاروبار کے لیے بہت سی راہیں ہموار ہو جائیں گی۔‘‘
’’چھوٹے کنور!‘‘ راجا صاحب نے تلخ لہجے میں کہا۔ ’’اول تو میں تجارت میں سیاست کا قائل نہیں۔ دوسرے یہ کہ۔‘‘ وہ کچھ رک کر بولے۔ ’’کیا میں نے تمہیں یہی تربیت دی ہے کہ زیادہ منافع کے لیے غلط طریقے استعمال کرنا بھی جائز ہے؟‘‘
’’راج با!‘‘ کنور ریاض نے نظریں جھکا کر جواب دیا۔ ’’میں اسے غلط طریقہ نہیں سمجھتا۔ یہ ایک خاص نوع کا انویسٹمنٹ ہے۔‘‘

''انویسٹمنٹ نہیں ہے۔ رشوت ہے یہ!''
کنور ریاض نے کنور الیاس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بہتر ہوگا کہ ہم دونوں اپنا اپنا حصہ لے کر الگ ہو جائیں۔ میرا کاروبار الگ ہو اور آپ کا...''
''چھوٹے کنور!'' راجا صاحب غصے سے بول پڑے۔ ''کاروبار کی تقسیم کا فیصلہ تم کیسے کر لینا چاہتے ہو؟ کیا تم مالک ہو اس کے؟ کیا میں مر گیا ہوں؟ مت بھولو کہ یہ سب کچھ ابھی صرف میرا ہے۔''
''حق تو ہمارا بھی ہے۔'' کنور ریاض کچھ بے باک ہو گیا۔ ''ہمیں ہمارے حصے...''
''بند کرو زبان!'' راجا صاحب گرج اٹھے۔ ''میں نے اگر تم دونوں کو چھوٹ دے رکھی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں تم دونوں سے بے خبر بھی رہا ہوں!''
''میں نے کیا کیا ہے راج با؟'' کنور الیاس بول پڑا۔
راجا صاحب نے اسے تیز نگاہوں سے دیکھا، اس کے بعد پھر کنور ریاض کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ''تمہاری سیاست نوازی کا علم مجھے آج نہیں، بہت پہلے ہو گیا تھا۔''
کنور ریاض نے کاکا خلیل کی طرف دیکھا اور بڑے تلخ لہجے میں بولا۔ ''آپ اسی لیے کبھی کبھی دفتر تشریف لاتے رہتے تھے کاکا جی؟''
''ہاں۔'' راجا صاحب مشتعل رہے۔ ''یہ فرض انہیں میں نے سونپا تھا کہ ہر قسم کے حالات پر کڑی نظر رکھیں۔ ان سے بس ایک معاملے میں چوک ہو گئی تھی۔ خیر اس پر تو میں بعد میں کسی وقت بات کروں گا۔'' وہ کاکا خلیل کی طرف متوجہ ہوئے۔ ''کل آپ دفتر جائیے۔ میں بینک منیجر کو لکھ دوں گا کہ راجا انڈسٹریز کے تمام اکاؤنٹ اب میرے نام سے ہوں گے، اس سلسلے میں تمام کاغذی کارروائی آپ مکمل کروا لیجیے گا۔ اب کوئی چیک ان دونوں میں سے کسی کے دستخط سے بھی پاس نہیں ہوگا۔''
''لیکن...'' کنور ریاض نے کچھ کہنا چاہا۔
''چپ رہو، بات پوری کرنے دو۔'' راجا صاحب نے اسے ڈانٹ دیا، اس کے بعد پھر کاکا خلیل کی طرف متوجہ ہوئے۔ ''راجا انڈسٹریز کے دو شعبے بنا دیجیے۔ ایک شعبے کے جنرل منیجر بڑے کنور اور دوسرے شعبے کے جنرل منیجر چھوٹے کنور ہوں گے۔ ان کی تنخواہیں تین تین لاکھ روپے ماہانہ ہوں گی۔''
''راج با!'' کنور ریاض تیزی سے بولا۔ ''اگر میرے ہاتھ میں کوئی اکاؤنٹ نہیں رہنے دیا گیا تو راجا انڈسٹریز بہت بڑے خسارے سے دوچار ہو جائے گی۔ وہ پیسا واپس نہیں آسکے گا جو میں ایک پارٹی کو دے چکا ہوں۔''
''صبر کر لیا جائے گا اس پر۔'' راجا صاحب نے کہا۔
''میں نہیں چاہتا کہ اس سے زیادہ خراب صورتِ حال سے دوچار ہونا پڑے۔''
''اس سے زیادہ خراب کیا ہو سکتا ہے؟''
راجا صاحب کنور ریاض کو گھورنے لگے، پھر بولے۔
''تم جس پارٹی کو فنڈز دیتے رہے ہو، اس کی مدِمقابل اور اس کی ٹکر کی سیاسی پارٹی ایک ہی ہے اور اس کے دو اہم رہنماؤں کو گزشتہ دنوں قتل کیا جا چکا ہے۔ الزامات اسی پارٹی پر لگائے جا رہے ہیں جس کے ہم درد تم بنے بیٹھے ہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ جو قتل ہو چکے ہیں، ان میں تمہیں بھی شاملِ تفتیش کر لیا جائے!''
''اس سے کچھ نہیں ہوگا۔'' کنور ریاض نے کہا۔ ''وہ قتل میری پارٹی کو پھنسانے کے لیے کروائے ہیں کسی نے!''
''بہت خوب!'' راجا صاحب نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اب وہ پارٹی تمہاری بھی ہو گئی!'' لفظ ''تمہاری'' پر زور دیا گیا تھا۔
کنور ریاض نے بے باکی سے جواب دیا۔ ''یقیناً میں اسے اپنی پارٹی سمجھتا ہوں ورنہ اسے اتنے فنڈز کیوں دیتا!''
''تمہاری تنخواہ تین لاکھ روپے مقرر کی جا رہی ہے۔ اسی میں سے دیتے رہنا فنڈز۔'' راجا صاحب نے تلخی سے کہا۔
''تو اب میں خود کو ملازم سمجھوں؟''
''جب تک میں زندہ ہوں۔''
''تو پھر اب مجھے یہ بھی سوچنا پڑے گا کہ ملازم کو اپنے مالک کے ساتھ اس کے گھر میں رہنا چاہیے یا نہیں!''
راجا صاحب نے کچھ چونک کر اس کی طرف دیکھا، پھر سر ہلا کر بولے۔ ''ٹھیک ہے۔ تم اس حد تک آگے جا چکے ہو کہ تمہاری اس بات پر مجھے حیرت نہیں ہونا چاہیے۔ تمہارے بڑے بھائی نے میرے فیصلے کے خلاف اب تک آواز نہیں اٹھائی!''
''بڑے جو ہیں۔'' کنور ریاض نے نوکیلے سے انداز میں کہا۔
کنور الیاس اس وقت بھی سر جھکائے ہوئے تھا۔ کاکا خلیل کی نظریں بھی جھکی ہوئی تھیں۔ چہرے پر کسی قسم کے تاثرات نہیں تھے۔
''کیا اب میں جاؤں؟'' کنور ریاض کھڑا ہو گیا۔

''کھڑے ہونے کے بعد پوچھ رہے ہو؟'' راجا صاحب نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ کنور ریاض کچھ تلملا کر بیٹھ گیا۔

راجا صاحب بولے۔ ''اس وقت تم جو بدمزہ ہوئے ہو، اس کا اثر گھر کی فضا پر نہیں پڑنا چاہیے۔ کسی کے علم میں نہیں آئے کہ اس وقت کیا باتیں ہوئی ہیں، اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب تم دونوں اس کا ذکر اپنی بیویوں سے بھی نہ کرو۔''

''اگر میں نے یہاں سے چلے جانے کا فیصلہ کیا تو بات تو پھیلے گی۔'' کنور ریاض نے کہا۔

راجا صاحب بے حد غصے میں کچھ کہتے لیکن کنور الیاس جلدی سے بول پڑا۔ ''میں چھوٹے کنور کو سمجھاؤں گا راج با!''

''اب تک سمجھاتے ہی رہے ہو!'' راجا صاحب نے اسے گھور کر دیکھا۔ کنور الیاس نے نظریں جھکا لیں۔

راجا صاحب پھر دونوں بھائیوں کی طرف متوجہ ہوئے۔ ''اب تم دونوں جا سکتے ہو۔''

ان دونوں کے رخصت ہونے کے بعد بھی کاکا خلیل وہیں کھڑا رہا۔

راجا صاحب نے اس کی طرف دیکھا۔ ''تم کچھ کہنا چاہتے ہو؟''

''جی راجا صاحب!'' کاکا خلیل نے کہا۔ ''آپ کیونکہ گھر کے ماحول میں کوئی غیر معمولی فضا نہیں چاہتے اس لیے میرا خیال ہے کہ بچوں کو ہاکس بے جانے کی اجازت دے دیں گے۔''

راجا صاحب نے اس کی طرف دیکھا۔ ''تم مبہم بات کر رہے ہو کاکا خلیل!''

کاکا خلیل نے کہا۔ ''یہ اورنگزیب میاں کی خواہش ہے کہ سب بہن بھائی ہفتے کی شام کو ہاکس بے جائیں اور اتوار کی شام تک واپس آ جائیں۔ وہ فریحہ کو بھی اپنے ساتھ لے جا رہے ہیں۔''

راجا صاحب نے کچھ سوچتے ہوئے کاکا خلیل کے چہرے پر نظریں جمائے رکھیں، پھر آہستگی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ یہ گویا اجازت کا اشارہ تھا۔

کاکا خلیل نے پوچھا۔ ''مجھے اجازت ہے؟''

''جاؤ!''

کاکا خلیل مؤدبانہ انداز میں جھکا اور کمرے سے جانے لگا۔ راجا صاحب کی نظریں اس پر جمی رہیں۔

کمرے سے نکلتے ہی کاکا خلیل نے کنور ریاض کو اپنے سامنے پایا تو جھجک کر رک گیا۔

''چلتے رہیے کاکا جی!'' کنور ریاض نے قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''میں آپ ہی کا انتظار کر رہا تھا۔ دو ایک باتیں کرنا ہیں۔''

کاکا خلیل کے چہرے پر سختی کا تاثر ابھر آیا۔

''یہ فریحہ کون ہے؟'' کنور ریاض نے پوچھا۔ ''آپ کی بیٹی سامعہ سے بھی کافی مشابہت ہے اس میں اور راج با سے بھی!''

کاکا خلیل نے ہونٹ بھینچ لیے۔

جب کنور ریاض نے محسوس کر لیا کہ جواب میں کچھ سننے کو نہیں ملے گا تو اس نے دوسرا سوال کیا۔ ''سامعہ کی شادی تو کر دی ہوگی آپ نے!''

''اس کا انتقال ہو چکا ہے۔'' جواب دیتے ہوئے کاکا خلیل کے ہونٹوں میں لرزش تھی۔

کنور ریاض چونکا۔ ''کب؟''

جواب اس سوال کا بھی نہیں دیا گیا۔

کاکا خلیل نے کہا۔ ''اگر آپ کو فریحہ کے بارے میں مزید کوئی بات کرنا ہے تو مناسب ہوگا کہ راجا صاحب سے کیجیے!''

کنور ریاض بولا۔ ''گویا راج با کو...''

کاکا خلیل نے اس کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی یکایک اپنی رفتار بڑھائی اور کافی آگے نکل گیا۔

کنور ریاض جھنجلائے ہوئے سے انداز میں اپنی جگہ پر رک گیا اور جاتے ہوئے کاکا خلیل کو گھورتا رہا۔

☆☆☆

سنیچر کے دن دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد دو کاریں ہاکس بے روانہ ہوئیں۔ ایک کار میں نرگس، الماس اور شاہ زیب تھے۔ وہ کار شاہ زیب کی تھی۔ اورنگزیب دوسری کار میں فریحہ کے ساتھ بیٹھ گیا تھا جو فریحہ کے لیے ہی خریدی گئی تھی۔ ڈرائیونگ بھی وہی کر رہی تھی۔ الماس نے ہی اورنگزیب کو فریحہ کے ساتھ تنہا جانے کا موقع دیا تھا اور شاہ زیب کی کار میں بیٹھ گئی تھی۔

''اچھی ڈرائیونگ کرتی ہو تم!'' اورنگزیب نے بات چھیڑی۔ ''گاڑی کی رفتار ٹریفک کے فلو سے ہم آہنگ رہنا چاہیے اور یہ کام تم جانتی ہو۔''

''شکریہ۔'' فریحہ خفیف سا مسکرائی۔

''فریحہ!'' اورنگزیب بڑی سنجیدگی سے بولا۔ ''میں چاہتا تھا کہ تم سے کسی وقت تنہائی میں بات کرنے کا موقع ملے!''

''کوئی خاص بات کرنا چاہتے ہیں؟''
''ہاں...''
''کہیے!''
''تم ہمارے گھر کا ایک پُراسرار کردار ہو۔''
فریحہ ہنس پڑی۔ ''اچھا!''
''تم نے اپنے بارے میں کسی کو کبھی کچھ نہیں بتایا۔''
فریحہ سنجیدہ نظر آئی۔ ''مجھے منع کیا گیا ہے۔''
''کس نے منع کیا ہے؟ راج دانے؟''
''اس گھر میں اور کس کا حکم چلتا ہے!''
''تمہاری والدہ اور...''
''پلیز!'' فریحہ نے اس کی بات کاٹی۔ ''میری ذات کے علاوہ کسی بھی موضوع پر بات کریں گے تو میں ضرور جواب دوں گی۔''
''کاکا جی کے بارے میں بات کروں؟'' اورنگزیب مسکرایا۔ ''یا یہ بھی تمہاری ذاتی بات ہے؟''
''وہ میرے نانا ہیں۔'' فریحہ نے جواب دیا پھر بولی۔ ''بس! اس کے علاوہ میں ان کے بارے میں کوئی اور بات نہیں کروں گی۔''
''یہ جواب تو تم نے غالباً اس لیے دے دیا کہ الماس کے سامنے تم انہیں نانا کہہ کر مخاطب کر چکی ہو۔ بعد میں تم نے بات بنادی تھی لیکن الماس کو اندازہ ہو گیا تھا۔''
''میں جانتی ہوں وہ سمجھ گئی ہوگی۔ اسی لیے میں نے اس سوال کا جواب دے دیا۔ آپ بالکل ٹھیک سمجھے ہیں۔''
''کیا کاکا جی...''
فریحہ نے فوراً بات کاٹی۔ ''آج موسم بھی کافی خوشگوار ہے۔''
اورنگزیب اس طرح بات کٹنے پر بے ساختہ مسکرا پڑا۔
''اچھا ٹھیک ہے۔'' وہ ہنس کر بولا۔ ''اب میں تم سے ایسی کوئی بات نہیں کروں گا جس میں تمہارے ماضی سے متعلق کوئی سوال ہو۔''
''موسم کے بارے میں کیا خیال ہے!''
''اس موسم میں دل گدگدانے لگتا ہے۔'' اورنگزیب نے شوخ لہجے میں کہا۔ ''خاص طور سے جب ساتھی بھی پسند کا ہو۔''
فریحہ یک بہ یک بہت سنجیدہ نظر آنے لگی۔
''ایک راز کی بات بتاؤں آپ کو۔'' اس کا لہجہ بہت گمبھیر تھا۔ ''نہ جانے کیوں، جی چاہتا ہے آپ پر اعتماد کرلوں۔''

''یہ تو خوش قسمتی ہے میری!'' اورنگزیب جو اس کی سنجیدگی دیکھ کر سٹپٹایا تھا، مسکرا پڑا۔
فریحہ بولی۔ ''میں کسی سے محبت کرتی ہوں۔''
''صاف صاف نام لے لیں اس کا! میں منتظر ہوں۔'' اورنگزیب غلط فہمی کا شکار ہو گیا تھا۔
فریحہ نے کہا۔ ''بس اتنا بتا سکتی ہوں کہ اس کا نام الف سے شروع نہیں ہوتا۔ وقت آئے گا جب میں آپ کو اس سے ملاؤں گی۔''
اورنگزیب کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے دل و دماغ کو ہی نہیں سارے وجود کو دھچکا لگا ہو۔ وہ گمان بھی نہیں کر سکتا تھا کہ فریحہ اپنی کسی سے محبت کا اظہار اتنی بے باکی سے کر بیٹھے گی۔ اس اظہار کا ایک ہی مطلب تھا کہ وہ اورنگزیب کو اب اس سے زیادہ بات کرنے یا بے تکلف ہونے کا موقع نہیں دینا چاہتی تھی۔
اورنگزیب کھڑکی کے باہر دیکھنے لگا۔ اس وقت اس کی حالت عجیب ہو گئی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے سرِعام تھپڑ مار دیا ہو۔
''کیا آپ کو یہ جان کر خوشی نہیں ہوئی؟'' فریحہ بولی۔
''نہیں تو، ایسی کوئی بات نہیں۔'' اورنگزیب اس کی طرف دیکھتے ہوئے زبردستی ہنسا۔
''آپ میری بات سن کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگے!''
''بس میں چونک گیا تھا۔ اپنے چہرے کے تاثرات تم سے چھپانے کے لیے باہر دیکھنے لگا تھا۔''
''چونکنے کی اس میں کیا بات تھی؟''
''چونکا اس بات پر تھا کہ آپ نے اس معاملے میں مجھے اپنے راز میں کیوں شریک کرلیا!''
''میں چاہتی تھی کہ کسی کو اپنا راز دار بناؤں۔ کسی کو اپنا سمجھوں!''
''اس حد تک اپنا سمجھنے کا شکریہ۔''
''میں آپ سے چھوٹی ہوں۔ مجھ سے اس طرح بات نہ کیجیے۔''
''شکریہ تو کسی کا بھی ادا کیا جا سکتا ہے۔ اس سے عمر کا کوئی تعلق نہیں۔''
''آپ کو موسیقی کس قسم کی پسند ہے؟'' فریحہ نے موضوع بدل دیا۔
اورنگزیب ہنس پڑا۔ وہ اسی طرح اپنی کیفیت ختم کرنا چاہتا تھا جو فریحہ نے اپنی محبت کا اظہار کرکے اس پر طاری کی تھی۔

فریحہ بولی۔ ''اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟''

''دراصل۔'' اورنگزیب نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''دراصل میرے جواب سے تم مجھے نہایت غیر معقول آدمی سمجھو گی جو موسیقی سے لگاؤ نہ رکھتا ہو، اسے ایسا ہی سمجھا جاتا ہے۔ میں ہر قسم کی موسیقی سن لیتا ہوں لیکن کسی بھی قسم کی موسیقی سے لطف اندوز نہیں ہوتا۔''

''مجھے لائٹ کلاسیکل موسیقی پسند ہے۔ نرگس، الماس اور شاہ زیب کو آج کل کی موسیقی پسند ہے۔ اسی لیے میں ایک چھوٹا ٹیپ ریکارڈر اور آڈیو کیسٹ اپنے ساتھ لے کر آئی ہوں۔ نرگس اور شاہ زیب نے بھی اپنے ٹیپ ریکارڈر ساتھ لیے ہیں لیکن ان کے پاس کیسٹ صرف نئی طرز کے ہیں۔ میں تو وہ سن کر بہت بور ہوتی ہوں۔ میں نے تھوڑی بہت موسیقی سیکھی بھی ہے۔''

''واہ! پھر تو کچھ سناؤ۔''

فریحہ ہنسی۔ ''اتنی اچھی آواز نہیں ہے میری۔ اسی لیے میں نے زیادہ نہیں سیکھا البتہ اس کا علم ضرور حاصل کیا ہے۔''

''سنتا آیا ہوں کہ یہ علم بہت گہرائی رکھتا ہے۔ مجھے اس کے بارے میں جاننے کی خواہش ضرور ہے۔ کم از کم بنیادی باتیں ضرور جاننا چاہتا ہوں۔''

''میں جس حد تک جانتی ہوں، وہ بتا سکتی ہوں آپ کو!''

اس طرح ہاکس بے تک کے سارے راستے ہی موضوعِ گفتگو زیادہ تر موسیقی کی مبادیات اور راگ راگنیوں کے بارے میں رہا۔

☆☆☆

راجا مظفر حسین خان کے گھر کے دونوں ملازموں نے ہٹس کی صفائی کر کے ایک ہٹ میں دو اور دوسری ہٹ میں تین بستر لگا دیے تھے۔ انہیں یہ ہدایت اورنگزیب ہی نے دی تھی۔ الماس، نرگس اور فریحہ ایک ہٹ میں سوتیں جبکہ دوسرے ہٹ میں لگے ہوئے بستر اورنگزیب اور شاہ زیب کے لیے تھے۔

کاروں سے اتارا جانے والا نجی نوعیت کا سامان اسی مناسبت سے دونوں ہٹس میں پہنچا دیا گیا۔ جو چیزیں ''مشترک'' تھیں وہ ہٹس کے برآمدوں میں رکھ دی گئیں۔ ملازموں کے بستر بھی دونوں ہٹس کے برآمدوں میں تھے۔ ان میں ایک بستر اس چوکیدار کا بھی تھا جو ان ہٹس کی حفاظت کے لیے وہیں رہتا تھا۔

وہ سب دن کی روشنی ہی میں ہاکس بے پہنچ گئے تھے۔

انہوں نے خاصا وقت سمندر کی لہروں سے کھیلنے میں گزارا۔ ایک دوسرے سے ایسی مہذبانہ چہلیں بھی ہوتی رہیں جو بہن بھائی ایک دوسرے سے کر سکتے تھے البتہ نرگس سے شاہ زیب کی چھیڑ چھاڑ کی نوعیت کچھ مختلف تھی۔ یہ اب اورنگزیب کے لیے بھی راز نہیں رہا تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔

ان ساری تفریحات کے باوجود اورنگزیب پوری طرح لطف اندوز نہیں ہو رہا تھا۔ رہ رہ کر اسے فریحہ کی یہ بات یاد آجاتی تھی کہ وہ کسی اور سے محبت کرتی تھی۔

بیشتر وقت انہوں نے ہٹس سے باہر رہ کر ہی گزارا۔ کھانا بھی ساحل پر ایک بڑی سی چادر بچھا کر کھایا۔ اس کے بعد چائے پینے کے دوران میں تاش کھیلنا شروع کیا۔ اسی دوران میں نرگس ہٹ سے شاہ زیب کا ٹیپ ریکارڈر اور چند کیسٹ اٹھا لائی تھی۔ اورنگزیب نے دیکھا تھا کہ اسے یہ اشارہ شاہ زیب سے ملا تھا۔

''یہ گانے ہیں یا ہاہا کار۔'' فریحہ منہ بنا کر بولی۔ ''ذرا آواز ہی کم کر دو نرگس! میرے دماغ پر ہتھوڑے برس رہے ہیں۔''

نرگس نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ آواز کم کر دی۔ ٹیپ ریکارڈر شاہ زیب اور نرگس کے درمیان میں رکھا ہوا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد شاہ زیب نے اپنی دانست میں فریحہ سے نظر بچا کر آواز پھر تیز کر دی۔ اورنگزیب نے محسوس کیا کہ فریحہ سے شاہ زیب کی حرکت پوشیدہ نہیں رہی تھی۔ اس کے چہرے سے بیزاری کا اظہار ہونے لگا۔ کارڈ غلط سلط پھینکنے لگی۔ وہ کھیل میں ذہنی طور پر حاضر نہیں رہی تھی۔

اورنگزیب کو شاہ زیب کی حرکت بری لگی مگر اس نے کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا۔ اب وہ یہی کوشش کرنا چاہتا تھا کہ فریحہ کی حمایت کے معاملے میں خود کو لیے دیے رکھے۔

''اب دل نہیں لگ رہا ہے۔'' فریحہ بولی۔ ''میں جا کر لیٹتی ہوں۔'' وہ پتے پھینک کر اٹھ گئی۔ اس کے اٹھ جانے کا سبب بھی کی سمجھ میں آگیا۔

''جانے کیوں!'' شاہ زیب مضحکہ خیز سی سنجیدگی کے ساتھ بولا۔ ''فریحہ کو موسیقی سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ خیر! ہم تو کھیل جاری رکھیں گے۔'' وہ پتے بانٹنے لگا۔

ان کے دونوں ملازم اور ہٹس کا چوکیدار ان لوگوں سے کافی فاصلے پر بیٹھے گپ شپ کر رہے تھے۔

فریحہ کے اٹھ جانے کے بعد اب اورنگزیب کا دل بھی کھیل میں نہیں لگ رہا تھا لیکن اس نے کھیل سے خود کو اس

لیے الگ نہیں کیا کہ الماس کو اسے چھیڑنے کا جواز مل جاتا۔

فریحہ کی ہٹ سے چالیس سال پرانے ایک گیت کی آواز آنے لگی۔ وہ راستے میں اورنگزیب کو بتا بھی چکی تھی کہ وہ اپنی پسند کے کیسٹ لے کر آئی تھی۔

''لو۔'' اورنگزیب نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''تم کہہ رہے تھے کہ فریحہ کو موسیقی سے دلچسپی نہیں ہے۔''

''یہ کوئی موسیقی ہے!'' نرگس نے منہ بنایا۔

''موسیقی تو خیر ہے۔'' اس موقع پر الماس نے فریحہ کی حمایت کی۔ ''بس اپنی اپنی پسند کی بات ہے۔ فریحہ کو پرانی موسیقی پسند ہے۔''

''ارے چھوڑو بھی!'' نرگس بولی۔ ''تم چال چلو۔''

انہوں نے کھیل جاری رکھا۔

چاندنی رات تو وہ یقیناً تھی لیکن تاش کھیلنے کے لیے ان لوگوں نے ایک الیکٹرک لیمپ بھی قریب رکھ لیا تھا لیکن تھوڑی دیر بعد ہی انہوں نے محسوس کیا کہ روشنی کچھ کم ہوگئی تھی۔

''ارے!'' الماس بولی۔ ''یہ تو بادل آگئے ہیں۔''

بادلوں نے چاند کو ڈھک لیا تھا۔ زمین اس کی روشنی سے محروم ہوگئی تھی۔

''چلو ختم کرو۔'' اورنگزیب نے کہا۔ ''اب ہٹ میں بیٹھ کر گپ شپ کریں گے۔ ہوسکتا ہے کہ بارش شروع ہوجائے۔''

''یہ موسم تو نہیں ہے بارش کا۔'' الماس بولی۔

شاہ زیب ہنسا۔ ''کراچی میں بارش کا موسم نہیں ہوتا۔''

''کھیل ختم نہیں کریں گے۔'' نرگس بولی۔ ''ضروری نہیں کہ بادل آئیں تو بارش بھی ہو۔'' وہ کھڑی ہوئی۔ ''میں دوسرا لیمپ لے کر آتی ہوں۔''

اسی وقت ہٹ کی طرف سے فریحہ کی چیخ سنائی دی۔

''کیا ہوا فریحہ؟'' اورنگزیب تقریباً چیختا ہوا اٹھا۔

شاہ زیب اور الماس بھی کھڑے ہوگئے تھے۔ وہ سب ہٹ کی طرف لپکے، ملازم اور چوکیدار بھی دوڑ پڑے تھے۔

''کیا ہوگیا صاحب؟'' ایک ملازم نے چیختے ہوئے پوچھا۔

چاروں بہن بھائیوں میں سے کسی نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ انہیں کچھ معلوم ہوتا تو جواب دیتے۔ اورنگزیب کے چیختے ہوئے سوال کا بھی ہٹ کی طرف سے فریحہ کا کوئی جواب نہیں آیا تھا۔ بس ایک پرانے گیت کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

وہ سب دوڑتے ہوئے ہٹ میں داخل ہوئے۔ فریحہ اپنے بستر پر کیا، کمرے میں بھی نہیں دکھائی دی۔ اس کے سرہانے تپائی پر رکھا ہوا ٹیپ ریکارڈر اس وقت بھی بج رہا تھا۔

فریحہ ہٹ کے دوسرے کمرے میں بھی نہیں ملی۔ دوسرے کمرے میں تو کیا وہ دوسری ہٹ میں بھی نہیں تھی۔

اورنگزیب نے پاگلوں کی طرح چیخ چیخ کر فریحہ کو آوازیں دینا شروع کردیں لیکن کہیں سے جواب نہیں ملا۔ نرگس اور الماس کے چہروں پر تو ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔ شاہ زیب بھی پریشان نظر آرہا تھا۔ چوکیدار اور دونوں ملازم بھی بوکھلائے ہوئے تھے۔ چوکیدار تو سڑک کی طرف دوڑ لگا آیا تھا۔

بادل خاصے گہرے ہوگئے تھے۔ ہر طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ دور دور تک کچھ دکھائی بھی نہیں دے رہا تھا۔

قرب و جوار کی ہٹس میں سے دو تین میں کچھ لوگ موجود تھے۔ چیخ پکار سن کر وہ ٹارچیں ہاتھوں میں لیے ان کی طرف آئے اور ماجرا پوچھنے لگے۔

''ہماری ایک بہن ہے۔'' الماس نے روہانسی آواز میں ان لوگوں کو بتایا۔ ''وہ ہٹ میں تھی، ہم لوگ باہر تاش کھیل رہے تھے۔ اس کی چیخ سنائی دی تو ہم لوگ دوڑ کر آئے، پتا نہیں کہاں غائب ہوگئی ہے۔''

''اتنی جلدی کوئی کیسے غائب ہوسکتا ہے؟'' آنے والوں میں سے ایک نے تعجب کا اظہار کیا۔

جو لوگ ان کے قریب آئے تھے، آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے۔

''پولیس کو فون کریں بھیا!'' شاہ زیب نے بوکھلائے ہوئے لہجے میں اورنگزیب سے کہا۔

''پہلے راج دا کو کرو۔'' اورنگزیب نے کہا۔ ''پھر جلدی سے اپنا موبائل نکالتا ہوا بولا۔ ''ٹھہرو! میں کرتا ہوں۔''

الماس بھی کبھی گھبرائے ہوئے انداز میں اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے اب بھی فریحہ کو آوازیں دیے جارہی تھی۔

اورنگزیب نے راجا مظفر حسین سے رابطہ کرکے کہا۔ ''کچھ گڑبڑ ہوگئی ہے راج دا!''

''کیا ہوا؟'' راجا صاحب نے پوچھا۔ ''تم بہت گھبرائے ہوئے لگ رہے ہو۔ کہاں سے بول رہے ہو؟''

''ہم ہاکس بے پر ہی ہیں راج دا! فریحہ کہیں غائب ہوگئی ہے۔ ہم نے اس کی بس چیخ سنی تھی۔''

''کیا کہہ رہے ہو؟'' راجا صاحب کی آواز سے بے چینی صاف ظاہر ہوئی۔ اورنگزیب نے جلدی جلدی سارا واقعہ بیان کردیا۔

راجا صاحب نے جلدی سے پوچھا۔ ''کتنی دیر ہوچکی ہے اس بات کو؟''

''ہم نے گھڑی نہیں دیکھی تھی راج دا! شاید دس منٹ سے زیادہ ہوگئے ہیں۔ کیا ہمیں پولیس کو فون کردینا چاہیے؟''

''تم کچھ مت کرو۔ بس ڈھونڈواسے۔ شاید کہیں ہو۔ میں وزیرِداخلہ کوفون کرتا ہوں۔''

اس سے پہلے کہ اورنگزیب کچھ کہتا، دوسری طرف سے رابطہ منقطع ہوچکا تھا۔ اورنگزیب کے چکرائے ہوئے دماغ کو اس خیال سے کچھ تسکین ملی کہ اس صورتحال میں راجا صاحب کو براہِ راست وزیرِداخلہ کا خیال آیا تھا۔ ان کے تعلقات اتنے تھے کہ وہ اگر چاہتے تو وزیراعظم سے بھی رابطہ کرسکتے تھے۔

وزیرِداخلہ کی وجہ سے یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ پولیس غیر معمولی تیز رفتاری سے کام نہیں لیتی۔ پولیس کی دو گاڑیاں توقع سے کچھ پہلے ہی وہاں پہنچ گئیں۔ آنے والوں میں ایک ڈی ایس پی بھی تھا۔

فریحہ کی اس طرح ''گمشدگی'' حیرت انگیز تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ہوا میں تحلیل ہوگئی ہو۔ پولیس پوچھ گچھ اور ہٹ کا مکمل جائزہ اور اپنے ''روٹین ورک'' کے بعد اس امکان کے اظہار کے علاوہ کچھ نہیں کرسکی کہ فریحہ کو غالباً اغوا کیا گیا تھا۔ فوری طور پر اسے کوئی سراغ نہیں مل سکا۔

☆☆☆

سراغ مل بھی نہیں سکتا تھا۔ فریحہ نے سارے کام احتیاط اور نبیل کی ہدایات کے مطابق کیے تھے۔ پرانے گیتوں کا کیسٹ اسے نبیل ہی نے دیا تھا۔ کیسٹ کے دوسرے گیت کے بیچ میں ہی اس نے فریحہ کی چیخ کی آواز ریکارڈ کی تھی۔ چیخنے کے بعد پھر گیت تھے۔ فریحہ کو نئے گیت اور موسیقی پسند تو نہیں تھی لیکن اس نے جس رویّے کا اظہار کیا تھا، موسیقی اسے اتنی بھی ناپسند نہیں تھی۔ وہ اس نے اٹھ جانے کا ایک بہانہ بنایا تھا۔ ہٹ میں جاکر اس نے ٹیپ ریکارڈر میں لگا ہوا کیسٹ بجا دیا تھا۔ اس کے بعد جھانک کر دیکھا تھا کہ اورنگزیب وغیرہ بدستور تاش کھیلنے میں مصروف تھے اور ان کے جلد اٹھ جانے کا امکان کم ہی تھا۔ یہ اندازہ لگانے کے بعد ہی فریحہ نے بجتا ہوا کیسٹ نکال کروہ کیسٹ لگا دیا تھا جو اسے نبیل نے دیا تھا۔

اس وقت بادل چھا گئے تھے اس لیے فریحہ کو آسانی حاصل ہوگئی تھی۔ وہ کھڑکی کے راستے ہٹ سے باہر نکلی تھی۔ اس وقت ہینڈی ویکیوم کلینر اس کے ہاتھ میں تھا جس سے اس نے کھڑکی کے نیچے اپنے قدموں کے نشان صاف کردیے تھے۔ ویکیوم کلینر کی آواز اتنی کم تھی جو اورنگزیب وغیرہ کے کانوں تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔

قدموں کے نشانات صاف کرتے ہوئے وہ تیزی سے اس طرف بڑھ گئی تھی جہاں چھوٹے بڑے پتھر پھیلے ہوئے تھے۔ وہاں نبیل اس کا منتظر تھا۔ وہ اسے اپنے ساتھ تیزی سے سڑک کی طرف لے گیا جہاں کسی بیوریج کمپنی کا ٹرک کھڑا تھا۔ اس سارے کام میں بہ مشکل اتنا ہی وقت صرف ہوا تھا کہ جب اورنگزیب وغیرہ نے فریحہ کی ریکارڈڈ چیخ سنی تھی، اس وقت ٹرک وہاں سے روانہ ہوچکا تھا۔

نبیل کے جسم پر پہلے ہی سے بیوریج کمپنی کے ڈرائیور کی وردی تھی۔ فریحہ نے اپنے لباس پر ہی مردانہ لباس پہن لیا تھا جس پر جگہ جگہ کالک لگی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے بال اس ٹوپی میں چھپا لیے تھے جو ٹرک میں اس کے لیے لباس کے ساتھ ہی موجود تھی۔ اس وقت اس کا چہرہ میک اپ سے بے نیاز تھا۔

ہٹ میں جاکر اس نے کیسٹ بجانے کے بعد پہلا کام یہی کیا تھا کہ اپنا منہ اچھی طرح دھولیا تھا۔ چہرے پر دو ایک جگہ کاجل کے دھبّے لگا لیے تھے۔ اس وضع قطع میں وہ ڈرائیور کا ساتھی کلینر لڑکا نظر آنے لگی تھی۔

راہ میں ایک جگہ پولیس والوں نے روکا اور سرسری جانچ پڑتال کے بعد نکل جانے دیا۔

شہری حدود میں داخل ہونے سے پہلے پولیس کی دو گاڑیاں بہت تیزی سے ہاکس بے کی طرف جاتی نظر آئی تھیں اور انہوں نے سمجھ لیا تھا کہ معاملہ کیا ہوگا۔

ان کی منزل ایک بنگلا تھی جس کا گیراج اتنا بڑا تھا کہ بیوریج کا ٹرک اس میں آسانی سے آگیا۔

اب فریحہ اور نبیل اسی بنگلے کے ایک کمرے میں موجود تھے۔

''یہاں تک صورتِ حال میری منصوبہ بندی کے عین مطابق ہوگئی۔'' نبیل نے کہا۔ ''اب تم کپڑے تبدیل کرلو۔''

''میں ہیجان میں مبتلا ہوں نبیل!'' فریحہ نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''اب تو مجھے بتا دو کہ یہ سب تم نے آخر کیوں کیا ہے؟''

''تم کپڑے تبدیل کرلو پہلے!'' نبیل نے کہتے ہوئے باتھ روم کی طرف اشارہ کیا۔ فریحہ کے چہرے سے فکرمندی صاف ظاہر ہو رہی تھی۔ اس نے ایک طویل سانس لی اور اپنے کپڑے اٹھا کر باتھ روم میں چلی گئی۔

نبیل نے اپنی جیب سے موبائل نکال کر دیکھا۔ یہ اس کی قطعی غیرارادی حرکت تھی۔ دماغ میں صرف یہ خیال تھا کہ مسٹر ڈارک نے اسے اب تک فون کیوں نہیں کیا؟

فریحہ کپڑے تبدیل کر کے باتھ روم سے نکل آئی۔ اس نے اپنا چہرہ اور بال بھی درست کر لیے تھے۔

''ہاں نبیل!'' وہ فوراً بولی۔ ''اب مجھے زیادہ دیر تک نہ الجھائے رکھو۔''

''فریحہ!'' نبیل نے اس سے گفتگو کرنے کے لیے خود کو تیار کرلیا تھا۔ اس نے فریحہ کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ''تم اندازہ لگا سکتی ہو کہ اچانک میرے پاس اتنا پیسا کہاں سے آ گیا؟ میں اتنے ٹھاٹھ باٹ سے کیسے رہنے لگا؟''

''اندازہ کیا، یقین ہے مجھے۔'' فریحہ نے سنجیدگی سے کہا۔ ''تم پیسا نہ ہونے ہی کی وجہ سے فرسٹڈ تھے۔ تمہارے پاس یہ پیسا جائز طریقے سے ہرگز نہیں آیا ہوگا۔ یقین کے باوجود میں نے تم سے یہ بات کبھی نہیں کہی لیکن یہ ڈر مجھے ہمیشہ رہا کہ تم کسی مصیبت میں نہ پھنس جاؤ۔''

نبیل نظریں جھکا کر کچھ سوچنے لگا۔

یکایک فریحہ کے چہرے کا رنگ متغیر ہوا۔ وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔ ''کیا تم واقعی کہیں پھنس گئے ہو؟''

''تم سے میں نے جو کچھ کروایا، اس کے لیے میں نے تم سے کیا کہا تھا؟''

''یہی کہ یہ سب کچھ تم میری بھلائی کے لیے کر رہے ہو!''

''اسی میں میری بھلائی مضمر تھی۔''

''صاف صاف بتاؤ نبیل!'' فریحہ نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

''میں ایک بلیک میلر کے چکر میں پھنس گیا ہوں فریحہ!'' نبیل نے متفکر نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اس کے لیے مجھے اسی نے مجبور کیا تھا کہ میں تمہیں اغوا کر کے قتل کر دوں۔''

''قتل!'' فریحہ کے منہ سے نکلا اور وہ بھونچکا سی رہ گئی۔

نبیل کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ ابھری۔ ''تم یقین کرلوگی کہ میں تمہیں قتل کر دوں گا؟''

''میں اس کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔''

''میں بھی اس کا تصور نہیں کر سکتا کہ مجھے کوئی تمہیں قتل کرنے پر مجبور کر سکتا ہے۔ میں نے یہ سب کچھ صرف اس لیے کیا ہے کہ اس بلیک میلر کو اپنے جال میں لا سکوں۔''

''یہ کیسے کرو گے تم؟ کون ہے وہ بلیک میلر؟''

نبیل نے اس کے دونوں سوال نظرانداز کر دیے اور بولا۔ ''پہلی کال میں اس نے یہی کہا تھا کہ میں تمہیں اغوا کر کے قتل کر دوں پھر اس کی دوسری کال آئی۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ اس نے تمہارے صرف قتل کی بات کیوں نہیں کی، یہ کیوں کہا کہ اغوا کر کے قتل کر دوں۔ میرے پاس اس سوال کا ظاہر ہے کہ کوئی جواب نہیں تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ راجا صاحب سے تمہارا تاوان وصول کرنا چاہتا ہے لیکن تاوان کی رقم مل جانے کے بعد بھی وہ یہ نہیں چاہتا کہ میں تمہیں چھوڑ دوں۔ وہ تاوان وصول کرنے کے بعد تمہیں قتل کروانا چاہتا ہے۔''

''اور تم کیا کرنا چاہتے ہو؟''

''میں اسے تمہارے سامنے لا کر ذلیل کرنا چاہتا ہوں۔''

''کیا وہ...''

فریحہ کی بات پوری ہونے سے پہلے نبیل کے موبائل کی گھنٹی بجنے لگی۔ نبیل نے جلدی سے موبائل نکال کر نمبر دیکھا۔

''وہی ہے؟'' فریحہ نے جلدی سے پوچھا۔

''اجنبی نمبر ہے۔ وہی ہوگا۔ ہمیشہ نئے نمبر سے فون کرتا ہے۔'' نبیل نے جواب دینے کے بعد موبائل آن کرتے ہوئے اپنے کان سے لگایا۔ ''ہیلو!'' وہ بولا۔

''شاندار!'' دوسری طرف سے مسٹر ڈارک کی آواز آئی۔ ''حیران کن طریقے سے اغوا کیا ہے تم نے اسے۔ کہاں ہو اس وقت؟''

''بہتر ہوگا کہ موبائل پر یہ بات نہ کی جائے! یہ بتاؤ کہ اب کیا کرنا ہے؟''

''فون کرو راجا مظفر کو!'' آواز آئی۔ ''اس سے پچاس کروڑ طلب کرو۔ دھمکی دے دو کہ تاوان نہ دیا گیا تو فریحہ کو قتل کر دیا جائے گا۔''

''تاوان کہاں اور کیسے وصول کرنا ہے؟'' نبیل نے پوچھا۔

فریحہ دم سادھے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

نبیل سے کہا گیا۔ ''یہ منصوبہ بھی تم خود بناؤ۔''

''ٹھیک ہے۔ میں سوچ کر فون کرتا ہوں راجا مظفر کو۔''

''میں تم سے کتنی دیر میں معلوم کروں؟''

''ایک گھنٹے بعد۔''

''اتنی دیر؟''

''تم نے مجھ پر ہی سب کچھ چھوڑ دیا ہے۔ سوچنے میں کچھ وقت تو لگے گا۔''

''رائٹ۔'' دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔

نبیل نے موبائل اپنے کان سے ہٹایا ہی تھا کہ فریحہ بول پڑی۔ ''کیا سوچنے میں وقت لگے گا؟''

نبیل نے وہ ساری باتیں دہرا دیں جو مسٹر ڈارک سے ہوئی تھیں۔

''پچاس... پچاس کروڑ؟'' فریحہ کے منہ سے نکلا۔

نبیل نے کچھ سوچتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

فریحہ نے پوچھا۔ ''اب کیا کرو گے؟''

''بلیک میلر نے خود ہی سب کچھ مجھ پر چھوڑ دیا ہے لیکن میں نے پہلے ہی سب کچھ سوچ لیا تھا۔''

''کیا سوچا ہے؟''

نبیل نے سر ہلایا اور موبائل پر کوئی نمبر ملانے لگا۔ فریحہ اس پر نظریں جمائے رہی۔ نبیل نے اپنی جیب سے کسی دھات کی بنی ہوئی ڈیوائس موبائل کے ماؤتھ پیس پر رکھ دی تھی۔ فریحہ نے اسے بولتے سنا۔

''راجا صاحب! میں نے فریحہ کو اغوا کر لیا ہے۔ آپ کے لیے میرا یہ پیغام ریکارڈڈ ہے۔ اس کا جواب آپ کو آدھے گھنٹے بعد اس فون نمبر پر دینا ہے جو میں ابھی بتاؤں گا۔ اگر آپ پچاس کروڑ روپے دینے کے لیے تیار ہوں تو فریحہ کو زندہ چھوڑ دیا جائے گا۔ دوسری صورت کیا ہوگی، اس کا اندازہ آپ خود لگا سکتے ہیں۔ اگر آپ نے پولیس سے رابطہ کیا تو یہ فریحہ کے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔ پولیس ٹیلی فون نمبر سے اس جگہ کا پتا نکالے گی جہاں یہ ٹیلی فون ہے۔ وہ وہاں چھاپا مارے گی یا وہاں کی نگرانی کرے گی، یا وہ جو کچھ بھی کرے، مجھے اس کا علم ہو جائے گا۔ اب آپ کاغذ قلم سنبھال لیں۔ میں ذرا سا رک کر آپ کو فون نمبر بتاتا ہوں۔'' نبیل نے پندرہ سیکنڈ رک کر فون نمبر بتایا اور رابطہ منقطع کر دیا۔

فریحہ الجھے ہوئے انداز میں بولی۔ ''یہ تم نے کیوں کہا کہ یہ ریکارڈڈ پیغام ہے اور یہ تم نے ماؤتھ پیس پر کیا لگایا تھا؟''

''یہ۔'' نبیل نے ڈیوائس اپنی جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ ایک ایسا آلہ ہے جس کی وجہ سے میری صحیح آواز راجا صاحب تک نہیں پہنچے گی۔ کبھی وہ اپنے سامنے مجھے بولتے ہوئے سنیں تو آواز نہیں پہچان سکیں گے۔''

''اور ریکارڈڈ پیغام کا کیا مطلب؟''

نبیل خفیف سا مسکرایا۔ ''یہ پیغام انہیں اب پہنچ رہا ہوگا۔''

''کیا مطلب؟'' نبیل نے جواب دیا۔ ''میں نے ابھی انہیں نہیں، کسی اور جگہ فون کیا تھا۔ وہ ایک چھوٹا سا فلیٹ ہے۔ ٹیلی فون وہیں ہے۔ میں نے اسی نمبر پر رنگ کر کے اس کی آنسرنگ مشین پر اپنا پیغام ریکارڈ کرایا ہے۔ اس انسٹرومنٹ میں راجا صاحب کا موبائل نمبر فیڈ کر چکا ہوں۔ وہ انسٹرومنٹ ایسا ہے کہ وہ از خود راجا صاحب کا موبائل نمبر ڈائل کرے گا اور جب راجا صاحب کال ریسیو کریں گے تو وہ ٹیپ گھومنے لگے گا جس پر میرا پیغام ریکارڈ ہوا ہوگا۔ وہ راجا صاحب سن لیں گے۔''

''اور اسی نمبر پر تمہیں جواب دیں گے؟''

''نہیں۔ وہ دوسرا ٹیلی فون ہے۔ اس میں بھی آنسرنگ مشین کا انسٹرومنٹ لگا ہوا ہے۔ اس میں میرا موبائل نمبر فیڈ ہے۔ راجا صاحب کو اس فون پر اپنا جواب ریکارڈ کرانا ہوگا۔ پیغام ریکارڈ کرنے کے بعد وہ انسٹرومنٹ میرے موبائل سے رابطہ کرے گا اور راجا صاحب کا ریکارڈڈ جواب مجھ تک پہنچا دے گا۔''

''مائی گاڈ نبیل!'' فریحہ پلکیں جھپکائے بغیر نبیل کو حیرت سے دیکھتی ہوئی بولی۔ ''تم اس قسم کے معاملوں میں اتنے پروفیشنل بن گئے ہو؟''

''حالات سب کچھ سکھا دیتے ہیں فریحہ!'' نبیل نے سنجیدگی سے کہا۔

''تم بلیک میلر کو اپنے جال میں کس طرح لاؤ گے؟''

''منصوبہ میرے دماغ میں ہے۔ ابھی میں اس کے ہر پہلو پر غور کر رہا ہوں۔ مجھے بے داغ کام کرنا ہے۔ میں سب کچھ سوچ لوں، پھر تمہیں بتا دوں گا۔ اب تم جا کر سو جاؤ۔ اس گھر کا ایک بیڈروم تمہارے لیے...''

''مجھے ابھی نیند نہیں آ سکتی۔'' فریحہ نے کہا۔ ''میں اس وقت تک تمہارے قریب رہنا چاہتی ہوں جب تک جوابی پیغام تمہیں ملے۔''

''اچھا۔'' نبیل نے کھوئے ہوئے سے انداز میں کہا اور کچھ سوچتا رہا۔

☆☆☆

راجا صاحب کے گھر میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ معلوم تو ان کی بیگمات کو بھی ہوگیا تھا لیکن اس مسئلے پر گفتگو راجا صاحب صرف اپنے بیٹوں سے کر رہے تھے۔

''میں نے فون کردیا ہے اسے!'' راجا صاحب کہہ رہے تھے۔ ''اس نے مجھے فیصلہ کرنے کے لیے آدھا گھنٹا دیا تھا۔ میں نے فون کیا تو دوسری طرف سے ریکارڈ کی ہوئی اسی کی آواز سنائی دی۔ مجھ سے کہا گیا تھا کہ میں اپنا جواب ریکارڈ کروادوں۔ میں نے یہ پیغام ریکارڈ کروایا تھا کہ سوچنے کے لیے آدھا گھنٹا بہت کم ہے اور اتنی بڑی رقم اس وقت گھر میں بھی نہیں ہے لہٰذا وہ مجھے جواب دینے کے لیے تین بجے تک کا وقت دے۔ تین چار منٹ بعد ہی پھر اس کا ریکارڈڈ پیغام ملا کہ وہ تین بجے تک انتظار کرلے گا، اس سے زیادہ ہرگز نہیں۔''

راجا صاحب کا بڑا بیٹا کنور الیاس بولا۔ ''اتنا وقت آپ نے کیوں مانگا ہے؟''

''بچے ہاکس بے سے آجائیں۔ ان سے ساری صورتِ حال کی تفصیل معلوم ہوجائے۔ ابھی انہوں نے صرف فون پر بتایا ہے کہ فریحہ کیسے غائب ہوئی۔ میں نے وزیرِ داخلہ کو تو فون کردیا تھا۔ پولیس تو حرکت میں آگئی تھی۔ مجھے اس کا بھی انتظار ہے کہ وہ لوگ کیا کرسکے! وزیرِ داخلہ اب کسی وقت بھی مجھے فون پر کچھ بتا سکتے ہیں۔''

''وزیرِ داخلہ کو آپ نے تاوان کے بارے میں نہیں بتایا؟'' کنور الیاس نے پوچھا۔

''نہیں۔'' راجا صاحب نے جواب دیا۔ ''میں فریحہ کی زندگی کا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ مجھے یہ خطرہ مول لینا چاہیے؟'' راجا صاحب نے کنور الیاس کو گھور کر دیکھا۔

کنور الیاس سٹپٹا گیا۔ ''نہیں۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ فریحہ کے بارے میں ہم لوگ تو کچھ نہیں جانتے۔ اس بارے میں فیصلہ آپ ہی کرسکتے ہیں۔''

''تم بہت خاموش ہو!'' راجا صاحب نے کنور ریاض کی طرف دیکھا جو کچھ گم صم نظر آرہا تھا۔

''جی راج با!'' کنور ریاض جلدی سے بولا۔ ''آپ نے اس بلیک میلر کو بالکل صحیح جواب دیا۔ پچاس کروڑ کے لیے فریحہ کی زندگی خطرے میں نہیں ڈالی جاسکتی۔ وزیرِ داخلہ کو بتانے کا مطلب یہ ہوتا کہ پولیس اس فلیٹ پر چڑھ دوڑتی جس کا ٹیلی فون نمبر آپ کو دیا گیا ہے۔ پولیس کے لیے اس جگہ کا پتا لگانا ذرا بھی مشکل نہیں ہوگا، اور پولیس کا وہ اقدام بلیک میلر کو غصہ دلا دیتا۔''

''اس جگہ کا پتا لگانا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔'' کنور الیاس بولا۔ ''یہ کام تو ہم خود بھی کرسکتے ہیں۔ نیومیریکل ڈائریکٹری سے معلوم ہوجاتا ہے۔''

''تمہارے پاس ہے نیومیریکل ڈائریکٹری؟''

''میرے پاس تو نہیں ہے لیکن ٹیلی فون ایکسچینج سے حاصل کی جاسکتی ہے۔''

''اتنی رات گئے...'' راجا صاحب کچھ کہتے کہتے رکے اور کچھ سوچتے ہوئے بولے۔ ''وزیرِ مواصلات کو فون کیا جائے تو وہ ڈائری اس وقت بھی مل جائے گی لیکن اس جگہ کا پتا لگا کر ہم کیا کریں گے۔ مطلب یہ کہ کیا کرسکیں گے؟''

''بچوں کو آنے دیا جائے۔'' کنور ریاض بولا۔ ''نوجوانوں کے ذہن زیادہ تیز چلتے ہیں۔''

راجا صاحب نے منہ بنایا۔ ''میں ابھی اتنا زیادہ بوڑھا نہیں ہوا ہوں۔'' پھر انہوں نے کنور ریاض کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''جا کر کاکا خلیل کو جگاؤ۔ میں نے ابھی تک انہیں کچھ نہیں بتایا ہے۔''

کنور ریاض چلا گیا۔

ذرا دیر بعد ہی کاکا خلیل پریشان سا وہاں پہنچا۔ اتنی رات گئے طلبی کسی کے لیے بھی پریشان کن ہوسکتی تھی۔ پھر اس وقت اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں جب راجا صاحب نے اسے حالات سے آگاہ کیا۔

''کیا... کیا...'' وہ پریشانی کے عالم میں رک رک کر بولا۔ ''پولیس کو اطلاع دے دی گئی؟''

''صرف گم شدگی کے بارے میں۔'' راجا صاحب نے جواب دیا۔ ''تاوان کے بارے میں کچھ نہیں بتایا گیا۔ فریحہ کی زندگی داؤ پر نہیں لگائی جاسکتی۔ سوچ سمجھ کر کوئی قدم اٹھانا پڑے گا۔ اس کی زندگی بچانے کے لیے پچاس کروڑ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔''

''راجا صاحب!'' کاکا خلیل ہراساں لہجے میں بولا۔ ''کیا اس اغوا کا مقصد صرف تاوان وصول کرنا ہوگا؟''

''بہ ظاہر تو ایسا ہی لگتا ہے۔ تمہارے دماغ میں کوئی اور خیال آیا ہے؟''

''اغوا فریحہ کو ہی کیوں کیا گیا؟ ہمیں تو اس گھر کے سبھی بچے عزیز ہیں۔ کسی کے لیے بھی پچاس کروڑ قربان کیے جاسکتے ہیں!''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' راجا صاحب نے کہا۔

''لیکن تم نے جو دلیل دی ہے، اس میں کوئی وزن نہیں۔ اگر الماس یا شاہ زیب یا ان میں سے کسی کو بھی اغوا کیا جاتا، یہ بات کہی جاسکتی تھی کہ آخر وہی کیوں!''

کاکا خلیل نے نظریں جھکالیں۔

یکا یک راجا صاحب بولے۔ ''شاید بچے آگئے!''

تیز تیز قریب آتے ہوئے قدموں کی آہٹیں ان سبھی نے سنی تھیں۔

کسی ملازم کو ہدایت کردی گئی تھی کہ وہ چاروں آئیں تو انہیں راجا صاحب کے کمرے میں بھیج دیا جائے۔ لیکن اگر یہ ہدایت نہ بھی کی گئی ہوتی تو وہ چاروں اِدھر ہی کا رخ کرتے۔ ان چاروں کے چہروں پر اس وقت بھی ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

''سکون سے بیٹھ جاؤ۔'' راجا صاحب نے ان سے کہا۔ ''پانی پی لو۔ بہت گھبرائے ہوئے ہو تم لوگ! سنبھالو خود کو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

کاکا خلیل نے ایک ملازم کو بلا کر ان چاروں کے لیے پانی منگوایا۔ اتنی دیر تک کمرے پر مرگ آسا سکوت طاری رہا۔ وہ چاروں راجا صاحب کا منہ تکتے رہے۔ جب وہ پانی پی چکے تو راجا صاحب نے کہا۔ ''اب میں تم لوگوں کو جو بات بتاؤں گا، اس سے تو تم لوگ حواس باختہ ہو جاؤ گے لیکن بہتر ہوگا کہ خود کو سنبھالے رکھو۔ پہلے تم لوگ مجھے وضاحت سے بتاؤ کہ فریحہ کیسے غائب ہوئی۔ تم بتاؤ شاہ زیب! تم اپنے بھائی بہنوں سے کچھ کم حواس باختہ ہو!''

شاہ زیب نے وہ سب کچھ بتا دیا جو پہلے ہی فون پر راجا صاحب کو بتایا جا چکا تھا۔

راجا صاحب کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ کال وزیر داخلہ کی تھی۔ راجا صاحب نے کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد فون بند کیا پھر سب سے مخاطب ہو کر بولے۔

''پولیس ابھی تک فریحہ کا کوئی سراغ نہیں لگا سکی ہے۔ ان لوگوں کو صرف ایک ٹرک کے بارے میں کچھ شکوک ہیں جو فریحہ کے اغوا کے بعد ہاکس بے سے شہر کی طرف آتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔ اتنی رات گئے اس راستے پر کوئی اور گاڑی نہیں دیکھی گئی۔ پولیس کو اس ٹرک کے بارے میں صبح ہونے کے بعد ہی کچھ معلوم ہو سکے گا۔''

اورنگزیب بولا۔ ''آپ ایسی کیا بات بتانے والے تھے جو ہمیں اور زیادہ حواس باختہ کر دیتی؟''

اس سے پہلے کہ راجا صاحب کوئی جواب دیتے، کاکا خلیل بول پڑا۔ ''راجا صاحب! بیگمات بہت پریشان ہوں گی۔ کیا میں ان کی ڈھارس بندھا آؤں؟''

راجا صاحب نے سر کے اشارے سے اجازت دی اور اس کے ساتھ ہی کہا۔ ''تاوان کے بارے میں کچھ نہ بتانا ورنہ وہ اور پریشان ہوں گی۔''

''تاوان؟'' الماس چونک کر بولی۔

باقی بہن بھائیوں کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے تھے۔

راجا صاحب انہیں اغوا کنندہ کے فون کے بارے میں بتانے لگے۔ کاکا خلیل کمرے سے نکل آیا۔ باہر آتے ہی اس کے چہرے سے پریشانی کے آثار غائب ہوگئے، لیکن سوچ بچار کا تاثر قائم رہا۔

ایک کام تو آسانی سے ہو جائے گا، وہ سوچتا ہوا تیزی سے ایک کمرے کی طرف بڑھا۔

بیگمات کے پاس جا کر ان کی ڈھارس بندھانے سے پہلے وہ پانچ سات منٹ تک خاصا مصروف رہا تھا۔ ان سب سے بات کرنے کے بعد وہ دوبارہ راجا صاحب کے کمرے میں پہنچا۔

''تین بجنے والے ہیں۔'' راجا صاحب اس وقت کہہ رہے تھے۔ ''مجھے اب اسے فون کرنا چاہیے۔''

اورنگزیب پوچھ بیٹھا۔ ''تاوان ادا کریں گے آپ؟''

راجا صاحب نے اس کی طرف دیکھا۔ ''کوئی اور راستہ ہے تمہاری نظر میں؟'' اورنگزیب نے آہستگی سے نفی میں سر ہلا دیا۔

راجا صاحب نے موبائل نکال کر نمبر ملایا۔ سب ان کا منہ تکتے رہے۔ راجا صاحب نے چند لمحے بعد بولنا شروع کیا۔ ''مجھے تمہارا مطالبہ منظور ہے۔ رقم ادا کر دی جائے گی۔ اب یہ بتاؤ کہ رقم تم کہاں لوگے؟ دوسری بات یہ کہ میں اطمینان کرنا چاہتا ہوں کہ فریحہ خیریت سے ہے اور تم نے اس کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی۔''

راجا صاحب نے رابطہ منقطع کر دیا اور سب کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ ''وہ اسی انداز میں گفتگو کر رہا ہے۔ چند منٹ میں اس کا ریکارڈڈ جواب آ جائے گا۔''

''یہ طریقہ اس نے کیوں اختیار کیا ہے؟'' اورنگزیب بولا۔

''جرائم پیشہ لوگ اپنے بچاؤ کے طریقے تو کرتے ہیں۔'' راجا صاحب نے جواب دیا۔ ''میں اندازہ لگا سکتا ہوں کہ جس فلیٹ میں ٹیلی فون ہیں، وہاں وہ خود نہیں ہوگا۔''

''ٹیلی فون ہیں؟'' اورنگزیب کا لہجہ سوالیہ تھا۔

''ہاں۔'' راجا صاحب نے جواب دیا۔ ''جب اس کا

جواب آتا ہے تو میرے موبائل پر دوسرا نمبر آتا ہے۔ میرا مطلب ہے کہ مجھے فون کرنے کے لیے اس نے جو نمبر دیا ہے، وہ کچھ اور ہے۔ دونوں نمبر الیکٹرانک انسٹرومنٹ سے منسلک ہوں گے۔ ایک میں میرا نمبر فیڈ کیا گیا ہوگا اور دوسرے میں اس نے وہ نمبر فیڈ کیا ہوگا جو اس نے مجھے بتایا ہے۔ اسی انسٹرومنٹ میں اس نے اپنا وہ نمبر فیڈ کیا ہوگا جس نمبر کا ٹیلی فون یا موبائل اس کے قریب موجود ہوگا۔''

اس وقت نرگس پہلی مرتبہ بولی۔ ''تو اس انسٹرومنٹ سے اس شخص کا نمبر معلوم کیا جاسکتا ہے۔''

''اس فلیٹ، بنگلے یا جہاں بھی وہ ٹیلی فون ہیں، وہاں جانے کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم فریحہ کی زندگی خطرے میں ڈال دیں۔ عین ممکن ہے کہ وہ شخص اس جگہ سے قریب کہیں موجود ہو۔ وہ اس جگہ نظر رکھے ہوئے ہوگا۔ کوئی بھی اس کی نظر سے بچ کر شاید وہاں نہ جاسکتا ہو۔''

شاہ زیب بولا۔ ''کہیں تاوان لے کر بھی وہ شخص دھوکا نہ دے جائے راج دا!''

''تاوان کے لیے کسی کو اغوا کرنے والے عموماً ایسا نہیں کرتے۔'' راجا صاحب نے کہا۔ ''ہاں اگر اسے فریحہ سے کوئی ذاتی دشمنی بھی ہو تو اور بات ہے۔''

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔

راجا صاحب نے جھنجلا کر پوچھا۔ ''کون ہے؟''

جواب میں باہر سے ایک ملازم کی آواز آئی۔ اس کی آواز سے ظاہر ہوا کہ وہ راجا صاحب کی ڈانٹ سے کچھ ڈر گیا تھا۔

راجا صاحب نے اس کی آواز پہچان کر کہا۔ ''آجاؤ! کیا بات ہے؟''

ملازم اندر آیا اور راجا صاحب ہی کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔ ''کنور صاحب کو ان کی بیگم یاد کررہی ہیں۔''

راجا صاحب کا منہ بن گیا۔ وہ کاکا خلیل کی طرف دیکھ کر بولے۔ ''کیا آپ ان خواتین کو تسلی دے کر نہیں آئے تھے کاکا خلیل؟''

''میں بتا کر آیا تھا راجا صاحب!'' کاکا خلیل نے جواب دیا۔

کنور ریاض اجازت طلب نظروں سے راجا صاحب کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''جاؤ!'' راجا صاحب نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کھردرے لہجے میں کہا۔

کنور ریاض شرمندہ سا وہاں سے چلا گیا۔

''جلدی آنا۔'' اس نے جاتے جاتے راجا صاحب کی آواز سنی تھی۔

لیکن اس کی واپسی سے پہلے ہی فریحہ کے اغوا کنندہ کی کال آگئی۔ راجا صاحب نے اپنے موبائل پر اس کی ریکارڈڈ آواز سنی۔

''پہلے آپ فریحہ کی باتیں سن لیجیے راجا صاحب! اس طرف سے اپنا اطمینان کرلیجیے۔'' پھر فریحہ کی قدرے کپکپاتی ہوئی آواز آنے لگی۔ ''میں بالکل ٹھیک ہوں۔ مجھے کوئی تکلیف نہیں پہنچائی گئی۔ اگر پچاس کروڑ ادا کردیے جائیں گے تو مجھے زندہ چھوڑ دیا جائے گا۔'' پھر اغوا کنندہ کی آواز آئی۔ ''سن لیا آپ نے راجا صاحب! امید ہے اب آپ مطمئن ہوگئے ہوں گے۔ اب صبح قریب آگئی ہے اس لیے رقم کی وصول یابی میں کل رات کو کرسکوں گا۔ دن گزرنے کا انتظار کیجیے! فریحہ خیریت سے رہے گی اور کل رات آپ کو مل جائے گی۔ رقم آپ کو جہاں پہنچانا ہوگی، وہ پتا آپ کو دن گزرنے کے بعد ہی بتایا جائے گا، بلکہ اس وقت سے آدھا گھنٹا پہلے جب مجھے اس جگہ وہ رقم وصول کرنا ہوگی۔ رقم کا بندوبست آپ دن میں کرلیجیے گا۔ ہاں ایک بات کا ضرور خیال رکھیے گا۔ رقم بڑے بانڈز کی شکل میں ہو تاکہ ایک بریف کیس میں آسانی سے آجائے۔ مجھے آخر میں بس یہ اور کہنا ہے کہ پولیس کو اس معاملے سے بے خبر رکھ کر آپ نے بہت اچھا کیا ورنہ آپ فریحہ کی زندگی خطرے میں ڈال دیتے۔''

راجا صاحب نے موبائل کا اسپیکر کھول دیا تھا اس لیے وہ ساری باتیں باقی لوگوں نے بھی سن لیں۔ اسی وقت کنور ریاض آگیا۔

''کل صبح بانڈز کا بندوبست کرلینا۔'' راجا صاحب نے کنور الیاس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''فارن کرنسی اکاؤنٹ کا چیک میں تمہیں ابھی بنادیتا ہوں۔'' راجا صاحب نے اپنے بستر کی سائڈ ٹیبل سے چیک بک نکالی۔

''کیا فون آگیا اس کا؟'' کنور ریاض نے پوچھا۔

''ہاں۔'' کنور الیاس نے جواب دیا اور پھر وہ سب کچھ بتانے لگا جو اغوا کنندہ نے فون پر کہا تھا۔

الماس، نرگس، اورنگزیب اور شاہ زیب نے اس دوران میں خاموشی اختیار کررکھی تھی۔ کبھی وہ ایک دوسرے کی طرف، کبھی راجا صاحب کی طرف دیکھنے لگتے تھے۔

راجا صاحب کے چہرے پر گہری سنجیدگی تو تھی لیکن وہ باقی لوگوں کی طرح پریشان نہیں دکھائی دے رہے تھے۔

کا کا خلیل ادب سے ایک طرف کھڑا ہوا تھا۔
راجا صاحب نے چیک کنور الیاس کو دیتے ہوئے کہا۔
''بانڈز لا کر میرے حوالے کر دینا۔ میں خود جا کر...''
ان کی بات ادھوری رہ گئی۔ موبائل کی گھنٹی بج اٹھی تھی۔ کال کرنے والا فون نمبر دیکھ کر راجا صاحب نے کچھ اس انداز میں طویل سانس لی کہ شاہ زیب جلدی سے بول پڑا۔
''کیا پھر وہی ہے راج دا؟''
راجا صاحب نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کال ریسیو کی اور اسپیکر بھی کھول دیا۔
موبائل سے آواز آنے لگی۔ ''راجا صاحب! ایک بات اور نوٹ کر لیں۔ میں نہیں چاہتا کہ جس شخص کو میں رقم لے کر بلانا چاہتا ہوں، وہ اس وقت گھر پر نہ ہو۔ اپنے دونوں بیٹوں کو ہدایت کر دیجیے کہ رات ہو تو وہ گھر پر ہی ہوں۔ میں انہی دونوں میں سے کسی کو بلاؤں گا۔ میرا خیال ہے کہ اپنے بیٹوں کو ہر قیمت پر رات کو گھر پر روکے رکھنا آپ کے لیے مشکل نہیں ہوگا۔''
اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا گیا۔ راجا صاحب نے موبائل بند کرتے ہوئے اچٹتی اچٹتی سی نظریں کنور ریاض اور کنور الیاس پر ڈالیں۔
کنور الیاس بڑبڑایا۔ ''وہ یہ کیوں چاہتا ہے کہ اسے رقم پہنچانے والا ہم ہی دونوں میں سے کوئی ہو!''
کنور ریاض خاموش رہا مگر اس کے چہرے پر تشویش کے آثار زیادہ گہرے تھے۔
راجا صاحب نے کنور الیاس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میرے بعد اس گھر میں تمہی دونوں کی ذمے داریاں سب سے سوا ہیں۔''
جواب میں کسی نے کچھ نہیں کہا۔
کنور ریاض بڑبڑایا۔ ''اگر اس نے مجھے بلایا تو...''
''کیوں؟'' راجا صاحب نے اسے گھور کر دیکھا۔
''کیا تمہیں جاتے ہوئے ڈر لگے گا؟''
''نہیں، یہ بات نہیں۔'' کنور ریاض نے جلدی سے کہا۔ ''میں کچھ اور سوچنے لگا تھا۔''
''کیا سوچنے لگے تھے؟''
''رات کو مجھے ایک ضروری کام...''
''کام!'' راجا صاحب پھٹ پڑے۔ ''اس بچی کی زندگی سے زیادہ ضروری کام؟''
کنور ریاض پر شاید مزید جھاڑ پھٹکار ہوتی مگر اسی وقت ایک ملازم نے آ کر اطلاع دی کہ سپرنٹنڈنٹ پولیس راجا صاحب سے ملنے آیا ہے۔''
''کیوں!'' کنور ریاض چونکا۔
''بے وقوف ہو گیا؟'' راجا صاحب نے جھنجلا کر کہا۔ ''فریحہ کے بارے میں پوچھ گچھ کرنے آیا ہوگا!'' پھر انہوں نے ملازم سے کہا۔ ''ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ۔ میں آتا ہوں۔'' پھر وہ سب سے بولے۔ ''تم میں سے کوئی ڈرائنگ روم میں نہ آئے۔ میں نہیں چاہتا کہ تم میں سے کسی کے منہ سے کوئی ایسی بات نکل جائے جس سے سپرنٹنڈنٹ کو تاوان کے بارے میں پتا چلے۔''
''ہمیں تو وہ ضرور بلائے گا'' اورنگزیب بولا۔ ''فریحہ کو اس وقت اغوا کیا گیا ہے جب وہ ہمارے ساتھ تھی۔''
''ہوں۔'' راجا صاحب کچھ سوچنے لگے، پھر بولے۔ ''خیر! ابھی تو میں جا کر ملتا ہوں۔ اگر اس نے کہا تو میں تم لوگوں کو بلوا لوں گا۔''
راجا صاحب تیزی سے قدم اٹھاتے ہوئے کمرے سے نکل گئے۔

☆☆☆

نبیل نے جتنی بھی کالز کی تھیں اور جتنی بھی ریسیو کی تھیں، وہ سب فریحہ کے سامنے کی بات تھی لیکن نبیل کی طرح مسلسل جاگتے رہنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ اسی دوران میں نبیل نے اس سے چند ایسی باتیں بھی کی تھیں جنہوں نے اسے چونکا دیا تھا۔ وہ خاصی مضطرب بھی ہوئی تھی۔
موبائل پر جب راجا صاحب سے نبیل کا ''سودا'' طے ہو گیا تو وہ گویا اس وقت کی آخری بات تھی۔ اس کے بعد جو کچھ ہونا تھا، وہ دن گزرنے کے بعد ہی ہونا تھا۔ اسے جماہیوں پر جماہیاں آنے لگیں اور اس موقع پر جب نبیل نے اس سے کہا کہ وہ بیڈروم میں جا کر سو جائے تو اس نے اس کی بات مان لی۔
دوپہر کو وہ جاگی تو اس نے نبیل کی آنکھوں کی سرخی اور منتشر بالوں سے جانا کہ وہ پل بھر کے لیے بھی نہیں سویا تھا۔ نبیل نے اس سے کہا کہ وہ اس کے لیے ناشتا تیار کرتا ہے۔
''نہیں۔'' فریحہ نے کہا۔ ''پہلے تم غسل کر لو۔ تم سوئے بھی نہیں ہو۔ غسل کر لو گے تو طبیعت کچھ سنبھل جائے گی۔ میں اس دوران میں ناشتا تیار کر لیتی ہوں۔ تم مجھے کچن دکھا دو۔''
نبیل اسے کچن دکھا کر باتھ روم میں چلا گیا۔ فریحہ نے ناشتا تیار کیا۔ کچن میں اشیائے خورونوش کا سامان بس اتنا تھا

کہ زیادہ سے زیادہ اگلے دن تک کام آجاتا۔ نبیل نے اتنا ہی بندوبست کرلینا کافی سمجھا ہوگا۔

ناشتے کے دوران میں فریحہ نے پوچھا۔ ''دن بھر سوئے نہیں تو کیا کرتے رہے؟''

''بس دو ایک فون کیے یا کچھ رسائل دیکھتا رہا جو کل ہی لایا تھا۔''

''فون کسے کیے تھے؟''

''ناشتا تم اچھا تیار کرلیتی ہو۔'' نبیل نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''پھر بات ٹال گئے!'' فریحہ نے سنجیدگی سے کہا۔ ''رات بھی تم نے دو ایک بار ایسا کیا تھا۔ تم نے مجھے کچھ بتایا ضرور ہے لیکن کچھ باتیں چھپائی بھی ہیں۔ مجھے یقین ہے۔''

''تمہارا یقین درست ہے فریحہ!'' نبیل نے کہا۔ ''وقت آنے پر تمہیں وہ سب کچھ بھی معلوم ہوجائے گا جو میں ابھی کسی وجہ سے تمہیں نہیں بتا سکتا۔''

''کس وجہ سے؟''

''وجہ بتانا بھی میں مناسب نہیں سمجھتا۔'' نبیل نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ وہ جانتا تھا کہ ان باتوں کو جان کر فریحہ ہیجان میں مبتلا ہوجائے گی اور اسے اس کے منصوبے پر ہرگز عمل نہیں کرنے دے گی جبکہ نبیل اس رات کئی زندگیوں کے فیصلے کرڈالنا چاہتا تھا۔ ان زندگیوں میں خود اس کی زندگی بھی شامل تھی۔ اپنے ہی پیدا کردہ حالات سے اب وہ خود ہی اکتا چکا تھا۔

''میں کھانے کے لیے کچھ پکا لیتی ہوں۔'' فریحہ نے ناشتے کے بعد کہا۔

نبیل نے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

ان میں زیادہ تر ان باتوں پر گفتگو ہوتی رہی جو نبیل گزشتہ رات فریحہ کو بتا چکا تھا۔

رات دس بجے نبیل نے راجا صاحب کو پیغام دیا کہ جگہ کے بارے میں وہ کچھ دیر بعد بتائے گا، اور اگر صحیح وقت معلوم کرنے کے لیے استفسار کیا گیا تو کوئی جواب نہیں دیا جائے گا۔

غالباً تاکید ہی کی وجہ سے راجا صاحب کی طرف سے مستفسرانہ پیغام نہیں آیا۔ جب ایک گھنٹا گزر گیا تو فریحہ نے پوچھا۔ ''کتنی دیر انتظار کرواؤ گے؟''

''دو گھنٹے اور۔'' نبیل نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ ''دراصل اس قسم کے معاملات میں صحیح وقت کبھی نہیں بتانا چاہیے۔''

فریحہ اس کا منہ دیکھ کر رہ گئی۔

آدھے گھنٹے بعد مسٹر ڈارک کی کال آئی۔ اس نے کہا۔ ''تم نے بتایا تھا کہ راجا صاحب کو آدھی رات کا وقت دو گے۔ کیا وقت دیا؟''

''ابھی نہیں دیا۔'' نبیل نے جواب دیا۔ ''ایک بجے فون کروں گا۔''

''معاملے کو اتنا پیچیدہ کیوں کررہے ہو؟''

''یہ معاملہ ہی ایسا ہے۔ مجھے بہت احتیاط کرنا پڑرہی ہے۔''

''رقم کہاں منگواؤ گے؟''

''تمہیں بھی میں یہ ایک بجے کے بعد بتا سکوں گا۔''

''نبیل!'' مسٹر ڈارک کا لہجہ غصیلا ہوگیا۔ ''تمہارے لہجے سے مجھے بغاوت کی بو آرہی ہے۔ کیا تم وہ پچاس کروڑ خود ہڑپ کرنا چاہتے ہو؟ مت بھولو کہ میرے ایک اشارے پر تم پھانسی کے تختے تک جاسکتے ہو۔''

''جانتا ہوں مسٹر ڈارک!'' نبیل نے غیر جذباتی انداز میں کہا۔ ''تم میری احتیاط کو بغاوت سمجھ رہے ہو تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ اطمینان رکھو۔ پچاس کروڑ تمہیں ہی ملیں گے۔''

دوسری طرف سے مزید کچھ کہے بغیر رابطہ منقطع کردیا گیا۔

فریحہ پوچھ بیٹھی۔ ''کیا کہہ رہا تھا؟''

''میری نیت پر شک کررہا ہے۔'' نبیل نے کہا، پھر نفرت سے بولا۔ ''خود بدنیت ہے نا!''

''اسے تم پر غصہ آرہا ہوگا۔''

''تم ان باتوں میں اپنا دماغ نہ الجھاؤ۔'' نبیل نے کہا پھر بولا۔ ''ایک گلاس پانی پلاؤ گی؟''

فریحہ فوراً اٹھ گئی۔ فریج اس کمرے میں نہیں تھا۔ اسے کچن کا رخ کرنا پڑا۔ وہاں سے اس کے جاتے ہی نبیل نے اپنی جیب سے دوسرا موبائل نکال کر بڑی عجلت میں کسی سے رابطہ کیا۔

''ہیلو؟'' دوسری طرف سے آواز آئی۔

''میں اسے ڈیڑھ بجے کا وقت دوں گا جعفری! تمہیں آج دیر تک جاگنا ہوگا۔'' نبیل نے کہا۔

''آج کی رات تو مجھے نیند ہی نہیں آئے گی نبیل، میری جان!'' دوسری طرف سے کہا گیا۔ ''میں تو اس وقت کے انتظار میں اور تاک میں تھا لیکن آج تم نے خود ہی فیصلہ کرلیا ہے تو نہ جانے کیوں میں تھوڑا سا مغموم ہوگیا ہوں۔''

''بچپن کے دوست ہونا!'' نبیل نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''اچھا خیر! میں زیادہ باتیں نہیں کرسکتا۔ ڈیڑھ بجے کے بعد مجھے تمہارے فون کا انتظار رہے گا۔''

اس سے پہلے کہ دوسری طرف سے مزید کچھ کہا جاتا، نبیل نے رابطہ منقطع کر دیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ان باتوں کے دوران میں ہی فریحہ آجائے اور اس سے ان باتوں کے بارے میں استفسار کرے۔

ایک بجنے میں دو منٹ پر اس نے اس فون نمبر پر رابطہ کیا جو اسکا ریکارڈڈ پیغام راجا صاحب تک پہنچا دیتا۔ پیغام میں اس نے ایک جگہ بتاتے ہوئے کہا۔ ''آپ مطلوبہ رقم کے بانڈز اپنے چھوٹے بیٹے کنور ریاض کے ذریعے بھجوا دیں۔ کنور ریاض کے ساتھ یا ان کے آس پاس بھی کوئی نظر نہیں آنا چاہیے۔ جو جگہ میں نے بتائی ہے، وہ آپ کے گھر سے صرف پندرہ منٹ کی ڈرائیو پر ہے۔ اگر کنور ریاض پندرہ منٹ بعد بھی گھر سے روانہ ہوں تو ٹھیک ڈیڑھ بجے وہاں پہنچ جائیں گے۔''

یہ پیغام ریکارڈ کروانے کے بعد نبیل نے فون بند کر دیا اور فریحہ کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔ ''اب آدھے منٹ کے اندر اندر یہ پیغام راجا صاحب کو مل جائے گا۔''

فریحہ کے چہرے پر اب خاصا اضطراب تھا کیونکہ وہ بڑی حد تک جانتی تھی کہ اس رات کیا ہونے والا تھا۔ نبیل نے اس سے دو ایک ہی باتیں چھپائی تھیں۔ ان میں ایک بات یہ بھی تھی کہ اب جو کچھ ہوتا، اس میں اس کے بچپن کے ایک دوست جعفری کا کردار بڑھ جاتا۔

فریحہ اس مرتبہ اٹھی تو فریج سے پانی کی ایک بوتل ہی نکال لائی۔ اس کا گلا بار بار خشک ہونے لگا تھا۔

پانچ منٹ گزرے تھے کہ مسٹر ڈارک کی کال آئی۔ اس نے کہا۔ ''تم نے کہا تھا کہ ایک بجے کے بعد بتاؤ گے۔ پیغام بھیجا؟''

''ہاں۔ میں نے راجا صاحب سے کہہ دیا ہے کہ وہ اپنے چھوٹے بیٹے کنور ریاض کے ذریعے مطلوبہ رقم کے بانڈز بھجوا دیں۔''

''کہاں؟''

''ایک پتا دے دیا ہے انہیں!''

''کہاں کا پتا؟''

''تم جزئیات میں کیوں پڑ رہے ہو مسٹر ڈارک!'' نبیل نے منہ بنایا۔

''میں پہلے بھی تمہاری نیت کے بارے میں اپنے شک کا اظہار کر چکا ہوں۔''

''میری نیت میں کھوٹ نہیں ہے۔''

''تو پھر رقم اس جگہ منگائی جانا چاہیے جہاں میں چاہوں۔''

''تم کہاں چاہتے ہو؟'' نبیل نے خشک لہجے میں پوچھا۔

''میں تمہیں ایک فلیٹ کا پتا بتاتا ہوں۔ تم فوراً راجا صاحب کو پیغام بھیج دو کہ جگہ تبدیل کر دی گئی ہے۔ کنور ریاض کو وہ فلیٹ مقفل نہیں ملے گا۔ وہ کال بیل دینے کے تکلف میں پڑے بغیر فلیٹ میں داخل ہو جائے۔ اسے پہلے کمرے سے آگے نہیں بڑھنا۔ بانڈز بریف کیس سے نکال کر وہ صوفوں کی درمیانی ٹیبل پر رکھ دے اور خالی بریف کیس لے کر واپس چلا جائے۔''

''اس کی کیا ضرورت ہے؟'' نبیل نے پوچھا۔ ''میرا مطلب ہے، وہ بریف کیس رکھ کر کیوں نہ چلا جائے؟''

''یہ میں بتا دوں گا تمہیں، پہلے راجا صاحب کو پیغام دے دو۔'' مسٹر ڈارک نے جھنجلائے ہوئے سے انداز میں کہا۔ ''ایسا نہ ہو کہ تمہارا یہ پیغام ملنے سے پہلے ہی کنور ریاض وہاں سے روانہ ہو جائے۔''

''نہیں ہوگا روانہ۔'' نبیل نے اطمینان سے کہا۔ ''راجا صاحب کو میرا پیغام ملے ابھی تین منٹ سے زیادہ نہیں ہوئے ہوں گے۔ کنور ریاض بارہ منٹ بعد روانہ ہوگا۔ تم جلدی سے میری بات کا جواب دے دو تاکہ وقت ضائع نہ ہو۔''

''تم...'' مسٹر ڈارک بہت غصے میں کچھ کہتے کہتے رک گیا پھر بولا۔ ''اچھا سنو! ہوسکتا ہے کہ راجا صاحب نے پولیس یا کسی سرکاری ایجنسی کے آدمیوں یا کسی بھی شخص کے تعاون سے اس بریف کیس میں کوئی بم رکھوا دیا ہو جو اسی وقت پھٹ جائے جب میں بریف کیس کھولوں۔ دوسری بات یہ کہ اس کمرے میں ایک کیمرا لگا ہوا ہے، کلوز سرکٹ ٹی وی کیمرا۔ میں اس کمرے کا منظر دیکھ رہا ہوں گا اور مجھے معلوم ہو جائے گا کہ وہاں بریف کیس خالی کر دیا گیا ہے۔''

''گویا تم اسی فلیٹ میں کسی جگہ موجود ہو گے۔''

''اب مزید وقت ضائع نہ کرو۔ میں تمہاری بات کا جواب دے چکا ہوں۔'' مسٹر ڈارک کا انداز ایسا تھا جیسے وہ دانت پیستے ہوئے بولا ہو اور پھر اس نے مزید کچھ سنے بغیر رابطہ منقطع کر دیا۔

نبیل کے ہونٹوں پر ایک تلخ سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

☆☆☆

باڈی گارڈ کا بریف کیس اس وقت راجا صاحب کے کمرے ہی میں تھا۔ کاکا خلیل اور راجا صاحب کے دونوں بیٹوں کے علاوہ بیٹوں کے بیٹے اورنگ زیب اور شاہ زیب بھی موجود تھے۔ خواتین کو راجا صاحب نے اس رات بھی اپنے کمرے میں نہیں بلایا تھا اور ان کی اجازت کے بغیر وہ آ نہیں سکتی تھیں۔

نبیل کا پیغام ملے پانچ منٹ سے کچھ زیادہ گزر چکے تھے۔

راجا صاحب بولے۔ ''ضروری نہیں ہے کہ تم پندرہ منٹ پہلے ہی روانہ ہو۔ کچھ پہلے نکل جاؤ تو بھی کوئی حرج نہیں ہوگا۔''

''جی!'' کنور ریاض کی آواز بہت دھیمی تھی۔

''کیا بات ہے؟'' راجا صاحب نے اسے گھور کر دیکھا۔ ''کیا تم کچھ گھبرائے ہوئے ہو؟''

''بات معمولی تو نہیں ہے راج با!'' کنور ریاض نے کہا۔ ''کیا یہ زندگی کا ایک عجیب و غریب تجربہ نہیں ہوگا؟''

''وہ تو یقیناً ہوگا۔'' راجا صاحب نے کہا۔ مگر تمہیں نروس نہیں ہونا چاہیے۔ اگر وہ مجھے بلاتا تو میں بے جھجک چلا جاتا۔''

اسی وقت راجا صاحب کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ انہوں نے موبائل کی اسکرین دیکھی اور بڑبڑائے۔ ''اب اسے کیا کہنا ہے؟''

اورنگ زیب نے چونک کر پوچھا۔ ''کیا وہی ہے؟''

راجا صاحب نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے موبائل کان سے لگایا۔ رابطہ ہوتے ہی دوسری طرف سے آواز آنے لگی۔ ''کسی وجہ سے جگہ تبدیل کرنا ضروری ہو گیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ابھی آپ نے اپنے بیٹے کو روانہ نہیں کیا ہوگا۔ اب میں ایک نیا پتا بتا رہا ہوں۔ یہ فلیٹ ذرا دور ہے۔ اگر آپ اپنے بیٹے کو ابھی روانہ کر دیں تو ڈرائیو پچیس منٹ کی ہوگی۔ یہ بھی سن لیجیے کہ فلیٹ میں کس طرح داخل ہونا اور کیا کرنا ہے۔''

پیغام میں پتا بتانے کے ساتھ ساتھ وہ ہدایات بھی دے دی گئیں جو نبیل کو مسٹر ڈارک نے دی تھیں۔

کنور ریاض جب روانہ ہوا تو سب لوگ برآمدے میں موجود اسے اس طرح رخصت کر رہے تھے جیسے کوئی کسی کو زیادہ دن کے لیے الوداع کہتا ہے۔

کنور ریاض کی کار پھاٹک سے نکل کر نظروں سے اوجھل ہوگئی لیکن راجا صاحب برآمدے ہی میں رکے رہے۔ ان کی وجہ سے کوئی اور بھی وہاں سے نہ ہل سکا۔ بے تاب الماس اور نرگس نہیں نہ نہیں سے جھانک کر ان لوگوں کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ بڑی رانی اور چھوٹی رانی کا بھی کچھ ایسا ہی حال ہوگا لیکن وہ ان لڑکیوں کی طرح اس تا کا جھانکی کی جرأت نہیں کر سکتی تھیں۔ انہی کی طرح کنور الیاس اور کنور ریاض کی بیویاں بھی اپنے کمروں تک محدود رہی تھیں۔

راجا صاحب سوچ میں ڈوبے ہوئے ٹہلنے لگے۔

آخر کنور الیاس سے خاموش نہ رہا گیا۔

''کیا چھوٹے کنور کی واپسی تک یہیں انتظار کیجیے گا راج با؟'' وہ بولا۔

راجا صاحب نے چونک کر اس کی طرف دیکھا، کچھ سوچتے ہوئے انداز میں سر کو اثباتی جنبش دی اور کہا۔ ''مجھے گھبراہٹ سی ہو رہی ہے۔ کمرے میں جا کے اور زیادہ ہوگی۔ یہاں یہ احساس کچھ جاں بخش ہے کہ میں ایک کھلی جگہ پر ہوں۔ تم لوگ چاہو تو جا کے آرام کر لو۔ چھوٹے کنور کی واپسی میں گھنٹا بھر تو لگ ہی جائے گا۔''

''ہم آپ کو اکیلا نہیں چھوڑیں گے راج دا!'' شاہ زیب بولا۔ ''کم از کم میں تو آپ کے پاس ہی رکوں گا۔''

اورنگ زیب اور کنور الیاس نے بھی اسی خیال کا اظہار کیا کہ وہ راجا صاحب کو پریشانی کے عالم میں وہاں اکیلا نہیں چھوڑیں گے۔

کاکا خلیل نے ان سب کا عندیہ جان لینے کے بعد ایک ملازم سے کرسیاں منگوا کر برآمدے میں ڈلوا دیں۔ سب بیٹھ بھی گئے لیکن ذرا دیر بعد ہی راجا صاحب کھڑے ہو کر پھر ٹہلنے لگے۔

''تم لوگ بیٹھے رہو۔'' راجا صاحب نے باقی لوگوں سے کہا۔ ''میری وجہ سے تم لوگ بھی ٹہلو گے تو مجھے الجھن ہوگی۔''

کنور الیاس کو گئے ہوئے جب آدھے گھنٹے سے زیادہ گزر گیا تو بے چین راجا صاحب نے موبائل پر اس سے رابطہ قائم کیا۔

''میں واپس آ رہا ہوں راج با!'' دوسری طرف سے کنور ریاض نے ان کی آواز سنتے ہی کہا۔ ''اس فلیٹ سے نکل کر ابھی بیٹھا ہوں کار میں۔''

''بانڈز رکھ دیے اس فلیٹ میں؟'' راجا صاحب نے پوچھا۔

''جی۔''

''کوئی خاص بات تو نہیں ہوئی؟''

''جی نہیں۔''

''ٹھیک ہے، آؤ۔'' راجا صاحب نے کہہ کر رابطہ منقطع

کردیا۔
کنور الیاس بے چینی سے پوچھ بیٹھا۔ ''واپس آرہا ہے وہ؟''
''ہاں۔'' راجا صاحب نے جواب دیا۔
''تاوان لینے والے کا فون تو اب آنا چاہیے۔ وہ جو کچھ چاہتا تھا، وہ اسے مل چکا ہے۔''
''ہاں۔'' راجا صاحب نے دوبارہ کہا۔ ''پانچ دس منٹ میں اسے اطلاع تو دینا چاہیے کہ وہ فریحہ کو کس طرح آزاد کررہا ہے یا کرے گا۔''
پھر دس کے بجائے پندرہ منٹ گزر گئے، اغوا کنندہ کی کال نہیں آئی۔
''کہیں وہ دھوکا نہ دے جائے!'' کنور الیاس نے خدشہ ظاہر کیا۔ ''شاید وہ اب بھی فریحہ کو آزاد نہ کرے! آپ نے اندھا جوا کھیلا ہے راج با!''
''فریحہ کی خاطر میں اس سے بڑا جوا بھی کھیل سکتا ہوں۔'' راجا صاحب نے کہا۔ ''آخر وہ میرے ہی گھر کی بیٹی ہے۔''
راجا صاحب کا دوسرا فقرہ چونکا دینے والا تھا۔ کہیں سے چھپ کر ان لوگوں کی باتیں سنتی ہوئی الماس بھی چونک پڑی۔ اسے یہ خیال بہت پہلے آچکا تھا کہ فریحہ راجا صاحب کی کسی خفیہ شادی کا نتیجہ ہوسکتی ہے۔
الماس کو یہ خیال راجا صاحب سے فریحہ کی مشابہت کے سبب آیا تھا۔
''راج دا!'' اورنگ زیب حیرت سے بولا۔ ''آپ کے گھر کی بیٹی؟ فریحہ!''
''ہاں۔'' راجا صاحب نے کہا۔ ''میں یہ بات تم لوگوں کو اپنی موت سے پہلے بتا جاتا، اور اگر موت مجھے کچھ بتانے کی مہلت نہ دیتی تو اس کا علم تم لوگوں کو میری وصیت سے ہوتا جو میرے قانونی مشیر کے پاس محفوظ ہے لیکن آج یہ ضروری ہوگیا کہ میں اب اس انکشاف میں دیر نہ لگاؤں۔''
''لیکن!'' کنور الیاس الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''وہ اس گھر کی بیٹی آخر کیسے ہے؟ آپ سے اس کی شباہت مجھے چونکا تو چکی ہے مگر...''
اس کا فقرہ ادھورا رہ گیا۔ کوٹھی کے پھاٹک کے باہر سے کار کے ہارن کی آواز سنائی دی تھی اور سبھی اس طرف متوجہ ہو گئے تھے۔
رات کے اس پہر میں چوکیدار کسی اجنبی کار کے لیے پھاٹک نہیں کھول سکتا تھا۔ اس نے ایک وزیٹنگ کارڈ راجا صاحب کو پہنچایا۔
''یہ صاحب آئے ہیں۔'' اس نے کارڈ راجا صاحب کو دیتے ہوئے کہا تھا۔
''ان ٹیلی جنس آفیسر!'' راجا صاحب کارڈ پر نظریں جمائے ہوئے بڑبڑائے اور پھر چوکیدار سے بولے۔ ''آنے دو اسے!''
چوکیدار تیزی سے واپس لوٹا۔
''ان ٹیلی جنس آفیسر!'' کنور الیاس کی بڑبڑاہٹ میں الجھن تھی۔ ''اور اتنی رات گئے؟''
راجا صاحب نے کچھ نہیں کہا۔ ان کی نظریں پھاٹک کی طرف تھیں۔
کار اندر آئی۔
برآمدے کے سامنے کار روک کر اس سے جو شخص اترا، وہ جوان العمر تھا۔ برآمدے میں موجود ہر فرد کی نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ قریب آگیا۔
''میرا پورا نام آپ نے کارڈ پر پڑھ ہی لیا ہوگا۔'' وہ راجا صاحب سے مخاطب ہوا۔ ''ویسے عموماً سبھی مجھے صرف جعفری کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔''
''اتنی رات کو آپ کی زحمت کا سبب؟'' راجا صاحب کا لہجہ بہت خشک تھا۔
''آپ نے اپنے گھر کی ایک لڑکی فریحہ کے بارے میں رپورٹ کی تھی۔'' جعفری بولا۔ ''میرے محکمے نے یہ کیس پولیس کے محکمے سے اپنے پاس لے لیا ہے اور اس کیس کی فائل مجھے دی گئی ہے۔''
''لیکن اتنی رات گئے؟'' راجا صاحب کی پیشانی پر شکن پڑ گئی۔
''آپ نے جو کچھ کہا ہے، اس کا ثبوت اسی وقت مل سکتا ہے۔''
''کیا مطلب؟''
''آپ نے اغوا کنندگان کو تاوان بھجوادیا لیکن پولیس کو اس کی اطلاع نہیں دی۔'' جعفری بولا۔ ''آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا راجا صاحب!''
''مسٹر آفیسر!'' راجا صاحب کھردرے لہجے میں بولے۔ ''میں ضروری نہیں سمجھتا کہ تمہاری اس بات کی تردید یا تائید کروں، لیکن وزیر داخلہ سے یہ شکایت ضرور کرسکتا ہوں کہ تم نے مجھے اتنی رات گئے پریشان کیا ہے۔''
جعفری کے جواب سے پہلے ہی سب کی توجہ ایک بار پھر پھاٹک کی طرف مبذول ہوگئی۔ کنور ریاض کی کار پھاٹک سے اندر آرہی تھی۔
''راجا صاحب!'' جعفری نے ہلکی سی مسکراہٹ کے

کا کہنا تھا۔ ”میرے لیے اس کی کوئی اہمیت نہیں کہ آپ میری شکایت کس کس سے کر سکتے ہیں۔“

راجا صاحب نے قدرے بے چین نگاہوں سے کاکا خلیل کی طرف اس طرح دیکھا جیسے اس موقع پر اس کا مشورہ چاہتے ہوں۔

کاکا خلیل کی نظریں اس وقت کنور ریاض کی طرف تھیں جو اپنی کار جعفری کی کار کے پیچھے لاکر روک رہا تھا۔ کار روکتے ہوئے بھی اس کی نظریں جعفری پر رہیں کیونکہ وہ اس کے لیے ایک نیا چہرہ تھا۔

”مسٹر جعفری!“ راجا صاحب تیز لہجے میں بولے۔ ”بہتر ہوگا کہ تم اس وقت رخصت ہو جاؤ اور میرے گھر کے لوگوں کو ڈسٹرب نہ کرو۔“

”حیرت ہے راجا صاحب!“ جعفری نہایت سنجیدگی سے بولا۔ ”آپ اپنے گھر کی ایک لڑکی کے بارے میں تحقیقات رکوانا چاہتے ہیں۔“

”تحقیقات تم دن میں بھی آکر...“

جعفری نے ان کی بات کاٹ دی۔ ”اہمیت تو ابھی کی ہے راجا صاحب!“

کنور ریاض کار سے اتر کر ان لوگوں کی طرف آرہا تھا۔ وہ بریف کیس اس وقت بھی اس کے ہاتھ میں تھا جس میں وہ بانڈز لے گیا تھا۔

”کیا معاملہ ہے راج با؟“ کنور ریاض نے جعفری کے چہرے سے نظریں ہٹا کر راجا صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”ان صاحب کا تعلق ایک انٹیلی جنس ایجنسی سے ہے۔“ راجا صاحب نے کھردرے لہجے میں کہا۔ ”یہ فریحہ کے بارے میں تحقیقات کے لیے تشریف لائے ہیں۔“

کنور ریاض چونکا۔

راجا صاحب مزید کچھ کہتے لیکن موبائل کی گھنٹی بج اٹھنے کے باعث انہیں فوری طور پر اس کی طرف متوجہ ہونا پڑا تھا۔

”ہیلو!“ انہوں نے کال ریسیو کرتے ہوئے بے چینی سے کہا۔

”معمول کے مطابق یہ بھی میرا ریکارڈڈ پیغام ہے۔ میرے اندازے کے مطابق اس وقت وہ کار آپ کی کوٹھی کے پھاٹک کے قریب ہوگی جس میں فریحہ زندہ سلامت آپ تک پہنچ رہی ہے۔ اسے جو شخص لے کر آرہا ہے، وہ آپ کے لیے اجنبی ہوگا۔ یہ آپ اسی سے پوچھ لیجیے گا کہ وہ کون ہے۔“

دوسری طرف سے رابطہ منقطع ہوگیا۔

کنور ریاض نے راجا صاحب کو ٹھوبا کان سے الگ کرتے ہوئے دیکھ لیا تو بولا۔ ”راج با! میں یہ بریف کیس اپنے کمرے میں رکھ کر آتا ہوں۔“

”ایسی بھی کیا جلدی ہے کنور صاحب!“ جعفری نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ یہ بریف کیس ابھی میری نظروں سے اوجھل نہ ہو۔“

”مسٹر آفیسر!“ راجا صاحب تیز لہجے میں بولے۔ ”تمہیں ایک خالی بریف کیس سے کیا دلچسپی ہے؟“

”خوب!“ جعفری کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔ ”تو آپ جانتے ہیں کہ یہ بریف کیس خالی کر کے لایا گیا ہے؟“

یہ جملہ سن کر کنور ریاض کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔

☆☆☆

”بس اب چند لمحوں میں ڈراپ سین ہونے والا ہے۔“ نبیل نے اس وقت کہا جب اس کی کار راجا صاحب کی کوٹھی کے پھاٹک سے اندر داخل ہو رہی تھی۔

برابر کی سیٹ پر بیٹھی ہوئی فریحہ بولی۔ ”ابھی تم نے موبائل پر کس سے بات کی تھی؟ کون کہاں پہنچ گیا ہے؟“

”راجا صاحب کے پاس۔“ نبیل نے جواب دیا۔ ”وہ ان ٹیلی جنس آفیسر میرا دوست بھی ہے۔ اس کا نام جعفری ہے۔“

فریحہ نے برآمدے میں گھر کے سبھی مردوں کو کھڑا دیکھ لیا تھا۔ انہی سب کے ساتھ اس نے ایک اجنبی چہرہ بھی دیکھا۔ وہ چہرہ جعفری کا تھا۔

نبیل نے کار کنور ریاض کی کار کے پیچھے روک دی۔

”فریحہ! میری بچی!“ راجا صاحب بے تابانہ برآمدے سے اتر کر کار کی طرف آئے۔

فریحہ کار سے اتری تو اس کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔ ایسا محسوس کیا جا سکتا تھا کہ وہ کسی بھی لمحے پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے گی۔ وہ کار سے اترتے ہی راجا صاحب کے سینے سے لگ گئی۔

ڈرائیونگ سیٹ کی طرف کے دروازے سے نبیل اترا۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔

”یہ مس فریحہ ہیں۔“ برآمدے میں کھڑا ہوا جعفری بولا۔ ”ان کی تصویر محکمہ پولیس کو دی گئی تھی۔“

اس وقت آڑ سے سب کچھ سنتی ہوئی الماس دوبارہ چونکی تھی۔ اس نے نبیل کو پہچان لیا تھا۔

”مبارک ہو راجا صاحب!“ جعفری بولا۔ ”میری یہ مبارک باد مس فریحہ کی واپسی کے سلسلے میں ہے۔ تاوان لے کر اس نے آپ کو دھوکا نہیں دیا۔ مس فریحہ خیریت سے

واپس آ گئیں۔"

"میری زندگی ان کی وجہ سے بچ گئی۔" فریحہ نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہتے ہوئے نبیل کی طرف اشارہ کیا۔

"راجا صاحب!" نبیل بڑی سنجیدگی سے بولا۔ "فریحہ کو میں نے ہی اغوا کیا تھا لیکن مجھے اس کے لیے مجبور کسی اور نے کیا تھا۔ اس کی تو خواہش تھی کہ میں انہیں قتل کر دوں۔ کوئی بیس منٹ پہلے اس نے مجھے فون کیا تھا کہ اب فریحہ کو زندہ رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ پچاس کروڑ کے بانڈز اسے مل چکے ہیں۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" راجا صاحب تیز لہجے میں بولے۔ "تم اپنا جرم کسی اور کے سر تھوپنا چاہتے ہو؟"

"نہیں نہیں۔" فریحہ جلدی سے بول پڑی۔ "یہ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔"

"راجا صاحب!" جعفری بولا۔ "یہ مجھے بھی معلوم ہے کہ مس فریحہ کو اغوا کروانے والا کون ہے۔"

"کون ہے؟" راجا صاحب نے تیزی سے پوچھا۔

جعفری نے جواب دیا۔ "جس نے تاوان وصول کیا۔"

"کس نے کیا؟"

"بریف کیس کھول کر دیکھ لیجیے! آپ اسے خالی سمجھ رہے ہیں لیکن یہ خالی نہیں ہوگا۔ اسی لیے کنور صاحب یہ اپنے کمرے میں رکھ آنے کے لیے بے چین تھے۔ بانڈز یہ واپس لے آئے ہیں۔ تاوان انہی کو وصول کرنا تھا۔"

بریف کیس کنور ریاض کے ہاتھ سے چھوٹ کر برآمدے کے فرش پر گرا۔ یہ اس کی آواز سے بھی ظاہر ہو گیا کہ وہ خالی نہیں تھا۔

سبھی نے چونک کر کنور ریاض کی طرف دیکھا جس کا چہرہ سفید پڑنے لگا تھا۔

"کنور ریاض!" جعفری سرد لہجے میں بولا۔ "تم جیسے کمزور دل لوگوں کو ایسے خطرناک کھیل نہیں کھیلنا چاہئیں۔"

"کیا کہہ رہے ہو تم آفیسر!" راجا صاحب کی آواز کانپ گئی۔

"راجا صاحب!" جعفری نے کہا۔ "میں نے کہا تھا نا کہ میرا اسی وقت آنا ضروری تھا۔ مجرم کے خلاف اس وقت دو اہم ثبوت موجود ہیں۔ اس بریف کیس میں بانڈز کی موجودگی ثابت کرتی ہے کہ یہ رقم ملنے کے بعد ہی مس فریحہ کو قتل کرنے کے لیے کہا گیا تھا۔ دوسرا ثبوت وہ موبائل ہے جو اس وقت بھی کنور ریاض کی جیب میں ہی ہوگا کیونکہ ابھی بیس پچیس منٹ پہلے ہی اس موبائل پر مس فریحہ کو قتل کرنے کے لیے کہا گیا تھا۔ اس موبائل کے ماؤتھ پیس کے اندر غالباً ایک ڈیوائس لگوائی گئی ہے جس سے کنور ریاض کی آواز بدل جاتی تھی۔"

"اور وہ بدلی ہوئی آواز میرے موبائل میں ریکارڈ ہے۔" نبیل بولا۔

کنور الیاس، اورنگ زیب اور شاہ زیب سکتے کی سی حالت میں کنور ریاض کی طرف دیکھ رہے تھے۔ چھپ کر وہ سب کچھ دیکھنے اور سننے والیوں کی حالت بھی یقیناً غیر ہو گئی ہو گی۔

کاکا خلیل کے ہونٹوں پر اس وقت تلخ سی مسکراہٹ تھی۔

"چھوٹے کنور!" راجا صاحب ڈوبتی ہوئی سی آواز میں بولے۔ "تمہاری حالت سے ظاہر ہو رہا ہے کہ ابھی جو کچھ کہا گیا ہے، وہ بالکل درست ہے۔ نہایت رنج ہوا ہے مجھے اس وقت! میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ پیسے کے معاملات میں گڑبڑ کے عادی ہونے کے ساتھ ساتھ تم اتنے سفاک بھی ہو گئے ہو کہ..."

"راجا صاحب!" جعفری نے تیزی سے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "میں اندازہ کر سکتا ہوں کہ آپ کیا انکشاف کرنا چاہتے ہیں۔ بہتر ہوگا کہ وہ سب کچھ یہاں کھڑے نہ کہا جائے۔ آپ تو بے خبر ہیں لیکن میں ایک انٹیلی جنس آفیسر ہوں۔ مجھ سے پوشیدہ نہیں کہ گھر کی خواتین چھپ کر یہاں ہونے والی باتیں سن رہی ہیں۔"

الماس اور نرگس، گھبرا کر اپنی جگہ سے مڑیں اور اپنے اپنے کمروں کی طرف بھاگیں۔ گھر کے افراد پر راجا صاحب کے رعب و دہشت کا عالم کچھ ایسا ہی تھا۔

☆☆☆

جعفری کے محکمے کے کچھ لوگ کوٹھی کے قریب ہی موجود تھے۔ جعفری نے موبائل پر ان سے بات کی تو انہوں نے اندر آنے میں ذرا بھی دیر نہیں کی۔ کنور ریاض کو ہتھکڑیاں لگا دی گئیں۔ اس کی جیب سے اس کا دوسرا موبائل برآمد کر لیا گیا تھا اور بریف کیس کھول کر اس میں رکھے ہوئے بانڈز بھی دیکھ لیے گئے تھے۔

کنور ریاض کا چہرہ اتنا سفید پڑ گیا تھا جیسے اس کے جسم سے خون کا ایک ایک قطرہ نچوڑ لیا گیا ہو۔ اسے بالکل چپ لگ گئی تھی۔ اپنی صفائی میں وہ ایک لفظ بھی نہیں بول سکا تھا یا شاید اس نے سمجھ لیا تھا کہ وہ اب اپنی صفائی میں کچھ کہنے کے قابل نہیں رہا ہے۔

باپ کو ہتھکڑیاں لگتے دیکھ کر شاہ زیب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ اورنگ زیب مغموم نظر آنے لگا تھا۔

"تم یہ سب کچھ کیا کر بیٹھے میرے چھوٹے بھائی!"

کنور الیاس نہایت اداس لہجے میں بولا۔
رنج واندوہ کا تاثر راجا صاحب کے چہرے پر بھی تھا۔
''مسٹر جعفری!'' راجا صاحب بولے۔ اس مرتبہ ان کا لہجہ بالکل بدلا ہوا تھا۔ انہوں نے تھکے ہوئے مغموم لہجے میں کہا۔ ''کیا یہ ممکن ہے کہ آپ میرے اس بدنصیب بیٹے کو فوراً اپنے ساتھ نہ لے جائیں؟ میں آپ کی اور آپ کے محکمے کے لوگوں کی عدم موجودگی میں اپنے گھر کے لوگوں کے سامنے اس سے کچھ باتیں کہنا چاہتا ہوں۔ آج کے بعد تو میری یہ خواہش ہوگی کہ میں اس کا چہرہ بھی نہ دیکھوں۔''
''راجا صاحب!'' جعفری نے کہا۔ ''آپ کے دکھ کے پیشِ نظر میں اتنا کر سکتا ہوں کہ میرے محکمے کے باقی لوگ یہاں نہ ہوں۔ مجرم کے ساتھ میری موجودگی تو ضروری ہے۔''
''اور اس میں کوئی حرج بھی نہیں ہے راجا صاحب!'' نبیل بہت دیر بعد بولا۔ ''یہ ان سب باتوں سے واقف ہیں جو آپ اپنے گھر والوں کے سامنے اپنے بیٹے سے کرنا چاہتے ہیں۔ وہ سب کچھ میں اسے بتا چکا ہوں۔ یہ میرا دوست ہے راجا صاحب! آج اس وقت جو کچھ ہوا ہے، اس کے لیے میں نے ہی اس سے رابطہ کیا تھا۔ مجھے وہ سب باتیں فریحہ نے اس گھر میں آنے سے پہلے بتا دی تھیں۔''
راجا صاحب نے چونک کر فریحہ کی طرف دیکھا جو سر جھکائے ہوئے تھی۔ افسردگی کا تاثر اس کے چہرے پر بھی تھا۔
''راجا صاحب!'' کاکا خلیل بول اٹھا۔ ''یہ نبیل کبھی بہت اچھا نوجوان تھا۔ کچھ اسباب ہیں کہ یہ بگڑ گیا۔ فریحہ کو وہ سب کچھ بھی معلوم ہے۔ اس کے باوجود اس نے نبیل کو سب کچھ بتا دیا تو اس کی بھی ایک وجہ ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔''
راجا صاحب کاکا خلیل کا منہ تکتے رہ گئے۔ پھر انہوں نے فریحہ کی طرف دیکھا جو بہ دستور نظریں جھکائے ہوئے تھی۔
''ہم ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر باتیں کر سکتے ہیں راجا صاحب!'' جعفری بولا۔ ''میرے یہ آدمی یہیں رک جائیں گے۔''
''اچھا۔'' راجا صاحب نے نڈھال لہجے میں کہا۔ ''ایسا کر لیتے ہیں۔''
اس کے بعد جعفری کی ہدایت پر اس کے محکمے کے لوگ برآمدے ہی میں رک گئے۔
ذرا دیر بعد راجا صاحب اپنے سب لوگوں کے ساتھ ڈرائنگ روم میں تھے۔ کنور ریاض وہاں تک اس طرح چلتا ہوا آیا تھا جیسے خواب میں چل رہا ہو۔ بہت دیر سے اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔
''سنو!'' راجا صاحب نے کنور الیاس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہاری اور گھر کے دوسرے لوگوں کی غلط فہمی دور کرنا چاہتا ہوں۔ فریحہ میری نہیں، چھوٹے کنور کی بیٹی ہے۔''
یہ ایک ایسا انکشاف تھا کہ کنور الیاس ہی نہیں، اورنگ زیب اور شاہ زیب کے دماغوں کو بھی اچھا خاصا جھٹکا لگا۔
''ہاں۔'' راجا صاحب نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''مجھ سے فریحہ کی مشابہت نے تم لوگوں کے دل میں شک پیدا کیا تھا کہ یہ میری بیٹی ہو سکتی ہے لیکن یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ بعض بچوں کے نقوش کبھی کبھی اپنے ماں باپ کے بجائے دادا یا دادی سے مشابہہ ہو جاتے ہیں۔ ایسا ہی فریحہ کے ساتھ بھی ہوا ہے۔ یہ مجھ پر اور اپنی ماں پر گئی ہے۔ اس کی ماں سامعہ، کاکا خلیل کی بیٹی تھی۔''
سب نے چونک کر اب کاکا خلیل کی طرف دیکھا۔ اس کی نظریں اب جھکی ہوئی تھیں۔ مرحوم بیٹی کے ذکر نے اس کے چہرے پر افسردگی طاری کر دی تھی۔
نبیل اور جعفری پر اس انکشاف کا کوئی ردِعمل نہیں ہوا۔ وہ پہلے ہی ان سب باتوں سے واقف تھے۔
کنور ریاض نظریں جھکائے بیٹھا رہا تھا۔
راجا صاحب نے چند لمحے خاموش رہنے کے بعد پھر بولنا شروع کیا۔ ''کاکا خلیل کی بیٹی سامعہ بہت خوب صورت تھی لیکن شاید ذہین اور سمجھ دار نہیں تھی۔ وہ بدنصیب چھوٹے کنور کی باتوں میں آ گئی لیکن ناسمجھ ہونے کے باوجود اس نے چھوٹے کنور کے ساتھ بہت آگے نکل جانا غلط سمجھا۔ چھوٹے کنور کو مجبوراً اس سے شادی کرنا پڑی۔ شادی خفیہ طور پر ہوئی تھی۔ دو ایک ماہ بعد چھوٹے کنور کا دل بھر گیا تو اس نے سامعہ سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اس نے سامعہ سے وعدہ تو کیا تھا کہ مناسب وقت دیکھ کر مجھے اس بارے میں بتا دے گا لیکن اس کے دل میں کھوٹ شروع ہی سے تھا۔ اس نے یہ ماننے ہی سے انکار کر دیا کہ سامعہ سے اس کی شادی ہوئی ہے۔ کاکا خلیل کو یہ سب کچھ بتانے پر سامعہ اس وقت مجبور ہوئی جب اسے احساس ہوا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ کاکا خلیل پر قیامت گزر گئی لیکن اس نے مجھے کچھ نہیں بتایا۔ اپنے خاندان کی طرح یہ بھی میرے نمک کا پاس رکھتا رہا۔ کنور ریاض نے ایک ہوشیاری یہ بھی کی تھی کہ جو نکاح نامہ سامعہ کے پاس تھا، وہ اس سے لے کر ضائع کر دیا۔ رجسٹرار کے

پاس بھی اس کے مندرجات نہیں ہیں۔ یہ چھوٹے کنور ہی کو معلوم ہوگا کہ وہ اس نے کس طرح ختم کرائے۔ غالباً کوئی بڑی رقم خرچ کی ہوگی۔ اس کے باوجود کاکا خلیل یا سامعہ یہ ضرور ثابت کرسکتے تھے کہ فریحہ چھوٹے کنور ہی کی بیٹی ہے۔ ڈی این اے ٹیسٹ سے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہوجاتا لیکن کاکا خلیل نے میرے خاندان کی عزت کو محفوظ رکھنا اپنا فرض جانا۔ اس نے سامعہ کو بھی تاکید کی کہ وہ صبر کرے۔ بیٹی کے ساتھ باپ نے بھی صبر کیا لیکن فریحہ جب بڑی ہوئی اور اصرار کرنے لگی کہ اسے اس کے باپ کے بارے میں بتایا جائے تو سامعہ اس وقت مجبور ہوگئی جب ایک بیماری نے اسے موت کے قریب پہنچا دیا۔ جذبات میں بہہ کر اس نے فریحہ کو سب کچھ بتا دیا۔ فریحہ نئے دور کی لڑکی ہے۔ وہ پُرجوش ہوگئی۔ اس کی خواہش تھی کہ اپنا حق لینے کے لیے کسی بھی اقدام سے گریز نہ کرے لیکن کاکا خلیل نے اسے بھی سمجھایا۔ فریحہ نے رودھو کر نانا کی بات مان لی لیکن قدرت کو یہ منظور تھا کہ فریحہ کے ساتھ انصاف ہو۔ کاکا خلیل نے ہمیشہ یہ کوشش کی تھی کہ میں فریحہ کو نہ دیکھ سکوں مگر اتفاقاً ایک بار میں نے اسے دیکھ ہی لیا۔ اس کے نقش و نگار میں اپنی جھلک دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی۔ میں نے کاکا خلیل سے اس کا ذکر کیا۔ کاکا اس وقت نہ جانے کس جذباتی کیفیت میں تھا کہ رو پڑا۔ اس حالت میں اس نے مجھے ساری حقیقت بتادی اور مجھے یوں لگا جیسے میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی ہو۔ فوری طور پر تو میں بہت مشتعل ہوگیا تھا لیکن کاکا خلیل نے میرے قدموں پر سر رکھ دیا کہ اگر میں فریحہ کو اس کا حق دلوانا ہی چاہتا ہوں تو اس میں ٹھنڈے مزاج اور تحمل سے کام لوں۔''

جب تک راجا صاحب بولتے رہے تھے، کمرے پر گہرا سکوت طاری رہا تھا۔ ان کے خاموش ہونے پر اس سکوت میں ایک ٹھنڈی سانس سنائی دی جو کنور الیاس کی تھی۔ وہ اپنے چھوٹے بھائی کو ترحم آمیز نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

''بہرحال!'' راجا صاحب نے فریحہ کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''میں نے اپنی اس پیاری بچی کو یہاں بلوالیا۔ مجھے یہ خیال تو تھا کہ اسے دیکھ کر چھوٹے کنور کو شبہ تو ہوسکتا ہے مگر اس کے ساتھ یہ گمان بھی تھا کہ شاید کسی وقت خون جوش مارے اور یہ بدنصیب باپ اپنی بیٹی کو اپنے کلیجے سے لگالے۔ یہ میرے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ یہ اس بچی کی جان لینے پر تل جائے گا لیکن۔'' راجا صاحب نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''مجھے بالکل اندازہ نہیں ہورہا ہے کہ اس نے یہ سفاکانہ قدم اٹھانا کیوں ضروری سمجھا؟''

''عدالت کے کٹہرے میں سب کچھ سامنے آجائے گا۔'' جعفری بولا۔ ''تاہم میں کچھ اندازہ لگا سکتا ہوں۔ آپ کے اس بیٹے کی ہمدردیاں ایک سیاسی پارٹی کے ساتھ ہوگئی تھیں۔ انہوں نے اس کے لیے فنڈز بھی بہت فراہم کیے تاکہ جب وہ پارٹی اقتدار میں آجائے تو وہ اس سے زیادہ سے زیادہ فوائد حاصل کرسکیں۔ دولت کی کمی نہ ہونے کے باوجود انہیں دولت کی ہوس ہے۔ انہوں نے اس پارٹی کی مخالف پارٹی کے چند افراد کو قتل بھی کروایا۔ وہ قتل شاید صرف خوش نودی کے لیے کروائے ہوں۔ اور اگر ان کا کوئی دوسرا مقصد تھا تو وہ بھی سامنے آہی جائے گا۔ وہ قتل کیونکہ ایک ہی زنجیر کی کڑیاں سمجھے گئے تھے اس لیے ان کی ایک ہی فائل بنی جو مجھے ہی دی گئی۔ اس کی تحقیقات کے دوران میں میرے سامنے یہ بات آئی کہ آپ کے بیٹے کی ہمدردیاں اس پارٹی کے ساتھ ہیں جس کی مخالف پارٹی کے لوگوں کو قتل کروایا گیا۔ مزید چھان بین سے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ اس پارٹی کے لیے فنڈز بھی فراہم کررہے ہیں۔ میں نے ان کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے کی کوشش کی تو مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ فنڈز کی فراہمی کے سلسلے میں بڑے بھائی سے ان کے تعلقات میں کچھ کشیدگی آگئی تھی۔ کیا آپ کو اس کا علم ہوا؟''

''ہاں۔'' راجا صاحب نے جواب دیا۔ ''میں نے اسے سرزنش کی تھی۔''

''تب پھر یہی ایک بات ممکن ہے۔'' جعفری نے کہا۔ ''اب ان کے لیے مشکل ہوگیا ہوگا کہ اس پارٹی کی مالی مدد جاری رکھ سکیں لہٰذا انہوں نے ایک ایسا قدم اٹھایا جسے ایک پنتھ دو کاج کہا جاسکتا ہے۔ مس فریحہ کو اغوا کرواکے انہوں نے اس پارٹی کی مدد کے لیے پچاس کروڑ بھی حاصل کرنا چاہے اور...'' جعفری خاموش ہوا اور پھر ذرا سا رک کر بولا۔ ''دوسرا مقصد مجھ پر ابھی پوری طرح واضح نہیں ہے۔''

راجا صاحب نے دوبارہ ٹھنڈی سانس لی اور بولے۔ ''وہ اب میری سمجھ میں آرہا ہے۔ یہاں بھی دولت کی ہوس کارفرما ہے۔ یہ چاہتا ہوگا کہ میرے بعد جو دولت اس کے حصے میں آئے، اس پر صرف اس کے بیٹے شاہ زیب کا حق ہو۔ میری دولت کا جو آدھا حصہ بڑے کنور کو ملتا، اس پر نرگس کا حق ہوتا۔ اس کی طرف سے یہ اس لیے مطمئن ہوگا کہ نرگس سے شاہ زیب کی شادی ہوجاتی۔ میرے گھر میں یہ رومانس بھی چل رہا ہے اور میں بھی اپنے گھر کی کسی بات سے بےخبر نہیں رہا ہوں۔''

''یقیناً!'' فریحہ پہلی مرتبہ بولی۔ اس کا لہجہ بہت تلخ تھا۔ ''کنور ریاض کا مقصد یہی ہوگا۔''

پہلی مرتبہ کنور ریاض نے جھٹکے سے سر اٹھا کر اس کی

طرف دیکھا۔
''فریحہ!'' راجا صاحب بولے۔ ''تم اس کا نام تو نہ لو! یہ بہرحال تمہارا باپ ہے۔''
''نہیں۔'' فریحہ نے نفرت سے کہا۔ ''جس شخص کا خون سفید ہو چکا ہو، اسے میں اپنا باپ کہنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔''
کنور ریاض کا اٹھا ہوا سر پھر جھک گیا۔
''بس۔'' راجا صاحب نے کنور الیاس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں تم لوگوں کو یہ سب کچھ اس کے سامنے بتانا چاہتا تھا تاکہ اگر یہ اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہے تو کہہ ڈالے مگر یہ اب تک خاموش ہے۔ مجھے اس کی تھوڑی سی خوشی ہوئی ہے۔ اس میں ابھی تھوڑی بہت شرم باقی ہے۔''
اس وقت کنور ریاض کی آنکھوں سے دو آنسو ڈھلک گئے۔
''راجا صاحب!'' جعفری بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ آپ سب کچھ کہہ چکے۔ کیا اب مجھے اجازت ہے؟''
''جعفری!'' نبیل بول پڑا۔ ''تم نے میرے سلسلے میں اب تک کوئی قدم نہیں اٹھایا۔''
''تم میرے ساتھ چلو۔ ہیڈ کوارٹر میں وہ کام بھی کر لیا جائے گا۔''
''نہیں۔'' نبیل نے فریحہ پر ایک نظر ڈالنے کے بعد کہا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ وہ کام بھی تم یہیں کر ڈالو۔''
اس وقت کسی خیال سے فریحہ کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ وہ نبیل کا چہرہ تکنے لگی تھی۔
''فریحہ!'' نبیل اداس سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ''تمہیں اندازہ تو ہو گیا تھا کہ میں کچھ غلط راستوں پر نکل گیا ہوں اور میں نے بھی تمہیں بتایا تھا کہ ان کاموں کی وجہ سے میں ایک بلیک میلر کے جال میں پھنس گیا ہوں لیکن میں نے اپنے کاموں کی وضاحت نہیں کی تھی۔ ان راستوں پر چل کر میں بہت جلد تھک گیا ہوں۔ میرا ضمیر مجھے شدت سے کچوکے دینے لگا تھا اس لیے میں نے وہ سب کچھ جعفری کو بتا دیا ہے اور اس کی سزا بھگتنے کے لیے تیار ہوں۔''
فریحہ اسے پھٹی پھٹی سی آنکھوں سے دیکھتی ہوئی بولی۔ ''ایسے کیا کام کر چکے ہو تم نبیل؟''
''کنور ریاض نے جن لوگوں کو قتل کروایا تھا، وہ میرے ہی ہاتھوں قتل ہوئے تھے۔''
''نہیں۔'' فریحہ کی آواز کانپ گئی۔ ''نہیں۔'' اس نے دہرایا اور پھر دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر سسکیاں لینے لگی۔
''یعنی... یعنی...'' راجا صاحب اپنی بات پوری نہیں کر سکے۔
''جی ہاں راجا صاحب!'' جعفری نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''میرا دوست پھانسی یا عمر قید کی سزا بھگتنے کے لیے تیار ہو چکا ہے اور میں اپنا فرض ادا کرنے پر مجبور ہوں۔''
اس نے اپنے محکمے کے دو آدمیوں کو ڈرائنگ روم میں بلوایا اور انہوں نے نبیل کو ہتھکڑیاں لگا دیں۔ اس وقت فریحہ روتی اور بھاگتی ہوئی ڈرائنگ روم سے چلی گئی تھی۔ اس کے لیے ممکن نہیں تھا کہ نبیل کو ہتھکڑیاں لگتے ہوئے دیکھ سکے۔
گھر کی خواتین کو ان باتوں کا علم دوسرے دن ہو سکا۔
اس رات کے بعد سے راجا صاحب کے گھر پر ایسا سکوت طاری رہنے لگا جیسے وہاں کسی کی موت ہو گئی ہو۔
کچھ عرصے مقدمہ چلنے کے بعد عدالت نے کنور ریاض اور نبیل کو عمر قید کی سزائیں سنا دیں۔ کنور ریاض کو پھانسی کی سزا شاید اس لیے نہیں دی گئی تھی کہ قتل اس نے اپنے ہاتھوں سے نہیں کیے تھے اور نبیل کے ساتھ رعایت کا سبب یقینی طور پر یہی ہو سکتا تھا کہ اس نے خود ہی اپنے آپ کو قانون کے حوالے کیا تھا۔
اس کے بعد راجا صاحب کے گھر میں کچھ جذباتی فیصلے ہوئے۔
''میں اب تم سے شادی نہیں کروں گا نرگس!'' شاہ زیب نے نرگس سے کہا تھا۔ ''میں اپنے باپ کی یہ خواہش پوری نہیں کرنا چاہتا کہ تمہارے واسطے سے میں تمہارے باپ کی دولت بھی حاصل کر لوں۔''
دوسری طرف اورنگ زیب کے استفسار پر فریحہ نے کہا تھا۔ ''میں زندگی کی آخری سانس تک نبیل کا انتظار کروں گی۔''
الماس نے یہ باتیں سنی تھیں مگر کچھ نہیں سوچ سکی تھی۔ اس کا دماغ تو جیسے پتھرا کر رہ گیا تھا۔ وہ اپنی زندگی کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکی۔ محبت تو نبیل سے اسے بھی تھی۔
راجا صاحب کو اس کے بعد کبھی مسکراتے ہوئے بھی نہیں دیکھا گیا۔ اس خیال سے وہ ہمیشہ رنجیدہ نظر آئے کہ ان کے ایک بیٹے کی غلطی سے ان کے گھر کے کئی افراد کی زندگیاں تباہ ہو گئیں۔



پہلا رنگ

خواب گراں

ایچ اقبال

قناعت بڑ مشکل کام ہے۔ خصوصاً ایسے لوگوں کے لیے جن کی آنکھیں دُنیاوی چمک دمک سے خیرہ ہو چکی ہوں۔ وہ بھی کنوئیں سے نکل کر سمندر میں آئی تو اُس کا دل کوئی لمبی جست لگانے کے لیے مچلنے لگا۔ اپنے شوہر کی قلیل تنخواہ اور قناعت پسندی سے اُسے چڑ ہو گئی تھی۔ آخرکار اُس نے خود ہاتھ پاؤں چلانے کا ارادہ کر لیا لیکن وہ یہ بھول گئی تھی کہ ہمارے معاشرے میں کوئی بھی حسین عورت مردوں کے درمیان آ کر بہت جلد ایک ایسا کھلونا بن جاتی ہے جس کی حفاظت کا کوئی بھی ذمہ نہیں لے سکتا

اس گلوکارہ کا قصہ جو ابتدائی کامیابیوں کے بعد اپنے آپے میں نہیں رہی تھی

جب چارلی ہوٹل کھلا تھا تو ایک معمولی سا ہوٹل تھا۔ وہاں آنے والے بھی زیادہ تر وہ لوگ ہوتے تھے جن کا تعلق جرائم کی دنیا سے ہوتا تھا۔ انہی کی وجہ سے متوسط طبقے کے شریف لوگوں نے اِدھر کا رُخ کرنا چھوڑ دیا تھا۔ ابتدا میں وہ لوگ اس لیے آنے لگے تھے کہ انھوں نے عرفی کی خاصی شہرت سُنی تھی جو اس ہوٹل میں حیرت انگیز کرتب دکھا کے اور اپنی عجیب و غریب شعبدہ بازیوں سے گاہکوں کی دل بستگی کا سامان بنا رہتا تھا۔

دیکھنے میں عرفی کی عمر اٹھائیس سال کے لگ بھگ معلوم ہوتی تھی۔ اس کا جسم چھریرا اور چہرے کے نقوش ایسے تھے کہ اسے بس قبول صورت کہا جا سکتا تھا۔ مگر اس کی سُرخ و سفید رنگت کی وجہ سے بعض لوگ اسے خوبصورت سمجھتے تھے۔ وہ ہوٹل کا باقاعدہ ملازم تھا۔ اندھیرا پھیلنے کے بعد وہ ایک طرف بنے ہوئے چھوٹے سے اسٹیج پر نمودار ہوتا، کچھ حیرت انگیز شعبدے دکھاتا اور پھر کوٹ کی جیب سے گلابی رنگ کے دو گولے نکال کر انھیں ہاتھوں سے فضا میں اُچھالتا ہوا اسٹیج سے اتر کر ہال میں آ جاتا۔ پھر ذرا دیر بعد ہی لوگ دیکھتے کہ اس کے ہاتھوں میں دو نہیں بلکہ تین گولے ہیں۔ یہ اندازہ کسی کو بھی نہیں ہو پاتا تھا کہ تیسرا گولا کہاں سے آ گیا۔ کیونکہ عرفی کا ہاتھ جیب کی طرف جاتا ہوا نظر نہیں آتا تھا۔ پھر دو منٹ بھی نہیں گزرنے پاتے کہ گولوں کی تعداد چار، اور پھر پانچ ہو جاتی۔ وہ یہ کرتب بڑی چابک دستی سے دکھاتا تھا۔ کبھی کسی نے نہیں دیکھا تھا کہ کوئی گولا اس کے ہاتھ سے گرا ہو۔ جو گولا وہ بائیں ہاتھ سے اُچھالتا وہ فضا میں سیدھا اٹھنے کے بجائے بیضوی دائرہ بناتا ہوا اس کے دائیں ہاتھ میں پہنچ جاتا اور دائیں ہاتھ سے اچھالے ہوئے گولے کا رخ بائیں ہاتھ کی طرف ہوتا جب کہ تین گولے پہلے ہی سے فضا میں ہوتے۔ یہ کرتب دکھاتے ہوئے اس کا منہ تھوڑا کھل جاتا، جیسے وہ ہنس رہا ہو اور آنکھیں نیم باز ہو جاتیں۔ مجموعی تاثر ایسا ہوتا تھا جیسے وہ اپنے اس کرتب سے خود کچھ مسرت حاصل کر رہا ہو۔ نوشین کا خیال تھا کہ عرفی کو اپنے اس کرتب سے خود بھی کچھ لذت حاصل ہوتی ہے۔

یہ کرتب دکھاتے ہوئے وہ دھیرے دھیرے قدم اُٹھا کر ساری میزوں کے درمیان سے سارے ہال کا چکر لگاتے ہوئے کاؤنٹر کی طرف لوٹتا جو اسٹیج کے برابر میں ہی بنا ہوا تھا۔ اس طرف بڑھتے ہوئے گولوں کی تعداد کم ہوتی چلی جاتی اور جب وہ کاؤنٹر کے قریب پڑی ہوئی ایک کرسی پر بیٹھتا تو اس کے ہاتھوں میں صرف دو ہی گولے ہوتے جنھیں وہ اپنی جیبوں میں ڈال لیتا اور پھر اس کے چہرے پر ایسی اُداسی نظر آنے لگتی جیسے ساری دنیا کی محرومیاں اس کے وجود میں سموئی ہوئی ہوں۔

اس اُداس عرفی کو دیکھ کر نوشین محسوس کرتی کہ کوئی گدگداتا ہوا سا جذبہ اس کے دل کو چھوتا ہوا گزرنے لگا ہے۔ اس کا جی چاہنے لگتا کہ عرفی سے باتیں کرے لیکن چار دن سے مسلسل آنے کے باوجود اسے کوئی ایسا موقع نہیں ملا تھا۔ عرفی اس کرسی پر چند منٹ بیٹھنے کے بعد کاؤنٹر کے پیچھے بنے ہوئے ایک دروازے سے اندر چلا جاتا۔ پھر بیس منٹ یا آدھے گھنٹے کے بعد دوبارہ اسٹیج پر نظر آتا۔ آدھے گھنٹے تک شعبدے دکھاتا اور دو گولے ہاتھوں میں لے

کر انھیں اُچھالتا ہوا پھر ہال میں آ جاتا۔
اندھیرا پھیلنے کے بعد سے رات کے بارہ بجے تک اس کا یہی کام تھا۔ ایک بجے چارلی ہوٹل بند ہو جاتا تھا۔
نوشین پہلی بار یہاں تین سال پہلے آئی تھی جب اسے اپنی خالہ کے آخری وقت میں انھیں دیکھنے کے لئے جیکب آباد سے اس شہر میں آنا پڑا تھا لیکن اس وقت وہ یہاں تھوڑی دیر بیٹھ سکی تھی۔ وہاں بیٹھنے والوں کی گھورتی ہوئی آنکھیں اسے اپنے جسم پر نوکیلے دانتوں کی طرح چبھتی محسوس ہوئی تھیں۔ ایسا لگا تھا جیسے وہ سب اسے آنکھوں ہی آنکھوں سے نگل لینا چاہتے ہوں۔ اس پر کچھ فقرے بھی کسے گئے تھے اور پھر وہ گھبرا کر صرف چائے پینے کے بعد وہاں سے نکل بھاگی تھی۔
لیکن اب تین سال بعد اس نے سُنا تھا کہ چارلی ہوٹل کا ماحول بدل گیا ہے' اب بُرے لوگ وہاں نہیں آتے اس لیے عورتیں اور خصوصاً نوجوان لڑکیاں وہاں بہت جانے لگی ہیں۔ ان لڑکیوں کے لیے وہاں کی واحد پُرکشش چیز عرفی ہی تھا!
یہ سننے کے بعد ہی نوشین تین سال بعد دوسری بار وہاں آئی تھی اور پہلے ہی دن وہ عرفی سے اس وقت بہت متاثر ہوئی تھی جب وہ کاؤنٹر کے قریب کرسی پر بیٹھ کر اداس نظر آنے لگا تھا۔ یہ نوشین بھی نہیں سمجھ سکی تھی کہ عرفی کی اداسی میں ایسی کیا کشش تھی جس نے اس کے دل کو گدگدا دیا تھا۔
تین سال بعد چارلی ہوٹل کی حالت بھی بہت بدلی ہوئی نظر آئی۔ ہال میں قدم رکھتے ہی نوشین نے محسوس کیا تھا جیسے وہ کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں آئی ہو۔ موزائیک کے نہایت چکنے فرش پر اعلیٰ قسم کی میز کرسیاں بڑے سلیقے سے لگی ہوئی تھیں۔ میزوں کے صاف و شفاف میز پوشوں پر خوبصورت گلدستے سجے ہوئے تھے۔ ان میزوں کے گرد چکراتے ہوئے ویٹروں کے جسم پر بھی مخصوص وردیاں تھیں اور وہ بہت دھیمے لہجے میں گاہکوں کے آرڈرز لے رہے تھے۔
گزشتہ تینوں مرتبہ نوشین دس بجے تک بیٹھ کر چلی گئی تھی لیکن آج اس کے پاس اتنا وقت تھا کہ وہ ہوٹل بند ہونے تک بھی بیٹھ سکتی تھی۔ اس نے ساڑھے نو بجے اس وقت کھانا منگوایا جب عرفی کاؤنٹر کے پیچھے بنے ہوئے دروازے سے اندر چلا گیا تھا۔
جب وہ کھانا کھا چکی اور ویٹر برتن سمیٹنے آیا تو نوشین نے اس سے کہا۔ "تم تو جانتے ہوگے کہ تمہارے ہوٹل کے بازیگر صاحب کا گھر کہاں ہے؟"
"جی نہیں مس صاحبہ!" ویٹر نے ادب سے جواب دیا۔ "یہ



بس چارلی صاحب کو معلوم ہوگا۔"

نوشین چُپ ہوگئی لیکن ایک مرتبہ اس کی نظر ہال کے کنارے پر بنے ہوئے اس بڑے سے کیبن کی طرف اُٹھ گئی تھی جس کے دروازے کے اوپری حصّے میں لگے ہوئے شیشے پر انگریزی میں لکھا تھا "چارلیز روم"۔ "پروپرائٹر" یا "مینجر" کے بجائے "چارلیز روم" لکھنے میں ایک ندرت تھی۔

تھوڑی دیر بعد عرفی پھر اسٹیج پر نظر آیا۔ اس کے نظر آنے سے پہلے کسی نامعلوم جگہ پر لگا ہوا گانگ بجایا گیا تھا تاکہ لوگوں کی توجہ اسٹیج کی طرف مبذول ہو جائے۔

عرفی نے شعبدے دکھانا شروع کیے۔ اسی وقت ویٹر نوشین کی میز پر چائے لایا۔ اس مرتبہ نوشین نے اس سے پوچھا۔ "تم یہ تو نہیں جانتے کہ ان کا گھر کہاں ہے لیکن یہ تو جانتے ہوگے کہ وہ جاتے کس وقت ہیں؟"

"ساڑھے بارہ ایک کے درمیان چلے جاتے ہیں۔" ویٹر نے جواب دیا۔ نوشین اسٹیج کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ آج وہ بارہ بجے کے بعد رُکے تو ہوٹل کے باہر عرفی سے تعارف حاصل کرنے کی کوشش کی جاسکتی ہے۔

شعبدہ بازیوں اور گولوں کا کرتب دکھانے کے بعد گیارہ بج کر دس منٹ پر عرفی پھر کاؤنٹر کے قریب کی کرسی پر اُداس بیٹھا نظر آیا۔

نوشین کو اچانک خیال آیا تھا کہ وہ جسے عرفی کی اداسی سمجھ رہی ہے وہ کہیں خوف کا تاثر تو نہیں ہے؟

نوشین نے سُنا تھا کہ گذشتہ ڈیڑھ سال میں عرفی پر چار مرتبہ قاتلانہ حملے ہوچکے تھے۔ ان میں سے تین حملے تو ہوٹل ہی میں ہوئے تھے۔ کسی جرائم پیشہ شخص نے اچانک اپنی میز سے اٹھ کر عرفی پر چاقو سے حملہ کیا تھا لیکن قریب ہی کی ایک اور میز پر بیٹھے ہوئے تین آدمیوں نے جھپٹ کر حملہ آور کو جکڑ لیا تھا۔ پھر اسے پولیس کے حوالے بھی کردیا گیا تھا۔

دو مرتبہ نامعلوم سمتوں سے عرفی پر گولیاں چلائی گئی تھیں' ان حملوں میں وہ زخمی بھی ہوا تھا۔ ایک مرتبہ پندرہ دن اور دوسری مرتبہ دس دن تک اسے اسپتال میں رہنا پڑا تھا۔

ایک بار اسے ہوٹل کے باہر بھی ہلاک کرنے کی کوشش کی جاچکی تھی۔ وہ دن کا وقت تھا۔ عرفی صدر بازار میں کچھ شاپنگ کررہا تھا کہ کسی نے اس کے پہلو میں چھُرا گھونپنے کی کوشش کی تھی لیکن اس وقت بھی قسمت نے عرفی کا ساتھ دیا تھا۔ حملہ آور کو نہ صرف ناکامی ہوئی تھی بلکہ وہ پکڑا بھی گیا تھا۔

آخری مرتبہ اس پر چھ ماہ قبل ہوٹل ہی میں حملہ ہوا تھا اور چونکہ اس وقت تک عرفی نے خاصی شہرت حاصل کرلی تھی اس لیے اخبارات نے اس معاملے کو بہت زیادہ اُچھالا اور پولیس پر خاصی لے دے کی تھی کہ عرفی پر قاتلانہ حملے کیوں ہوتے رہتے ہیں اور ان حملوں کا سبب کیوں نہیں سامنے آتا؟

کچھ اخبارات نے اس سلسلے میں عرفی کا انٹرویو بھی لینا چاہا تھا لیکن عرفی نے انٹرویو دینے سے انکار کردیا تھا۔ اس نے تو کبھی چھوٹا سا بیان بھی نہیں دیا تھا۔

خوفزدگی کی بات نوشین کے دماغ میں صرف ایک پل کے لیے آئی اور اس نے اس خیال کو مسترد کردیا۔ اگر وہ خوف زدہ ہوتا تو یہ شہر ہی چھوڑ کر بھاگ جاتا یا کم از کم ہوٹل میں یوں کھلے عام اپنے "شوز" تو جاری نہ رکھتا۔ یہ تو اس کے نڈر ہونے کی علامت تھی کہ وہ اپنا یہ کام جاری رکھے ہوئے تھا!

عموماً لڑکیوں کے دل بہادر نوجوانوں سے متاثر ہوجاتے ہیں اور غالباً اسی لیے چارلی ہوٹل میں لڑکیوں کی آمد میں اضافہ ہوا تھا مگر نوشین سوچتی تھی کہ وہ اس کی بہادری سے نہیں' اس کی اداسی سے متاثر ہوئی ہے۔ وہ اس کی اداسی میں ایک عجیب سی رومانوی کشش محسوس کرتی تھی۔

ساڑھے گیارہ بجے عرفی پھر اسٹیج پر نمودار ہوا۔ اس وقت نوشین نے اپنا بل ادا کردیا تاکہ جب چاہے کسی تاخیر کے بغیر اُٹھ سکے۔

بارہ بجے عرفی نے اپنی شعبدے بازیوں کا سلسلہ بند کیا اور اسٹیج کا پردہ گر گیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اب عرفی گولوں کا کرتب نہیں دکھائے گا۔ اس وقت ہال کی تمام میزیں بھری ہوئی تھیں لیکن اسٹیج کا پردہ گرتے ہی لوگوں نے وقفے وقفے سے میزیں چھوڑنا شروع کیں۔ نوشین بھی کرسی سے اٹھ کر ہوٹل سے نکل آئی۔

ہوٹل کی کوئی پارکنگ لاٹ نہیں تھی۔ لوگ اپنی کاریں سڑک پر فٹ پاتھ سے لگا کے کھڑی کرتے تھے۔ جن کو جگہ نہیں ملتی تھی' وہ اردگرد کی دوسری سڑکوں پر گاڑی کھڑی کرکے پیدل چلتے ہوئے ہوٹل آتے اور جاتے تھے۔

نوشین جلدی آئی تھی اس لیے اسے ہوٹل کے سامنے ہی کار کھڑی کرنے کی جگہ مل گئی تھی۔ وہ سیکنڈ ہینڈ سوزوکی کار تھی جو اس نے قسطوں پر خریدی تھی۔ کار میں بیٹھ کر اس نے چابی تو لگادی لیکن انجن اسٹارٹ نہیں کیا۔ اسے عرفی کے باہر آنے کا انتظار تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ عرفی کو کس طرح مخاطب کرے۔ وہ یہ اندازہ نہیں لگا پارہی تھی کہ عرفی کا ردِعمل کیا ہوگا۔ وہ اس سے کس طرح پیش آسکتا ہے۔

دھیرے دھیرے کاریں کم ہوتی چلی گئیں۔ ہوٹل سے نکلنے والے ہر فرد کو نوشین بڑے غور سے دیکھتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اگر وہ ذرا بھی غافل ہوئی تو عرفی نکل جائے گا اور وہ انتظار ہی کرتی رہ جائے گی۔

ساڑھے بارہ بجے تک وہاں کھڑی ہوئی تین چوتھائی سے زیادہ کاریں جاچکی تھیں۔ ہوٹل سے نکلنے والے کچھ لوگ پیدل چلتے ہوئے دوسری سڑکوں کی طرف جارہے تھے۔

جو کاریں باقی رہ گئی تھیں' ان میں زیادہ اچھی کاروں پر اچٹتی

سی نظر ڈالتے ہوئے نوشین سوچ رہی تھی کہ انہی میں سے کوئی کار عرفی کی ہوگی۔ اسے یقین تھا کہ عرفی کو بہت اچھی تنخواہ ملتی ہوگی اور وہ خاصی پُر آسائش زندگی گزارتا ہوگا۔ چارلی ہوٹل کی کامیابی میں سب سے بڑا ہاتھ تو عرفی ہی کا تھا۔

جب ایک بجنے میں پانچ منٹ رہ گئے تو نوشین مضطرب ہوگئی۔ اب وہاں اس کی کار کے سوا کوئی کار بھی نہیں رہ گئی تھی لیکن اس نے عرفی کو باہر نکلتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ اس نے جلدی سے اپنی کار کی چابی نکالی اور اُتر کر تیزی سے ہوٹل کے صدر دروازے کی طرف بڑھی۔ اس وقت ہوٹل کے دو ملازم وہ دروازہ بھی بند کرنے والے تھے۔ نوشین کو تیزی سے قریب آتے دیکھ کر وہ رک گئے پھر جب وہ قریب پہنچی تو ان میں سے ایک نے کہا۔

"ہوٹل تو بند ہوچکا ہے محترمہ!"

"عرفی صاحب تو ابھی یہیں ہوں گے۔ مجھے ان سے ملنا ہے۔"

"وہ تو شاید آدھے گھنٹے پہلے ہی جاچکے۔"

"میں نے تو انھیں باہر نکلتے ہوئے نہیں دیکھا؟"

"وہ پچھلے دروازے سے جاتے ہیں محترمہ!"

"اوہ!"

دونوں آدمیوں کے چہروں پر بہت مدھم سی مسکراہٹ اُبھر آئی تھی اور انہوں نے ایک دوسرے کو بڑی معنی خیز نظروں سے دیکھا تھا۔

نوشین پلٹ کر چل دی۔ اسے مایوسی تو ہوئی ہی تھی لیکن جھنجلاہٹ بھی ہوئی تھی۔ اسے اپنی میز کے ویٹر سے یہ بھی پوچھ لینا چاہیے تھا کہ عرفی کس طرف سے آتا ہے لیکن یہ پوچھنے کا جواز تو اس وقت بنتا جب اسے خیال آتا کہ عرفی کوئی اور دروازہ بھی استعمال کرسکتا ہے۔

کار اس نے تیز رفتاری سے دوڑادی۔ ایک بج کر پانچ منٹ ہونے والے تھے۔ پانچ گھنٹے سے بھی زیادہ دیر کے بعد اسے اپنے شوہر کا خیال آیا۔ اسے یقین تھا کہ ابھی تو وہ رنگ اور برش سے اُلجھا ہوا کسی کینوس پر اپنی تصویر بنانے میں وقت ضائع کر رہا ہوگا۔



تصویر بنانے میں قیصر اتنا منہمک تھا کہ اسے وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا تھا۔ اتفاقاً ہی اس کی نظر دیوار گیر کلاک پر پڑ گئی۔ سوا ایک بج چکا تھا۔ قیصر کی پیشانی پر ایک شکن پڑ گئی۔ نوشین ابھی تک گھر نہیں لوٹی تھی۔ ایک دم سے قیصر کا موڈ اتنا خراب ہوا کہ اس نے برش اور رنگ کی پلیٹ تپائی پر ڈال دی اور قریب پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ کر سگریٹ سُلگانے لگا۔

نوشین سے اس کی شادی کو ایک سال گزر چکا تھا لیکن ابھی ان کے گھر میں تیسرے وجود کا اضافہ نہیں ہوا تھا اور نوشین کے ایک اقدام کے بعد فی الحال تو اس کی توقع بھی نہیں رہی تھی۔ ان دونوں کے والدین جیکب آباد میں رہتے تھے۔ محلّہ بھی ایک ہی تھا۔

ان دونوں کی شادی وہیں ہوئی تھی اور والدین کی مرضی سے ہوئی تھی۔ شادی کی پہلی ہی رات قیصر خوش بھی ہوگیا تھا کہ اس کے والدین کا انتخاب بُرا نہیں تھا۔ نوشین ہزاروں سے نہیں لیکن سیکڑوں لڑکیوں سے خوبصورت ضرور تھی۔

شادی کے بعد وہ دونوں جیکب آباد سے یہاں آگئے تھے۔ قیصر یہیں کے ایک بینک میں سیکنڈ آفیسر کی حیثیت سے ملازم تھا۔

یہاں آنے کے دو ماہ بعد اسے احساس ہونے لگا تھا کہ اس میں اور نوشین میں ذہنی ہم آہنگی نہیں تھی۔ وہ اپنی چادر کے مطابق پاؤں پھیلانے کا قائل تھا جبکہ نوشین کے خواب بڑے لمبے چوڑے تھے جن کو وہ راتوں رات حقیقت میں ڈھلتے ہوئے دیکھنا چاہتی تھی۔ قیصر کے لئے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ ان خوابوں کی تکمیل کرسکتا۔ الاؤنسز وغیرہ ملا کر اس کی تنخواہ بارہ ہزار کے قریب تھی۔ پانچ ہزار اپارٹمنٹ کی قسط کے چلے جاتے تھے۔ دو ہزار روپے وہ اپنے غریب والدین کو بھیجتا تھا جنہوں نے اسے پڑھا لکھا کر کسی قابل بنایا تھا۔ جیکب آباد میں اس کا ایک چھوٹا بھائی بھی تھا جسے وہاں پانچ ہزار کی ملازمت ملی ہوئی تھی لیکن قیصر اپنا فرض سمجھتا تھا کہ اپنی بساط کے مطابق والدین کی کچھ نہ کچھ خدمت سے گریز نہ کرے۔

باقی پانچ ہزار روپوں میں قیصر کے خیال کے مطابق کفایت شعاری سے کام لیتے ہوئے مناسب گزر اوقات کرکے بہتر مستقبل کا انتظار کیا جاسکتا تھا۔ پانچ سال پہلے اسے ایک کلرک کی حیثیت سے ساڑھے چار ہزار سے کچھ زیادہ ملا کرتے تھے۔ چار سال میں اس نے اتنی ترقی کی تھی کہ سیکنڈ آفیسر بن گیا تھا۔ بارہ ہزار تنخواہ ہو جانے کے بعد ہی اس نے قسطوں پر یہ اپارٹمنٹ لیا تھا اور اس کے بعد شادی کی تھی۔ اس کی دانست میں امکان تھا کہ ایک ڈیڑھ سال میں وہ مینجر بن جاتا تو اس کی تنخواہ مزید بڑھ جاتی۔ اس کے علاوہ اسے اپنی مصوّری کا مستقبل بھی خوش آئند نظر آرہا تھا۔ اس نے تجریدی مصوری میں کچھ تجربات شروع کئے تھے تاکہ اپنا ایک منفرد مقام بنا سکے۔ اسے امید تھی کہ کچھ عرصے بعد لوگ وہ باتیں سمجھنے لگیں گے جو وہ اپنی ان تصویروں کے ذریعے کہنے کی کوشش کرتا تھا۔

نوشین نے میٹرک تو کیا تھا لیکن وہ بھی ایک غریب گھر کی لڑکی تھی اسی لئے قیصر کا خیال تھا کہ وہ پانچ ہزار روپوں میں گزر اوقات کرلے گی لیکن دو ماہ بعد ہی اس نے پر پُرزے نکالنا شروع کردیے۔ یہ بات تو اسے بہت ہی کھلتی تھی کہ قیصر دو ہزار روپے اپنے والدین کو بھیجا کرتا تھا۔ اس کے باوجود نوشین نے اخراجات اتنے بڑھائے کہ شادی کا چوتھا مہینہ گزرتے گزرتے قیصر دس ہزار روپوں کا مقروض ہوگیا۔

یہیں سے دونوں میں تلخی بڑھنا شروع ہوئی۔ نوشین نے یہ تک کہہ دیا کہ وہ اپنے اخراجات پورے کرنے کے لئے ملازمت

کرلے گی۔ قیصر کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا اگر نوشین کو اتنی اچھی ملازمت مل سکتی کہ گھر کے کام کاج کے لئے کوئی ملازمہ رکھ لی جاتی لیکن وہ صرف میٹرک تھی۔ اسے دو ڈھائی ہزار سے زیادہ کیا تنخواہ ملتی!

جب قیصر نے اس کی توجہ اس طرف دلائی تو اس نے اس سلسلے میں خاموشی تو اختیار کرلی لیکن اس کے چہرے سے صاف معلوم ہونے لگا تھا کہ وہ ادھیڑبن میں مبتلا ہوگئی تھی۔

قیصر کا خیال تھا کہ ایک چھوٹے سے شہر سے ایک بڑے شہر میں آکر نوشین احساسِ کمتری کا شکار ہوگئی تھی اور اسی احساس نے اس کے دماغ میں شدید انتشار پیدا کردیا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ راتوں رات کوئی ایسا عمل کیا جائے کہ دنیا بھر کی آسائشات فوراً اس کے سامنے ہاتھ باندھ کر آکھڑی ہوں۔

اتفاق سے نوشین نے گلا بڑا اچھا پایا تھا۔ بڑی بڑی فنکاراؤں کے گائے ہوئے گیت اور غزلیں وہ بڑی خوش اسلوبی سے گالیا کرتی تھی۔

قیصر کو بھی اس کا گانا بہت اچھا لگتا تھا لیکن یہ بات اس کے ذہن میں قطعاً نہیں آئی تھی کہ نوشین کی خوش گلوئی آمدنی کا ذریعہ بھی بن سکتی ہے۔ خود نوشین ہی کو اس کا خیال آیا تھا۔ ان دنوں فور اسٹار اور فائیو اسٹار ہوٹلوں میں مشرقی موسیقی رواج پانے لگی تھی۔ دو ایک ہوٹلوں نے گلوکاراؤں کی خدمات حاصل کرلی تھیں۔ بعض ہوٹلوں میں طبلے کے ساتھ صرف وائلن یا سارنگی پر مشرقی دُھنیں بجائی جاتی تھیں۔ کسی ہوٹل نے اخبار میں "گلوکارہ کی ضرورت" کا اشتہار دیا تو نوشین اس پر لپک پڑی۔ آواز تو اس کی اچھی تھی ہی لیکن قدرتی طور پر اسے ردھم کی سمجھ بھی تھی چنانچہ اس کا انتخاب ہوگیا۔

نوشین نے اپنی اس کامیابی کی اطلاع قیصر کو بعد میں دی۔ اس وقت اس کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔

قیصر کسی نہ کسی حد تک آزاد خیال تھا، پھر بھی یہ بات اسے کچھ اچھی نہیں لگی کہ اس کی بیوی رات کو دس بجے سے ساڑھے گیارہ بجے تک ہوٹل میں گانا گاکر لوگوں کا دل بہلایا کرے۔ اس نے یہ محض اس لئے گوارا کرلیا کہ اس طرح گھریلو تلخیاں کم ہوسکتی تھیں۔

ابتدا میں نوشین کی تنخواہ بیس ہزار روپے مقرر ہوئی تھی لیکن وہ دو ماہ میں ہی اتنی مقبول ہوگئی کہ اس نے اپنی تنخواہ میں دس ہزار کا اضافہ کرلیا۔ پہلے وہ ٹیکسی میں آتی جاتی تھی لیکن پھر چار ماہ بعد ہی اس نے ایک سیکنڈ ہینڈ کار خریدلی اور قیصر کو بتایا کہ وہ اس نے ہوٹل کے مینجر سے قسطوں پر خریدی ہے تو قیصر کے دل میں کچھ شکوک پیدا ہوئے اور یہ شکوک اس وقت ختم ہوئے جب اس نے بہت خاموشی سے اس کی تصدیق کرلی اور یہ اطمینان بھی کرلیا کہ اس کی بیوی کردار کے حساب سے بہت سنبھلی ہوئی تھی اور اس کا احتمال نہیں تھا کہ اس کی کوئی حرکت باعثِ شرمندگی ہوتی، تاہم اس نے اپنے جاننے والوں کو نہیں بتایا کہ اس کی بیوی نے کسی ہوٹل میں ایک گلوکارہ کی حیثیت سے گانا شروع کردیا ہے۔

نوشین اپنی ساری تنخواہ صرف اپنی ذات پر خرچ کرتی تھی۔ مہینے میں دس پندرہ ہزار روپے کے تو صرف کپڑے یا ایک آدھ زیور خریدلیتی تھی، پانچ ہزار روپے کار کی قسط کے چلے جاتے تھے اور باقی روپے وہ اپنے اکاؤنٹ میں جمع کرتی تھی یا گھر سے باہر کھانے پینے میں خرچ کرڈالتی تھی۔

قیصر کو اس کا کوئی گلہ بھی نہیں تھا۔ اس کی تو خواہش تھی کہ نوشین کا ایک پیسا بھی گھر میں خرچ نہ ہو لیکن کچھ ہی عرصے بعد اسے یہ دیکھ کر تشویش رہنے لگی کہ نوشین اس منزل پر آکر بھی.... مطمئن نہیں تھی۔ اس کی تو خواہش تھی کہ اس کے پاس دس بارہ لاکھ روپے کی بہت اچھی کار اور کم سے کم ہزار گز کا ایک بنگلا بھی ہو اور قیصر کا خیال تھا کہ بات وہاں جاکر بھی ختم نہیں ہوگی، نوشین کی ہوس بڑھتی ہی جائے گی، اور عزت و آبرو کے ساتھ کوئی عورت اتنا زیادہ حاصل نہیں کرسکتی۔

ایک ماہ قبل نوشین اس وقت بہت جھلاّئی تھی جب اس کے ہوٹل والوں نے ایک مشہور و معروف فنکارہ کی خدمات بھی حاصل کرلی تھیں۔ اسے ہفتے میں صرف ایک دن پروگرام کرنے کے لئے آمادہ کیا گیا تھا۔ ہوٹل والوں کی خواہش تو یہ تھی کہ وہ فنکارہ ماہ رُخ ویک اینڈ کی رات کو پروگرام کیا کرے لیکن وہ صرف بدھ کی رات کو پروگرام کرنے کے لئے آمادہ ہوئی تھی۔

اس طرح نوشین کو ہفتے میں ایک دن چھٹی کرنے کا موقع مل گیا تھا لیکن وہ مشتعل اس بات پر تھی کہ ہوٹل والوں نے ماہ رُخ سے ایک لاکھ روپے ماہانہ کا کنٹریکٹ کیا تھا! یعنی چار دن کے ایک لاکھ جبکہ نوشین کو چھبیس ستائیس دن کے تیس ہزار ملتے تھے۔

"میں کسی دن سمجھوں گی اس ماہ رُخ کی بچی سے!" نوشین نے تلملا کر کہا تھا۔ "اس کی آواز مجھ سے اچھی ہرگز نہیں ہے۔"

"کوئی حماقت نہ کر بیٹھنا۔" قیصر نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ "دوسروں کے لئے گڑھا کھودنے والا بعض اوقات خود ہی اپنے کھودے ہوئے گڑھے میں گر پڑتا ہے۔ پھر یہ بھی دیکھو کہ وہ ایک باقاعدہ فنکارہ ہے۔ پندرہ سال تک یہ فن سیکھتی رہی ہے۔ پھر ناموری کا معاوضہ تو زیادہ ملتا ہی ہے۔"

نوشین چپ تو ہوگئی تھی لیکن قیصر نے محسوس کیا تھا کہ اس نے اس کی بات سمجھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ بدھ کی رات جب وہ گھر پر ہوتی تو تلملائی ہوئی سی رہتی لیکن اس روز بدھ کی چھٹی ہونے کے باوجود وہ سرِ شام ہی کہیں چلی گئی تھی اور اب سوا بج چکا تھا۔

اندیشوں اور وسوسوں میں گھرے ہوئے ذہن کے ساتھ قیصر نے سگریٹ ختم کی ہی تھی کہ کال بیل کی آواز سُنائی دی۔ قیصر ایک

طویل سانس لے کر کرسی سے اُٹھا۔ اس وقت کال بیل بجانے والی نوشین ہی ہو سکتی تھی۔ دروازے کے قریب پہنچتے پہنچتے قیصر نے کوشش کی کہ اپنے موڈ کی خرابی کے تاثرات اپنے چہرے پر ظاہر نہ ہونے دے۔

آنے والی نوشین ہی تھی!

"میں تو کھانا کھا کر آئی ہوں" وہ اندر آتے ہی اتنی بے پروائی سے بولی جیسے ڈیڑھ بجے رات کو گھر لوٹنا اس کے لئے کوئی خاص بات نہ ہو۔ "آپ نے شاید ابھی نہیں کھایا ہوگا۔"

"کھالیا۔" قیصر نے آہستہ سے کہا اور دروازہ بند کرنے لگا۔

"میں تو اب تھک گئی ہوں' سخت نیند آرہی ہے۔ آپ تو معمول کے مطابق تین بجے تک کام کریں گے۔"

"نہیں" قیصر نے کہا۔ "تم بیڈ روم میں چل کر لیٹو' میں سب چیزیں سمیٹ کر آتا ہوں۔"

نوشین اپنا پرس جھلاتی ہوئی اندر چلی گئی۔

قیصر دس منٹ بعد بیڈ روم میں داخل ہوا تو نوشین بستر پر لیٹ چکی تھی اور اس نے کمبل اوڑھ لیا تھا۔ آدھی رات کے بعد اب کچھ سردی ہونے لگی تھی اور امکان تھا کہ ہفتے بھر میں سردی خاصی بڑھ جائے گی۔

قیصر نے بیڈ کے سرہانے سے ٹیک لگا کر ٹانگیں پھیلا دیں۔ کمبل ٹانگوں سے کمر تک لے لیا اور نوشین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "آج تو شاید تمہارا پروگرام نہیں تھا ہوٹل میں!"

"نہیں" نوشین نے کہا۔ "آج میں چارلی ہوٹل چلی گئی تھی! وہاں کے بازیگر عرفی کی بہت شہرت سُنی تھی' سوچا دیکھ آؤں!"

"کیا اتنی رات گئے تک عورت کا گھر سے باہر رہنا مناسب ہے؟"

"کیوں؟" نوشین کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں۔ "کیا حرج ہے اس میں؟"

"حرج بس یہ ہے کہ دل میں بے بنیاد وسوسے اور اندیشے پیدا ہونے لگتے ہیں۔"

"کیسے وسوسے؟" نوشین کی تیوریاں اور چڑھ گئیں۔

"یہ تم خود بھی سمجھ سکتی ہو!"

"آپ مجھ پر شک کر رہے ہیں؟" نوشین تڑخ کر بولی۔

میں نے ابھی وسوسوں اور اندیشوں کے ساتھ بے بنیاد کا لفظ بھی استعمال کیا ہے۔ تم مجھے سمجھنے کی کوشش نہیں کرتیں نوشین! میں تمہیں محتاط دیکھنا چاہتا ہوں۔ مجھے اس بات سے ڈر لگنے لگا ہے کہ تیس ہزار روپے ماہانہ کی آمدنی بھی تمہارے لئے اطمینان بخش نہیں ہے۔"

"تیس ہزار میں آج کل ہوتا کیا ہے!"

"جب میری تنخواہ ساڑھے چار ہزار تھی' تب بھی میں مطمئن تھا۔"

"ہر ایک کا مزاج ایک سا تو نہیں ہوتا!"

"پہلے تمہارا مزاج بھی وہ نہیں تھا جو' اب ہے۔" قیصر نے کہا۔ "خواہشات کے پیچھے دوڑنے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ خواہشات پوری بھی ہو جائیں گی۔"

"میں کہاں دوڑتی پھرتی ہوں!" نوشین کے لہجے میں تلخی آگئی۔ "اس ملازمت کے بعد میں اور کہاں دوڑی ہوں؟"

"اگر نہیں دوڑی ہو تو اس لئے کہ کوئی راستہ نظر نہیں آیا جب راستہ نظر آئے گا تو دوڑ پڑو گی۔ جس طرح اس ملازمت کا راستہ نظر آیا تھا تو دوڑ پڑی تھیں۔ خیر! جو ہوا' سو ہوا اب تمہیں اپنی خواہشات کی مزید تکمیل چاہئے تو جم کر لگن اور محنت سے کام کرو۔"

"جس طرح آپ کئی سال سے کینوس رنگین کرتے چلے جا رہے ہیں اور حاصل کچھ نہیں ہو رہا ہے۔" نوشین نے تلخی سے کہا۔

"اگر میری لگن سچی ہے تو یہ ضرور رنگ لائے گی۔ دیر سویر کی بات قدرت کے ہاتھ میں ہے۔"

"اب تک میری سمجھ میں نہیں آسکا کہ آپ مجھ سے چاہتے کیا ہیں؟"

"خدا نے تمہیں بہت اچھی آواز دی ہے نوشین! اگر تم گائیکی کا فن سیکھنے کے لئے کسی استاد کی خدمات حاصل کرلو تو ترقی خود آگے بڑھ کر تمہارے قدم چوم سکتی ہے۔"

"سیکھنے ہی میں دو چار سال ضائع کردوں!" نوشین نے منہ بنا کر کہا۔

"تمہاری اسی قسم کی باتوں سے مجھے ڈر لگتا ہے۔ زندگی کی دوڑ میں عجلت پسندی' انسان کو کسی گہرے گڑھے میں بھی گرا دیتی ہے۔ تم دو چار سال ضائع کرنا نہیں چاہتیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ وہ ضائع نہیں ہوں گے' تمہارے لئے ایک مضبوط بنیاد بنیں گے۔"

"آپ مجھ سے زیادہ پڑھے لکھے ہیں قیصر' لیکن زمانے کی تیز رفتاری نہیں دیکھ رہے ہیں۔ آج کل مضبوط بنیادیں بنانے کے چکر میں پڑنے والے بہت پیچھے رہ جاتے ہیں۔ میرے ہوٹل میں بہت بڑے بڑے لوگ آتے ہیں مگر ان میں کئی ایسے ہیں جن کے پاس صرف دو ڈھائی سال پہلے کچھ بھی نہیں تھا۔"

"جن کے پاس اتنی جلدی سب کچھ ہو جاتا ہے' وہ صحیح راستوں سے ہرگز نہیں ہو سکتا۔"

"راستوں کے بارے میں' صحیح اور غلط کی شناخت کیسے ہو؟"

"اندھا دھند دوڑا جائے تو قدم غلط راستوں کی طرف بھی اُٹھ جاتے ہیں۔ سوچ سمجھ کر قدم اُٹھایا جائے تو انسان کا ضمیر ہی اسے غلط اور صحیح راستوں کی تمیز کرا دیتا ہے۔ ہاں اگر انسان کا ضمیر ہی مر جائے یا انسان اسے خود مار ڈالے تو دوسری بات ہے۔"

"مطمئن رہیے کہ میرا ضمیر زندہ ہے۔"

"میری دعا ہے، میری خواہش ہے کہ وہ زندہ رہے۔"
"اچھا اب سو جائیے، میں بہت تھک گئی ہوں۔" نوشین نے کہا اور دوسری طرف کروٹ لے لی۔
قیصر خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ نوشین نے اپنی خامیوں سے قطع نظر قیصر کے دل میں کچھ نہ کچھ جگہ بنا لی تھی۔ وہ عشق یا محبت نہ سہی مگر انسیت ضرور تھی۔ قیصر چاہتا تھا کہ نوشین اس سے کبھی جدا نہ ہو لیکن اب اسے اندیشہ لاحق ہوگیا تھا کہ نوشین اس سے بچھڑ جائے گی اور اس کی سوچ ایسی تھی کہ اس سے بچھڑنے کے بعد وہ شاید خود کو برباد ہی کر بیٹھے۔



دوسرے دن ویک اینڈ تھا۔ نوشین جانتی تھی کہ اس رات چارلی ہوٹل میں عرفی خصوصی شو پیش کرتا تھا۔ اس شو میں اس کے کمالات نہ صرف عام دنوں سے بالکل مختلف بلکہ ہر خصوصی شو سے کسی نہ کسی حد تک ہٹ کر ہوتے تھے اس لئے اس روز ہوٹل کی "انٹری فیس" دگنی سے بھی کچھ زیادہ ہوتی تھی اور میز بھی پہلے سے ریزرو کروانا پڑتی تھی اس لئے نوشین نے دو دن پہلے ہی میز ریزرو کرالی تھی۔
وہ خصوصی پروگرام نو بجے سے ساڑھے دس بجے تک ہوتا تھا لیکن نوشین کو بھی اس روز معمول کے مطابق دس بجے سے ساڑھے گیارہ بجے تک اپنے ہوٹل میں پروگرام کرنا تھا لیکن وہ سوچ چکی تھی کہ "اچانک بخار" کی لپیٹ میں آجانے کے باعث وہ چھٹی کرلے گی۔ ممکن تو یہ بھی تھا کہ وہ اپنا پروگرام دس بجے شروع کرنے کے بجائے گیارہ بجے شروع کرتی مگر اس نے رات کو گھر جاتے ہی فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ اگلی رات کو پروگرام کے بعد عرفی سے ضرور ملے گی لہٰذا ضروری تھا کہ وہ چھٹی کرتی۔
رات کو آٹھ بجے ہی اس نے اپنے ہوٹل منیجر کو اپنی فرضی بیماری کی اطلاع دے دی اور ساڑھے آٹھ بجے چارلی ہوٹل پہنچ گئی۔ قیصر نے اس سے پوچھا بھی تھا کہ وہ اس روز اتنی جلدی کیوں جارہی ہے اور اس نے بہانہ کردیا تھا کہ آج اسے ایک ٹھمری گانا ہے اور اس نیم کلاسیکل "آئٹم" کے لئے اسے ایک ڈیڑھ گھنٹے مشق کرنا ہے۔
یہ بہانہ اس نے محض اس لیے کیا تھا کہ قیصر کا کوئی "لیکچر" سُن کر اس کا موڈ خراب نہ ہو۔ ورنہ وہ صحیح بات بھی بتا دیتی۔ دو ڈھائی ماہ سے اس نے قیصر کی پروا کرنا بالکل چھوڑ دی تھی۔ ایسا تو نہیں تھا کہ وہ قیصر سے بالکل اکتا گئی ہو لیکن جلد از جلد آسمان کو چھُو لینے کی خواہش کے باعث وہ قیصر کی "روک ٹوک" برداشت کرنے کے لئے بالکل تیار نہیں تھی۔ اس نے ہوٹل کی ملازمت کے کچھ ہی عرصے بعد محسوس کرلیا تھا کہ اس کا مستقبل بالکل محفوظ ہے۔ اگر قیصر کسی بات پر اسے طلاق بھی دے دیتا تو بھی اس کے دانست میں اس کا مستقبل بالکل محفوظ تھا۔ ہوٹل میں جو لوگ اس کا گانا سُننے کے لئے آتے تھے، ان میں سے کئی بہت بڑے بڑے آدمی اس کی "نظرِ کرم" کے خواہاں نظر آنے لگے تھے جن میں سے دو تین کی عمر تیس بتیس سال سے زیادہ نہیں تھی لیکن نوشین نے اب تک خود کو بہت "ریزرو" رکھا تھا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ ان لوگوں میں سے کوئی بھی ایسا نہیں تھا جس نے اس کی جمالیاتی حس کو چھیڑا ہو۔
عرفی وہ واحد شخص تھا جس نے نوشین کے دل کو گدگدایا تھا۔ جو بظاہر تو خوبصورت نظر نہیں آتا تھا مگر اس میں کوئی ایسی انجانی کشش ضرور تھی جس نے نوشین کو متاثر کیا تھا۔ لیکن اس کے دل میں ابھی ایسی کوئی خواہش پیدا نہیں ہوئی تھی کہ اگر اسے موقع مل گیا تو وہ قیصر سے طلاق لے کر عرفی سے شادی کرلے گی۔ وہ عرفی سے صرف دوستی کی خواہاں تھی۔ اسے یہ خیال بھی تھا کہ عرفی خود کو یہاں "ضائع" کر رہا ہے۔ وہ سمجھتی تھی کہ عرفی اگر مغربی ممالک کے دورے پر نکل جائے تو اسے خاصی دولت اور شہرت بھی حاصل ہوسکتی تھی جبکہ چارلی ہوٹل اسے وہ سب کچھ نہیں دے سکتا تھا۔
شاید نوشین کے لاشعور میں یہ خیال بھی ہو کہ مغربی ممالک کے دوروں پر وہ بھی عرفی کے ساتھ جاسکتی ہے اور وہ دونوں ہی اپنے اپنے "فن" کا مظاہرہ کرسکتے ہیں جس سے دولت اور شہرت ان دونوں کے قدم بھی چوم سکتی تھی۔ نوشین نے گائیکی کا فن تو نہیں سیکھا تھا لیکن اپنی دلکش آواز کی مقبولیت کے باعث وہ خود کو "فنکارہ" سمجھنے لگی تھی۔ یہ اس کا مشاہدہ بھی تھا کہ اسی سال ایک نہایت بے سُرے، "پاپ سنگر" نے مغربی ممالک کا دورہ کرکے اپنے صرف ایک گانے کی بے پناہ مقبولیت کے باعث نہایت شہرت حاصل کی تھی جب وہ وطن لوٹا تھا تو یہاں بھی اس کی پزیرائی کرنے والوں کی تعداد میں اچانک اضافہ ہوگیا تھا۔ یہ دیکھنے کے بعد اسے خود اپنی مقبولیت بھی یقینی محسوس ہونے لگی تھی لیکن مغربی ممالک میں "شوز" کرنے کے لئے اسے کسی سہارے کی ضرورت تھی۔ اسے اب تک کوئی "اسپانسر" نہیں ملا تھا اور اسی لیے اسے خیال آرہا تھا کہ وہ عرفی کو سہارا بنا سکتی ہے اور عرفی کو "اسپانسر شپ" دلانا اس کے لئے مشکل نہیں ہوتا۔ وہ اس سلسلے میں ان بڑے لوگوں سے بات کرسکتی تھی جو اس کی نظرِ کرم کے منتظر تھے۔
ہوٹل پہنچ کر اس نے فوراً کھانا منگوایا تاکہ اس کے بعد اطمینان سے عرفی کا "شو" دیکھ سکے۔
کھانے کے دوران میں اس نے سترہ اٹھارہ سال کی صوفیہ کو بھی دیکھا جو عموماً ہال میں اِدھر اُدھر ٹہلتی ہوئی نظر آتی تھی۔ ایک ویٹر ہی سے نوشین کو معلوم ہوا تھا کہ وہ اس ہوٹل کے مالک چارلی کی لڑکی تھی اور ایک سپروائزر کی حیثیت سے ہال میں چکراتی رہتی تھی۔
چارلی کے بارے میں اسے معلوم ہوا تھا کہ وہ ایک نو مسلم تھا۔ چند سال پہلے وہ کرسچین تھا۔ اس کی بیوی مر چکی تھی۔ صوفیہ

اس کی واحد اولاد تھی لیکن مسلمان ہو جانے کے بعد بھی صوفیہ نے اپنے لباس میں کوئی تبدیلی نہیں کی تھی۔ وہ اب بھی اسکرٹ پہنتی تھی۔ شاید اسے اپنی گوری اور متناسب پنڈلیوں کی نمائش کرنا بہت پسند تھا ورنہ صورت شکل کے اعتبار سے تو وہ اوسط درجے کی لڑکی تھی۔ اس وقت اس نے سردی کی وجہ سے کمر تک کا گرم کوٹ بھی پہن رکھا تھا۔

اس رات عرفی کا شو دیکھ کر نوشین کا دل خوشی سے بلیوں اُچھلنے لگا۔ اسے یقین ہو گیا کہ اس قسم کے کمالات دکھانے میں یورپ کا کوئی ماہر بھی عرفی کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ خصوصاً دو "آئٹم" تو ایسے تھے کہ ہال میں بیٹھا ہوا ہر فرد دم بخود رہ گیا تھا۔

ایک آئٹم کو شعبدے بازی یا نظر بندی کا کمال کہا جا سکتا تھا' عرفی نے اسٹیج پر کھڑے کھڑے اپنی جیب سے سُرخ رنگ کا سفید پھولوں والا رومال نکال کر کہا تھا۔ "میں یہ رومال آپ لوگوں کی طرف پھینکتا ہوں' اسے کون پکڑے گا؟"

ہال میں سبھی نے ہاتھ اٹھا دیے تھے۔

"نہیں!" عرفی نے مسکرا کر کہا تھا۔ "رومال میں زیادہ دور تک نہیں پھینک سکتا" اور پھر اس نے ان چاروں میز پر نظر دوڑائی تھی جو اسٹیج کے قریب ترین تھیں۔

اس وقت نوشین کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئی تھیں۔ وہ انہی چاروں میزوں میں سے ایک پر تھی۔ اس کا دل مچل اٹھا تھا کہ عرفی رومال اس کی طرف پھینکے۔ اس وقت اسے قطعاً اندازہ نہیں تھا کہ عرفی کس قسم کا شعبدہ یا کمال دکھانا چاہتا تھا۔

پھر اس وقت نوشین کے دل کی دھڑکنیں اور تیز ہو گئیں جب عرفی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ "رومال میں آپ کی طرف پھینک رہا ہوں میڈم!" پھر اس کا ہاتھ ایسی پوزیشن میں آیا تھا جیسے وہ رومال پھینکنے ہی والا ہو۔ اس نے رومال کا صرف ایک کونا پکڑ رکھا تھا۔

نوشین نے اپنے ہاتھ اس طرح اٹھائے جیسے رومال کو کسی قیمت پر بھی گرنے نہ دینا چاہتی ہو۔

پھر عرفی نے رومال پھینکا' مگر کیا وہ رومال تھا؟

دیکھنے والوں کو ایسا لگا جیسے رومال کا کپڑا تیزی سے بڑا ہوتا چلا گیا ہو۔ اس کا ایک کونا عرفی کے ہاتھ میں ہی رہا لیکن دوسرا کونا آٹھ نو فٹ کے فاصلے پر بیٹھی نوشین کے ہاتھ سے ٹکرایا۔ رومال کو کسی چادر کی طرح پھیلتے دیکھ کر وہ اتنی گڑبڑا گئی تھی کہ وہ نرم ریشمیں کپڑا غیر ارادی ہی طور پر اس کی گرفت میں آگیا۔

فوراً ہی عرفی بولا۔ "بس' چھوڑ دیجیے!"

نوشین نے اسے جس طرح غیر ارادی طور پر پکڑا تھا' اسی طرح وہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ بھی گیا اور عرفی نے اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔

پھر لوگوں نے دوسرا حیرت انگیز منظر دیکھا کہ وہ کپڑا حیرت انگیز سرعت سے سکڑتا چلا گیا۔ اور آخر میں وہ صرف رومال ہی رہ گیا۔

عرفی اسے ہاتھ میں لہراتے ہوئے سارے ہال پر نظریں دوڑا رہا تھا اور تالیوں کی گونج اتنی تھی کہ ہال میں کان پڑی آواز سُنائی نہیں دے سکتی تھی۔

عرفی نے تین مرتبہ جھک جھک کر اس پذیرائی کا شکریہ ادا کیا۔

تالیاں بجتی رہیں اور اس وقت یکایک رک گئیں جب عرفی نے رومال کو اوپر کی طرف جھٹکا اور لوگوں کو یوں محسوس ہوا جیسے گیند کے برابر سرخ رنگ کا ایک گولا رومال میں سے نکل کر چھت کی طرف گیا ہو' اور پھر جب وہ نیچے آرہا تھا تو اسے روکنے کے لئے عرفی نے اپنا بایاں ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے دائیں ہاتھ سے رومال کو ایک بار پھر اوپر کی طرف جھٹکا اس مرتبہ بھی ایک گولا' رومال میں سے نکلتا محسوس ہوا۔ وہ چھت کی طرف جا رہا تھا کہ پہلا گولا عرفی کے بائیں ہاتھ میں آگیا۔ اس نے فوراً ہی وہ گولا اچھال بھی دیا۔

دوسرا گولا اس کے خالی ہاتھ میں آگیا اور پہلا گولا جب اس کے دائیں ہاتھ میں آیا تو اس کے ہاتھ میں رومال نہیں تھا' کوئی آنکھ یہ نہیں دیکھ سکی تھی کہ عرفی نے رومال اپنی جیب بھی رکھا تھا یا اسٹیج کے فرش پر پھینک دیا تھا۔

ہال ایک بار پھر تالیوں سے گونج اُٹھا۔

عرفی اسٹیج پر کھڑا دونوں گولے اُچھالتا رہا۔ نوشین دم بخود بیٹھی دھڑکتے دل کے ساتھ اس کی طرف دیکھتی رہی۔

جب تالیاں رکیں تو عرفی اسٹیج کی سیڑھیاں اتر کر ہال میں آگیا اور پھر معمول کے مطابق گولوں کی تعداد بڑھتی چلی گئی۔ تین..... چار.....پانچ!

اور پھر اس وقت نوشین چونکی جب چھٹا گولا بھی نظر آیا اور اس کے بعد ساتواں بھی!

تالیاں پھر بج اٹھیں جب سات گولے فضا میں رقص کرتے نظر آئے۔ عرفی کے ہاتھ بہت تیزی سے متحرک تھے اور وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔

ہال کے وسط میں وہ چھت سے لٹکے ہوئے ایک پنکھے کے نیچے رُک گیا۔ اس وقت تک تالیاں بجنا بتدریج بند ہو چکی تھیں!

موسم ایسا تھا کہ نہ تو پنکھے چل رہے تھے' نہ ائرکنڈیشنر چلائے گئے تھے لیکن اچانک وہ پنکھا آہستہ آہستہ چلنے لگا۔

کیا کوئی اور نیا کمال! نوشین نے سوچا۔

پنکھا چلنے کا کوئی جواز سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ ہال کا صرف وہی پنکھا حرکت میں آیا تھا جس کے نیچے عرفی کھڑا تھا۔ باقی پنکھے بدستور ساکت تھے۔

جو پنکھا چلا تھا' اس کی رفتار بھی تیز نہیں ہوئی تھی۔ وہ اتنی دھیمی رفتار سے چل رہا تھا کہ اس کے ہر پنکھ کی گردش صاف نظر آرہی تھی۔ وہ دو سیکنڈ میں ایک گردش مکمل کر رہا تھا۔

اس وقت نوشین کو اپنے دل کی دھڑکنیں ناہموار محسوس

ہونے لگیں جب اس نے ایک گولے کو چلتے ہوئے پنکھے کے بیچ سے اوپر جاتے دیکھا۔ پھر دوسرا گولا بھی اوپر گیا اور پھر جب تیسرا گولا اوپر جارہا تھا تو پہلا گولا واپس آرہا تھا۔ وہ کسی پنکھ سے ٹکرائے بغیر عرفی کے ہاتھ میں آگیا۔

ہال میں پھر تالیاں بج اُٹھیں۔ سات میں سے تین گولے پنکھے کے بیچ سے اوپر جارہے تھے اور واپس آرہے تھے۔ باقی چار گولوں کو اتنا نہیں اُچھالا جاتا تھا کہ وہ پنکھے سے اوپر جائیں لیکن یہ بھی کوئی معمولی بات نہیں تھی کہ تین گولے چلتے ہوئے پنکھے کے بیچ سے اوپر جا آرہے تھے مگر اس آمدورفت میں کوئی گولا بھی کسی پنکھ سے ٹکرائے بغیر عرفی کے ہاتھ میں پہنچ جاتا تھا۔

نوشین جاگتی آنکھوں سے یہ خواب دیکھنے لگی کہ عرفی لندن کے رائل البرٹ ہال کے اسٹیج پر اپنے اس کمال کا مظاہرہ کررہا تھا' اور ہال میں وہ خود بھی موجود تھی۔ وہاں بیٹھے ہوئے لوگ آپس میں باتیں کرتے ہوئے اس کی طرف بھی کچھ اشارہ کررہے تھے اور ایک دوسرے کو کچھ بتارہے تھے۔

جاگتی آنکھوں سے نوشین نے نہ جانے کیا کیا خواب دیکھ ڈالے اور پھر اس وقت چونکی جب ہال میں تالیاں بج رہی تھیں۔ اور اسٹیج کا پردہ گر رہا تھا۔

○☆○

دس بج کر چالیس منٹ ہوئے تھے جب نوشین کی کار چارلی ہوٹل کے عقب میں پہنچ کر رُک چکی تھی۔

وہ سڑک زیادہ چوڑی نہیں تھی۔ انگریزی میں اس کے لئے "روڈ" کے بجائے "اسٹریٹ" کا نام زیادہ مناسب تھا۔ دس بج چکے تھے اس لیے تمام دکانیں بند ہو چکی تھیں۔ اسٹریٹ لائٹس کی روشنی میں دور دور تک کوئی راہ گیر نظر نہیں آرہا تھا لیکن ہوٹل کے عقب میں تین کاریں کھڑی ہوئی تھیں پھر لگ بھگ تین چار فرلانگ آگے بھی دو کاریں کھڑی تھیں۔ ٹریفک برائے نام ہی تھا۔

نوشین نے جب کار روکی تھی تو اس نے دیکھا تھا کہ وہاں کھڑی ہوئی تینوں کاروں میں سے ایک کی ڈرائیونگ سیٹ سے کسی نے سر اٹھا کر اس کی کار کی طرف دیکھا تھا اور پھر اتنا نیچے ہوگیا تھا کہ اب نوشین کو وہ کار خالی ہی معلوم ہورہی تھی۔

فوری طور پر نوشین کی سمجھ میں نہیں آسکا کہ وہ شخص کار میں اس طرح کیوں چھپا ہوا تھا؟ یہ تو ایک پُراسرار سی حرکت تھی۔ پھر اچانک نوشین کو وہ قاتلانہ حملے یاد آئے جو عرفی پر کیے جاچکے تھے۔ اس خیال سے نوشین کے دل کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں کہ کار میں چُھپا ہوا وہ شخص عرفی کے دشمنوں میں سے کوئی نہ ہو' وہ اس تاک میں ہو سکتا تھا کہ عرفی باہر نکلے تو وہ اس پر گولی چلادے!

لیکن اس خیال سے نوشین صرف مضطرب ہوئی' اس کے جسم میں خوف نہیں سرسرایا۔ وہ فطرتاً خاصی نڈر تھی لیکن اس خیال سے پریشان ضرور ہوئی کہ اگر وہ شخص کار میں' عرفی کو گولی مارنے ہی کے لئے چُھپا ہوا ہے تو عرفی یقیناً اس سے بے خبر ہوگا!

پہلے تو نوشین کار ہی میں بیٹھے بیٹھے عرفی کا انتظار کرنا چاہتی تھی لیکن عرفی کے لئے خطرہ محسوس کرتے ہی وہ اپنی کار سے اُتری اور فٹ پاتھ پر چڑھ کر اس جگہ جا کھڑی ہوئی جہاں سے نوشین کے خیال کے مطابق عرفی کو باہر آنا چاہئے تھا۔ وہاں کھڑے کھڑے وہ کن انکھیوں سے اس مشتبہ کار کی طرف دیکھتی رہی۔ اس نے فیصلہ کیا تھا کہ جب عرفی باہر آئے گا تو وہ اسے اپنی آڑ میں رکھے گی تاکہ کار میں چُھپے ہوئے اس پراسرار شخص کو عرفی پر گولی چلانے کا موقع نہ مل سکے۔

اس وقت نوشین نے پہلی بار بڑی سنجیدگی سے اس پہلو پر غور کیا کہ آخر کچھ نامعلوم لوگ عرفی کی جان کے دشمن کیوں ہوگئے ہیں؟ ایک ہوٹل میں شعبدے بازی اور کرتب دکھانے والا وہ نوجوان آخر کسی کو کیا نقصان پہنچا سکتا تھا کہ لوگ اس کی جان کے دشمن ہو جائیں! اور عرفی؟ وہ تو اتنی بے خوفی سے اپنا گولوں کا کرتب دکھاتے ہوئے ہال میں چکراتا رہتا تھا جیسے ہزاروں نادیدہ ہاتھ اس کے محافظ ہوں۔

لیکن اس وقت وہاں سناٹے میں کوئی نہیں تھا جو عرفی کی حفاظت کرسکتا اس لیے نوشین اپنی دانست میں عرفی کی محافظ بن جانا چاہتی تھی۔

گیارہ بج کر دس منٹ ہوئے تھے جب نوشین نے عرفی کو باہر آتے دیکھا۔ وہ اس وقت اپنے ہوٹل کے مخصوص لباس کے بجائے سفید شرٹ پتلون اور جیکٹ پہنے ہوئے تھا۔ وہ نوشین کو دیکھ کر ٹھٹکا۔

"آپ!" اس کے منہ سے نکلا۔ غالباً اسے یاد آگیا تھا کہ یہ وہی لڑکی تھی جس کی طرف اس نے رومال پھینکا تھا اور وہ رومال کسی چادر کی طرح پھیلتا چلا گیا تھا۔

"پلیز' عرفی صاحب! آپ میری آڑ میں رہتے ہوئے اپنی کار کی طرف بڑھیے!" اس وقت نوشین کے تنفس کی رفتار بگڑی ہوئی تھی۔

"آخر بات کیا ہے محترمہ!" عرفی نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"اس وقت آپ خطرے میں پڑ سکتے ہیں عرفی صاحب! پلیز' میری بات مانئے! میری آڑ میں رہتے ہوئے اپنی کار کی طرف بڑھیے!"

"میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ آپ کس خطرے کی بات کررہی ہیں اور نہ یہاں میری کوئی کار کھڑی ہے جس کی طرف مجھے جانا ہو!"

"اوہ! کیا آج آپ کی کار خراب ہوگئی ہے؟" نوشین نے کہا اور پھر جواب کا انتظار کیے بغیر بولی۔ "خیر! آپ میری کار کی طرف چلئے' میں آپ کو آپ کے گھر تک پہنچا دوں گی!" پھر اس نے اضطراری طور پر عرفی کا بازو پکڑا اور اپنی کار کی طرف لے جانے لگی۔

اسٹریٹ لائٹس کی روشنی میں عرفی کے چہرے پر الجھن صاف نظر آنے لگی تھی۔ غالباً وہ نوشین کے اس رویے کو سمجھنے سے قاصر رہا تھا۔ نوشین اسے اپنی کار کے قریب لے گئی۔ عرفی کو اس نے بدستور اپنی آڑ میں رکھا تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ کے برابر کی نشست کا دروازہ کھول کر اس نے عرفی کو اندر دھکیلتے ہوئے کہا۔ "پلیز! جلدی سے بیٹھئے۔"

عرفی بیٹھ تو گیا لیکن اس کے چہرے سے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے وہ کچھ بے بسی بھی محسوس کرنے لگا ہو۔ الجھن میں تو وہ پہلے ہی مبتلا تھا۔

نوشین تیزی سے گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ والے دروازے کی طرف گئی۔ دروازہ کھولنے سے پہلے اس نے مشتبہ کار کی طرف بھی ایک اچٹتی سی نظر ڈالی تھی اور پھر جلدی سے اندر بیٹھ کر کار کا انجن اسٹارٹ کر دیا تھا۔ کار کو حرکت میں لانے سے پہلے اس نے عقب نما آئینے کا زاویہ بھی بدلا تھا تاکہ مشتبہ کار پر نظر رکھ سکے۔

عرفی الجھی ہوئی استفہامیہ نظروں سے نوشین کی طرف دیکھتا رہا اور وہ کار کو حرکت میں لا کر تیزی سے رفتار بڑھاتی چلی گئی۔ پھر اس نے عقب نما آئینے میں یہ بھی دیکھا کہ وہ مشتبہ کار بھی حرکت میں آچکی تھی اور نوشین کی کار کے پیچھے آرہی تھی۔

"وہ ہمارے پیچھے لگ چکا ہے۔" نوشین نے پُرتشویش لہجے میں کہتے ہوئے عرفی پر ایک اچٹتی سے نظر ڈالی اور عقب نما آئینے میں دیکھنے لگی۔

"میں اب تک آپ کی کوئی بات بھی نہیں سمجھ سکا!" عرفی نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔ "آخر کون ہمارے پیچھے لگ گیا ہے؟"

"ہوٹل کے پیچھے جو تین کاریں کھڑی ہوئی تھیں' ان میں سے ایک میں کوئی شخص چھپا ہوا تھا اور اب اس نے ہمارا تعاقب شروع کر دیا ہے۔"

"اوہ!" عرفی کے لہجے میں ایسا اطمینان تھا جیسے نوشین نے اسے کسی خطرے سے ہرگز آگاہ نہ کیا ہو!

اس کے اطمینان پر نوشین نے حیرت سے اس پر ایک نظر ڈالی اور پھر کہا۔ "کیا وہ آپ کا کوئی باڈی گارڈ ہے؟"

عرفی نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے کہا۔ "آپ یہاں آکر کیوں کھڑی ہو گئی تھیں۔ کیا آپ کا خیال تھا کہ یہاں اس وقت میرے لیے کسی قسم کا خطرہ ہو گا؟"

"نہیں۔" نوشین نے کہا۔ "اس طرف میں صرف اس لئے آئی تھی کہ آپ سے ملاقات کر سکوں۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ ہوٹل سے باہر نکلنے کے لئے آپ پچھلا راستہ استعمال کرتے ہیں۔"

"مجھ سے ملنے کی آپ کی اس خواہش کا کوئی خاص سبب ہے؟"

"آپ کے اس اطمینان سے مجھے یہ اطمینان ہوا ہے کہ تعاقب میں آنے والا آپ کا کوئی محافظ ہی ہو گا۔ اب میں دیکھ رہی ہوں کہ ہمارے آگے آگے بھی ایک کار دوڑ رہی ہے اور میرا خیال ہے کہ یہ انہی دونوں کاروں میں سے ایک ہے جو ہوٹل سے دو ڈھائی فرلانگ آگے کھڑی ہوئی تھیں۔ گویا آپ نے اپنی حفاظت کا مناسب انتظام کر رکھا ہے۔" نوشین کے چہرے سے اطمینان چھلکنے لگا۔ "اب میں اسے اپنی خوش قسمتی سمجھوں گی کہ آج آپ کی کار خراب ہونے کی وجہ سے مجھے آپ کو اپنی کار میں بٹھانے کا موقع مل گیا۔"

"میرے پاس کار نہیں ہے۔" عرفی نے کہا۔

"کار نہیں ہے؟" نوشین نے حیرت سے دُہرایا۔

"جی ہاں! میرے پاس کار نہیں ہے' اور مجھے کار کی ضرورت بھی نہیں ہے۔" عرفی نے کہا۔ "میرا گھر ہوٹل سے صرف تین میل کے فاصلے پر ہے۔ میں کھانا کھا کر ہوٹل سے نکلتا ہوں اور پیدل ہی گھر کی طرف جاتا ہوں۔ اس طرح اچھی خاصی چہل قدمی بھی ہو جاتی ہے۔"

نوشین کے لئے یہ خاصا حیران کن امر تھا کہ عرفی کے پاس کار نہیں تھی۔ عرفی پھر بولا۔ "آپ بڑی تیز رفتاری سے خاصی آگے نکل آئی ہیں' جو راستہ میرے گھر کی طرف مڑتا ہے وہ کافی پیچھے رہ گیا۔ اگر آپ مجھے میرے گھر تک ہی پہنچانا چاہتی ہیں تو آپ کو اپنی کار موڑنا پڑے گی۔"

نوشین نے ایک طویل سانس لے کر کار کی رفتار کم کی اور پھر پیچھے آنے والی کار کو سگنل دیتے ہوئے۔ "یوٹرن" لیا۔

"آپ کا گھر کہاں ہے؟" نوشین نے پوچھا۔

جواب میں عرفی نے جس علاقے کا نام لیا' وہ سُن کر نوشین کی حیرت میں مزید اضافہ ہوا۔ اس علاقے میں اوسط درجے سے بھی کم درجے کے لوگوں کے مکانات تھے۔

"آپ وہاں رہتے ہیں؟" نوشین کی حیرت اس کے لہجے میں بھی آگئی۔

"جی ہاں' کیوں؟"

نوشین کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہے۔ یہ اس کے تصور میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ چارلی ہوٹل کا اتنا مقبول شخص اتنے معمولی علاقے میں رہتا ہو گا اور اس کے پاس کار بھی نہیں ہو گی!

عرفی نے اس کے جواب کا انتظار نہیں کیا اور اسے راستے کے بارے میں بتاتا رہا۔

نوشین قدرے توقف سے بولی۔ "کیا چارلی ہوٹل آپ کو مناسب معاوضہ نہیں دیتا؟"

"دیتا ہے" عرفی نے کہا۔ "میری تنخواہ سات ہزار روپے ہے جو میرے لئے بہت کافی ہے۔"

نوشین کچھ رُک کر بولی۔ "پہلے میرا خیال تھا کہ چارلی ہوٹل سے آپ کو تیس چالیس ہزار روپے ماہانہ تو ملتے ہی ہوں گے۔ تب

بھی میں نے سوچا تھا کہ آپ خود کو ضائع کر رہے ہیں لیکن سات ہزار کی بات سن کر تو اس میں کوئی شبہ ہی نہیں رہا۔"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا!" عرفی دھیرے سے بولا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اسے دھیمے لہجے میں بات کرنے کی عادت ہی تھی۔

نوشین بولی۔ "کیا آپ کو اندازہ نہیں کہ آپ کیا ہیں!"

"میرا خیال ہے کہ میں کچھ بھی نہیں ہوں۔"

"میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ اگر آپ غیر ملکی دورے پر نکل جائیں تو آپ کے قدموں میں دولت کا ڈھیر لگ جائے گا اور شہرت بھی آپ کے قدم چومے گی۔"

"میرے سامنے ایسے اخراجات ہی نہیں ہیں کہ مجھے دولت کی ضرورت ہو۔ رہی شہرت کی بات تو میری سمجھ میں کبھی نہیں آسکا کہ انسان کو اس سے کس قسم کی تسکین ملتی ہے۔" عرفی نے کہا۔

"معاف کیجئے گا' آپ کے سوچنے کا یہ ڈھنگ تو بڑا غیر فطری ہے۔"

"میرا خیال ہے' بہت سے لوگوں کے سوچنے کا ڈھنگ ایک جیسا نہیں ہوتا۔" عرفی نے کہا پھر جلدی سے بولا۔ "اب بائیں جانب موڑ لیں۔"

نوشین نے بریک لگاتے ہوئے کار اس طرف موڑی۔ یہاں سے وہ علاقہ شروع ہو گیا تھا جس کا نام عرفی نے بتایا تھا۔

"اب تک مجھے یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ آپ مجھ سے کیوں ملنا چاہتی تھیں۔" عرفی بولا۔ "اور اب میرا گھر بھی قریب آگیا ہے۔ وہاں میں اکیلا رہتا ہوں ورنہ آپ کو ایک پیالی کافی پینے کی دعوت ضرور دیتا۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ آپ اکیلے رہتے ہیں!" نوشین مسکرائی۔

وہ اب مطمئن ہو گئی تھی کیونکہ ان دونوں کاروں کا اب کہیں پتا نہیں تھا جو اس کے آگے پیچھے لگی ہوئی تھیں۔

"کیا آپ کے لئے کوئی فرق پڑتا ہے؟" نوشین نے پوچھا۔

"فرق تو میرے لئے بھی کوئی نہیں پڑتا۔" عرفی نے کہا۔

"شاید کوئی ایک تنہا لڑکی کو آپ کے ساتھ آپ کے گھر میں جاتے دیکھ لے اور....."

"میرا کوئی پڑوسی بھی میرے لئے کوئی غلط بات نہیں سوچ سکتا۔" عرفی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "یہاں سب میرا احترام کرتے ہیں۔"

"ہو سکتا ہے کل کوئی اس بارے میں آپ سے پوچھے؟"

"اگر کسی نے دیکھ لیا تو ضرور پوچھے گا۔"

"پھر آپ کیا جواب دیں گے؟"

"جو حقیقت ہے۔"

"اس پر یقین کر لیا جائے گا؟"

"یقیناً۔"

"اس کا مطلب ہے کہ محلے میں آپ کا کافی بھرم ہے!"

عرفی نے اس بات کا جواب دینے کے بجائے کہا۔ "یہ جو الیکٹرک پول قریب آرہا ہے' وہیں کار روک لیجئے گا' پول اسی مکان کے دروازے کے قریب ہے جو میرا گھر ہے۔"

نوشین نے بریک لگائے اور الیکٹرک پول کے پاس کار روک دی اور تعجب سے اس کار کی طرف دیکھا جو کچھ ہی فاصلے پر کھڑی ہوئی تھی۔ وہ ان دونوں کاروں میں سے نہیں تھی جو ہوٹل سے روانگی کے وقت نوشین کی کار کے آگے پیچھے لگی رہی تھیں لیکن وہ اس کار کو دیکھ کر متعجب اس لئے ہوئی کہ اس علاقے میں رہنے والا کوئی شخص بھی کار رکھنے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔



گھر میں داخل ہونے کے بعد نوشین کے تعجب میں اور اضافہ ہوا۔ وہ صرف دو چھوٹے چھوٹے کمروں کا مکان تھا۔ ایک کمرے میں صرف کرسیاں اور ایک تپائی پڑی ہوئی تھی۔ فرش' قالین سے بے نیاز تھا اور آرائش کی کوئی اور چیز بھی وہاں نہیں تھی۔

عرفی نے اس سے وہیں بیٹھنے کے لئے کہا اور کافی بنانے کے ارادے سے دوسری طرف کا دروازہ کھول کر نکل گیا۔ نوشین نے دیکھا کہ اس طرف صحن تھا۔ گویا کچن اور باتھ روم وغیرہ صحن ہی میں بنائے گئے تھے۔

تجسس نے نوشین کو دوسرے کمرے میں جھانکنے پر مجبور کر دیا۔ وہ عرفی کا بیڈ روم تھا لیکن ایسا بیڈ روم جہاں بیڈ کے علاوہ صرف ایک کرسی' ایک تپائی اور ایک غالباً کپڑوں کی الماری تھی۔

نوشین ایک ٹھنڈی سانس لے کر واپس کرسی پر آکر بیٹھ گئی۔ اسے جارلی پر شدت سے غصہ آنے لگا تھا کہ وہ اتنے بڑے فنکار کا اس بری طرح استحصال کر رہا تھا۔ وہ عرفی پر بھی جھنجلائی جو ان حالات پر قناعت کئے ہوئے تھا۔ کیا اسے احساس نہیں تھا کہ ترقی کے راستے اس نے اپنے لئے خود ہی بند کر رکھے ہیں۔ راستے میں کہا ہوا عرفی کا ایک جملہ بھی اسے یاد آیا۔ عرفی نے کہا تھا۔ "میرے سامنے ایسے اخراجات ہی نہیں ہیں کہ مجھے دولت کی ضرورت ہو۔"

نوشین یہ سوچنے پر مجبور ہو گئی کہ عرفی یا تو بہت مایوس آدمی ہے یا بہت پُراسرار! اسے پُراسرار اس لئے سمجھا جا سکتا تھا کہ اس پر کئی قاتلانہ حملے ہو چکے تھے لیکن اگر ان کاروں میں اس کے محافظ نہیں تھے تو سمجھا جا سکتا تھا کہ وہ ایک بہت ہی غیر محفوظ زندگی گزار رہا تھا۔

عرفی جلد ہی دو پیالیوں میں کافی بنا کر لے آیا۔

"بہرحال" نوشین نے کافی کا پہلا گھونٹ لے کر کہا۔ "آپ کا یہ گھر دیکھ کر تو میں پھر کہوں گی کہ آپ کا استحصال کیا جا رہا ہے

اور خود آپ بھی اس طرف توجہ نہیں دے رہے ہیں کہ یہاں آپ کی صلاحیتیں ضائع ہو رہی ہیں۔"

"میں ایسا اس لئے نہیں سمجھتا کہ میری یہ زندگی چارلی صاحب ہی کی مرہونِ منت ہے۔ رہی اس گھر کی بات تو میں یہاں بہت اطمینان و سکون سے رہ رہا ہوں۔"

"آپ سے یہ میری پہلی ملاقات ہے۔" نوشین نے کہا۔ "ورنہ میں آپ سے ضرور پوچھتی کہ چارلی صاحب کے آپ پر ایسے کیا احسانات ہیں کہ آپ ان کی خاطر اپنی زندگی ہی ضائع کر لیں!"

"میری زندگی ہی مجھ پر چارلی صاحب کا قرض ہے' اور پھر میں سمجھتا ہوں کہ پتھر جہاں ہوتا ہے' وہیں بھاری ہوتا ہے۔ اگر ادھر اُدھر ہو جائے تو زمانے کی ٹھوکریں اس کا مقدر بن جاتی ہیں۔ خیر چھوڑیے' اس موضوع پر گفتگو مجھے مضمحل کر دیتی ہے۔ میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے مجھے اپنی کار میں بیٹھنے کا شرف بخشا۔"

"اب آپ نے تکلفانہ باتیں شروع کر دیں!" نوشین مسکرائی۔ "مجھے خوشی ہوگی اگر آپ مجھے اپنا دوست سمجھیں!"

"میں آپ کی دوستی کے قابل کہاں ہوں محترمہ!"

"میرا نام نوشین ہے۔" وہ بولی۔ "میرے پاس ایک کار ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں کوئی اہم شخصیت ہوں۔ میرا تعلق کسی بڑے گھرانے سے نہیں ہے۔ جس طرح آپ ایک ہوٹل میں ملازمت کرتے ہیں' اسی طرح میں بھی ایک ہوٹل سے وابستہ ہوں۔ فرق صرف کام کا ہے۔ میں اس ہوٹل میں ایک گلوکارہ کی حیثیت سے شو کرتی ہوں۔" اس نے ہوٹل کا نام بتا کر کہا۔ "اگر آپ کسی وقت میرا پروگرام دیکھنے آئیں تو مجھے خوشی ہوگی۔ میرا پروگرام دس بجے سے ساڑھے گیارہ بجے تک ہوتا ہے۔"

"مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ گلوکارہ ہیں۔ موسیقی سُننا میرا واحد شوق ہے لیکن یہ میری بدقسمتی ہے کہ آپ کا پروگرام دیکھنے نہیں آ سکتا۔ شاید آپ جانتی ہوں کہ مجھے چارلی ہوٹل میں روزانہ ہی رات تک مصروف رہنا پڑتا ہے۔ چھٹی کسی دن بھی نہیں ہوتی۔"

"آج تو میری چھٹی بھی نہیں تھی لیکن آپ سے ملنے کی خواہش نے مجھے چھٹی کرنے پر مجبور کر دیا۔"

"میں اس پر فخر کر سکتا ہوں کہ آپ جیسی گلوکارہ نے مجھے اس قابل سمجھا۔"

"فخر تو مجھے کرنا چاہیے کہ میں آپ جیسے باکمال شخص کے ساتھ بیٹھی کافی پی رہی ہوں۔"

"میں تو ایک حقیر سا انسان ہوں نوشین صاحبہ!"

یہ آپ کا انکسار ہے' آپ تو یہاں نہ جانے کتنے لوگوں کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹک رہے ہیں۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو آپ پر اتنے قاتلانہ حملے نہ ہوتے۔ آپ بہت نڈر ہیں کہ آپ کو ان کی پروا نہیں۔"

"موت کا ایک دن معین ہے' اس پر میرا ایمان ہے لہٰذا میں کبھی خوفزدہ نہیں ہوتا۔ جس دن مجھے مرنا ہوگا' اس دن مجھے کوئی طاقت نہیں بچا سکتی۔ حملے مجھ پر ہزار بھی ہوں تو میں ان کی پروا بھی نہیں کروں گا۔"

"لیکن آپ نے باڈی گارڈز تو رکھ چھوڑے ہیں!"

"میں نے کوئی باڈی گارڈز نہیں رکھا۔"

"تو پھر ہمارے آگے پیچھے وہ کاریں کس کی تھیں؟"

"خدا جانے!" عرنی نے کہا۔ "میں تو ان کا چہرہ شناس بھی نہیں ہوں۔"

"مائی گاڈ!" نوشین نے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ "اس کے باوجود آپ نے تعاقب کرنے والوں کی پروا نہیں کی؟"

"میں نے کہا نا کہ جس دن مجھے مرنا ہوگا' اس دن مجھے کوئی طاقت نہیں بچا سکتی۔"

"آپ کا یہ ایمان اپنی جگہ مگر انسان کو خود بھی اپنا کچھ خیال رکھنا چاہیے' آپ چارلی صاحب کو اپنا محسن بتاتے ہیں لیکن انہیں اس بات کا خیال نہیں کہ آپ کے پاس ایک کار تو ہونا چاہیے جس میں آپ کسی نہ کسی حد تک حفاظت سے اپنے گھر آ جا سکیں۔ آدھی رات کے بعد آپ کا پیدل گھر آنا تو کسی طرح بھی مناسب نہیں کہا جا سکتا!"

"مجھے تو یہ کچھ ایسا غیر مناسب نہیں لگتا۔ اس طرح چہل قدمی ہی ہو جاتی ہے۔ رہی کار کی بات تو چارلی صاحب نے مجھے کئی مرتبہ کار دلانا چاہی لیکن میں نے نہیں لی۔"

"اس پر میں حیرت کا اظہار کر سکتی ہوں۔"

"میں آپ کو اپنی فطرت کے بارے میں اتنا بتا چکا ہوں کہ آپ کو حیران نہیں ہونا چاہیے۔"

ان باتوں کے دوران میں انہوں نے کافی ختم کر لی تھی۔ اس کے بعد نوشین نے محسوس کیا کہ عرنی چاہتا تھا کہ اب وہ اس کے گھر سے رخصت ہو جائے۔ وہ بار بار اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی میں وقت دیکھنے لگا تھا۔

"آج آپ کے ساتھ اتنا وقت گزار کر مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ اب میں اجازت چاہوں گی۔" وہ کھڑی ہوگئی۔ "لیکن کیا میں یہ سمجھ لوں کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے دوست بن گئے؟"

"دراصل میرا کوئی دوست نہیں اس لئے میں یہ اندازہ بھی نہیں لگا سکتا کہ دوست کس طرح بنا جاتا ہے!" پہلی مرتبہ وہ پھیکے سے انداز میں مسکرایا۔

"بس اسی طرح بنا جاتا ہے کہ ملاقاتیں ہوتی رہیں۔" نوشین نے ہنس کر کہا۔ "آپ میرا پروگرام دیکھنے آئیں یا نہ آئیں لیکن میں ایک ڈیڑھ گھنٹے کے لئے روزانہ ہی آپ کے ہوٹل آیا کروں

گی۔"

"ضرور تشریف لائیں۔"

اس ملاقات میں عرفی نے ذرا بھی گرم جوشی کا اظہار نہیں کیا' اس کے چہرے پر کوئی ایسا تاثر بھی نہیں اُبھرا کہ ایک خوبصورت لڑکی کے ساتھ اسے اپنے گھر میں تنہائی کا احساس ہوا ہو لیکن نوشین اس سے دل برداشتہ نہیں ہوئی۔ نہ جانے کیوں اسے یقین تھا کہ وہ عرفی کو دھیرے دھیرے راہ پر لے آئے گی۔ اسے سنہرے سپنے دکھائے گی جنہیں دیکھنے کی شاید اسے عادت ہی نہیں تھی۔

یہ خوف نوشین کے دل میں بالکل پیدا نہیں ہوا کہ اب اگر کسی وقت عرفی پر حملہ ہوا اور وہ بھی اس کے ساتھ ہوئی تو وہ بھی اس کے ساتھ ماری جاسکتی ہے!

جب وہ گھر پہنچی تو قیصر نے اتنی جلدی دروازہ کھولا تھا جیسے بے چینی سے اس کا انتظار کرتا رہا ہو۔

• "کیا آج کام نہیں کر رہے تھے؟" نوشین نے تعجب کا اظہار کیا۔

"تمہاری وجہ سے میرا ذہن منتشر ہوگیا تھا۔ تم کہاں چلی گئی تھیں؟" قیصر نے دروازہ بند کرکے پوچھا۔

"کیوں؟" نوشین چونکی۔

"تمہارے ہوٹل کے مالک ظفر صاحب کا فون آیا تھا۔" قیصر نے سنجیدگی سے کہا۔ "وہ تمہاری خیریت پوچھ رہے تھے۔ انہیں ان کے منیجر نے بتایا تھا کہ تم کو آج بخار ہوگیا ہے اس لئے پروگرام نہیں کرسکو گی۔ پہلے تو ان کی بات سُن کر میں گڑبڑا گیا تھا مگر نہ جانے کیسے بروقت ذہن میں خیال آگیا کہ تم نے آج کہیں اور جانے کے لیے یہ بہانہ بنایا ہوگا اس لئے میں نے ان سے کہہ دیا کہ تم سو رہی ہو اور طبیعت قدرے بہتر ہے۔"

"شکر ہے" نوشین نے اطمینان کی سانس لی اور اپنے کمرے کی طرف بڑھی۔

تھوڑی دیر بعد جب دونوں بستر پر لیٹے تو قیصر نے پوچھا۔ "آج کہاں گئی تھیں؟"

"وہی عرفی کا پروگرام دیکھنے چلی گئی تھی۔ میں نے سُنا تھا کہ وہ آج خصوصی پروگرام پیش کرتا ہے۔"

"اخبار میں اس کا اشتہار بھی آتا ہے کبھی کبھی۔" قیصر نے کہا۔ "وہ پروگرام تو غالباً ساڑھے دس بجے ختم ہو جاتا ہے۔"

"ہاں" نوشین نے کہا' پھر بولی۔ "آپ کو حیرت ہوگی قیصر کہ اتنے ماہرِ فن شخص کے پاس کار تک نہیں ہے۔ میں اسے اس کے گھر تک چھوڑنے چلی گئی تھی۔ اس نے کافی کے لئے روک لیا۔ اسی میں کچھ دیر ہوگئی۔"

"اس کے گھر والے کیسے لوگ ہیں؟"

نوشین سمجھ گئی کہ قیصر دراصل کیا جاننا چاہتا ہے۔ وہ بے پروائی سے بولی۔ "اکیلا ہی رہتا ہے۔ شاید اس کا کوئی عزیز کم از کم اس شہر میں تو نہیں ہے۔"

"ہوں۔" قیصر خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگا۔

نوشین نے کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھا اور پھر کمبل ٹھیک کرتے ہوئے بولی۔ "سردی اب روزانہ ہی بڑھتی جا رہی ہے۔"

"اب تو اس سے تمہاری دوستی ہوگئی ہوگی!" قیصر بولا۔

"ہاں' کہا جاسکتا ہے۔" نوشین نے بے پروائی سے کہا۔ "ہم میں کافی دیر تک باتیں ہوتی رہی تھیں۔ میں نے اسے سمجھانا چاہا تھا کہ جارلی ہوٹل والے اس کا استحصال کر رہے ہیں۔ غضب خدا کا' اس جیسے باکمال شخص کی تنخواہ سات ہزار روپے۔"

"اوہ!" قیصر نے کہا۔ "یہ جان کر شاید تمہیں مایوسی ہوئی ہوگی!"

"کیا مطلب!" نوشین کی پیشانی پر شکن پڑگئی۔ "آپ کہنا کیا چاہتے ہیں آخر!"

"جو میں کہنا چاہتا ہوں' وہ تم نے سمجھ لیا ہے ورنہ یہ سوال نہ کرتیں!"

"قیصر! اگر آپ اس قسم کی باتیں کرنا معمول بنالیں گے تو ہماری زندگی خاصی مشکل ہو جائے گی!"

"یہ اندازہ تو مجھے کافی دن پہلے ہو چکا ہے۔"

"پھر بھی آپ بات بڑھائے چلے جا رہے ہیں!"

"یہ فریضہ تو تم سرانجام دے رہی ہو۔ تم نے ذرا بھی نہ سوچا کہ ایک.... جوان شخص کے ساتھ آدھی رات کے وقت اس کے گھر میں اتنی دیر تک رکنا کس حد تک مناسب ہے!"

"آپ حد سے آگے بڑھ رہے ہیں قیصر!" نوشین کا لہجہ تیز ہوگیا۔

"نہیں نوشین!" قیصر نے بظاہر پُرسکون لہجے میں کہا۔ "میری تو شدید خواہش ہے کہ بات حد سے آگے نہ بڑھے۔"

"تو پھر اس موضوع پر بات ختم کر دیجئے!"

قیصر نے خاموشی تو اختیار کرلی لیکن اس نے نچلا ہونٹ دانتوں میں دبالیا تھا اور اس کے چہرے پر سُرخی پھیل گئی تھی۔

○☆○

پھر کچھ دن گزر گئے۔ نوشین نے معمول بنا لیا کہ ساڑھے سات بجے ہی گھر سے نکل جاتی۔ قیصر نے اس سے یہ پوچھنا ہی چھوڑ دیا کہ وہ اتنی جلدی کیوں روانہ ہو جاتی تھی۔ شاید اس نے باور کرلیا تھا کہ اب وہ اپنی ازدواجی زندگی کے آخری دن گزار رہا ہے۔

نوشین آٹھ بجے جارلی ہوٹل میں ہوتی اور پھر ساڑھے نو بجے وہاں سے روانہ ہو کر ہوٹل پہنچ جاتی جہاں اسے اپنا پروگرام کرنا ہوتا تھا۔ پھر اپنے ہوٹل ہی میں کھانا کھا کر ساڑھے بارہ بجے تک گھر پہنچتی۔ قیصر معمول کے مطابق تصویر بنانے میں مشغول نظر

آتا۔ دونوں میاں بیوی میں دو ایک رسمی جملوں کا تبادلہ ہوتا اور نوشین اپنے کمرے میں جا کر سو جاتی۔

قیصر دو بجے تک اپنے کام میں منہمک رہنے کے بعد خوابگاہ کا رُخ کرتا۔ پہلے تو وہ دفتر کے بعد دو چار گھنٹے نوشین کے ساتھ گزارنے کے بعد اپنے کام میں مصروف ہوتا تھا لیکن اب گھر کی فضا میں ایسا تناؤ آگیا تھا کہ وہ بینک سے آکر ڈیڑھ دو گھنٹے آرام کرنے کے بعد ہی رنگ اور برش سنبھال لیتا تھا۔

نوشین نے قیصر کے اس رویّے کی بالکل پروا نہیں کی۔ وہ اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اپنے وہ خواب داؤ پر نہیں لگانا چاہتی تھی جو ہر وقت اس کی آنکھوں میں بسے رہتے تھے۔ ان خوابوں ہی کی تکمیل کے لئے اس نے ایک لیڈی ڈاکٹر سے مل کر ایسا بندوبست بھی کر لیا تھا کہ ماں نہ بن سکے۔ اس کا خیال تھا کہ ماں بننے کے بعد وہ اپنے خوابوں کی تکمیل کے لئے کوشاں نہیں رہ سکے گی۔

جب وہ چارلی ہوٹل میں ہوتی تو ایک آدھ بار عرفی سے نظریں چار ہونے کے بعد ان میں ہلکی سی مسکراہٹ کا تبادلہ ضرور ہوتا لیکن یہ اس نے ہمیشہ محسوس کیا تھا کہ عرفی کی مسکراہٹ "جوابی" ہوتی تھی اور وہ بھی مدھم سی! نوشین کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ عرفی اتنا اُداس کیوں رہتا ہے۔

بدھ کی رات جب اس کی چھٹی ہوتی تھی، وہ ایک بار پھر عرفی کو ہوٹل کے عقبی دروازے سے اپنی کار میں لے کر اس کے گھر گئی تھی۔ اس رات یون گھنٹے تک اس سے باتیں کرتی رہی تھی۔ اس نے گھما پھرا کر یہ باتیں زیادہ کی تھیں کہ عرفی اگر ایک بار بھی مغربی ممالک کا دورہ کر لے تو اس کی زندگی سنور سکتی ہے لفظوں کی الٹ پھیر کے ساتھ عرفی کا جواب یہی ہوا کرتا تھا کہ "پتھر اپنی جگہ پر ہی بھاری رہتا ہے" کبھی وہ چارلی کا احسان مند ہونے کا ذکر بھی کر دیتا مگر اس احسان کی تفصیل اس نے نہیں بتائی تھی جو چارلی نے اس پر کیا تھا۔

نوشین نے اس کے بعد بھی ہمت نہیں ہاری۔ دوسرے بدھ کو وہ دن میں ہی اس کے گھر پہنچ گئی۔ عرفی اسے اچانک اپنے گھر پر دیکھ کر وقتی طور پر حیران بھی ہوا تھا۔

اس روز باتوں باتوں میں نوشین نے اس سے کہا۔ "ہم میں اب تک تکلف کی ایک فضا قائم ہے۔ کیوں نہ ہم اب ایک دوسرے کو "آپ" کہنے کے بجائے "تم" کہا کریں۔"

"اس سے کیا فرق پڑے گا؟"

"اس طرح یہ بات واضح ہو جائے گی کہ ہم دونوں واقعی دوست بن چکے ہیں۔"

"اچھا!" عرفی کے لہجے میں تھوڑا سا تعجب تھا۔

اس وقت وہ نوشین کو اتنا اچھا لگا کہ اس کا جی چاہا کہ عرفی کے گلے میں بانہیں ڈال دے مگر اس نے خود کو سنبھال لیا۔ اس نے سوچا تھا کہ جب تک وہ قیصر کی بیوی ہے، اسے ہرگز یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ کسی دوسرے کے گلے میں بانہیں ڈال دے۔ وہ عرفی کو کسی حد تک چاہنے ضرور لگی تھی۔ وہ پہلا شخص تھا جس نے شادی کے بعد اس کے دل کو گدگدایا تھا لیکن جب تک وہ قیصر کی بیوی تھی، عرفی کو صرف دوست ہی سمجھنا چاہتی تھی یا شاید ایک سہارا جس کی وجہ سے وہ بھی ترقی کی راہیں طے کر سکتی تھی۔

پھر دو ایک اور ملاقاتوں میں ان کی بے تکلفی اس حد تک ضرور ہو گئی کہ وہ ایک دوسرے کو "تم" کہنے لگے۔ اس کے باوجود عرفی نے اپنی نجی زندگی کے بارے میں کبھی کچھ نہیں بتایا۔

ایک روز نوشین اپنا پروگرام کرنے کے بعد معمول کے مطابق مینجر کے کمرے میں کھانا کھا رہی تھی کہ مینجر نے اسے چونکا دیا۔

"تمہارے لئے ایک خوش خبری ہے نوشین!"

"وہ کیا؟" نوشین نے چونک کر پوچھا تھا۔

"چودھری مشتاق اس شہر کے ایک بہت بڑے آدمی ہیں۔ ان کے گھر پر اس جمعرات کو کوئی تقریب ہے۔ وہ اس رات اپنے گھر پر چند گھنٹے کے لئے گانے کا پروگرام بھی رکھنا چاہتے ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ اس پروگرام میں تم گاؤ۔"

نوشین کے دل کی دھڑکنیں یکلخت تیز ہو گئیں۔ یہ پہلا موقع تھا کہ جب اسے کسی پرائیوٹ پروگرام کی دعوت مل رہی تھی۔

مینجر نے مزید کہا۔ "تم کیونکہ ہوٹل میں آنے والوں کے ساتھ بہت ریزرو رہتی ہو اس لئے چودھری صاحب نے یہ بات مجھ سے کی ہے۔"

نوشین نے اپنی خوشی چھپاتے ہوئے بڑی بے پروائی سے پوچھا۔ "وہ معاوضہ کیا دیں گے؟"

"بیس ہزار روپے۔"

"یہ کچھ کم نہیں ہیں؟"

"یہ تمہیں پہلا فنکشن مل رہا ہے اس لئے میرا مشورہ ہے کہ تمہیں یہ پیشکش مسترد نہیں کرنا چاہئے۔ بعد میں تم کو جب اور فنکشن ملنے لگیں تو دھیرے دھیرے اپنا معاوضہ بڑھا دینا۔"

"اچھا" نوشین نے بے اعتنائی برقرار رکھی۔ "لیکن معاوضہ ایڈوانس ملنا چاہئے۔"

"وہ تمہیں کل ہی مل جائے گا۔"

"لیکن ہوٹل کے پروگرام کا کیا ہو گا؟"

"یہاں سے پروگرام ختم کر کے تم ان کے گھر جانا۔ وہاں تمہیں ساڑھے بارہ سے تین بجے تک گانا ہو گا۔"

"سازندے وغیرہ؟"

"وہ ہوٹل ہی کے ہوں گے، ان کا معاوضہ الگ ہو گا۔"

"ساڑھے بارہ بجے تک وہاں کیا تقریب ہے؟"

"کوئی خاص نہیں! بس گیٹ ٹوگیدر والی تقریب ہے۔ مہمان خواتین و حضرات کچھ ڈرنک وغیرہ کریں گے، پھر انگریزی موسیقی

کے ریکارڈوں پر ایک ڈیڑھ گھنٹے رقص کا دور ہوگا۔ پھر کھانے کے بعد صرف وہ لوگ رُک جائیں گے' جنہیں گانا سننے کا شوق ہوگا۔ تم چاہو تو اس تقریب میں بھی شرکت کر سکتی ہو۔ ہوٹل کے پروگرام کے وقت یہاں آجانا اور پھر چلی جانا۔ چودھری صاحب کا گھر تلاش کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوگی۔ کل وہ ایڈوانس کی رقم کے ساتھ اپنا وزیٹنگ کارڈ بھی دے جائیں گے۔"

"انگریزی رقص مجھے نہیں آتا۔ کسی مرد کے ساتھ ناچنا مجھے اچھا بھی نہیں لگے گا۔ ہاں اگر کچھ موڈ بنا تو دیکھنے چلی جاؤں گی۔"

اس رات نوشین ہوٹل سے اپنے گھر جا رہی تھی تو بہت خوش تھی۔ ایک رات میں چند گھنٹے کے پروگرام کے بیس ہزار روپے اس کے لئے اچھی خاصی رقم تھی لیکن اس کے دل میں یہ کانٹا ضرور چُبھ رہا کہ تھا اس کے ہوٹل میں صرف چار پروگرام کرنے والی ماہ رُخ کو ایک لاکھ روپیہ ملتا تھا اور پرائیوٹ فنکشن کا معاوضہ وہ پچاس ہزار روپے لیا کرتی تھی۔

ماہ رخ کے لئے حسد نوشین کے دل میں کُوٹ کُوٹ کر بھر چکا تھا۔ وہ ماہ رخ کو تباہ کرنا چاہتی تھی۔ اپنی اس خواہش پر عمل کرنے کے لئے اس نے جڑی بوٹیوں سے دوائیں بنانے والے ایک شخص سے ایک سفوف بھی حاصل کر لیا تھا جو نزلہ دور کرنے کے لئے گرم پانی میں ڈال کر بھپارے کے کام آتا تھا لیکن اسے تاکید کی گئی تھی کہ اس سفوف کی معمولی مقدار بھی اگر اس نے غلطی سے کھالی تو وہ گانے کے قابل نہیں رہے گی' اس کا گلا خراب ہو جائے گا۔

نوشین نے وہ سفوف اس لئے حاصل کیا تھا کہ بعض اوقات نزلے کی وجہ سے اسے اپنے پروگرام کے خراب ہونے کا اندیشہ رہتا تھا لیکن جب اسے اس سفوف کی یہ "خاصیت" معلوم ہوئی تو اس نے تہیہ کر لیا کہ ماہ رخ کا گلا تباہ کرنے کے لئے وہ اس سفوف کو کسی نہ کسی طرح کام میں ضرور لائے گی۔ وہ اس بارے میں مسلسل سوچتی رہتی تھی کہ یہ کام کس طرح کرے کہ اس پر کسی قسم کا شبہ نہ ہو سکے۔

دوسرے روز اس نے دن میں ہی عرفی کے گھر جا کر اسے اپنے پرائیوٹ پروگرام کے بارے میں بتایا۔

"مبارک ہو نوشین۔" عرفی نے کہا۔ "یہ ترقی کی طرف تمہارا ایک اہم قدم ہے۔"

"اس پروگرام میں تو تم آ کر میرا گانا سُن سکتے ہو! اس وقت تو تمہیں فرصت ہوگی۔ ایک بجے تک بھی پہنچ جاؤ تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ میں چودھری صاحب کو پہلے بتا دوں گی کہ تم میرے مہمان ہوگے۔"

"میں کوشش کروں گا کہ ضرور آؤں۔"

"کوشش نہیں' وعدہ کرو۔"

عرفی کچھ سوچنے لگا' پھر بولا۔ "میں ڈرتا ہوں نوشین کہ ہماری بے تکلفی میں مزید اضافہ نہ ہو۔"

"مگر کیوں!"

"معلوم نہیں یہ غلط ہے یا صحیح لیکن مجھے ایسا لگنے لگا ہے کہ جیسے تم حیرت انگیز تیزی سے میرے قریب ہوتی جا رہی ہو اور میں نہیں چاہتا کہ یہ قربت اور بڑھے۔"

"مگر کیوں!" نوشین نے اپنے الفاظ دُہرائے۔

"اس لئے کہ تم کسی اچھے گھر سے تعلق رکھتی ہو اور میں ......" وہ کہتے کہتے رک گیا۔

"اور میں!...... کیا؟" نوشین نے بے تابی سے پوچھا۔

عرفی نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور پھر کہا۔ "میری زندگی کے اس راز سے صرف چارلی صاحب واقف ہیں۔ شاید میں بھی کبھی واقف نہ ہو پاتا لیکن ایک مرتبہ چارلی صاحب کچھ زیادہ نشے میں تھے۔ نشے میں میرے سامنے وہ راز اگل گئے۔ لیکن بعد میں انہوں نے مجھ سے کبھی اس موضوع پر بات نہیں کی۔ میں اس وقت صرف نو دس سال کا تھا۔ شاید چارلی صاحب کو یہ خیال ہو کہ میں بچپن کی وہ باتیں بھول گیا ہوں گا لیکن میرے ذہن پر وہ سب کچھ آج بھی پتھر کی لکیر کی طرح نقش ہے۔"

"تم اصل بات بتانے کے بجائے سسپنس پیدا کر رہے ہو عرفی!"

"میں شاید تمہیں یہ بات کبھی نہ بتاتا' وہ میرے لئے کوئی قابل فخر بات نہیں ہے لیکن اتنے دنوں میں مجھے تم پر اتنا اعتماد ہو گیا ہے کہ میں تمہیں اپنا یہ راز بتانے میں کوئی حرج نہیں سمجھ رہا ہوں۔ یہ بتانے کا فیصلہ میں نے شاید اس لئے بھی کیا ہے کہ تم اچھی طرح سوچ سمجھ لو کہ میں تمہاری دوستی کے قابل ہوں بھی یا نہیں!"

"تم برابر سسپنس بڑھاتے جا رہے ہو۔" نوشین کچھ جھنجلا گئی۔

"شاید اپنے بارے میں کوئی اہم بات بتانے سے پہلے انسان اس قسم کی تمہید ضرور باندھتا ہے۔ اس طرح اصل بات کہنے کی ہمت ہو جاتی ہے۔"

"تو اب ہمت ہو گئی یا نہیں؟" نوشین کی جھنجلاہٹ میں اضافہ ہوا۔

عرفی سر جھکا کر کچھ سوچنے لگا پھر نوشین کی طرف دیکھ کر بولا۔ "میں گندگی کا ایک ڈھیر ہوں نوشین!"

"کیا مطلب!"

عرفی نے نظریں جھکا لیں اور دھیمے لہجے میں کہنے لگا۔ "ایک تاریک رات میں چارلی صاحب نے ایک نوزائیدہ بچے کو کوڑے کے ایک ڈھیر پر روتا ہوا پایا تھا اور وہ اسے اٹھا کر اپنے گھر لے گئے تھے۔ وہ بہت نیک دل انسان ہیں نوشین! انہوں نے ہی اس نوزائیدہ بچے کی پرورش کی۔"

نوشین کے دل کی دھڑکنیں کچھ تیز ہو گئیں۔

عرفی نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور بولا۔ "میرا خیال ہے کہ تم نے حقیقت سمجھ لی ہوگی۔ ہاں نوشین! وہ نوزائیدہ بچہ میں ہی تھا۔ چارلی صاحب چاہتے تھے کہ میں کچھ پڑھ لکھ جاؤں۔ میں

پڑھ بھی رہا تھا لیکن جب نو دس سال کی عمر میں مجھے اپنی حقیقت کا علم ہوا تو تعلیم سے میرا جی اُچاٹ ہو گیا۔ اس وقت سے آج تک یہ خلش مجھے چین نہیں لینے دیتی کہ میں کیا ہوں؟ تم بھی سمجھ چکی ہو گی کہ جب ایک نوزائیدہ بچہ کسی کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دیا جائے تو اس کی اصلیت کیا ہو گی؟"

"تو تم آج تک اپنے والدین سے ملنے کے لئے بے قرار ہو؟" نوشین نے پہلو بدلا۔

"ہرگز نہیں!" عرفی نے سختی سے کہا۔ "مجھے ان لوگوں سے بالکل محبت نہیں، بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ مجھے ان دونوں سے نفرت ہے۔ میری شدید خواہش ہے کہ میں زندگی بھر ان کی شکل بھی نہ دیکھوں۔ جنہوں نے اپنا گناہ بڑی سفاکی سے کوڑے کے ایک ڈھیر پر پھینک دیا ہو، مجھے ان سے کیونکر محبت ہو سکتی ہے۔ میرے لئے تو چارلی صاحب ہی میرے باپ ہیں، میری ماں ہیں۔ میں نے ایک بار تم سے کہا تھا کہ میری زندگی مجھ پر چارلی صاحب کا قرض ہے اور میں یہ قرض شاید کسی طرح بھی نہیں اُتار سکتا۔"

نوشین چند لمحے خاموش رہی، پھر سنجیدگی سے بولی۔ "اسی لئے تم ہر وقت اُداس رہتے ہو!"

"ہاں نوشین! مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میں اس زمین پر گندگی کا ایک بوجھ ہوں اور یہ بوجھ زمین پر نہیں رہنا چاہئے۔"

"میں تو ایسا نہیں سمجھتی عرفی!" نوشین نے سوچتے ہوئے کہا۔ "اگر غلطی کی تھی تو ان دونوں نے جو تمہارے وجود میں آنے کا سبب بنے۔ اس میں تمہارا تو کوئی دوش نہیں ہے۔ پھر یہ کہ تم ایک بہت اچھے انسان ہو۔ میں ایک تنہا لڑکی تمہارے ساتھ اتنا وقت گزار چکی ہوں لیکن تم نے کبھی کوئی ایسی حرکت نہیں کی جو شرافت کی سطح سے گری ہوئی ہوتی۔"

"کم از کم میں تو خود کو گندگی کے ایک ڈھیر کے سوا کچھ نہیں سمجھتا۔ مجھے خود سے گھن سی آتی ہے۔ جب میں غسل کرتا ہوں تو یقین کرو کہ پاگلوں کی طرح اپنے جسم کو رگڑتا ہوں۔ جیسے اس طرح میرے وجود کی گندگی دُھل جائے گی لیکن بعد میں مجھے اپنے اس پاگل پن کا احساس بھی ہوتا ہے۔ گندگی میرے جسم پر لگی ہوئی نہیں ہے۔ میں تو مجسم گندگی ہوں اور یہ سب کچھ میں نے تمہیں اس لئے بتایا ہے کہ تم اچھی طرح سوچ سمجھ لو۔ کیا میں واقعی اس قابل ہوں کہ تم مجھے اپنا دوست بناؤ؟"

"تم تو اس وقت میری نظر میں پہلے سے بھی زیادہ عظیم ہو گئے ہو عرفی!" نوشین نے جذباتی لہجے میں کہا۔ "اتنی اخلاقی جُرات آج کل شاید کسی میں بھی نہ ہو کہ وہ اپنے بارے میں ایسی باتیں کسی کو بتا دے۔ لوگ تو اپنی معمولی سی خرابیاں بھی دوسروں سے چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔"

"اگر تم یہ سب کچھ جاننے کے باوجود مجھے اپنا دوست سمجھنا چاہتی ہو تو یہ میرے لئے باعثِ تقویت ہے۔" عرفی کی آواز بھرّا گئی۔ میں نے تو اپنی حقیقت جاننے کے بعد خود کو سب سے الگ تھلگ کر لیا۔ اسکول جانا بھی چھوڑ دیا تھا۔ چارلی صاحب بھی سمجھ گئے تھے کہ میری یہ تبدیلی ان کی غلطی سے ہوئی تھی۔ اس کے بعد انہوں نے اس بارے میں مجھ سے کبھی کوئی بات نہیں کی مگر ان کے بعض جملوں سے کبھی کبھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ آج بھی اپنی اس غلطی پر پشیمان ہیں۔"

"تم نے یہ شعبدے بازی اور کمالات کہاں سے سیکھے؟"

"تمہیں شاید یقین نہ آئے کہ یہ سب کچھ میں نے فلموں میں دیکھ کر خود ہی سیکھا ہے۔ میں بچپن میں اپنا زیادہ تر وقت اس قسم کی فلمیں دیکھنے ہی میں گزارا کرتا تھا اور سوچا کرتا تھا کہ یہ سب کچھ کیسے ہوتا ہے۔ دھیرے دھیرے کچھ باتیں میری سمجھ میں آنے لگیں۔ میں اپنے کمرے میں اس کی مشقیں کرتا رہتا تھا اور یہ بھی سوچا کرتا تھا کہ کچھ نئی باتیں بھی کی جائیں۔ انہی نئی باتوں میں یہ گولے کا تماشا بھی ہے۔ ابتدا میں اسنوکر... کی دو گیندیں میرے ہاتھ لگ گئی تھیں۔ میں اپنی اس مشق میں گولوں کا اضافہ کرتا چلا گیا۔ اس طرح بات سات گولوں تک پہنچ گئی۔ پھر اپنے کمرے میں لگے ہوئے پنکھے کو دیکھ کر مجھے ایک نئی بات سوجھی لیکن اس کی مشق میں مجھے چار سال لگے۔ اوہ! شاید میں تمہیں بور کر رہا ہوں۔"

"ایسا نہیں ہے۔" نوشین نے جلدی سے کہا۔ "میں پوری دلچسپی لے رہی ہوں۔ میں تمہاری زندگی کے بارے میں ہر بات جان لینا چاہتی ہوں۔"

عرفی ذرا دیر کچھ سوچتا رہا، پھر بولا "ابتدا میں چارلی ہوٹل اتنا بڑا ہوٹل نہیں تھا۔ کچن میں چارلی صاحب خود کام کیا کرتے تھے۔ میں ان کا ہاتھ بٹایا کرتا تھا۔ کبھی کبھی مجھے ویٹر کے فرائض بھی انجام دینا پڑتے تھے۔ جب ہوٹل نے کچھ ترقی کر لی اور چارلی صاحب کو اس کا علم ہوا کہ میں اپنے کمرے میں پڑے پڑے کیا کیا کرتا ہوں تو انہوں نے کہا کہ میں ہوٹل میں لوگوں کے سامنے یہ سب کچھ کیا کروں۔ میں نے ان کی بات مان لی، یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ میں ان کی کوئی بات نہ مانوں۔"

"تمہارے ان کمالات نے ہی چارلی ہوٹل کو اتنی ترقی دی ہے۔"

"میں نے اس بارے میں کبھی نہیں سوچا۔"

"تمہاری باتوں سے مجھے اندازہ ہوا ہے کہ پہلے تم چارلی صاحب ہی کے ساتھ رہتے تھے۔ پھر اب الگ مکان میں کیوں رہنے لگے ہو؟"

"دراصل لوگ شروع ہی سے یہ جانتے تھے کہ میں چارلی صاحب کی اولاد نہیں ہوں، انہوں نے مجھے کسی سے لے کر پالا ہے۔ اسی وجہ سے جب ان کی بیٹی صوفیہ جوان ہوئی تو میں نے فیصلہ کیا کہ اس سے پہلے کہ لوگ کسی قسم کی باتیں بنانے لگیں اور میرے محسن کی بیٹی کی بدنامی ہو، مجھے ان سے الگ ہو جانا چاہئے۔


Samsol
کلاسِک
شیونگ کریم
خوشگوار دِن کی
تازگی بھری ابتداء!
Samsol
Classic
PERFUMED
Lather
Shaving
Cream

چارلی صاحب یہ علیٰحدگی نہیں چاہتے تھے لیکن جب میں نے اشاروں کنایوں میں انہیں نزاکت کا احساس دلایا تو وہ میری بات مان گئے۔ یہ مکان میں نے خود ہی پسند کیا تھا لیکن اس کی خریداری چارلی صاحب ہی کی جیب سے ہوئی تھی۔"

"انہیں یہاں کے لئے کچھ ڈھنگ کا فرنیچر بھی خریدنا چاہئے تھا۔"

"میں نے ہی انہیں ایسا نہیں کرنے دیا۔ آخر ضرورت ہی کیا تھی فضول خرچی کی! یہ جو سامان تم دیکھ رہی ہو' میرے لئے بہت کافی ہے۔"

"تم عجیب آدمی ہو عرفی!"

"تعیشات میں پڑنے کو میرا جی ہی نہیں چاہتا۔"

"تم زندگی سے اکتائے ہوئے ہو۔"

"تمہاری یہ بات شاید درست ہے۔" عرفی نے کہا۔

"ایک بات بتانے سے تم ہمیشہ گریز کرتے رہے ہو۔ جس شخص کا کوئی دوست نہ ہو' اس کا کوئی دشمن بھی نہیں ہوتا لیکن تم پر کئی بار قاتلانہ حملے ہو چکے ہیں۔ آخر وہ لوگ کون ہیں جو تمہیں ......"

"پلیز نوشین!" عرفی نے اس کی بات کاٹ دی۔ "میں تم سے درخواست کروں گا کہ اس موضوع کو اب کبھی نہ چھیڑنا' اگر تم مجھے اپنا دوست سمجھتی ہو تو پھر میرا فرض بن جاتا ہے کہ تمہیں خطرات سے دور رکھوں۔ اگر تم نے یہ راز جان لیا تو تمہاری زندگی بھی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔"

"وہ کیسے!" نوشین نے تعجب سے کہا۔

"میں ابھی تم سے درخواست کر چکا ہوں کہ اس موضوع پر بات نہ کرو۔"

"تم نے مجھے اُلجھن میں ڈال دیا ہے۔"

"یہ اُلجھن اس سے زیادہ بہتر ہے کہ تم کسی خطرے میں پڑ جاؤ۔" عرفی نے کہا اور پھر اس نے خود ہی موضوع بدلنے کے لئے کہا۔ "چودھری مشتاق کے گھر میں تمہارا پروگرام کس وقت شروع ہوگا؟"

"ساڑھے بارہ بجے۔" نوشین نے کہا۔ "لیکن تم ایک بجے تک بھی آجاؤ تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ یہ میں ابھی تم سے کہہ بھی چکی ہوں لیکن تم نے صرف موضوع بدلنے کے لیے یہ سوال کیا ہے۔"

عرفی حسب معمول پھیکے سے انداز میں مسکرا کر رہ گیا تھا۔

نوشین جب اس کے گھر سے لوٹی تو سچ مچ اس کی یہ الجھن بڑھ چکی تھی کہ آخر عرفی کی زندگی میں ایسا کیا راز ہے کہ اس پر قاتلانہ حملے ہوتے رہے ہیں اور وہ سمجھتا ہے کہ اگر اس نے یہ بات نوشین کو بتا دی تو اس کی زندگی بھی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔

○☆○

بدھ کو نوشین کا پروگرام نہیں ہوتا تھا اس لئے وہ اپنے ہوٹل جاتی ہی نہیں تھی۔ ماہ رخ کو دیکھ کر ہی اس کی ہڈیاں سُلگنے لگتی تھیں لیکن چودھری مشتاق کے گھر میں اپنے پروگرام سے ایک دن پہلے پڑنے والے بدھ کو وہ اپنے ہوٹل پہنچ گئی۔ اس روز وہ ایک خطرناک فیصلہ کرکے وہاں پہنچی تھی۔ اس نے ایک ایسی میز کا انتخاب کیا جو اس جگہ سے بہت قریب تھی جہاں بیٹھ کر وہ خود اور ماہ رُخ پروگرام کیا کرتی تھیں۔

وہ اس وقت وہاں پہنچی جب ماہ رُخ نے ایک غزل ختم کی ہی تھی۔ لوگ تالیاں بجا کر ماہ رُخ کو داد دے رہے تھے۔ وہ نوشین کو دیکھ کر پہلے تو چونکی' پھر رسمی انداز میں مسکرائی۔ جواباً نوشین زیادہ کشادہ دلی سے مسکرائی۔

پانچ منٹ بعد ماہ رُخ نے مائیک میں کہا۔ "اب میں راگ پیلو میں ایک ٹھمری پیش کروں گی۔"

"راگ پیلو" کا نام سُن کر نوشین نے ایسا بُرا سا منہ بنایا جیسے کسی کڑوی کسیلی چیز کا نام سُنا ہو۔ اس وقت اس نے اپنا رخ دوسری طرف کر لیا تھا تاکہ ماہ رخ اس کے چہرے کے تاثرات نہ دیکھ سکے۔

دل ہی دل میں نوشین نے کہا۔ "آج کے بعد تم کبھی کوئی راگ پیلو ٹھیلو نہیں گا سکو گی۔"

جب ماہ رخ کا پروگرام ختم ہوا تو نوشین میز سے اٹھ کر اس کے قریب گئی اور مسکراتے ہوئے بولی۔ "آج آپ کا گانا سن کر دل بہت خوش ہوا اور اس بات کا افسوس بھی کہ میں پہلے کبھی کیوں نہیں آئی۔ میں تو آپ کو سن کر بھی بہت کچھ سیکھ سکتی ہوں۔"

"یہ آپ کی ذرّہ نوازی ہے۔" ماہ رخ نے انکساری سے کہا۔

"خود آپ کی آواز میں بلا کا سوزوگداز ہے۔ میں آپ کو سن چکی ہوں۔"

"آپ کھانا تو ہوٹل میں ہی کھا کر جاتی ہیں نا؟" نوشین بولی۔

"جی ہاں' منیجر صاحب کے کمرے میں۔ کیوں؟"

"میں بھی وہیں جا کر کھاتی ہوں مگر آج جی چاہ رہا ہے کہ آپ کے ساتھ ہال میں ہی بیٹھ کر کھاؤں۔" نوشین نے کہا۔ "باتوں باتوں میں بھی تو آپ مجھے گائیکی کے بارے میں کچھ نکتے بتا سکتی ہیں۔"

"اگر آپ مجھے اس قابل سمجھتی ہیں تو میں حاضر ہوں۔"

ماہ رُخ کی آمادگی کے بعد نوشین کے دل کی دھڑکنوں میں خفیف سا اضافہ ہو گیا۔

وہ دونوں جب ایک گوشے کی میز پر بیٹھ گئیں اور ویٹر سے کھانے کے لیے کہہ دیا تو ماہ رُخ بولی۔ "آج آپ کا پروگرام نہیں تھا' پھر بھی آپ نے اب تک کھانا نہیں کھایا' جب مجھے گانا نہیں ہوتا تو میں نو بجے تک کھانا کھا لیتی ہوں۔"

"آج جی چاہا تھا کہ آپ کے ساتھ کھاؤں۔"

"اس محبت کا شکریہ۔"

"اس میں شکریے کی کوئی بات نہیں' آپ کی رفاقت تو میرے لئے باعث اعزاز ہے۔"

ماہ رخ نے پھر انکساری کا مظاہرہ کیا۔

جب ویٹر کھانا لے کر آیا تو ماہ رخ اٹھتے ہوئے بولی۔ "میں ذرا ہاتھ دھو آؤں۔"

اس طرح نوشین کو اپنا کام کر گزرنے کا بہت ہی سنہری موقع مل گیا۔ اپنے پرس میں سے سفوف کی پڑیا اس نے پہلے ہی نکال لی تھی۔ ویٹر کے جاتے ہی اس نے نمک دانی اٹھائی اور سلاد پر چھڑکنے لگی۔ سلاد کی پلیٹ کے قریب ہی پالک گوشت کی ڈش رکھی تھی۔ نوشین نے چٹکی بھر سفوف اسی ڈش کے ایک کونے میں ڈال دیا۔ سفوف کی رنگت بھی سبزی مائل تھی۔ وہ پالک میں جذب ہوگیا۔ اگر اس وقت ہوٹل میں بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے کسی کی نظر نوشین کی طرف ہوگی تو اس نے بس اتنا ہی سمجھا ہوگا کہ نوشین سلاد پر نمک چھڑک رہی تھی۔

ماہ رخ ہاتھ دھو کر آگئی' پھر وہ دونوں اپنی اپنی پلیٹوں میں کچھ نہ کچھ نکالنے لگیں۔ جب ماہ رخ نے پالک گوشت کی ڈش اٹھائی تو نوشین کا دل دھڑک اٹھا۔ پھر اس وقت اس کا دل خوشی سے معمور ہوگیا جب ماہ رخ نے ڈش کے اسی حصے سے پالک گوشت نکالا جہاں نوشین نے چٹکی بھر سفوف چھڑکا تھا۔

کھانے کے دوران میں نوشین نے راگوں کی باتیں چھیڑ دیں اور ماہ رخ سے اس کی ریاضت کا طریقہ پوچھنے لگی۔

نوشین کو یہ اطمینان بھی تھا کہ وہ سفوف ماہ رخ پر فوری طور سے کچھ اثر نہیں کرے گا۔ اس کے اثرات بارہ چودہ گھنٹے بعد ظاہر ہونا شروع ہوتے تھے۔ یہ بات اسے جڑی بوٹیوں والے ہی سے معلوم ہوئی تھی۔

ہوٹل سے واپسی پر وہ بہت خوش تھی کہ اس نے اپنی راہ کا ایک کانٹا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نکال دیا۔

جمعرات کو اس نے اپنا پروگرام کیا۔ وہ جاننے کے لئے بے چین تھی کہ ماہ رخ پر کیا اثرات ہوئے۔ اثرات ہونے کی صورت میں منیجر کو اس کا علم ضرور ہو جانا چاہئے تھا لیکن نوشین از خود منیجر سے کوئی ایسا سوال نہیں کرنا چاہتی تھی کہ مشکوک ہو جاتی۔

لیکن جب ہوٹل سے وہ چودھری مشتاق کے گھر روانہ ہو رہی تھی تو منیجر نے خود ہی اس سے کہا۔ "آج دوپہر کو ماہ رخ کے گلے میں کچھ تکلیف ہوگئی تھی۔ شام کو اسلم صاحب نے اس کی خیریت معلوم کرنے کے لئے فون کیا تو معلوم ہوا کہ تکلیف اب اتنی بڑھ گئی ہے کہ اس سے بولا بھی نہیں جا رہا ہے۔ اس کا خصوصی ڈاکٹر اس وقت اس کا معائنہ کر رہا تھا۔"

"خدا خیر کرے۔" نوشین نے کہا۔ "کسی گلوکارہ کے گلے میں اتنی تکلیف ہو جانا بڑی تشویش کی بات ہے۔"

"مجھے تو کچھ زیادہ تشویش نہیں ہے۔ کوئی الٹی سیدھی چیز کھا لینے سے بھی ایسی تکلیف ہو جاتی ہے جو وقتی ہوتی ہے۔ ماہ رخ تو ویسے بھی کچھ زیادہ پرہیز کی قائل کبھی نہیں رہی حالانکہ گلوکاروں کو اس کا خیال ضرور رکھنا چاہئے۔"

"خدا کرے آپ کی بات ٹھیک نکلے کہ تشویش کی کوئی بات نہ ہو۔" نوشین نے کہا' پھر بولی۔ "میں اپنے گھر ایک فون کرنا چاہتی تھی۔"

"ہاں ہاں' ضرور۔" منیجر نے ٹیلیفون اس کے سامنے رکھ دیا اور کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "میں ذرا سازندوں وغیرہ کو ہدایات دے آؤں۔"

"وہ کس طرح جائیں گے؟"

"ہوٹل کی ایک ویگن لے جائے گی۔"

"تو انہیں بس اتنی دیر روک لیجئے کہ میں فون کرلوں' میں اپنی کار اس ویگن کے پیچھے رکھوں گی تاکہ آسانی سے چودھری صاحب کے گھر پہنچ جاؤں۔"

"ٹھیک ہے' میں ویگن ڈرائیور سے کہہ دیتا ہوں۔"

منیجر کے جانے کے بعد اس نے اپنے گھر کے نمبر ڈائل کیے۔ پہلے تو اس نے سوچا تھا کہ قیصر کو کچھ بتائے ہی نہیں مگر اس وقت اسے اچانک خیال آیا تھا کہ قیصر سے اس کے تعلقات ناخوشگوار تو ہو چکے تھے لیکن بہرحال وہ اس کا شوہر تھا۔ یہ اس کے ساتھ زیادتی ہوتی کہ وہ رات گئے تک پریشان رہتا۔

توقع کے مطابق وہ گھر پر ہی تھا۔ نوشین نے اس سے کہا۔

"آج رات میں چار بجے سے پہلے گھر نہیں لوٹ سکوں گی۔"

"کیوں!" قیصر کا لہجہ بالکل سپاٹ تھا۔

"مجھے آج ایک پرائیویٹ فنکشن مل گیا ہے۔"

"کہاں؟"

"ایک بہت بڑے آدمی ہیں' چودھری مشتاق۔" نوشین نے کہا۔ "ان کے گھر پر یہ میرا خصوصی فنکشن ہے۔"

"چودھری مشتاق!" قیصر نے چونک کر کہا۔ "وہی تو نہیں جو ایک مشہور دواساز ایجنسی میں ڈائریکٹر ہے؟"

"وہی۔"

"اس کا اکاؤنٹ میرے ہی بینک میں ہے۔ میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں' وہ کوئی اچھا آدمی نہیں ہے نوشین!"

"میرے لئے اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ وہ کوئی اچھا آدمی ہے یا برا۔" نوشین نے کہا۔ "مجھے تو بیس ہزار روپے مل رہے ہیں۔ دو تین گھنٹے گا کر آجاؤں گی۔"

"میں نے تمہیں بتا دیا' اب تمہاری مرضی۔" قیصر کے لہجے میں جھنجلاہٹ سی تھی اور پھر اس نے نوشین کی کوئی اور بات سنے بغیر سلسلہ منقطع کر دیا تھا۔

نوشین نے برا سا منہ بنا کر ریسیور رکھ دیا۔ اسے اس کی پروا نہیں تھی کہ قیصر کا موڈ خراب ہوگیا تھا۔

○☆○

نوشین جب ایک گھنٹے گا چکی تو چودھری مشتاق نے آدھے گھنٹے کے بریک کا اعلان کیا۔

نوشین کو اطمینان حاصل ہوا کہ تھوڑا سا آرام مل جائے گا۔ وہ ہوٹل کے پروگرام سے ہی کافی تھکی ہوئی تھی۔ وہ یہ بھی چاہتی تھی کہ عرفی کے سلسلے میں چودھری مشتاق سے بات کرے۔ وہ اپنے وسیع تعلقات کی وجہ سے کسی کو بھی اس پر آمادہ کر سکتا تھا کہ وہ کسی مغربی ملک میں عرفی کے "شو" کا انتظام کرے۔ ابھی تک عرفی نے اس کے لئے ہامی نہیں بھری تھی لیکن نوشین کا خیال تھا کہ جب اس قسم کا کوئی انتظام ہو جائے گا تو وہ عرفی کو آمادہ کر لے گی۔

ایک بجے وہ وہاں آ بھی چکا تھا اور ایک گیت ختم کرنے کے بعد نوشین نے پانچ منٹ کا وقفہ دے کر اسے چودھری مشتاق سے متعارف بھی کرا دیا تھا اور اس کی فنکاری کے بارے میں خاصی لمبی چوڑی باتیں کی تھیں۔

آدھے گھنٹے کا وقفہ ہوا تو وہ چودھری مشتاق کے ساتھ ایک طرف جا بیٹھی اور اس سے عرفی کے سلسلے میں وہ بات کی جو وہ چاہتی تھی۔

"کیوں نہیں نوشین!" چودھری مشتاق نے بے تکلفی سے کہا۔ "بلکہ میں تو کہوں گا کہ اس کے ساتھ ہی تمہارا پروگرام بھی ہونا چاہئے۔ ہیوسٹن میں میرا ایک جاننے والا ہے جو اس قسم کے پروگرام ارینج کرتا رہتا ہے۔ میں کل ہی اس سے فون پر بات کر لوں گا۔"

"کیا واقعی یہ کام اتنی آسانی سے ہو جائے گا جتنی آسانی سے آپ کہہ رہے ہیں؟" نوشین خوش ہو کر بولی۔

"چاہو تو ابھی عرفی کو یہیں بلا لو۔ میں خود اس سے وعدہ کر لیتا ہوں۔ تم دونوں اپنی اپنی جگہ اتنے بڑے فنکار ہو کہ تم دونوں کے پروگرام مغربی ممالک میں ہلچل مچا دیں گے۔"

"خیر میں تو کچھ بھی نہیں ہوں۔"

"تم انکساری سے کام لے رہی ہو یا تمہیں اندازہ ہی نہیں ہوا کہ تمہاری آواز سن کر کتنے دلوں کی دھڑکنیں بے قابو ہو جاتی ہیں۔" چودھری مشتاق نے یہ کہتے ہوئے نوشین کو ایسی نظروں سے دیکھا کہ وہ کچھ گڑبڑا گئی۔

چودھری مشتاق نے پھر کہا۔ "کیا میں عرفی کو بلاؤں؟"

"ابھی نہیں۔" نوشین نے اس سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ "خود عرفی باہر جانے کے لئے تیار نہیں ہے، پہلے میں اسے تیار کر لوں۔"

"اگر وہ تیار نہیں ہوتا تو صرف تمہارا پروگرام بھی ارینج کیا جا سکتا ہے۔ تمہیں یقین دلانے کے لئے میں ابھی تمہیں پچاس ہزار روپے ایڈوانس دے سکتا ہوں۔"

چودھری مشتاق کی نظریں نوشین کو اپنے جسم میں چبھتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔ وہ گڑبڑا کر بولی۔ "میں واش روم جانا چاہتی ہوں!"

"ہاں ہاں، ضرور۔"

چودھری مشتاق نے اشارے سے ایک ملازم کو بلایا اور اس سے کہا۔ "میڈم کو خصوصی باتھ روم میں لے جاؤ۔"

اس وقت نوشین اتنی گھبرائی ہوئی تھی کہ اس نے "خصوصی باتھ روم" کے الفاظ پر غور ہی نہیں کیا لیکن اس وقت وہ چونکی جب ملازم اسے ایک بیڈ روم میں لے گیا۔

"میں نے واش روم کے لئے کہا تھا۔" وہ ملازم سے تیز لہجے میں بولی۔

"اس بیڈ روم کے باتھ روم سے اچھا باتھ روم اس کوٹھی میں ایک بھی نہیں ہے میڈم!" نوکر نے بڑے ادب سے جواب دیا۔ "یہ بیڈ روم بھی اس کوٹھی کا سب سے اچھا بیڈ روم ہے۔ صاحب تو یہاں کبھی کبھی سو جاتے ہیں ورنہ یہ ان کے صرف خاص مہمانوں کے لئے وقف ہے۔ اس کا باتھ روم بھی....."

"تم باتیں بہت بناتے ہو۔" نوشین نے بگڑ کر کہا۔

نوکر نے جلدی سے آگے بڑھ کر ایک دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ "باتھ روم یہ ہے میڈم۔"

"ٹھیک ہے، بس اب جاؤ۔" نوشین نے سخت لہجے میں کہا اور باتھ روم میں داخل ہو کر دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

وہ باتھ روم واقعی بہت شاندار تھا۔ اس کا طول و عرض بارہ فٹ اور نو فٹ سے کچھ زیادہ ہی ہو گا۔ سینٹری اعلیٰ درجے کی لگی ہوئی تھی۔ باتھ ٹب اتنا چکنا، صاف و شفاف اور اس کی بناوٹ اتنی خوبصورت تھی کہ اگر نوشین اس میں لیٹ کر نہاتی تو گھنٹوں اس کا باہر نکلنے کو جی نہیں چاہتا۔ دیواریں آئینوں سے مزین تھیں اور خوشبو اس کے گوشے گوشے سے پھوٹ رہی تھی۔

وہ جس خوابگاہ سے گزر کر آئی تھی، وہ بھی اسے بلا کی دل نشین نظر آئی تھی۔ ایسی خوابگاہیں اور ایسے باتھ روم اس نے صرف مغربی فلموں میں لارڈز جیسے لوگوں کے گھروں میں دیکھے تھے۔

اور یہی سب چیزیں اس کی بہت بڑی کمزوری تھیں۔ وہ ایسی ہی چیزوں کے حصول کے خواب دیکھا کرتی تھی۔

وہاں نوشین کو دو تین منٹ سے زیادہ نہیں لگنا تھے لیکن وہ وہاں کی چیزوں ہی کو حسرت سے دیکھنے میں اتنی منہمک ہوئی کہ دس منٹ گزر گئے۔ پھر وہ چونکی اور دروازہ کھول کر باہر نکلی۔

باہر نکلتے ہی وہ ٹھٹکی۔ چودھری مشتاق اس کے سامنے کھڑا تھا۔

"آپ!" اس کے منہ سے نکلا۔

"تمہیں اتنی دیر لگی تو مجھے تشویش ہوئی۔ میں ابھی ابھی یہاں آیا ہوں۔"

"میں یہاں کی خوبصورت چیزوں کو دیکھنے میں منہمک رہ گئی تھی۔" نوشین کے منہ سے سچی بات نکل گئی۔

"یہ سب کچھ تمہیں حاصل ہو سکتا ہے نوشین!" چودھری مشتاق نے کہا اور دوسرے ہی لمحے نوشین نے خود کو اس کی آغوش میں پایا۔

قیصر کی باتوں کے اشارے اور چودھری مشتاق کی نظروں سے اس نے اس شخص کا کردار تو سمجھ لیا تھا لیکن چودھری مشتاق کی وہ حرکت اتنی اچانک تھی کہ اسے چند لمحوں کے لئے سکتہ سا ہوگیا لیکن پھر اس وقت وہ چونک گئی جب اس نے چودھری مشتاق کا چہرہ اپنے چہرہ پر جھکتا ہوا دیکھا۔ اس کے منہ سے شراب کی بُو آرہی تھی۔

اس وقت نوشین شاید اپنے جسم کی ساری طاقت سے تڑپ کر اس کی گرفت سے نکل گئی۔ وہ دوڑتے ہوئے وہاں سے بھاگ نکلنا چاہتی تھی لیکن چودھری مشتاق لپک کر دروازے پر جم گیا۔ اس کی آنکھوں میں شراب کے نشے سے زیادہ نشہ چھایا ہوا تھا۔

"میرے راستے سے ہٹ جایئے!" نوشین کی آواز کانپ گئی۔

"میں تمہیں یہ سب کچھ دے سکتا ہوں نوشین جو تمہیں پسند آیا ہے۔" چودھری مشتاق کی آواز نشے سے بوجھل تھی۔

"اگر کوئی چیز مجھے پسند آتی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کی خاطر میں خود کو بیچ دوں گی۔" نوشین کی سانس تیز تیز چلنے لگی۔

"اس دنیا کا ہر انسان بک جاتا ہے نوشین! بس دل کھول کر قیمت لگانے والا ہونا چاہئے۔ اس وقت میری کیفیت ایسی ہے کہ تم اپنی قیمت کچھ بھی لگا سکتی ہو!"

"میں کہتی ہوں میرے راستے سے ہٹ جایئے! میں شادی شدہ ہوں۔"

"مجھے معلوم ہے لیکن اس شادی کی کوئی حقیقت نہیں، میں اسے دو دن میں ختم کردوں گا۔"

"اگر آپ میرے راستے سے نہ ہٹے تو میں زور زور سے چیخنا شروع کردوں گی۔" نوشین نے بپھر کر کہا۔

"تمہیں اس کی ضرورت نہیں پیش آئے گی۔" چودھری مشتاق نے منہ بنا کر کہا۔ "میں جبر کا قائل نہیں ہوں، تم جا سکتی ہو۔" وہ ایک طرف ہٹ گیا اور بولا۔ "لیکن میرے دل کے دروازے اور میری تجوری تمہارے لئے اس وقت تک کھلی رہے گی جب تک تم جوان اور خوبصورت ہو۔"

نوشین تیزی سے آگے بڑھی اور دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں پھر بھی وہ تیزی سے چل رہی تھی۔ وہ اس جگہ پہنچی جہاں مہمان جمع تھے۔ سب کو نظرانداز کرتی ہوئی وہ سیدھی عرفی کے قریب گئی۔

"چلو عرفی!" اس کی آواز میں اب بھی لرزش تھی۔

"کیا بات ہے!" عرفی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"تمہارا تو رنگ زرد پڑ رہا ہے!"

"تم چلو تو یہاں سے!"

"لیکن تمہارا فنکشن......"

"جہنم میں گیا فنکشن، تم اٹھتے کیوں نہیں ہو؟" نوشین جھنجلا گئی۔

عرفی کھڑا ہوگیا لیکن اس وقت یکایک اس کے چہرے پر غور و فکر کے آثار نظر آنے لگے تھے۔

○☆○

نوشین نے اپنی کار کی رفتار زیادہ نہیں رکھی۔ اس کے حواس ابھی پوری طرح قابو میں نہیں آئے تھے۔ اسے ڈر تھا کہ اگر اس نے رفتار زیادہ کی تو اسٹیئرنگ اس کے ہاتھوں کی کپکپاہٹ کے باعث بے قابو ہو جائے گا۔

عرفی اس کے برابر کی نشست پر خاموش بیٹھا کسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس نے نوشین سے کوئی سوال نہیں کیا۔ نوشین نے کار اس کے گھر کے سامنے لے جا کر روکی۔ اتنی دیر میں اس نے خود پر کافی قابو پا لیا تھا۔

"کیا تم کچھ دیر رُکو گی؟" عرفی نے آہستہ سے پوچھا۔

"نہیں عرفی! اس وقت تو میں اپنے گھر جا کے کوئی گولی کھا کر سو جانا چاہتی ہوں لیکن تم نے اب تک مجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ میں فنکشن ادھورا چھوڑ کر کیوں آئی؟"

"تم کوٹھی کے اندرونی حصے میں کیوں گئی تھیں؟"

"میں واش روم گئی تھی۔"

"جب چودھری تمہارے پیچھے پیچھے گیا تھا تو میرا ماتھا ٹھنک گیا تھا۔"

"جب میں باتھ روم سے نکلی تو وہ وہاں کھڑا ہوا تھا۔ اس نے مجھ سے بدتمیزی کرنا چاہی تھی لیکن جب میں نے شور مچانے کی دھمکی دی تو اس نے میرا راستہ چھوڑ دیا۔ اس نے مجھ سے اتنی گھٹیا باتیں کی تھیں کہ بس کیا بتاؤں۔ اس کے بعد اس کا کوئی سوال ہی نہیں تھا کہ میں اپنا ادھورا فنکشن پورا کرتی......"

"یہ بڑے لوگ۔" عرفی نے ٹھنڈی سانس لی۔ "تمہیں محتاط رہنا چاہئے تھا۔ کوٹھی کے اندرونی حصے میں جا کر تم نے غلطی کی۔"

"جو ہوا، سو ہوا ـــ اب میں مطمئن ہوں کہ اس غلیظ شخص کے ہاتھوں سے بچ کر نکل آئی۔ میں کل کسی وقت تم سے ملوں گی۔"

عرفی کو کار سے اُتارنے کے بعد وہ اپنے گھر کی طرف روانہ ہوگئی۔ وہ کوشش کر رہی تھی کہ گھر پہنچنے سے پہلے پہلے خود پر پوری طرح قابو پالے۔ وہ قیصر پر ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی کہ اسے چودھری مشتاق کے گھر پر کس قسم کی صورتِ حال سے دوچار ہونا پڑا تھا۔

قیصر نے اس کے لئے دروازہ کھولا تو بڑے سرسری لہجے میں بولا۔ "تم نے تو کہا تھا کہ چار بجے تک آؤں گی۔"

"لوگ بہت کم رہ گئے تھے۔ محفل جم نہ سکی اس لئے میں جلدی آگئی۔" نوشین جواب دیتے ہوئے خوابگاہ کی طرف بڑھتی چلی

گئی۔

بستر پر لیٹنے کے بعد اس نے محسوس کیا کہ غصے سے اس کا خون اب تک کھول رہا تھا۔ اس نے چودھری مشتاق اور اس کے باتھ روم کو اپنے خوابوں کے مطابق ہی پایا تھا لیکن وہ یہ بھی جانتی تھی کہ ایسے لوگوں سے شادی کر کے بھی وہ ایسی چیزیں ہمیشہ کے لئے حاصل نہیں کر سکتی۔ سال چھ ماہ میں جب ان جیسے لوگوں کا دل بھر جاتا ہے تو وہ طلاق دینے میں ذرا بھی دیر نہیں لگاتے۔

نوشین کا موڈ اتنا خراب تھا کہ اگر وہ اس رات دو خواب آور گولیاں نہیں کھاتی تو اسے نیند نہیں آتی۔

خواب آور گولیاں کھانا اس کی عادت نہیں تھی اس لئے دوسرے دن وہ دوپہر تک سوتی رہی۔ جب وہ اُٹھی تو اپارٹمنٹ میں اکیلی ہی تھی۔ قیصر بینک جا چکا تھا۔ نوشین اپنا جسم ٹوٹا ٹوٹا سا محسوس کر رہی تھی۔ پھر اٹھ کر وہ باتھ روم میں گئی۔ گھنٹے بھر تک وہ گرم پانی کا شاور لیتی رہی، پھر کپڑے تبدیل کر کے کچن میں گئی اور ناشتے کے لئے کچھ تیار کیا۔

اس وقت چار بج چکے تھے۔ اس نے عرفی کے گھر جانے کا ارادہ بھی ترک کر دیا۔ وہ جانتی تھی کہ عرفی ساڑھے چار بجے گھر سے نکل کر پانچ بجے تک ہوٹل پہنچ جاتا تھا۔ ڈیڑھ دو گھنٹے اسے ان چیزوں کی مشق کرنا ہوتی تھی جس کا مظاہرہ اس رات اسے ہوٹل میں کرنا ہوتا تھا۔

ساڑھے پانچ بجے قیصر دفتر سے آگیا۔ نوشین نے محسوس کیا کہ اس کے چہرے پر بڑی گمبھیر سنجیدگی تھی۔ اس نے نوشین سے کوئی رسمی بات بھی نہیں کی۔ ایک گھنٹے تک آرام کرتا رہا، پھر کپڑے تبدیل کر کے کہیں چلا گیا۔

نوشین کو اس پر تعجب ہوا تھا۔ قیصر بینک سے آنے کے بعد کہیں نہیں جاتا تھا۔ آرام کرنے کے بعد رنگ اور برش سنبھال لیتا تھا اور رات گئے تک اسی میں مصروف رہتا تھا۔

نو بجے نوشین اپنے ہوٹل روانہ ہوئی، اس وقت قیصر نہیں لوٹا تھا۔ نوشین نے روانگی سے قبل اپنی چیک بک سے بیس ہزار کا ایک چیک بھی کاٹ کر اپنے پرس میں رکھ لیا تھا۔ وہ مینجر کے ذریعے چودھری مشتاق کو یہ رقم واپس کر دینا چاہتی تھی۔

جیسے ہی وہ مینجر کے کمرے میں داخل ہوئی، مینجر نے اس سے پوچھا۔ "اب تمہاری طبیعت کیسی ہے نوشین؟"

"کیوں!" نوشین کو اس کی بات پر تعجب ہوا۔ "مجھے کیا ہوا ہے؟"

"آج چودھری صاحب کا فون آیا تھا۔ وہ بتا رہے تھے کہ رات کو پروگرام کرتے کرتے تمہاری طبیعت کچھ خراب ہو گئی تھی اور تم پروگرام ادھورا چھوڑ کر چلی گئی تھیں۔ چودھری صاحب سے تم یہ بھی کہہ آئی تھیں کہ بیس ہزار روپے واپس کر دوں گی لیکن وہ کہہ رہے تھے کہ اس کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر اچانک طبیعت خراب ہو جائے تو کوئی کیا کر سکتا ہے۔"

نوشین سمجھ گئی کہ چودھری مشتاق اصل بات چھپانا چاہتا تھا۔ خود نوشین بھی نہیں چاہتی تھی کہ وہ باتیں مینجر یا کسی اور سے کہتی پھرے۔ وہ سوچ میں پڑ گئی کہ مینجر کو چیک دے یا نہ دے؟

مینجر بولا۔ "ماہ رخ کی طبیعت تو زیادہ خراب ہو گئی ہے۔"

"کیا ہوا؟" نوشین چونک کر بولی۔ رات کے واقعے کی اُلجھن میں اسے یاد ہی نہیں رہا تھا کہ وہ ماہ رخ کے ساتھ کیا حرکت کر چکی تھی۔

"کل رات گیارہ بجے سے وہ اسپتال میں داخل ہے۔" مینجر نے بتایا۔ "اس کے گلے کا اندرونی حصّہ متورم ہو گیا ہے اور خراشیں سی پڑ گئی ہیں۔ ڈاکٹروں کی سمجھ میں بھی نہیں آرہا کہ اس کا سبب کیا ہو سکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس قسم کا کیس ان کے پاس پہلی بار آیا ہے۔"

نوشین نے سوچا کہ ڈاکٹروں کو جڑی بوٹیوں کے اثرات کے بارے میں کچھ معلوم ہی نہیں ہوتا تو وہ اس کیس کو سمجھ کیسے سکتے ہیں۔ مگر اس خیال کے ساتھ ہی نوشین کو اچانک یہ خوف ہوا کہ اخبارات کے ذریعے اگر اس کیس کا علم اس جڑی بوٹیوں والے کو ہو گیا تو کیا ہوگا؟ اگر وہ پولیس کو کچھ بتا بیٹھتا تو نوشین کے لئے پریشانی ہو سکتی تھی۔ وہ حرکت کرنے سے پہلے اس نے اس بارے میں تو سوچا ہی نہیں تھا۔

اس سلسلے میں اطمینان اسے دوسرے دن حاصل ہو سکا جب وہ جڑی بوٹیوں والے کی دکان پر گئی۔ اس نے سوچا کہ وہ کچھ رقم دے دلا کر اس شخص کا منہ بند رکھنے کی کوشش کرے گی لیکن اس کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ دکان بند تھی۔ اس پر چاک سے لکھا ہوا تھا کہ دکاندار اپنی والدہ کے انتقال کے باعث اپنے گاؤں چلا گیا تھا اور اس کی واپسی والدہ کے چہلم کے بعد ہی ممکن تھی۔

نوشین کو اطمینان ہو گیا کہ اتنے عرصے میں تو ماہ رخ کے بارے میں خبریں چھپنا بند ہو چکی ہوں گی۔

دوپہر کو وہ عرفی کے گھر پہنچ گئی اور اس سے چودھری مشتاق کے بجائے دوسری باتیں۔۔۔ کرتی رہی۔ عرفی بھی چودھری مشتاق کا نام زبان پر نہیں لایا۔

پانچ بجے وہ واپس گھر گئی۔ قیصر اس روز بینک سے ہی نہیں لوٹا تھا۔ نوشین شام کو جب چارلی ہوٹل روانہ ہوئی، اس وقت تک قیصر نہیں آیا تھا۔ وقتی طور پر نوشین الجھن کا شکار ہوئی لیکن چارلی ہوٹل پہنچنے کے بعد سب کچھ بھول گئی۔

مقررہ وقت سے کچھ پہلے وہ اپنے ہوٹل پہنچی تو مینجر نے اسے بتایا کہ اسپتال میں ڈاکٹروں نے ماہ رخ کے گلے کا اندرونی ورم تو خاصا کم کر دیا ہے لیکن خراشیں مندمل نہیں کر سکے ہیں۔ ڈاکٹروں نے یہ بھی خیال ظاہر کیا ہے کہ ماہ رخ کی کسی غذا میں کوئی زہریلی چیز چلی گئی تھی لیکن اس پر بھی وہ حیران تھے کہ اس زہریلی چیز کا اثر

معدے پر کیوں نہیں پڑا تھا' صرف گلے پر کیوں پڑا تھا۔
پروگرام ختم کرکے نوشین بارہ بجے کے قریب واپس گھر پہنچی۔ قیصر اس وقت بھی موجود نہیں تھا۔ اپارٹمنٹ کی ایک چابی اس کے پاس بھی رہتی تھی۔ اس سے دروازہ کھول کر وہ اندر گئی۔
جب وہ خوابگاہ میں پہنچی تو اس نے بستر پر ایک بڑا سا لفافہ پڑا ہوا دیکھا۔ اس نے اپنا پرس ایک طرف پھینکا اور جھپٹ کر وہ لفافہ اُٹھایا جو بند نہیں کیا گیا تھا۔ اس میں سے ایک اور کسی قدر چھوٹا سا لفافہ نکلا جس کے ساتھ ٹائپ کیا ہوا ایک خط اور ایک تصویر تھی۔
اس تصویر پر نظر پڑتے ہی نوشین کو ایسا لگا جیسے اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی ہو۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس تصویر کو دیکھنے لگی جس میں وہ چودھری مشتاق کی بانہوں میں تھی۔ یہ تصویر اس لمحے کھینچی گئی ہوگی جب چودھری مشتاق کی اس حرکت پر نوشین بالکل سکتے کی سی حالت میں رہ گئی تھی۔ تصویر سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اپنی مرضی سے چودھری مشتاق کی آغوش میں تھی۔
تھوڑی دیر بعد نوشین کے ہاتھ کانپے۔ تصویر اس کے ہاتھ سے بستر پر گر گئی۔ اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ٹائپ کیا ہوا وہ خط اُٹھایا جو اس تصویر کے ساتھ تھا۔ وہ قیصر کے نام چودھری مشتاق کا خط تھا جس میں لکھا گیا تھا۔
ڈیئر قیصر!
تصویر دیکھ کر تم نے بات تو سمجھ لی ہوگی لیکن یہ خط میں تمہیں اس لئے لکھ رہا ہوں کہ ساری ہی بات بتادوں۔ نوشین مجھ سے شادی کرنے کے لئے تیار ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ تم شاید اسے طلاق نہیں دینا چاہتے۔ اس لئے ہم دونوں نے یہ تجویز سوچی کہ ایسی کوئی تصویر تمہیں بھیج دی جائے۔ اس کے بعد تو تمہاری غیرت کو جوش آنا ہی چاہئے۔
فقط۔ سی ایچ' مشتاق
نوشین کے دل کی دھڑکنیں بے قابو ہوگئیں۔ سانسیں تیزی سے چلنے لگیں۔ اس نے وہ خط پھینک کر اندر سے نکلا ہوا لفافہ اُٹھایا جو بند تھا۔ اس نے اسے چاک کیا' اس میں سے تین چیزیں نکلیں۔ نوشین کے لئے طلاق نامہ جو کسی وکیل نے تیار کیا تھا' ایک چیک جس پر نوشین کے مہر کی رقم لکھی ہوئی تھی اور ایک خط جو قیصر نے نوشین کے نام لکھا تھا۔
مائی ڈیئر نوشین!
خدا کرے تم چودھری مشتاق کے ساتھ خوش رہ سکو لیکن مجھے ڈر ہے کہ ایسے لوگ بہت جلد اُکتا جاتے ہیں۔ بہرحال یہ تمہارا فیصلہ ہے۔ میں تم دونوں کے بیچ میں دیوار نہیں بننا چاہتا۔ چودھری مشتاق سے شادی کرکے تمہارے خواب پورے ہوجائیں گے' اس کے لئے پیشگی مبارکباد! اس تصویر کی موجودگی میں' میں مجبور تو نہیں تھا کہ تمہیں مہر کی رقم ادا کروں مگر نہ جانے کیوں ایسا کر رہا ہوں۔ شاید اس لئے کہ اب مجھے تم سے محبت تو نہیں رہی تھی لیکن انسیت بہرحال تھی۔ اسی لئے دوستوں سے قرض لے کر یہ رقم مہیا کی ہے۔ مجھے یہ تصویر کل ہی مل گئی تھی' لیکن کل میں گھر اس لیے آیا تھا کہ آخری بار تمہیں دیکھ تو لوں۔ آخری بار پھر کہوں گا کہ نئی زندگی مبارک ہو......! قیصر۔
وہ سب کاغذات نوشین کے کپکپاتے ہوئے ہاتھوں سے گر گئے۔ اسے اس کی پروا تو نہیں تھی کہ قیصر نے اسے طلاق دے دی لیکن اسے قیصر پر غصّہ ضرور آیا کہ اس نے اس سلسلے میں اس سے کوئی بات ہی نہیں کی ورنہ وہ اسے اصل ماجرا سُنا دیتی۔
قیصر سے زیادہ اس کا خون چودھری مشتاق پر کھولا جس نے کمینگی کی حد کردی تھی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ اسی وقت چودھری مشتاق کو فون کرکے اسے جتنی بھی سُنا سکتی ہے' سُنا ڈالے لیکن پھر اس نے سوچا کہ اس سے فائدہ کیا ہوگا۔ چودھری مشتاق تو اور خوش ہوگا کہ اس کا منصوبہ سچ مچ دو دن میں کامیاب ہوگیا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ نوشین کی شادی دو دن میں ختم کرسکتا ہے اور ایسا کر گزرا تھا۔
وہ کافی دیر تک دونوں ہاتھوں سے سر پکڑے بستر پر بیٹھی رہی۔ اسے خیال آیا کہ اب اسے اس اپارٹمنٹ میں رہنے کا بھی کوئی حق نہیں رہا۔ یہ قیصر کا گھر تھا۔ وہ اٹھی اور اپنا ضروری سامان ایک سوٹ کیس میں بھرنے لگی۔ وہ یہ اپارٹمنٹ اسی وقت چھوڑ دینا چاہتی تھی۔
قیصر ابھی تک نہیں آیا تھا اور نوشین کو یقین تھا کہ جب تک وہ یہاں سے چلی نہیں جائے گی' قیصر نہیں آئے گا۔
ایک گھنٹے کے اندر اندر اس نے وہ اپارٹمنٹ چھوڑ دیا۔ اپارٹمنٹ چھوڑنے سے پہلے اس نے چودھری مشتاق اور قیصر کے خط کے ساتھ وہ تصویر بھی جلا کر ضائع کردی تھی۔ صرف طلاق نامہ اور چیک اپنے پرس میں ڈال لیا تھا۔
روانگی کے وقت پہلے اس کے دل میں خیال آیا تھا کہ عرفی کے گھر جائے لیکن پھر اس خیال سے یہ ارادہ ترک کردیا کہ شاید یہ عرفی کے لئے مناسب نہ ہو' وہ واپس اپنے ہوٹل پہنچی۔ منیجر اس وقت اپنے گھر جا چکا تھا۔ لیکن اسسٹنٹ منیجر موجود تھا۔ وہ نوشین کو دوبارہ دیکھ کر حیران ہوا لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا۔ نوشین بولی۔
"میرے لئے ایک کمرے کا بندوبست کردیجئے!"
"خیریت تو ہے نا!"
"میں نے کہا ہے کہ ایک کمرے کا بندوبست کردیجئے!" نوشین نے سرد لہجے میں کہا۔
اسسٹنٹ منیجر چپ ہوگیا۔
ذرا دیر بعد نوشین ہوٹل کی دوسری منزل کے ایک کمرے میں تھی۔ پورٹر سے اس نے اپنا سوٹ کیس بھی اوپر منگوالیا تھا۔
○☆○

دوسرے دن نوشین نے مینجر کو قیصر سے اپنی علیحدگی کے بارے میں بتا دیا لیکن وجہ بتانے سے گریز کیا۔ مینجر نے اس سے اظہارِ ہمدردی کیا۔

اسی دن مینجر ہی سے نوشین کو ماہ رخ کے بارے میں بھی پتا چلا کہ ڈاکٹروں نے اس کے گلے کا ورم تو ختم کر دیا تھا لیکن خراشیں ابھی ختم نہیں ہو سکی تھیں۔ ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ وہ ان خراشوں پر بھی قابو پالیں گے لیکن انہیں اندیشہ تھا کہ اب ماہ رخ ساری زندگی گانا نہیں گا سکے گی اور اگر گانے کی کوشش کرے گی تو وہ خراشیں دوبارہ بھی پیدا ہو سکتی ہیں۔

نوشین کے لئے یہ ایک بہت بڑی خوش خبری تھی لیکن ذہنی طور پر منتشر ہو جانے کے باعث اس نے ان باتوں میں زیادہ دلچسپی نہیں لی۔

منگل کو ہوٹل کے مالک نے اس سے بات کی کہ اب اسے جمعرات کو بھی پروگرام کرنا پڑے گا۔ اس پر نوشین نے تنخواہ میں اضافے کی شرط پیش کر دی۔ اس طرح اس کی تنخواہ میں دس ہزار روپے کا اضافہ ہو گیا۔

ایک ہفتے میں نوشین نے خود پر کافی قابو پالیا اور سوچنا شروع کر دیا کہ اب اپنے مستقبل کا کیا لائحۂ عمل مرتب کرے۔ زندگی کے ایک بہت اہم موڑ سے گزرنے کے بعد بھی وہ اپنے خوابوں سے دستبردار نہیں ہوئی تھی۔

عرفی اسے پسند تھا اور وہ اس سے شادی کر سکتی تھی یا کرنے کے لئے تیار ہو سکتی تھی لیکن صرف اس شرط پر کہ عرفی مغربی ممالک کے دورے کرنے کے لئے تیار ہو جاتا۔ اسی صورت میں نوشین اپنے خوابوں کی تکمیل کی طرف بڑھ سکتی تھی لیکن اس ایک ہفتے میں اس نے عرفی سے کئی ملاقاتوں میں اس معاملے پر شدید دباؤ ڈالنے کی کوشش میں ناکامی کے بعد سوچنا شروع کر دیا تھا کہ اب اسے عرفی کی طرف سے مایوس ہو جانا چاہئے۔

اس مایوسی کے بعد اس نے ہوٹل میں آنے والے ان لوگوں پر تنقیدی نظر ڈالنا شروع کی جو اب بھی اس کی نظرِ کرم کے منتظر تھے۔

انور جمالی ایک بہت بڑے باپ کا بیٹا تھا۔ عمر بھی تیس پینتیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ شادی شدہ تو تھا لیکن نوشین کوئی ایسی تدبیر سوچنا چاہتی تھی کہ اس کی دوسری بیوی بن کر وہ قانوناً اپنی پوزیشن مستحکم کر لے۔ اس کی ایک صورت یہی ہو سکتی تھی کہ وہ انور جمالی سے شادی سے پہلے ہی بہت کچھ اپنے نام کروالیتی اور مہر بھی لاکھوں میں بندھواتی۔ اس صورت میں اگر کچھ عرصے بعد اسے طلاق ہو جاتی تو بھی اس کی مالی پوزیشن مستحکم رہتی اور اگر طلاق نہ ہوتی تو اسے وہ سب کچھ حاصل ہوتا رہتا جس کی وہ تمنائی تھی۔ اس صورت میں اس کے لئے یہ بھی ضروری نہیں رہ جاتا کہ وہ اپنی ترقی کے راستے ہموار کرنے کے لئے غیر ملکی دوروں کے بارے میں سوچتی۔

قیصر سے طلاق کے بعد اس نے اپنے والدین سے بھی کوئی رابطہ نہیں کیا تھا اور اگر قیصر انہیں اطلاع دے چکا تھا تو بھی وہ دونوں اس سے ملنے نہیں آئے تھے۔ شاید انہوں نے سمجھ لیا ہو کہ ان کی بیٹی اب ان کے قابل نہیں رہ گئی۔

ہوٹل میں رہتے ہوئے اسے پندرہ دن گزر چکے تھے اور وہ کرائے کا کوئی چھوٹا سا بنگلا بھی ڈھونڈنے میں لگی ہوئی تھی۔

ایک دوپہر کھانا کھانے کے بعد وہ اپنے کمرے میں آرام کر رہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

دروازہ کھولنے پر اسے ایک اجنبی شکل نظر آئی۔ اس شخص کی عمر پینتیس سال کے قریب معلوم ہوتی تھی۔ اس نے اپنا نام عاطف حسن بتایا اور اپنا وزیٹنگ کارڈ نوشین کی طرف بڑھایا۔ کارڈ پر نوشین نے "کلاسک آرٹ پروموٹرز" لکھا ہوا دیکھا۔ نوشین کے لئے یہ نام اجنبی نہیں تھا۔ اس نے سُنا تھا کہ دنیا کے مختلف ممالک میں ثقافتی پروگرام ترتیب دینے والوں میں کلاسک آرٹ پروموٹرز کا نام سرِفہرست سمجھا جاتا تھا۔

کسی خیال سے نوشین کے دل میں خفیف سی گدگدی ہونے لگی۔ اس نے عاطف کو اندر بُلا کر بٹھایا اور ٹیلیفون کر کے چائے وغیرہ منگوانے کے بعد عاطف سے بولی۔ "آپ کا نام تو میرے لئے اجنبی ہے لیکن کلاسک آرٹ پروموٹرز کی میں نے خاصی شہرت سنی ہے۔"

"میں آٹھ سال سے یہ ادارہ چلا رہا ہوں۔" عاطف نے بتایا۔ "دنیا کے متعدد ممالک میں، میں نے بے شمار پروگرام کیے ہیں اور اپنے یہاں کے بڑے بڑے فنکاروں کو وہاں متعارف کرایا ہے۔"

"مجھے یہ سب کچھ معلوم ہے۔" نوشین نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "یہ بتائیے کہ آپ نے مجھ ناچیز کو شرفِ میزبانی کیوں بخشا ہے۔"

"بات یہ ہے مس نوشین کہ میں بہت جلد لندن کے پلاڈیم تھیٹر میں مس ماہ رخ کا ایک پروگرام کرنے والا تھا۔ خاصی تیاری ہو چکی تھی۔ لیکن کسی وجہ سے میں نے اخبار والوں سے یہ خبر چھپا رکھی تھی۔ مس ماہ رخ سے بھی کہہ دیا تھا کہ جب وہ لندن کے لئے روانہ ہوں، تبھی پریس والوں کو اس پروگرام کے بارے میں کچھ بتائیں مگر اچانک ماہ رخ صاحبہ گلے کی کسی ایسی بیماری میں مبتلا ہو گئیں کہ اب شاید کبھی نہ گا سکیں۔"

اس ذکر پر نوشین کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "بڑی بدقسمتی کی بات ہے کہ ہمارا ملک ایک اچھی فنکارہ کی آواز سے محروم ہو گیا۔"

"اس کا افسوس سبھی کو ہے۔ ان کا مستقبل تو بہت ہی تابناک تھا، بہرحال، جو خدا کی مرضی! جو ہونا تھا، وہ ہو گیا۔ اب میری خواہش ہے کہ ماہ رخ صاحبہ کی جگہ آپ یہ پروگرام کریں۔"

نوشین کا دل اس کے سینے میں بڑی زور سے اُچھلا۔ عاطف کا کارڈ دیکھ کر جس خیال نے اس کے دل کو گدگدایا تھا، وہ حقیقت بن کر سامنے آگیا تھا۔

عاطف پھر بولا۔ ”میں یہاں سے بہت خوشی کے ساتھ واپس لوٹوں گا اگر آپ اس پروگرام کے لئے تیار ہو جائیں۔“

نوشین کے لئے ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ اس پیشکش کو مسترد کر دیتی لیکن یہ پیشکش اس نے کچھ انکساری اور ردّوقدح کے بعد منظور کی۔ اس نے یہ بھی کہا کہ اسے ہوٹل کی ملازمت چھوڑ کر بہت نقصان ہوگا لیکن عاطف کی دلیل تھی کہ جب وہ پروگرام کے باعث شہرت پا کر لندن سے لوٹے گی تو ہوٹل والے اس کی خدمات زیادہ معاوضہ دے کر حاصل کرنے میں بھی خوش ہوں گے۔

ان میں ایک گھنٹے تک گفتگو ہوتی رہی۔ عاطف نے بتایا کہ اس پروگرام سے دس لاکھ روپے کا منافع ہونے کی اُمید ہے اور وہ اپنے اصول کے مطابق منافع کا آدھا حصّہ اس فنکار کو دیتا ہے جس کی وجہ سے پروگرام کامیاب ہوتا ہے اور وہ رقم ان اخراجات کے علاوہ ہوتی ہے جو سفر خرچ اور قیام کے دوران کے اخراجات ہوتے ہیں۔

نوشین اس وقت اپنی خوشی کو بہ مشکل چُھپا پا رہی تھی۔

ایک گھنٹے بعد عاطف یہ کہہ کر رخصت ہوا کہ اگلے روز وہ اسی وقت پھر آئے گا اور ایگری منٹ لیٹر اس کے ساتھ ہوگا تاکہ اس پر کل ہی دستخط ہو جائیں جس کے بعد وہ نوشین کو پچاس ہزار روپے ایڈوانس دے دیتا۔

نوشین کے پاسپورٹ پر ویزا لگوانے اور لندن کے ٹکٹ کی خریداری بھی کلاسک آرٹ پروموٹرز کے ذمّے ہوتی۔

نوشین اتنی خوش تھی کہ اسی وقت عرفی کے گھر پہنچی۔ اس کی طرف سے مایوس ہو جانے کے باوجود وہ ابھی نوشین کے دل سے نہیں نکل سکا تھا۔

عرفی اس وقت ہوٹل جانے کی تیاری کر رہا تھا لیکن نوشین کی وجہ سے اسے کچھ دیر رُکنا پڑا۔ اس نے سب کچھ سننے کے بعد نوشین کو مبارکباد دی۔

نوشین بولی۔ ”اگر تم بھی چلنے کے لئے تیار ہو جاؤ تو میں کل عاطف سے تمہارے لئے بات کروں۔“

”اب تمہاری ان باتوں کو مسترد کرتے ہوئے مجھے شرمندگی محسوس ہونے لگی ہے نوشین!“ عرفی نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ”لیکن میں بہت بے بس ہوں۔ چارلی صاحب کو چھوڑنا میرے لئے ممکن نہیں۔“

اس طرح نوشین کو اس دن بھی مایوسی ہوئی لیکن اس کی خوشی بہرحال اپنی جگہ تھی۔ اسے یقین تھا کہ وہ لندن سے بہت کامیاب ہو کر لوٹے گی۔ اسے نہ صرف ہوٹل سے زیادہ معاوضہ ملنے لگے گا بلکہ یہ امکان بھی تھا کہ اسے فلموں میں پلے بیک سنگر بننے کا موقع بھی مل جاتا۔ اسے یقین تھا کہ اگر وہ ماہ رخ کو راستے سے نہ ہٹاتی تو اسے اپنی کامیابی کا یہ راستہ فی الحال تو ہرگز نہ ملتا۔

دوسرے روز عاطف اپنے وعدے کے مطابق آیا۔ ایگری منٹ سائن ہونے کے بعد اس نے پچاس ہزار روپے ایڈوانس بھی دے دیئے۔

ایک ہفتے میں نوشین کے پاسپورٹ پر ایک ماہ کا ویزا بھی لگ گیا اور اس کا ریٹرن ٹکٹ بھی بن گیا۔

”یہ ٹکٹ تین دن بعد کا ہے۔“ عاطف نے کہا۔ ”لیکن میں آج ہی جا رہا ہوں۔ دوسرے لوگ کل کی فلائٹ سے جا رہے ہیں۔ آپ مزید ایک دن چھوڑ کر روانہ ہوں گی۔ آپ کو لندن تک اکیلے سفر کرنے میں کوئی دشواری تو نہیں ہوگی؟“

”پہلی مرتبہ اتنا طویل فضائی سفر کروں گی لیکن میرا خیال ہے کوئی دشواری تو نہیں ہونا چاہئے۔ میرے ساتھ سامان بھی زیادہ نہیں ہوگا۔ صرف کپڑے ہوں گے لیکن سب لوگ ساتھ کیوں نہیں چل رہے ہیں؟“

میں اس پروگرام کی پبلسٹی اس طرح کرنا چاہتا ہوں کہ لوگوں کو پروگرام سے تین دن پہلے تک آرٹسٹ کا نام معلوم نہ ہو سکے۔ لندن کے اخبارات میں اس کی پبلسٹی تو آج سے شروع ہو چکی ہوگی۔ اس طرح لوگوں کا یہ تجسس بڑھتا رہے گا کہ آرٹسٹ کون ہے؟ فی الحال تو صرف اتنی پبلسٹی کی جا رہی ہے کہ کلاسک آرٹ پروموٹرز والے پلاڈیم میں ایک مشہور فنکار کا پروگرام پیش کرنے والے ہیں۔ پبلسٹی کا یہ طریقہ بڑا مؤثر ثابت ہوتا ہے مس نوشین!“

”مگر آج مجھے اپنے ہوٹل والوں کو یہ بات بتا دینا چاہئے کہ میں ایک ماہ کے لئے لندن جا رہی ہوں۔“

”ہاں یہ تو آپ انہیں بتا دیں مگر جانے کی وجہ صرف تفریح بتائیں۔“

”انہیں یقین نہیں آئے گا۔“

”نہ آئے۔ بس آپ اپنے منہ سے کچھ نہ کہیں۔ پبلسٹی کے اس طریقے کے نتائج سامنے آئیں تو آپ میری قائل ضرور ہوں گی۔“

نوشین نے ایسا ہی کیا۔ شام کو جب اس نے منیجر کو اپنے لندن جانے کے پروگرام سے آگاہ کیا تو وہ چونک کر بولا۔

”واقعی آپ تفریحاً جا رہی ہیں؟“

”کیوں!“ نوشین بولی۔ ”کیا لندن کی تفریح کرنے کے لئے میرا دل نہیں چاہ سکتا۔“

”دراصل ان دنوں سننے میں آ رہا ہے کہ کلاسک والے پلاڈیم تھیٹر میں کسی آرٹسٹ کا پروگرام کر رہے ہیں لیکن آرٹسٹ کا نام چُھپایا جا رہا ہے۔ مجھے ابھی خیال آیا کہ شاید وہ آرٹسٹ آپ ہی ہوں!“

”میں اس قابل کہاں ہوں جناب!“ نوشین نے ٹھنڈی سانس

لے کر کہا۔ "ویسے اس پروگرام کی سن گن مجھے بھی ملی ہے۔ اب میں بھی لندن جا رہی ہوں تو موقع ملنے پر وہ پروگرام بھی دیکھ لوں گی۔"

مینجر نے شکایت کی کہ ہوٹل کو کم از کم ایک ہفتے پہلے اس پروگرام سے آگاہ کیا جانا چاہئے تھا تاکہ متبادل بندوبست کرنے میں دشواری نہ ہوتی۔ جواباً نوشین نے کہا اس کا پروگرام ہی اچانک بنا ہے۔



روانگی سے ایک دن پہلے نوشین چارلی ہوٹل گئی۔ اس نے ایک گھنٹے تک عرفی کا پروگرام دیکھا اور بڑے رنج کے ساتھ سوچتی رہی کہ کاش عرفی اس کی بات مان لیتا۔

دوسرے دن وہ دوپہر کو عرفی سے اس کے گھر پر ملی۔

"آج رات کو میری فلائٹ ہے۔" اس نے عرفی کو بتایا۔

"اگر تمہاری فلائٹ دن میں ہوتی تو میں تمہیں چھوڑنے ائرپورٹ ضرور چلتا۔"

"مجھے معلوم تھا کہ تم نہیں جا سکو گے لہٰذا اس وقت ملنے چلی آئی۔" نوشین نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "کاش تم اپنے بارے میں میرے جذبات سمجھ سکتے عرفی!"

"جب تم واپس آ جاؤ گی تو میں تمہیں ایک بات بتاؤں گا۔"

"کیا!" نوشین نے چونک کر پوچھا۔

"بس جب آؤ گی، تبھی بتاؤں گا۔"

نوشین نے بہت اصرار کیا لیکن عرفی ٹس سے مس نہ ہوا لیکن اس روز پہلی مرتبہ ایسا ضرور ہوا کہ جب نوشین اس کے گھر سے رخصت ہو رہی تھی تو اس کے چہرے سے معلوم ہو رہا تھا کہ ایک ماہ تک نوشین کو نہ دیکھنے کا احساس اسے رنجیدہ سا کر گیا تھا۔

اس رات نوشین جب ائرپورٹ پہنچی تو دو متضاد کیفیات کا شکار تھی۔ کبھی اسے اپنا دل ڈوبتا ہوا سا لگتا اور کبھی وہ اپنے سارے رگ وپے میں مسرت پھیلتی محسوس کرتی۔ اس نے سوچا کہ ایک بڑی کامیابی کی طرف اٹھتا ہوا پہلا قدم، انسان کو ایسی ہی کیفیات سے دوچار کر دیتا ہے۔

ڈپارچر لاؤنج میں وقت گزارتے ہوئے اسے عرفی کے علاوہ قیصر کی بھی یاد آئی۔ وہ بہرحال اس کا شوہر رہا تھا۔ اس کے ساتھ کچھ دن تو اچھے گزرے ہی تھے۔

پبلک ٹیلیفون پر نظر پڑی تو نوشین نے یہ بھی سوچا کہ وہ قیصر کو فون کر کے بتا دے کہ وہ لندن جا رہی ہے اور اس نے چودھری مشتاق سے شادی کرنا تو کجا، اس سے دوبارہ ملنا تک گوارا نہیں کیا تھا، قیصر نے ایک غلط فہمی کا شکار ہو کر اسے طلاق دی تھی، لیکن اس سوچ پر نوشین نے عمل نہیں کیا۔ اس نے سوچا تھا کہ اب اس سے فائدہ بھی کیا! جو تیر ایک بار کمان سے نکل جائے، وہ واپس نہیں آتا۔

پھر جب وہ طیارے میں بیٹھی پرواز کر رہی تھی تو نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ اپنے مستقبل کے منصوبے بناتی رہی کہ واپسی پر اس کے پاس پانچ لاکھ روپے ہوں گے جس سے وہ ایک خوبصورت نئی کار خریدے گی۔ اگر لندن نہ جانا پڑ گیا ہوتا تو وہ کرائے پر کوئی خوبصورت بنگلا لے ہی چکی ہوتی۔ اب بنگلے کو ڈیکوریٹ کرنے کے لئے بھی اس کے پاس ایک مناسب رقم ہوتی۔ اسے یقین تھا کہ ہوٹل سے بھی اسے ساٹھ ستر ہزار روپے ماہانہ تو ملنے ہی لگیں گے۔ اگر وہ قیصر کے ساتھ اس کی خواہش کے مطابق زندگی گزارتی رہتی تو نہ جانے کب تک پانچ ہزار روپیہ ماہانہ ہی اس کا مقدر بنے رہتے۔

نوشین کو عرفی کی یہ بات بھی یاد آتی رہی کہ جب وہ لندن سے آئے گی تو وہ اسے کوئی بات بتائے گا۔ نوشین ذرا بھی اندازہ نہیں لگا پا رہی تھی کہ وہ اسے کیا بتائے گا۔ کیا ان حملوں کے بارے میں جو اس پر ہوتے رہے تھے؟ لیکن وہ کہہ چکا تھا کہ اس راز سے پردہ اٹھا کر وہ نوشین کے لئے کوئی خطرہ کھڑا نہیں کرنا چاہتا۔

یہ اور نہ جانے کیا کیا خیالات نوشین کے ذہن میں چکراتے رہے۔ اس نے یہ بھی سوچا کہ واپسی پر وہ اپنے ماں باپ سے ملنے بھی جائے گی اور انہیں بتائے گی کہ قیصر سے طلاق لے کر اس کی زندگی بگڑی نہیں بلکہ سنور گئی ہے۔

لندن تک کے سفر میں وہ بہت کم سوئی۔

عاطف اپنے وعدے کے مطابق ہیتھرو ائرپورٹ پر اسے لینے کے لئے موجود تھا۔ اس کے پاس کرائے کی ایک خوبصورت کار تھی۔ راستے میں اس نے نوشین کو کئی ہوٹلوں کے نام بتائے، ان کے اسٹینڈرڈ اور اخراجات سے آگاہ کیا اور ہوٹل کا انتخاب اس پر چھوڑ دیا۔

نوشین نے جو ہوٹل پسند کیا، عاطف اسے وہیں لے گیا۔ "رازداری" برتنے کے باعث وہ نوشین کو اس ہوٹل میں نہیں ٹھہرانا چاہتا تھا جہاں خود اس کا قیام تھا لیکن اس نے نوشین کو بتا ضرور دیا کہ وہ کس ہوٹل کے کس کمرے میں ٹھہرا ہوا ہے۔

ایک گھنٹے تک نوشین سے باتیں کرنے کے بعد عاطف رخصت ہو گیا۔ اس نے تاکید کی تھی کہ ہوٹل کا کارڈ نوشین ہر وقت اپنے ساتھ رکھے تاکہ اگر بے خیالی میں بھی کسی وقت گھومنے کے لئے باہر نکل پڑے تو بھٹک جانے کی صورت میں وہ کارڈ ہی اس کے کام آ سکتا تھا۔

نوشین کے لئے یہ احساس بڑا سنسنی خیز تھا کہ وہ اس وقت لندن میں تھی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ اکیلی ہی گھومنے نکل پڑے لیکن طیارے میں جاگنے اور طویل سفر کے باعث وہ بے حد تھکی ہوئی تھی۔ اس نے آرام ہی کرنے کا فیصلہ کیا۔

دوسرے دن جب وہ ناشتے سے فارغ ہو چکی تھی تو عاطف کا فون آیا۔ اس نے خیریت پوچھی اور شام کو آنے کا وعدہ کیا۔

نوشین کہیں گھومنے کے خیال سے باہر نکل پڑی۔ پاؤنڈز کی صورت میں عاطف گزشتہ روز ہی اتنی رقم دے گیا تھا کہ وہ ایک ماہ تک ہوٹل کا کرایہ دینے کے علاوہ اپنے کھانے پینے اور گھومنے پھرنے کے اخراجات آسانی سے پورے کر سکتی تھی اور وہ خود بھی پانچ سو پاؤنڈ لے کر آئی تھی۔

ہوٹل کی لابی میں وہ اچانک انور جمالی کو اپنے سامنے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ یہ وہی شخص تھا جس سے بتدریج قریب ہونے کی کوششیں نوشین نے قیصر سے طلاق کے بعد شروع کی تھیں۔

"نوشین!" جمالی کے لہجے میں حیرت تھی۔

یہ پہلا موقع تھا جب اس نے اسے "نوشین صاحبہ" کہہ کر مخاطب کرنے کے بجائے بے تکلفی سے اس کا نام لیا تھا۔

نوشین نے اس کا بُرا نہیں مانا۔ وہ تو پہلے ہی فیصلہ کر چکی تھی کہ اگر اسے جمالی سے مکمل تحفظ... مل سکے تو وہ اس سے شادی کر لے گی۔ اس نے مسکرا کر کہا۔ "یہ ملاقات ایک بڑا دلچسپ اتفاق ہے۔"

لیکن وہ سوچ رہی تھی کہ یہ محض اتفاق نہیں ہو سکتا۔ جمالی اس کے تعاقب میں ہی لندن آیا ہوگا۔ نوشین کے خیال کے مطابق وہ اس پر خاصی حد تک فریفتہ ہو چکا تھا۔ یہ اس کی فریفتگی ہی تھی کہ اس نے لندن تک بھی دوڑ لگا دی تھی۔ وہ اتنا مالدار تو تھا ہی کہ لندن کے سفر کے اخراجات اس کے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتے تھے۔

وہ نوشین کو ہوٹل کے بار میں لے آیا۔ جہاں اس نے دو بیئر منگوانا چاہیں لیکن نوشین نے کہا کہ وہ شراب نہیں پیتی۔ جمالی نے اسے باور کرانا چاہا کہ بیئر کو شراب کا درجہ نہیں دیا جا سکتا لیکن نوشین نہیں مانی۔ جمالی نے بھی بیئر پینے کا پروگرام تبدیل کر دیا اور پھر وہ ہوٹل کے دوسرے حصے میں جا بیٹھے جہاں کافی کا آرڈر دیا گیا۔

اس دوران میں نوشین اسے بتا چکی تھی کہ وہ صرف تفریحاً لندن آئی ہے اور جمالی نے بتایا تھا کہ اس کے والد کے کاروباری معاملات لندن تک پھیلے ہوئے ہیں جن کی دیکھ بھال اسے ہی کرنا پڑتی ہے' وہ ہر ماہ لندن آتا رہتا ہے۔ مستقل آتے رہنے کی وجہ سے اس نے ایک چھوٹا سا مکان اور ایک کار بھی خرید لی تھی۔

نوشین نے جب یہ بتایا کہ وہ اس وقت تفریح کرنے کی غرض سے باہر نکلی تھی تو جمالی نے پیشکش کی وہ اسے لندن کی تفریح کرا سکتا ہے کیونکہ لندن کا ایک ایک گوشہ اس کا دیکھا ہوا ہے۔

نوشین نے اس کی پیشکش قبول کر لی۔ ہائیڈ پارک اس نے بڑے ذوق و شوق سے دیکھا کیونکہ اس پارک کے بارے میں وہ بڑی دلچسپ کہانیاں سنتی رہی تھی۔ درختوں کے سُرخ اور پیلے پتے دیکھنے کا اتفاق بھی اسے پہلی بار ہوا تھا۔

پانچ بجے کے قریب جمالی نے اسے واپس اس کے ہوٹل چھوڑ دیا اور دوسرے دن پھر آنے کا وعدہ کر کے رخصت ہو گیا۔

اندھیرا پھیلنے کے بعد عاطف آیا اور اسے اپنے ہوٹل لے گیا۔

"کھانا ہم کمرے میں کھائیں گے" اس نے کار سے اُترتے ہوئے کہا۔ "میں نہیں چاہتا کہ ہال میں کوئی ہم دونوں کو ساتھ دیکھے۔ اس طرح لوگوں کو شبہ ہو جائے گا کہ میں جو پروگرام کر رہا ہوں' اس کی آرٹسٹ تم ہی ہو۔"

چنانچہ انہوں نے کمرے میں کھانا کھایا اور پھر کافی پینے کے بعد اس نے نوشین کو وہ اخبارات دکھائے جن میں پروگرام کی پبلسٹی کی جا رہی تھی۔ دو ایک خبریں بھی دکھائیں۔ ان میں لوگوں کے اس تجسس کے بارے میں لکھا گیا تھا کہ آخر کلاسک پروموٹرز والے کس آرٹسٹ کو پیش کرنا چاہتے ہیں کہ اس کا نام اتنا راز میں رکھا جا رہا ہے۔

"پروگرام کب ہوگا؟" نوشین نے بے چینی سے پوچھا۔

"جلدی ہی ہو جاتا لیکن کچھ دشواریاں اچانک سامنے آگئی ہیں۔ دراصل یہاں کے انتظامات میرا جو آدمی کرتا ہے' وہ اچانک بیمار پڑ گیا اور پلاڈیم تھیٹر کے لیے اس تاریخ کو بکنگ نہیں کرا سکا جو تاریخ میں نے اسے بتائی تھی۔ یہ ایسا ہال ہے جس کی بکنگ بہت پہلے سے کرانا پڑتی ہے۔"

"تو پھر؟" نوشین نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"کوشش میں لگا ہوا ہوں۔ کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔ پروگرام تو کرنا ہی ہے' لیکن اب شاید ایک ماہ گزر جائے۔"

"لیکن میرا ویزا تو صرف ایک ماہ کا ہے۔"

"اس کی پروا نہ کرو۔ وہ میں بڑھوا دوں گا' لیکن اب نئے سرے سے انتظامات کرنے کی وجہ سے میری مصروفیت بہت رہے گی۔ ایسا ہو سکتا ہے کہ میں تم سے روزانہ نہیں مل سکوں۔"

"اس سے تو خیر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اتفاقاً ایک دوست سے ملاقات ہو گئی ہے۔ آج دن بھر اسی کے ساتھ گھومتی رہی۔"

"اسے بتا تو نہیں دیا کہ تم یہاں کیوں آئی ہو؟" عاطف نے گھبرا کر پوچھا۔

"نہیں' میں نے اسے یہی بتایا ہے کہ تفریحاً لندن آئی ہوں۔"

عاطف نے اطمینان کا سانس لیا اور پھر بولا۔ "چلو اب میں تمہیں تمہارے ہوٹل چھوڑ آؤں۔"



پروگرام کی تاخیر سے نوشین پریشان ہو گئی تھی لیکن اس کے لئے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں تھا کہ انتظار کرے۔ وہ اپنا بیشتر وقت لندن میں گھومنے میں گزارتی رہی۔ جمالی اس کے ساتھ ہوتا تھا۔ اس نے نوشین کو اچھی خاصی شاپنگ بھی کرا ڈالی۔ ایک مرتبہ اپنا گھر دکھانے بھی لے گیا۔ وہ اب نوشین سے کھلتا جا رہا تھا۔ ایک مرتبہ شاپنگ کرتے ہوئے وہ نوشین کا ہاتھ پکڑ کر اس کی بانہہ میں بانہہ ڈالے رہا۔

اٹھائیسویں دن نوشین کی پریشانی بہت بڑھ گئی۔ وہ ٹیلیفون کر کے عاطف کے ہوٹل پہنچی۔ عاطف نے اسے کافی پلائی اور اسے اطمینان دلانے کی کوشش کی۔

"کیا تم اخبارات میں اشتہارات نہیں دیکھ رہی ہو؟" وہ بولا۔ "اگر پروگرام نہ کرنا ہوتا تو میں اتنا پیسا کیوں ضائع کرتا.... بس پانچ دن کے بعد ہی پروگرام ہوگا۔ کل شام میں ایک پریس کانفرنس کر رہا ہوں' اس میں آرٹسٹ کے نام کا اعلان بھی کر دیا جائے گا۔"

پروگرام طے ہو جانے کی بات سُن کر نوشین نے کچھ اطمینان محسوس کیا' پھر بولی۔ "میرے ویزے کا کیا ہوگا؟"

"کل دوپہر میں تمہارے ہوٹل آؤں گا۔ تم میرے ساتھ چلنا۔ میں ویزا بھی بڑھوا دوں گا اور ٹکٹ پر واپسی کی تاریخ بھی بڑھوائی جائے گی۔"

وہاں سے نوشین مطمئن ہو کر لوٹی۔ رات کو اس نے خواب میں دیکھا کہ وہ ایک بہت بڑے ہال میں اسٹیج پر گانا گا رہی ہے۔ اگر اس نے پلاڈیم تھیٹر دیکھا ہوتا تو وہ خواب میں پلاڈیم ہی کا ہال دیکھتی۔

لیکن دوسرے دن جب اس نے ناشتا کرتے ہوئے اخبار دیکھا تو اسے سکتہ ہوگیا۔ ایک اشتہار میں کلاسک آرٹ پروموٹرز والوں نے اپنے آرٹسٹ کا نام دیا تھا اور وہ نام نوشین کا نہیں بلکہ ایک بہت بڑی فنکارہ ناہید سلطان کا تھا۔

نوشین کو یوں لگا جیسے اس کا وجود ریزہ ریزہ ہو کر بکھرتا چلا جا رہا ہو۔ ذرا دیر کے .... لئے تو اس کا دماغ شل ہوگیا تھا کہ یہ ہوا کیا؟ پھر جب وہ کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل ہوئی تو اس کے دماغ میں گونجنے والا پہلا سوال یہ تھا کہ عاطف نے اس کے ساتھ اتنا بڑا دھوکا کیوں کیا اور اس پر اتنے اخراجات کیوں کر ڈالے؟

دھیرے دھیرے وہ بدحواسی کی کیفیت سے نکلی اور اس پر غصہ غالب آنے لگا۔ وہ ٹیلیفون پر عاطف سے رابطہ کرنے کے بارے میں سوچ ہی رہی تھی کہ عاطف خود آگیا۔ اس کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ تھی۔

"یہ ......یہ ......" غصے کی شدت سے نوشین اپنی بات پوری نہیں کر سکی۔ اس کا جسم بھی کانپنے لگا تھا۔

"ہم اطمینان سے بیٹھ کر بھی بات کر سکتے ہیں۔" عاطف بولا۔

"یہ کیا کیا ہے تم نے میرے ساتھ!" نوشین چیخ پڑی لیکن وہ اتنی زور سے بھی نہیں چیخی تھی کہ اس کی آواز پھٹ جاتی۔ اپنی آواز پھٹ جانے پر وہ چونک بھی گئی تھی۔

"دیکھا تم نے!" عاطف بولا۔ "تمہاری آواز پھٹ گئی۔ اب تم بہت عرصے تک نہیں گا سکو گی نوشین بیگم! میں ماہ رخ کو بہت چاہتا ہوں۔ ہم اس سال شادی کرنے والے تھے اور وہ بہرحال اب بھی ہوگی لیکن تم نے ماہ رخ کو جس حال تک پہنچا دیا ہے' اسے میں فراموش نہیں کر سکتا تھا۔"

"کیا.... کیا مطلب؟" نوشین ہکلا گئی۔ "میں نے کیا کیا ہے ماہ رخ کے ساتھ؟"

"تم نے اسے تباہ کر دیا ہے نوشین!" عاطف دانت پر دانت جما کر بولا۔ "تم نے ایک دفعہ رات کو اس کے ساتھ کھانا کھایا تھا۔ یہ تو میں نہیں جانتا کہ تم نے اس کے کھانے میں کیا ملایا تھا لیکن جو کچھ ملایا تھا' وہ کوئی بہت ہی زہریلی چیز تھی جس نے ایک فنکارہ کا گلا تباہ کر دیا۔"

"یہ سراسر الزام ہے۔" نوشین کی آواز کانپ گئی۔

"یہ الزام نہیں ہے۔" عاطف کا لہجہ بڑا گمبھیر تھا۔ "میں چاہتا تو یہ کیس پولیس کو بھی دے دیتا اور ماہ رخ بھی کہہ رہی تھی کہ پولیس خود ہی تم سے حقیقت اُگلوا لے گی لیکن میں اس کے لئے تیار نہیں تھا۔ میں ماہ رخ کا انتقام لینے کے لئے تمہارے اس غرور کو ختم کرنا چاہتا تھا جو تم کو اپنی آواز کے سوزوگداز پر رہا ہے۔ کل میں تم کو کافی میں ایک ایسی چیز دے چکا ہوں کہ اب تم گا نہیں سکو گی۔"

"نہیں۔" نوشین لرز گئی۔

"ہاں نوشین بیگم!" عاطف کے ہونٹوں پر تلخ سی مسکراہٹ تھی۔ "اس کے لئے میں نے تم پر بہت روپیا خرچ کیا ہے لیکن ماہ رخ کا انتقام لینے کے لئے میں اس سے بھی زیادہ روپیا خرچ کر سکتا تھا۔ اب تم یہاں سے اپنے وطن جاؤ اور جوتیاں چٹخاتی پھرو' اب کوئی تمہیں نہیں پوچھے گا۔ اگر تم مجھ پر کیس کرنا چاہو تو شوق سے کرنا لیکن یہ انگلینڈ ہے۔ تم ہرگز ثابت نہیں کر سکو گی کہ میں نے تمہیں کچھ کھلا دیا ہے اور نہ تم یہ ثابت کر سکتی ہو کہ تم کو میں انگلینڈ لایا تھا۔ تم اکیلی آئی تھیں۔ مجھ سے الگ رہی تھیں جبکہ میرے سب ساتھی اسی ہوٹل میں مقیم ہیں جہاں میں رہتا ہوں۔ پولیس سے تو میں یہی کہوں گا کہ تم میرے پیچھے پڑی ہوئی تھیں کہ میں تمہیں بھی اس پروگرام میں شامل کر لوں مگر ناہید سلطان اتنی چھوٹی فنکارہ نہیں ہے کہ اس کے ساتھ تمہیں بھی اسٹیج پر لایا جا سکے۔ اب اگر تم چاہو تو اپنے گلے کا علاج کرنے کے لئے لندن میں رک سکتی ہو لیکن یہاں کا مہنگا علاج تم کراؤ گی کیسے؟ تمہارے پاس میرے اندازے سے اب بس اتنی ہی رقم ہونا چاہئے کہ دو ایک روز اور رک کر یہاں سے ناکام ونامراد لوٹ جاؤ۔"

نوشین کو اچانک محسوس ہونے لگا جیسے عاطف کی آواز کہیں دور سے آرہی تھی۔ اس کا دماغ منتشر سا ہونے لگا۔

"اب میں چلتا ہوں۔" عاطف نے کہا۔ "مجھے ائرپورٹ جا کر اپنے پروگرام کی اصل فنکارہ ناہید سلطان کو ریسیو کرنا ہے۔"

نوشین سکتے کی سی حالت میں بیٹھی رہ گئی اور عاطف چلا گیا۔ نوشین کے لیے یقین کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ اب وہ گانے کے قابل نہیں رہی ہوگی۔ اسے اپنے گلے میں کسی بھی قسم کی تکلیف نہیں محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے سوچا کہ وہ کچھ گائے اور اپنی تسلی کر

لے مگر کئی مرتبہ منہ کھولنے کے باوجود وہ گانے کی ہمت نہیں کر سکی۔ وہ خوف زدہ تھی کہ عاطف کی بات درست نہ ہو۔ وہ بڑے یقین سے کہہ کر گیا تھا کہ اب وہ گا نہیں سکے گی۔

وحشت زدہ سی حالت میں وہ کسی مجسمے کی طرح ... بیٹھی رہی اور پھر نہ جانے کتنی دیر بعد اس نے شاید غیر ارادی طور پر مدھم آواز میں ایک گیت گانا شروع کیا اور پھر اس وقت چونک پڑی جب پانچویں سُر تک پہنچتے ہی اس کے گلے میں تکلیف ہونے لگی۔ وہ ایک دم چپ ہوگئی۔ اس کا دل بہت زور زور سے دھڑکنے لگا۔ کچھ دیر بعد اس نے پھر گانا شروع کیا۔ پانچویں سُر تک پہنچتے ہی اس کے گلے میں تکلیف ہوئی لیکن اس نے تکلیف برداشت کی۔ چھٹے سُر پر تکلیف میں اور اضافہ ہوا اور ساتویں سُر تک پہنچنے سے پہلے ہی اس کی آواز پھٹ گئی۔

دوسرے ہی لمحے وہ بستر پر اوندھی گری پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ بلندیوں کو چھو لینے کی خواہشات' اس کے وجود میں ریزہ ریزہ ہو کر بکھر رہی تھیں۔ اس نے اپنی آواز کے سوز و گداز ہی کو اپنی ترقی کی بنیاد بنایا تھا لیکن اب اس کے سُر نامکمل تھے۔

وہ اتنی دیر روتی رہی کہ اس کی آنکھیں خشک ہوگئیں۔ پیاس سے اس کا حلق خشک ہونے لگا تھا۔ وہ بستر سے اُٹھ کر ڈگمگاتے قدموں سے فریج تک گئی اور پانی پی کر بستر کی طرف لوٹی۔ اب اس کی حالت پھر ایک مجسمے کی سی تھی۔ وہ ایک اجنبی دیس میں اب خود کو بالکل بے سہارا سمجھ رہی تھی۔ اچانک اسے جمالی کا خیال آیا۔ اس نے گیارہ بجے آنے کے لئے کہا تھا۔ ابھی گیارہ بجنے میں دس منٹ باقی تھے۔ وہ سوچنے لگی کہ اب اس اجنبی دیس میں اس کا آخری سہارا جمالی ہی ہو سکتا ہے۔

گیارہ بجنے میں دو منٹ باقی تھے جب جمالی آگیا۔ اسے دیکھتے ہی نوشین کا دل ایک بار پھر بھر آیا۔ آنکھوں کے سوتے پھوٹ پڑے۔

"کیا ہوا نوشین!" جمالی نے جلدی سے پوچھا اور اس کے قریب بیٹھ کر اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔

اس صورتِ حال میں یہ تھوڑی سی ہمدردی ایسی تھی کہ نوشین شدید جذباتی ہوگئی اور بے تحاشا جمالی سے لپٹ کر اس کا سینہ اپنے آنسوؤں سے بھگونے لگی۔

ایک بار پھر تھوڑی دیر بعد جب اس کی حالت سنبھلی تو اس نے ہلکی ہلکی سسکیوں کے ساتھ جمالی کو سارا قصہ سنایا۔

"اوہ گاڈ!" جمالی اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اس کے چہرے پر غصے کے آثار تھے۔ وہ بڑبڑایا۔ "اتنا خوفناک دھوکا! یہ عاطف آخر ہے کیا چیز! میں اس کا دماغ ٹھکانے لگا دوں گا۔ تم مجھے اس ہوٹل کا نام اور کمرا نمبر بتاؤ۔"

"وہ ابھی ہوٹل میں نہیں ہوگا۔ یہاں سے وہ ائرپورٹ گیا ہے' ناہید سلطان کو لینے! اگر تم اس سے کیا بات کرو گے جمالی؟"

"یہ فیصلہ تو اس سے ملاقات کے بعد ہی کروں گا کہ میں کیا کر سکتا ہوں۔ خیر! میں اس سے شام کو مل لوں گا۔ تم گھبراؤ نہیں۔ آخر میں ہوں نا یہاں لندن میں!"

"میرا ویزا ختم ہونے والا ہے' پیسے بھی ختم ہو رہے ہیں۔"

"اس کی پروا نہ کرو' بہتر ہوگا کہ تم اسی وقت ہوٹل چھوڑ دو' کیوں بلا وجہ یہاں کا کرایہ دیتی ہو۔ میرا گھر موجود ہے۔ میرے ساتھ چلو۔"

اس وقت نوشین کی دماغی حالت ایسی تھی کہ وہ کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں رہی تھی۔ اس نے فوراً جمالی کی بات مان لی۔ اپنا سامان سمیٹا اور ہوٹل کے واجبات ادا کر کے اس کے گھر روانہ ہوگئی۔

گھر پہنچنے کے بعد جمالی نے اسے بٹھاتے ہوئے کہا۔ "گھر تو یہ چھوٹا سا ہے لیکن مجھے امید ہے کہ یہاں تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ آج ہی میں تمہیں ایک ڈاکٹر کے پاس بھی لے چلوں گا۔ آخر معلوم تو ہو کہ آخر تمہارے گلے میں کیا خرابی ہوگئی ہے۔"

نوشین کچھ نہیں بولی۔ اسے قیصر کے الفاظ یاد آنے لگے تھے۔ اس نے کچھ اس قسم کی بات کہی تھی کہ دوسروں کے لئے گڑھا کھودنے والے کبھی کبھی خود بھی اس گڑھے میں گر جاتے ہیں۔

قیصر کی یہ بات سو فیصد درست ثابت ہو چکی تھی۔ اس نے ماہ رخ کو جس گڑھے میں دھکیلا تھا' اس میں خود بھی گر چکی تھی۔

نوشین کو ایک بات اور بھی یاد آئی مگر اس وقت یہ یاد نہیں آسکا کہ وہ بات قیصر نے کہی تھی یا عرفی نے لیکن وہ بات اسے اچھی طرح یاد تھی کہ عجلت پسندی میں انسان کو اچھے بُرے راستے کی تمیز نہیں رہ جاتی اور پھر وہ بھٹکتا ہی رہ جاتا ہے۔

شام کو جمالی اسے ایک ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ ڈاکٹر نے پوری توجہ سے اس کا معائنہ کیا اور پھر اس کے گلے کی خرابی کے بارے میں کچھ ایسی ٹیکنیکل باتیں کیں جو نوشین کی سمجھ میں نہ آسکیں لیکن اسے ڈاکٹر کی اس بات سے کچھ اطمینان بھی ہوا کہ اس کا علاج ممکن ہے جس کے بعد وہ ہرگز یہ محسوس نہیں کرے گی کہ بولتے ہوئے اس کی آواز پھنس رہی ہے۔

شام تک نوشین کو ایسا ہی محسوس ہونے لگا تھا جیسے بولنے میں اس کی آواز حلق میں پھنسنے لگتی تھی۔

ڈاکٹر نے اسے کھانے کی دواؤں کے علاوہ غرارے کرنے کے لئے بھی ایک مکسچر دیا اور کہا کہ اگر وہ ان دواؤں سے کوئی افاقہ محسوس کرے تو ایک ہفتے تک وہ دوائیں جاری رکھنے کے بعد دوبارہ معائنے کے لئے اس کے پاس آئے ورنہ دوسرے ہی دن آئے۔

ڈاکٹر کے پاس سے گھر لوٹتے ہوئے دوائیں خرید لی گئیں جو کافی مہنگی تھیں۔ جمالی نے نوشین کو گھر پر چھوڑا اور عاطف سے ملنے چلا گیا لیکن واپس آنے کے بعد اس نے بتایا کہ ملاقات نہیں ہو سکی۔

"اس کا ایک چمچہ ملا تھا ہوٹل میں" جمالی نے جھنجلائے ہوئے

انداز میں کہا۔ "وہ بتا رہا تھا کہ اب عاطف صاحب بہت مصروف رہیں گے اور پلاڈیم تھیٹر کا شو ہونے کے بعد ہی ان سے ملاقات ہو سکتی ہے۔"

نوشین کچھ نہ بولی۔ وہ بالکل گم صم سی ہو کر رہ گئی تھی۔ گلے کی تکلیف کی وجہ سے وہ اس روز کھانا بھی نہیں کھا سکی تھی اور صرف سوپ پینے پر اکتفا کیا تھا لیکن دوسری صبح جب وہ اٹھی تو اس نے گلے میں کچھ آرام محسوس کیا۔

"اس کا مطلب ہے کہ تمہاری یہ دوائیں جاری رہنا چاہئیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ لندن ہی میں تمہارا علاج زیادہ اچھا اور شاید جلدی ہو سکے گا۔ اخراجات کی تم بالکل پروا نہ کرو۔ تمہارا ویزا میں آج ہی بڑھوا دوں گا۔ ڈاکٹر سے میں نے سرٹیفکیٹ لے لیا ہے کہ اس علاج میں چار پانچ ماہ بھی لگ سکتے ہیں۔ تم اپنا پاسپورٹ اور ٹکٹ مجھے دو۔ میں آج ہی سب بندوبست کروا دوں گا۔ چونکہ یہاں سفارت خانے میں میرے بہت اچھے تعلقات ہیں اس لئے کوئی دشواری نہیں ہوگی۔ بس تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔ وہ لوگ بھی تمہیں دیکھ لیں گے کہ تم واقعی گلے کی بیماری میں مبتلا ہو۔"

نوشین خود کو ایسا محسوس کرنے لگی تھی کہ جیسے مُردہ بدست زندہ! وہ جمالی کے ساتھ گئی۔ جمالی نے جیسا کہا تھا' ویسا ہی ہوا۔ اس نے چھ ماہ کے لئے ویزا بڑھوالیا۔ پھر اس نے نوشین کو اپنے گھر پر چھوڑا اور ٹکٹ کے سلسلے میں ائرلائن کے دفتر گیا۔ واپسی پر اس نے بتایا کہ پچھلا ٹکٹ کینسل کرا کے اس نے کسی اور ائرلائن کا اوپن ٹکٹ خرید لیا ہے' جب نوشین کو جانا ہوگا تو تاریخ کنفرم کرالی جائے گی۔

"تمہارے ہوش و حواس ٹھیک نہیں ہیں نوشین!" اس نے کہا "بہتر ہوگا کہ پاسپورٹ اور ٹکٹ میں خود حفاظت سے کہیں رکھ دوں۔"

نوشین اس پر بھی معترض نہیں ہوئی۔

وتین دن بعد نوشین نے محسوس کیا کہ اس کی آواز خاصی حد تک کھل چکی تھی۔ جمالی نے اس سے کہا۔ "لیکن جب تک علاج مکمل نہ ہو جائے تم گانے کی کوشش بالکل نہ کرنا۔"

"اس علاج پر تمہارا بہت روپیا خرچ ہوگا!" نوشین نے دھیمی آواز میں کہا۔

"تمہارے لئے میں بہت کچھ کر سکتا ہوں نوشین!" جمالی نے اسے محبت پاش نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم نے شاید اب تک میرے دل میں جھانکنے کی بالکل کوشش نہیں کی۔"

نوشین نے نظریں جھکالیں۔ اس نے جمالی کے بارے میں وہی سب کچھ سوچا تھا جو اس نے اس وقت کہہ ڈالا تھا لیکن اب نوشین خود کو ایسی پوزیشن میں نہیں پا رہی تھی کہ جمالی کے سامنے اپنی کچھ شرائط رکھ سکتی۔

ٹکٹ تو اس کے پاس تھا۔ اگر وہ چاہتی تو وطن لوٹ سکتی تھی لیکن علاج کرائے بغیر اس حالت میں واپسی کے خیال سے ہی اس کا دل ڈوبنے لگتا تھا۔

اسی رات جمالی نے اسے بڑے غصے سے بتایا کہ عاطف آج ہی کی کسی فلائٹ سے ناہید سلطان کے ساتھ واپس چلا گیا ہے اور اب اس کے باقی ساتھی دو چار دن بعد جائیں گے۔

نوشین نے اس بات کا بھی کوئی اثر نہیں لیا۔ اس کی دانست میں اب یہ بیکار سی بات تھی کہ جمالی' عاطف سے جھگڑا کرتا۔ اس کے نتیجے میں اگر عاطف ماہ رخ کا معاملہ پولیس تک پہنچا دیتا تو وطن واپسی پر نوشین مشکلات سے دوچار ہو سکتی تھی۔ اس نے جمالی سے بھی کہا کہ وہ اس معاملے کو بھول جائے۔

ایک ہفتے میں نوشین اپنا گلا خاصا بہتر محسوس کرنے لگی۔ واضح آواز میں بات کرتے ہوئے بھی اسے کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوتی تھی لیکن یہ اس کے لئے بڑا تکلیف دہ احساس تھا کہ اس کی آواز کی مٹھاس باقی نہیں رہی تھی۔

"کیا اب اس آواز کے بعد بھی تم مجھے پسند کرتے رہو گے؟" وہ جمالی سے بڑی جذباتی آواز میں بولی۔

"مجھے تم سے محبت ہے نوشین! صرف تم سے!" اس نے نوشین کو اپنی آغوش میں لیتے ہوئے کہا اور پھر اس کے جذبات بھڑکتے چلے گئے۔ ذہنی طور پر نیم مُردہ نوشین اسے روک بھی نہیں سکی اور بعد میں بستر پر پڑی اپنی بدقسمتی پر آنسو بہاتی رہی۔ اس نے اپنے وطن میں تو خود کو پاکباز رکھا تھا مگر یہاں وہ کچھ بھی نہیں کر سکی تھی۔ اس کا وجود تو پہلے ہی اندر سے پاش پاش ہو چکا تھا۔

"رونے کیوں لگیں جانِ من!" جمالی بولا۔

"تم مجھ سے شادی کرلو گے نا؟" نوشین نے بڑی حسرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"کیا اب بھی تمہیں میری محبت پر شبہ ہے؟"

"میں اتنی زور سے گری ہوں جمالی کہ مجھ میں اب اعتماد... بالکل نہیں رہا۔" نوشین کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"چلو تمہیں کسی کلب لے چلتا ہوں۔ دل بہل جائے گا۔"

نوشین کا جی نہیں چاہ رہا تھا لیکن جمالی کے اصرار کو مسترد کرتے ہوئے اسے ڈر لگنے لگا تھا۔ وہ ہرگز نہیں چاہتی تھی کہ جمالی اس سے ناراض ہو جائے۔

وہ ایک نائٹ کلب تھا۔ وہاں جمالی کو اپنا ایک دوست جاوید مل گیا۔ اس نے جاوید سے نوشین کو متعارف کرایا اور بتایا کہ جاوید مستقل طور پر لندن ہی میں رہ رہا ہے اور یہاں اس نے شادی بھی کر لی ہے۔

رات گئے وہ گھر لوٹے۔ اس گھر میں بیڈروم ایک ہی تھا۔ نوشین وہیں سویا کرتی تھی جبکہ جمالی ڈرائنگ روم میں سوتا تھا لیکن اس رات سے وہ بیڈروم ہی میں نوشین کے ساتھ سوتا رہا۔

ایک ہفتے میں نوشین کا گلا کچھ اور بہتر ہوا۔ ڈاکٹر کے یہاں

سے واپسی پر جمالی کسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ نوشین کے استفسار پر اس نے بتایا کہ اس کے ڈیڈی کا فون آیا تھا' انہوں نے فوراً بلایا ہے۔

"مجھے کل کی فلائٹ سے جانا ہوگا۔" اس نے کہا۔ "تم میرے گھر میں رہتی رہو۔ میں جاوید سے کہہ جاؤں گا کہ وہ تمہارا ہر طرح خیال رکھے۔ تمہیں ہرگز کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ وہ تمہیں ڈاکٹر کے پاس بھی لے جاتا رہے گا۔ میں بیس پچیس دن میں لوٹ آؤں گا۔"

نوشین کا دل دھک سے ہوگیا۔ نہ جانے کیوں اسے خیال آیا تھا کہ جمالی اب واپس نہیں آئے گا۔

دوسرے دن اس نے فون کرکے جاوید کو بلایا اور نوشین کے سامنے ہی اس سے کہا۔ "بیس پچیس دن تک تمہیں نوشین کا مکمل خیال رکھنا ہوگا۔ واپسی پر مجھے تمہاری کوئی شکایت نہیں ملنا چاہئے۔"

○☆○

جمالی کے جانے کے بعد جاوید نے ہر طرح سے نوشین کا خیال رکھا' بلکہ پوری طرح سے جمالی کی جگہ لے لی۔ ہفتے میں دو ایک راتیں وہ جمالی ہی کے گھر پر گزارتا تھا۔ اس طرح نوشین ایک زندہ لاش بن کر رہ گئی۔ لاش جو کسی بھی زندہ انسان کی کسی حرکت پر کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کرتی۔

جمالی کو آنا تھا' نہ آیا۔ اب اگر جاوید کی جگہ کوئی اور لے لیتا تو بھی نوشین پروا نہ کرتی۔ اسے اپنے جس کردار پر ناز تھا' اس کی دھجیاں جمالی نے اُڑا دی تھیں۔ اب ان دھجیوں کو جاوید بکھیرتا یا کوئی اور! نوشین اب اس کے بارے میں کیا سوچتی اور کیوں سوچتی۔ پیسے والوں کے بارے میں اس نے جو اندازے لگا رکھے تھے' وہ حقیقت کا روپ دھار کر سامنے آچکے تھے لیکن ان سارے معاملات میں وہ خطاکار خود کو ہی سمجھتی تھی۔ اس نے کبھی ان لوگوں کی باتوں پر دھیان نہیں دیا تھا جو اس کے بہی خواہ تھے۔ اس سے کہا گیا تھا کہ جب انسان عجلت پسندی کا شکار ہوجائے تو وہ صحیح اور غلط راستوں کا امتیاز کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ اس کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ اگر وہ عاطف کے بارے میں چھان پھٹک کرلیتی تو ماہ رخ سے اس کا تعلق سامنے ضرور آتا اور وہ چوکنا ہوجاتی لیکن وہ تو فوراً ہی اس نشے میں سرشار ہوگئی تھی کہ خوش قسمتی نے خود اس کا دروازہ کھٹکھٹایا تھا۔ وہ سوچے سمجھے اور پرکھے بغیر عاطف پر اعتماد کر بیٹھی تھی جس کا خمیازہ اسے بھگتنا پڑ رہا تھا۔

علاج سے اس کے گلے کی حالت بہت دھیرے دھیرے ٹھیک ہو رہی تھی اور اس نے سوچا تھا کہ جو کچھ اس کے ساتھ بیتنا تھا' وہ بیت ہی چکا تھا' اب وہ لندن سے علاج کرکے ہی وطن لوٹتی تو بہتر تھا۔

دو ڈھائی ماہ ہی میں جاوید بھی اس سے اکتا گیا۔ اس نے نوشین کو اپنے ایک اور دوست اشرف کے حوالے کردیا۔ اس طرح نوشین ایک کٹی پتنگ کی طرح تیسرے ہاتھ میں پہنچ گئی۔

آخر وہ دن آیا جب ڈاکٹر نے اسے یہ خوش خبری سُنائی کہ اب وہ بالکل ٹھیک ہوچکی ہے۔ اس نے خود بھی محسوس کیا تھا کہ شروع میں اس نے اپنی آواز کی مٹھاس میں جو کمی محسوس کی تھی' اس کا بھی بڑی حد تک ازالہ ہوچکا تھا لیکن اس وقت اس کا دل بیٹھ گیا جب ڈاکٹر نے اس سے کہا۔

"مگر اب آپ مستقل طور پر گا نہیں سکتیں۔ کسی وقت کوئی ہلکا پُھلکا گیت گانے میں کوئی حرج نہیں ہے لیکن اگر آپ نے اسے اپنا پیشہ بنانا چاہا تو آپ کے گلے میں یہ تکلیف پھر پیدا ہوجائے گی اور کچھ مزید پیچیدگیاں بھی پیدا ہوسکتی ہیں۔"

نوشین جب گھر لوٹی تو ایک بار پھر بہت دیر تک پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی۔

اب اس کا ویزا ختم ہونے میں پندرہ دن رہ گئے تھے' لیکن اب وہ اس شہر میں ایک دن بھی نہیں رہنا چاہتی تھی جہاں آکر اس نے اپنی زندگی برباد کرلی تھی۔

دوسرے دن وہ خود ہی ائرلائن کے دفتر گئی۔ ایک ہفتے بعد کی ایک فلائٹ کے لئے اس کی سیٹ "اوکے" ہوگئی۔

ایک ہفتے بعد اس نے اشرف کو کچھ بتائے بغیر لندن کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ دیا۔

لندن تک آنے کے سفر میں اور یہاں سے رخصت کے سفر میں بڑا فرق تھا۔ جب وہ لندن کی طرف پرواز کررہی تھی تو اس کی جاگتی آنکھوں میں سپنوں کی ایک قطار تھی لیکن وہاں سے واپسی کے سفر میں اس کی آنکھیں مایوسیوں کی کہر میں دھندلائی ہوئی تھیں۔

اپنے وطن کا رخ کرتے ہوئے اس کی آخری امید اب صرف عرفی سے وابستہ تھی لیکن یہ فیصلہ کرنا اس کے لئے مشکل ہو رہا تھا کہ جو کچھ لندن میں اس پر گزری تھی' وہ سب کچھ اسے عرفی کو بتانا چاہئے یا نہیں!

بہت سوچ سمجھ کر اس نے فیصلہ کیا کہ اسے عرفی سے کوئی بات نہیں چھپانا چاہئے۔ خود عرفی نے بھی تو اسے اپنے بارے میں بتادیا تھا کہ وہ کسی گناہ کا بوجھ تھا جسے کوڑے کے ایک ڈھیر پر پھینک دیا گیا تھا۔

جب طیارے نے لینڈ کیا تو اس کی آنکھیں سُرخ ہو رہی تھیں۔ اس سفر میں وہ ایک منٹ کے لئے بھی نہیں سوئی تھی۔

ائرپورٹ سے باہر آکر جب اس نے اپنا شہر دیکھا تو بیتے ہوئے دنوں کی جانے کیا کیا باتیں اسے یاد آئیں اور اس کی آنکھیں آنسوؤں سے دھندلانے لگیں۔

فوری طور پر اس کا اب وہاں کوئی ٹھکانا بھی نہیں تھا اس لئے وہ سیدھی اپنے ہوٹل ہی پہنچی۔

"ارے!" منیجر اسے دیکھ کر چونکا۔ "تم اب آئی ہو؟"

سیاہ، لانبے، گھنے اور چمکیلے بال جاذبِ نظر بنا دیتے ہیں!



NEW AND IMPROVED FORMULA
WAVINOL
NATURAL HAIR FOOD

قدرت نے عطا کیا
اکسیری نے پیش کیا

ویوینول

بالوں کو گرنے اور سفید ہونے سے روکنے کی دوا

ویوینول بالوں کو لانبا، گھنا اور چمکیلا ہی نہیں بناتا بلکہ بالوں کی دوسری بیماریوں مثلاً بالوں کا وقت سے پہلے سفید ہونا۔ کمزور ہو کر گرنا، بالوں میں خشکی کی وجہ سے خارش رہنا۔ بالوں کی چمک ختم ہو جانا۔ دماغی کمزوری بھول، سر چکرانا اور سر کا درد جیسی شکایتوں کو ختم کر کے آپکی عمر دس سال کم ظاہر کرتا ہے۔ ویوینول بالوں کا قدرتی اور سائنٹفک علاج ہے۔

خواجہ میڈیکل اسٹور بالمقابل ایمپریس مارکیٹ صدر کراچی
دارالشفاء ٹریڈرز موتی مسجد روڈ نیو بالی کراچی
شافی دواخانہ سیلمانی دواخانہ۔ شاہی بازار حیدر آباد
رؤف ٹریڈنگ کمپنی ایڈوانی مین۔ حیدر آباد
دہلی دواخانہ مارکیٹ روڈ۔ سکھر
نونہال دواخانہ ریلوے روڈ ٹنڈو آدم
مرکزی میڈیکل اسٹور آرچر روڈ۔ کوئٹہ
یوپی پنسار اسٹور ہری کشن چند روڈ۔ کوئٹہ
وقاص میڈیسن کمپنی میاں میڈیسن مارکیٹ چوک انارکلی۔ لاہور
طاہر دواخانہ محمد علی ایمن میڈیسن مارکیٹ چوک اردو بازار لاہور
ایچ بشیر اینڈ سنز المنیہ مارکیٹ بیرون لوہاری گیٹ لاہور
خان برادرز میڈیکل اسٹور آسٹریلیا بلڈنگ ریلوے اسٹیشن۔ لاہور
کوثر دواخانہ کارخانہ بازار فیصل آباد
شاہی طبی دواخانہ چینوٹ بازار فیصل آباد
سعید دواخانہ ۱۸۔ صدر روڈ۔ پشاور صدر
حکیم صوفی نور احمد چوک اہلحدیث۔ جہلم
لال چند نرائن داس پنسار اسٹور کراچی روڈ خضدار

قدیم چنیوٹی دواخانہ مشہور چنیوٹی دواخانہ کچہری بازار۔ سرگودھا
گلزار دواخانہ قدیمی دواخانہ حسین آگاہی ملتان
نیو صدیقیہ دواخانہ نیو دارالادویہ چوک گھنٹہ گھر ملتان
مشتاق دواخانہ پاک گیٹ۔ ملتان
ابن سینا اسٹور گھنٹہ گھر بازار۔ ڈیرہ غازی خان
کاشف ٹریڈرز مسلم بازار ڈیرہ اسمٰعیل خان
شاداب دواخانہ گنجوی دواخانہ شاہی بازار بہاولپور
ریاض کریانہ اسٹور عارف براعظم۔ مین بازار بہاولپور
رحمانیہ دواخانہ بیرون سوڈی گلی۔ ساہیوال
چوہدری ڈرگ ہاؤس رؤف مارکیٹ اوکاڑہ
رحمانی دواخانہ گندم منڈی۔ قصور
الحبیب دواخانہ مرکز ادویات بوہڑ بازار راولپنڈی
عدنان دواخانہ اقبال روڈ۔ راولپنڈی
مشہور دواخانہ صدر بازار، راولپنڈی صدر
عصمت میڈیسن کمپنی خیبر بازار۔ پشاور
دیسی دواخانہ مین بازار۔ کھاریاں
حاذق دواخانہ قریشی دواخانہ۔ منڈی بازار لالہ موسیٰ

طاہر برادرز سرکلر روڈ۔ گجرات
نثار میڈیکل ریلوے روڈ۔ سیالکوٹ
صوفی دواخانہ چوک دروازہ اقبال روڈ۔ سیالکوٹ
سیال دواخانہ مراتب بازار کچہری روڈ ڈسکہ
صدیقی دواخانہ شہید میڈیکل ہوم گھنٹہ بازار گوجرانوالہ
نیو ہمدم دواخانہ اردو بازار۔ گوجرانوالہ
فاروق میڈیسن کمپنی سرگودھا روڈ شیخوپورہ
اخلاقی دواخانہ مین بازار۔ شیخوپورہ
جیفری دواخانہ ریل بازار۔ جھنگ
کرم دواخانہ ریل بازار۔ عارف والا
عثمانی دواخانہ عارف بازار۔ بورے والا
دواخانہ دارالشفاء کچہری بازار۔ خانیوال
حافظ دواخانہ مین بازار۔ میاں چنوں
مشہور دواخانہ ریل بازار۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ
رشید اینڈ سنز عیدگاہ روڈ۔ بہاولنگر
قادری دواخانہ ریلوے روڈ پاکپتن شریف
رحمٰن دواخانہ نیو صادق بازار۔ رحیم یار خان

اچھا دواخانہ ریل بازار۔ صادق آباد
الیاس پنسار اسٹور ظفر روڈ۔ مانسہرہ
تنویر دواخانہ خالد دواخانہ مسجد بازار ایبٹ آباد
نیو سلطانی دواخانہ قریشی دواخانہ نیو دواخانہ
عظیم دواخانہ منڈی بازار۔ جھال پور اٹک
خالد میڈیسن کمپنی ہسپتال روڈ چونیاں
جمیل دواخانہ کچہری بازار، سمندری
دواخانہ رفاہ عامہ ریلوے روڈ خانپور
شکوریہ میڈیکل اسٹور اتحاد چوک لیاقت پور
رؤف پنسار۔ مین بازار پسرور
اکرم دواخانہ بازار بانس والا گوجرہ
خواجہ دواخانہ انارکلی بازار ہسپتال روڈ چکوال
اسلامی دواخانہ ٹوبہ ٹیک سنگھ
دارالشفاء مینا بازار۔ منگورہ سوات
عوامی دواخانہ اینڈ پنسار اسٹور مین بازار میانوالی
محمد نواب محمد صالحین موتی والے چوک بازار ملتان
اپنا دواخانہ عقب ریل بازار صادق آباد

کاروباری خط و کتابت کے لئے ڈسٹری بیوٹر برائے پنجاب، سرحد و آزاد کشمیر:

وقاص میڈیسن کمپنی فرسٹ فلور۔ میاں میڈیسن مارکیٹ۔ چوک انارکلی۔ لوہاری گیٹ۔ لاہور فون: 230710

marksman

"ہاں، مجھے کچھ دیر ہو گئی۔" نوشین نے آہستہ سے کہا۔
"کوئی ایسی ویسی دیر!" مینجر نے کہا۔ "گزشتہ ماہ تک فلموں کے دو موسیقار یہاں کے چکر لگاتے رہے۔ وہ دونوں ہی اپنی اپنی فلموں میں تمہیں موقع دینا چاہتے تھے لیکن اب ایک ماہ سے ان کے نہ آنے کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ انہوں نے کسی اور کو سائن کر لیا ہو گا۔"
فوراً ہی نوشین کے ذہن میں عرفی کا جملہ گونجا کہ پتھر اپنی جگہ پر ہی بھاری ہوتا ہے، لیکن اس نے اپنی جگہ چھوڑ دی تھی۔
"آپ کے ہوٹل میں اب میرے لئے کوئی گنجائش ہے یا نہیں؟" نوشین نے یہ بات صرف اس لئے کہی کہ اسے دو ایک دن تک سر چھپانے کے لئے ہوٹل کے کسی کمرے کی چھت میسر آجائے۔ گانا تو اب وہ گا ہی نہیں سکتی تھی۔ اس نے ایک مرتبہ گنگنا کر بھی دیکھ لیا تھا کہ اس کی آواز میں اب پہلے جیسی بات نہیں رہی تھی اور ڈاکٹر کا یہ کہنا بھی غلط نہیں ہو سکتا کہ اگر اس نے گلوکاری کو اپنا مستقل پیشہ بنانا چاہا تو پھر گلے کی تکلیف میں مبتلا ہو سکتی ہے۔
مینجر نے کہا۔ "ایک بڑی فنکارہ کی خدمات تو حاصل کر لی گئی ہیں لیکن وہ ہفتے میں صرف تین دن دیتی ہے۔ باقی چار دنوں کے لئے ایک اور لڑکی آرہی ہے لیکن وہ تم سے بہتر نہیں۔ تمہیں اس کی جگہ لیا جا سکتا ہے مگر فیصلہ تو اسلم صاحب ہی کریں گے۔" اس نے ہوٹل کے مالک کا نام لیا۔
"تو پھر میرا سوٹ کیس کسی کمرے میں رکھوا دیجئے۔ میں چند دن میں کوئی اور بندوبست کر لوں گی۔"
"ہاں ہاں، یہ تو ابھی ہو جائے گا لیکن بات کیا ہے نوشین! تم کچھ بجھی بجھی سی نظر آرہی ہو۔"
"ایسی تو کوئی بات نہیں۔ بس لمبے سفر کی وجہ سے تکان ہے۔"
"اور ہاں!" مینجر کو جیسے کچھ یاد آیا۔ "اب مجھے اس بات کا بہت افسوس ہو رہا ہے کہ تم نے قیصر صاحب سے طلاق لے لی تھی۔"
"کیوں!" نوشین نے آہستہ سے پوچھا۔
"ان چند مہینوں میں تو قیصر صاحب کی کایا ہی پلٹ گئی ہے۔ بینک میں وہ صرف تین ماہ کے لئے مینجر بنے تھے لیکن پھر ان کی قسمت نے کیا عجب پلٹا کھایا کہ وہ اتنی جلدی وائس پریذیڈنٹ ہو گئے۔ بینک کی طرف سے انہیں ایک بنگلا اور کار بھی مل چکی ہے۔ اس کے علاوہ اتنے کم عرصے میں ان کی تصاویر کی دو نمائش ہو چکی ہیں اور ان کی ہر تصویر اتنی گراں فروخت ہوئی ہے کہ سابقہ تمام ریکارڈ ٹوٹ گئے ہیں۔ آج کے ہی اخبار میں ان پر ایک رنگا رنگ فیچر بھی شائع ہوا ہے۔ دیکھو!" مینجر نے میز پر پڑے ہوئے اخبار میں سے دو ورق نکال کر اس کے سامنے ڈال دیئے۔
دو رنگین صفحات تھے۔ اوپر ہی قیصر کی ایک خوبصورت تصویر چھپی تھی۔ سُرخی یہ تھی کہ، 'وہ فنکار جو اندھیرے سے اچانک روشنی میں آیا اور پھر چاندنی ہی چاندنی اس کے وجود میں اُترتی چلی گئی۔'
اس سُرخی کے بعد نوشین کی نظریں تصویروں پر بھٹکنے لگیں۔ خصوصاً ایک تصویر نے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لی۔ اس تصویر میں قیصر ایک خوبصورت لڑکی کے ساتھ کھڑا ہوا تھا اور تصویر کے نیچے لکھا تھا۔ "قیصر اپنی رفیقۂ حیات کے ساتھ اپنے بنگلے کے لان میں!"
اس وقت نوشین کے دل کی عجیب حالت ہوئی اور ایک بار پھر قیصر کی بات اس کے دماغ میں گونجی۔ "اگر میری لگن سچی ہے تو یہ ضرور رنگ لائے گی، دیر سویر کی بات قدرت کے ہاتھ میں ہے۔"
"تو قیصر نے دوسری شادی کر لی؟" نوشین نے مینجر کی طرف دیکھے بغیر آہستہ سے کہا۔
"ہاں، ابھی ایک مہینے پہلے ہی کی ہے۔"
"واقعی پتھر اپنی جگہ پر بھاری ہوتا ہے۔" نوشین بڑبڑائی۔
"جی؟"
"کچھ نہیں" نوشین ٹال گئی اور پھر بولی۔ "میرے لئے کمرے کا بندوبست کر دیجئے! میں بہت تھکی ہوئی ہوں۔"

○☆○

نوشین کا دل چاہ رہا تھا کہ اسی وقت عرفی سے ملنے جائے۔ لیکن اب نیند نے اسے بے قابو کر رکھا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ شام کو عرفی کے ہوٹل ہی جائے گی اور اس کا شو دیکھنے کے بعد اس کے ساتھ اس کے گھر جا کر اسے اپنی بربادی کی کہانی سُنائے گی۔ اس کے بعد عرفی کا ردِ عمل جو کچھ بھی ہو۔ اس نے خود کو ذہنی طور پر ہر بات کے لئے تیار کر لیا تھا۔
شام کو تیار ہو کر وہ ہوٹل سے نکلی۔ اپنی کار وہ ہوٹل ہی کی پارکنگ شیڈ میں کھڑی کر گئی تھی۔ اس نے آدھے گھنٹے قبل فون پر متعلقہ شخص کو ہدایت بھی کر دی تھی کہ وہ اس کی کار کی صفائی کروا دے چنانچہ جب وہ وہاں پہنچی تو کار کی صفائی تو ہو چکی تھی لیکن اس کے دو وہیل غائب تھے۔ اسے بتایا گیا کھڑے کھڑے دو ٹائروں کی ہوا بالکل نکل گئی تھی یا وہ پنکچر ہو گئے تھے۔ اس لئے ہوٹل کا آدمی دونوں پہیے لے کر پنکچر لگوانے گیا ہوا تھا۔
نوشین کا منہ بن گیا اور اس نے انتظار کرنے کے بجائے ہوٹل کے احاطے سے نکل کر ٹیکسی کر لی۔ جب ٹیکسی چارلی ہوٹل کی طرف جا رہی تھی تو نوشین کو خیال آیا کہ کار خریدنے کے بعد وہ ٹیکسی میں بیٹھنا اپنی ہتک سمجھنے لگی تھی لیکن اس وقت ٹیکسی کرتے ہوئے اسے ایسا کوئی احساس نہیں ہوا تھا۔ چھ ماہ میں وہ اتنی بُری طرح ٹوٹ پھوٹ چکی تھی کہ اس کے سارے خواب منتشر ہو گئے تھے۔ اب اسے ٹیکسی اور کار میں کوئی فرق نہیں محسوس ہو رہا تھا، اس کی شخصیت بدل چکی تھی۔ ایک خوابِ گراں دیکھتے دیکھتے اس

کی آنکھیں اچانک کھل چکی تھیں۔
جب وہ چارلی ہوٹل پہنچی تو اندھیرا ہو چکا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ عرفی اپنا پروگرام شروع کر چکا ہوگا لیکن وہاں ایسے کوئی آثار نظر نہیں آئے۔ اسٹیج کا پردہ گرا ہوا تھا۔ نوشین کو خیال آیا کہ شاید اب وقت تبدیل کر دیا گیا ہو۔ اس نے کھانا منگوا لیا۔ اس نے وطن واپس پہنچنے کے بعد اب تک کچھ نہیں کھایا تھا۔
وہ کھانے کے بعد عموماً کافی پیا کرتی تھی لیکن صرف سردیوں میں' اب گرمیاں شروع ہو چکی تھیں۔ اس نے چائے منگوائی۔ شو اب تک شروع نہیں ہوا تھا۔ اس نے چائے لانے والے ویٹر سے پوچھا۔ "عرفی صاحب کہاں ہیں؟ ان کا پروگرام ابھی تک شروع نہیں ہوا؟"
"وہ اپنے کیبن میں ہوں گے۔" ویٹر نے جواب دیا۔ "پروگرام اب وہ ہفتے میں صرف ایک بار کریں گے۔"
"ان کا کیبن کہاں ہے؟" نوشین نے تعجب سے پوچھا۔
"وہ ہے۔" ویٹر نے اس کیبن کی طرف اشارہ کر دیا جس کے دروازے کے شیشے پر "چارلیز روم" لکھا ہوا تھا۔
نوشین الجھن میں پڑ گئی۔ چارلی کے کیبن کو ویٹر نے عرفی کا کیبن کیوں کہا تھا؟ وہ جلدی جلدی چائے پی کر اٹھی اور کیبن کی طرف بڑھی۔ وہ ذہنی طور پر کچھ ایسی کیفیت میں آگئی تھی کہ اس نے کیبن میں داخل ہونے سے پہلے دستک بھی نہیں دی۔
کیبن میں ایک خوبصورت میز کے پیچھے عرفی بیٹھا ہوا تھا۔ کریم کلر کے بش کوٹ سوٹ میں اس کی شخصیت نکھری نکھری سی لگ رہی تھی۔ اس نے کیبن کا دروازہ کھلنے کی آواز سنتے ہی سر اٹھا کر دیکھا تھا اور پھر نوشین کو دیکھتے ہی کھڑا ہو گیا تھا۔
"تم یہاں بیٹھے ہو؟" نوشین نے بے اختیار پوچھا۔
"تم لندن سے کب آئیں؟" عرفی بھی جواب دینے کے بجائے سوال کر بیٹھا تھا۔
"میں آج ہی آئی ہوں۔" نوشین نے میز کے قریب پہنچ کر کہا۔ "جی تو چاہا تھا کہ فوراً تمہارے گھر جاؤں لیکن......"
"چلو اچھا ہوا تم وہاں نہیں گئیں۔" عرفی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "بیٹھو بیٹھو! تم کیا پیو گی؟ کچھ منگواؤں۔"
"مجھے تو ہال میں بیٹھے آدھے گھنٹے سے زیادہ ہو گیا تھا۔ پھر ایک ویٹر سے معلوم ہوا کہ تم یہاں ہو!"
"اور سناؤ! لندن میں تمہارا پروگرام کیسا رہا؟"
یہ سوال نہیں تھا' ایک ضرب تھی جو نوشین کے دل پر لگی اور اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔
"ارے! ارے! کیا بات ہے نوشین!" عرفی بے چین ہو گیا۔
اب تو نوشین نے سر میز پر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کے رونا شروع کر دیا۔ عرفی کی گھبراہٹ اور پریشانی بڑھ گئی۔ وہ جلدی سے نوشین کے قریب آیا اور اس کے شانے تھپکتے ہوئے بولا۔ "جو کچھ بھی ہوا ہے' بتاؤ تو سہی! پلیز نوشین!"
"میرے ساتھ.... بہت بڑا دھوکا ہوا ہے عرفی!...... میں کہیں کی نہیں رہی۔" نوشین نے روتے ہوئے کہا۔
"پلیز' خود کو سنبھالو اور بتاؤ کہ ہوا کیا ہے؟ کس نے دھوکا دے دیا تم کو؟"
نوشین نے خود کو سنبھالا۔ رومال سے اپنا چہرہ خشک کیا۔ عرفی نے کیبن میں رکھے ہوئے چھوٹے سے فریج سے پانی نکال کر اسے دیا۔
پانی پینے کے بعد اس نے کہا۔ "عاطف نے مجھے دھوکا دیا۔ میرے بجائے اس نے ناہید سلطان کا پروگرام کیا۔"
"پھر اس نے تم پر اتنا روپیا کیوں خرچ کیا؟" عرفی حیرت سے بولا۔
نوشین کا منہ کھلا اور پھر بند ہو گیا۔ اس کی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ سب کچھ سچ سچ بتا دے حالانکہ اس نے فیصلہ یہی کیا تھا۔ آخر اس نے نظریں جھکا کر بولنا شروع کیا اور سب کچھ سچ سچ بیان کر ڈالا۔
ذرا دیر کے لئے کیبن میں سکوت طاری رہا۔ عرفی گم صم سا بیٹھا اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔
کچھ دیر بعد نوشین نے نظریں اٹھائیں اور پھر پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ "ایک بار تم نے مجھ سے کہا تھا کہ تم میری دوستی کے قابل نہیں ہو۔ اب غالباً مجھے کہنا چاہئے کہ میں تمہاری دوستی کے لائق نہیں رہی۔"
"پلیز' ایسی باتیں مت کرو۔" عرفی نے پہلو بدل کر کہا۔ "جس طرح تم نے مجھے بے قصور سمجھا تھا' اسی طرح میں بھی تمہیں بے قصور سمجھتا ہوں۔ کاش تم نے صورتِ حال بگڑتے ہی لندن سے مجھے فون کر دیا ہوتا تو عین ممکن ہے کہ یہ سب کچھ نہ ہوتا لیکن تم نے ہوٹل والوں تک سے رابطہ نہ رکھا تھا۔ جب تم ڈیڑھ ماہ بعد بھی نہیں لوٹی تھیں تو میں نے تمہارے ہوٹل فون کیا تھا۔ دو دو'

چار چار' دن کے وقفے سے فون کرتا ہی رہا لیکن یہی معلوم ہوا کہ ان لوگوں سے بھی تم نے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔"

"ہاں!" نوشین نے سوچتے ہوئے کہا۔ "اب تمہارے کہنے سے مجھے خیال آرہا ہے کہ مجھے تم سے رابطہ کرنا چاہئے تھا لیکن اچانک اس صورتِ حال سے دوچار ہونے کے بعد شاید مجھ میں کچھ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہی تھی۔ شاید مجھے یہ خجالت بھی ہو کہ میں فون پر کیا بتاؤں گی یہاں سے تو میں اپنی آنکھوں میں بڑے بڑے خواب سجا کر گئی تھی۔ وہاں سے فون پر کیسے بتاتی کہ وہ خواب خون کے آنسو بن کر میری آنکھوں سے بہہ چکے ہیں۔"

"خیر!" عرفی نے ٹھنڈی سانس لی۔ "جو ہونا تھا' وہ تو ہو گیا۔ اب تو یہ سوچنا چاہئے کہ مستقبل کا کیا لائحۂ عمل ہو۔"

"میں بڑی خود غرض ہوں کہ اپنی کتھا سنانے تو بیٹھ گئی لیکن تم سے تمہارے بارے میں کچھ نہیں پوچھا۔ اس دوران میں تو تم پر کوئی حملہ نہیں ہوا؟"

"نہیں۔" عرفی نے کہا۔ "اور ڈی آئی جی صاحب کہہ رہے تھے کہ اب شاید کوئی حملہ ہوگا بھی نہیں۔"

"ڈی آئی جی صاحب!" نوشین چونکی۔

"ہاں۔" عرفی نے کہا۔ "ان کا کہنا ہے کہ میری وجہ سے جو جرائم پیشہ افراد گرفتار ہوئے تھے' وہ مجھ پر قاتلانہ حملے کے جرم میں بھی سزائیں بھگت رہے ہیں' کچھ یہ ملک چھوڑ کر فرار ہو گئے ہیں اور جو بچے ہوئے ہیں' انہیں عقل آگئی ہے کہ مجھ پر حملہ کر کے انہیں کچھ حاصل نہیں ہوگا' الٹا نقصان ہی ہوگا' جس طرح دوسروں کو ہوتا رہا۔"

نوشین حیرت سے اس کی طرف دیکھتی رہی اور بولی۔ "تمہاری باتیں میری سمجھ میں بالکل نہیں آرہی ہیں!"

"یہ جان کر تم سب کچھ سمجھ جاؤ گی کہ میں پولیس کے لئے انفارمر کی حیثیت سے کام کیا کرتا تھا۔" عرفی نے کہا۔ "شاید تمہیں علم نہ ہو کہ ابتدا میں تو چارلی ہوٹل جرائم پیشہ افراد کا گڑھ بن گیا تھا۔ چارلی صاحب اس کی وجہ سے بہت پریشان تھے۔ میں اس زمانے میں گولوں کا کرتب دکھانا شروع کر چکا تھا۔ پولیس کے کچھ بڑے افسران نے مجھ سے اور چارلی صاحب سے بات کی اور کہا کہ اگر ان سے تعاون کریں تو انہیں اس گندگی سے چھٹکارا مل سکتا ہے۔ میں اس کام کے لئے فوراً تیار ہو گیا۔ دراصل میری سوچ اور میرا جذبہ یہ تھا کہ زندگی میں کوئی اچھا کام کر جاؤں۔ میں نے جو کچھ کیا' اس کے عوض پولیس سے کوئی انعام تک نہیں لیا۔"

"مگر تم کرتے کیا تھے؟"

"مجھے کوئی خاص محنت نہیں کرنا پڑتی تھی۔ شاید تم جانتی ہو کہ جب جرائم پیشہ افراد کسی جگہ جمع ہوتے ہیں' خواہ وہ کوئی ہوٹل ہی کیوں نہ ہو تو اپنے جرائم کی منصوبہ بندیوں پر گفتگو شروع کر دیتے ہیں۔ چارلی ہوٹل میں بھی یہی ہوا کرتا تھا۔ میری وجہ سے ان کی منصوبہ بندیاں پولیس تک پہنچ جاتی تھیں۔"

"جرائم پیشہ افراد کیا اس قسم کی باتیں زور زور سے کرتے تھے؟"

"نہیں' زور زور سے تو نہیں کرتے لیکن حساس قسم کے ٹرانسمیٹر دھیمی آواز بھی کیچ کر لیتے ہیں۔" عرفی نے کہا۔ "ان دنوں میں نے جن گولوں سے کرتب دکھانا شروع کئے تھے' وہ گولے مجھے پولیس نے مہیا کئے تھے۔ ان گولوں کے اندر دو قسم کے آلات چھپے ہوئے تھے۔ ایک تو ٹرانسمیٹر اور ایک ایسا ریسیور جو صرف تپش ریسیو کرتا تھا۔ گولوں کی جس سمت میں ٹرانسمیٹر پوشیدہ تھے' اس طرف گولوں میں باریک باریک سوراخ بھی تھے۔ ان سوراخوں سے ٹرانسمیٹر ان جرائم پیشہ افراد کی آوازیں کیچ کر کے اس ریسیونگ سیٹ تک پہنچاتا تھا جو ہوٹل کے باہر ایک پولیس کار میں ہوتا تھا۔

میں چونکہ ہال میں گردش کرتا رہتا تھا اس لئے جب کچھ کام کی آوازیں ریسیونگ سیٹ تک پہنچتی تھیں تو وہاں سے ایک آلے کی مدد سے برقی رو چھوڑی جاتی تھی۔ گولے میں لگا ہوا ریسیور اس برقی رو کی وجہ سے گرم ہوتا تھا اور گولوں میں ہلکی سے تپش پیدا ہو جاتی تھی۔ اس طرح کسی میز پر کی جانے والی کسی منصوبہ بندی کی ساری تفصیل پولیس تک پہنچ جاتی تھی۔ پھر یہ کہ ان لوگوں کا نہ صرف منصوبہ ناکام ہوتا تھا بلکہ وہ گرفتار بھی کر لئے جاتے تھے۔ دھیرے دھیرے ان لوگوں میں یہ شبہات پیدا ہونے لگے کہ ان کی مخبری کرنے والا میں ہی ہو سکتا ہوں۔ یہ تو کبھی کسی کی سمجھ میں نہیں آیا ہوگا کہ میں ان کی مخبری کس طرح کر سکتا ہوں مگر انہوں نے مجھے ختم کر دینے کی کوششیں شروع کر دیں لیکن پولیس کے جوان میری حفاظت پر مامور تھے۔"

"تمہیں تو گولیاں بھی لگی تھیں!"

"ہاں" عرفی نے کہا۔ "اور میں صرف اداکاری کرتا تھا کہ مجھے گولی لگ گئی ہے۔ دراصل میرے لباس کے نیچے بلٹ پروف جیکٹ ہمیشہ رہتی تھی لیکن زخمی ہونے کا ڈراما کرنے کے لئے مجھے کچھ دن اسپتال میں گزارنا پڑتے تھے۔"

"یہ سب اگر اسی وقت مجھے معلوم ہو جاتا تو میرے لئے کیا خطرات پیدا ہو جاتے!" نوشین نے شکایتی انداز میں کہا۔

"میرے دشمن کسی طرح تمہیں گھیر سکتے تھے۔ میری تمہاری دوستی کی وجہ سے وہ تمہیں کسی طرح مجبور کرتے کہ تم مجھے زہر دے دو کیونکہ گولیاں برسا کر تو وہ مجھے ختم نہیں کر سکے تھے۔"

"اور میں تمہیں زہر دے دیتی؟"

"نہیں دیتیں!..... اور اسی وجہ سے وہ لوگ تمہارے دشمن بھی ہو جاتے۔"

نوشین سر جھکا کر کچھ سوچنے لگی' پھر بولی۔ "جب میں لندن جا رہی تھی تو تم نے کہا تھا کہ جب میں واپس آؤں گی تو تم مجھے کوئی

بات بتاؤ گے۔ کیا وہ یہی بات تھی؟"
"نہیں' اس وقت تک تو مجھے یہ اندازہ ہی نہیں تھا کہ پولیس سے مجھے کلیرنس مل جائے گی۔"
"پھر وہ کیا بات تھی؟"
عرفی نے ٹھنڈی سانس لے کر نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔ "تم نے جب مجھ سے قریب ہونے کی کوشش کی تھی تو پولیس والے چوکنا ہو گئے تھے۔ انہوں نے مجھے بھی ہدایت کی تھی کہ میں تمہاری طرف سے ہوشیار رہوں لیکن کچھ دن بعد انہوں نے مجھے بتا دیا کہ تم سے مجھے کوئی خطرہ پیش نہیں آسکتا۔"
"پولیس نے میرے بارے میں سب کچھ معلوم کر لیا تھا؟"
"ہاں۔"
"اور تمہیں بھی بتا دیا تھا؟"
"ہاں۔"
"گویا تمہیں......"
"ہاں نوشین!" عرفی نے کہا۔ "مجھے تمہاری اور قیصر صاحب کی طلاق کے بارے میں بھی بتا دیا گیا تھا۔ اس کے بعد سے ہی میں نے تمہارے متعلق زیادہ سوچنا شروع کیا تھا۔ میں جو کبھی کسی سے دوستی کے بارے میں بھی نہیں سوچنا چاہتا تھا' تمہارے بارے میں کچھ زیادہ ہی سوچنے لگا اور جب میں تم سے کچھ کہنے والا تھا تو تم لندن چلی گئیں۔"

نوشین کے دل کی دھڑکنیں کچھ تیز ہو گئیں۔
عرفی کہتا رہا۔ "اب سے دو ماہ قبل چارلی صاحب شدید بیمار پڑ گئے تھے۔ اب بھی وہ اسپتال ہی میں ہیں' انہیں یقین نہیں رہا کہ اب وہ زندہ بچ سکیں گے۔ پندرہ دن قبل انہوں نے اپنا سب کچھ مجھے سونپ دیا ہے۔ حتیٰ کہ اپنی بیٹی صوفیہ بھی۔"
نوشین کو یکایک یوں لگا جیسے اس کے دماغ میں چھن سے کوئی چیز ٹوٹ گئی ہو۔
"ہاں نوشین!" عرفی نے نظریں جھکا کر کہا۔ "پندرہ دن قبل صوفیہ سے میری شادی ہو چکی ہے۔ میں تم سے کہا کرتا تھا کہ میں چارلی صاحب کی کوئی بات نہیں ٹال سکتا۔ یہ بات ٹالنے کے لئے میرے پاس شاید کوئی جواز ہوتا اگر تم لندن نہ گئی ہوتیں یا بروقت لندن سے واپس آجاتیں۔"
"گویا ان ساڑھے چھ مہینوں میں یہاں سب کچھ بدل چکا ہے۔" نوشین ہنس پڑی۔ اس کا انداز بالکل پاگلوں جیسا تھا۔
عرفی نے غور سے اس کی طرف دیکھا' پھر بولا۔ "ساڑھے چھ مہینے تو بہت ہوتے ہیں نوشین! ساڑھے چھ گھنٹے میں بھی بہت کچھ بدل جاتا ہے۔"
نوشین کے دل کا درد اُمنڈ کر اس کی آنکھوں تک آجانا چاہتا تھا لیکن اس نے خود پر قابو رکھا اور مسکراتے ہوئے بولی۔ "صوفیہ کیسی ہے؟"
"اچھی ہے" عرفی نے سادگی سے جواب دیا۔ "آج کل اس کا بیشتر وقت اسپتال میں گزرتا ہے۔"
"میں یہ پوچھنا چاہتی تھی کہ صوفیہ تمہارے لئے ایک اچھی ہی بیوی ثابت ہو گی اور تم اس کے ساتھ خوش ہو گے!"
"ایک اچھی بیوی میں جو خوبیاں ہونا چاہئیں وہ یقیناً صوفیہ میں ہیں لیکن تمہاری بات پر میں' اس سے زیادہ کوئی تبصرہ کر سکتا ہوں تو صرف اتنا کہ شادی کے بعد مجھے اپنے جذبات سے سمجھوتا تو کرنا ہی چاہئے۔"
"خدا تمہیں خوش رکھے۔" نوشین اچانک کھڑی ہو گئی۔ اسے محسوس ہوا تھا کہ اگر وہ کچھ دیر اور رُکی تو اپنے جذبات پر قابو رکھنا اس کے لئے ممکن نہیں رہے گا۔
عرفی اس کے ساتھ کیبن سے باہر نکلا۔ دونوں بیرونی دروازے کی طرف بڑھے۔ عرفی کہہ رہا تھا۔
"ہم دوست تو بدستور رہیں گے نا نوشین! شادی سے دوستی تو متاثر نہیں ہو جاتی۔ ہماری دوستی کا آغاز بھی اس وقت ہوا تھا جب تم شادی شدہ تھیں۔ مجھے بھول مت جانا' ملتی رہنا۔ میں سوچوں گا کہ تمہارے مستقبل کی بہتری کے لئے کیا راستے تلاش کیے جا سکتے ہیں؟"
نوشین چپ رہی۔ وہ بولتے ہوئے بھی ڈر رہی تھی کہ اس کا کلیجا خون رو دے گا۔
وہ ہوٹل سے نکل آئے۔
"تمہاری کار کہاں ہے؟" عرفی نے اِدھر اُدھر دیکھ کر پوچھا۔
"اچھا' خدا حافظ" نوشین کی آواز بھرا گئی اور پھر وہ تیزی سے ایک طرف مڑی۔ اس کے قدم بڑی تیزی سے اٹھ رہے تھے' وہ اتنی ہیجانی کیفیت میں تھی کہ شاید دوڑنا ہی شروع کر دیتی مگر اس خیال سے اس نے خود پر قابو رکھا تھا کہ عرفی اسے دیکھ رہا ہو گا۔ اس کے دماغ میں ایک بار پھر ماضی کے جملوں کی بوچھار ہونے لگی تھی۔
"پتھر اپنی جگہ پر ہی بھاری ہوتا ہے۔"
"دوسروں کے لئے کھودے جانے والے گڑھے میں کبھی کبھی انسان خود ہی گر پڑتا ہے۔"
"عجلت پسندی میں انسان بُرے بھلے راستے میں تمیز نہیں کر پاتا۔"
اور ان جملوں کی یورش نوشین کا دماغ شل کیے دے رہی تھی۔ عرفی ہوٹل کے دروازے پر کھڑا اسے جاتے دیکھتا رہا۔ کچھ دور نکل جانے کے بعد وہ ایک اندھیری گلی میں مڑ گئی جس کا اختتام کہاں ہوتا؟ یہ وہ بھی نہیں جانتی تھی۔

سسپنس کے آخری صفحات
اور جاسوسی کے سرورق کے رنگ

الجھی ڈور

کایا کلپ

آخری رابطہ

عجیب بحران

تماشائے فطرت

سفید خون

خواب گراں